قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 26 ❖ شمارہ 04 ❖ مئی 2016ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

| | | |
|---|---|---|
| شعبہ اشتہارات | محمود ظفر خان | 0333-2256789 |
| نمائندہ کراچی | محمد عثمان خان | 0323-2168391 |
| | واجد حمید | 0323-2895528 |
| نمائندہ لاہور | فراز علی ہاشمی | 0300-4214400 |

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کورنگی روڈ
کراچی 75500

طابع: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم، کراچی

خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200


بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ایک چھوٹی سی کہانی سنیں، ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک کشتی میں بہت سے لوگ سوار تھے۔ کشتی دریا کو پار کرنے کے لیے بڑھتی جارہی تھی کہ وہ گرداب میں پھنس گئی۔ ملاح نے اسے گرداب سے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن کشتی پر وزن زیادہ تھا اس لیے ناخدا پتوار سے صحیح طور پر کام لے نہیں پا رہا تھا۔ تھک کر اس نے کہا ''اب ایک ہی علاج ہے کہ آپ سب اپنے اضافی اسباب کی قربانی دیں۔ اپنے اپنے سامان پھینک دیں ورنہ کشتی بھنور سے نکل نہیں پائے گی۔'' لوگوں نے اپنے تمام سامان دریا برد کر دیے لیکن کشتی کا وزن پھر بھی کم نہ ہوا تو ملاح نے کہا۔ ''بھائیو! آپ نے سامان کی قربانی دی لیکن کشتی کا وزن پھر بھی کم نہ ہوا۔ اب آپ میں سے کچھ لوگ اپنی قربانی دیں۔'' کشتی پر ہر قسم کے لوگ سوار تھے۔ بڑے بڑے علمائے علم، تاجر، حکومتی ارکان، سیاست دان اور عام سے لوگ......! جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ کشتی سے چھلانگ لگانے پر کوئی بھی تیار نہ تھا۔ علمائے علم کا کہنا تھا کہ ہمارے بغیر آنے والی نسل جہالت میں رہ جائے گی۔ تاجروں کا موقف تھا ہمارے بغیر ملک کا معاشی نظام کیسے چلے گا۔ سیاست دانوں کا خیال تھا کہ ہم نہ ہوں گے تو حکومت کیسے قائم رہے گی۔ سب کی نظریں عام افراد پر لگی تھیں لیکن وہ بھی ٹس سے مس نہیں ہورہے تھے۔ تب سیاسی رہنما کھڑا ہوا اور بولا۔ ''جو وطن سے محبت کرتے ہیں وہ قربانی ضرور دیں گے۔'' باقی سب تو بیٹھے رہے، تمام کے تمام عام افراد نے چھلانگ لگا دی۔ سب کے چہرے کھل اٹھے تب سیاست داں نے علمائے علم و تجار و حکومتی ارکان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''عوام اسی کام کے لیے تو پیدا کیے گئے ہیں۔'' اس دور میں بھی ہم اس کہانی کو سچ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔

قافلے دلدلوں میں جا ٹھہرے
رہنما پھر بھی رہنما ٹھہرے

معراج رسول

# جاهل مطلق

فیض آباد جو کبھی سلطنت اودھ کا دارالحکومت تھا لیکن بعد میں اسے نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ منتقل کر دیا تھا۔ اسی فیض آباد اور لکھنؤ کے عین وسط میں (لکھنؤ سے تقریباً 42 میل دور) ایک چھوٹا سا قصبہ ہے دریا آباد، اسے 840 ہجری میں جب شاہانِ شرقیہ جونپور کی حکومت تھی دریا خان نامی دکلہ دار نے ایک چشتی بزرگ مخدوم شیخ محمد آبکش قدوائی کو وہاں بود و باش کی گزارش کی۔ قدوائی اسرائیلی نسل سے ہیں اور ان کا سلسلہ نسب لاوی بن حضرت یعقوب سے ملتا ہے۔ اسی خاندان کے بزرگ قاضی معزالدین بہ قدوۃ العلم والدین خواجہ اجمیری کے ساتھ آئے تھے اور اودھ میں رہائش اختیار کی تھی اور اس قصبے کی آبادکاری ہوئی تھی۔ اسی قصبہ اور اسی خاندان میں وسط مارچ 1892 میں مولوی حاجی عبدالقادر کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ دادا مفتی شریعت مولوی مظہر کریم شاہجہاں پور کے سررشتہ عدالت کلکٹری تھے جن پر 1857 کے وقت بغاوت کا الزام لگا تھا اور کئی سال کالے پانی کی سزا انڈیمان جا کر بھگت آئے تھے۔ اس بچے کا ایسے خاندان سے تعلق تھا اس لیے تعلیم کی طرف رجحان منتقل کرانا ضروری تھا۔ جب وہ تین سال کا ہوا ان دنوں ڈپٹی کلکٹر صاحب کی پوسٹنگ لکھیم پور کھیری میں تھی۔ وہیں اس کی رسم بسم اللہ خوانی کی تقریب رکھی گئی۔ زنانہ حصے میں پردہ کرایا گیا۔ صحن میں تخت بچھا۔ مولوی صاحب مع اس بچے کے بیٹھ گئے۔ عزیز اقارب و دیگر مہمان فرشی دری پر براجمان تھے۔ مولوی صاحب نے کتاب کھول کر بچے کی انگلی حرف پر رکھ کر پرشفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کہیے بسم اللہ۔'' بچے پر شرم طاری رہی منہ سے کچھ نہ بولا۔ ایک بار دوبارہ سہ بار مگر اس نے تو گویا سر نہ اٹھانے کی قسم کھائی تھی۔ تنگ آکر والد نے چھڑی منگوائی مارنے کا خوف دلایا پھر بھی بچے نے زبان نہ ہلائی تو مہمانوں کی مداخلت پر اسے زنان خانے میں بھیج دیا گیا۔ اندر جاتے ہی انا بوا نے بچے سے کہا۔ ''کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ نہیں آتی، ذرا جا کر مولوی صاحب کو کہہ تو آؤ۔'' اتنا سننا تھا کہ بچے نے پردے سے باہر نکل کر مولوی صاحب کو دیکھا۔ دوڑ کر قریب گیا اور زور سے چلایا۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' مہمانوں کے اترے ہوئے چہرے بحال ہو گئے۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مٹھائی بٹنے لگی۔ اگلے دن سے پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے سیتاپور ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہیں سے اس نے 1908ء میں میٹرک کیا پھر کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ ایف اے یہیں سے کیا۔ تعلیم یافتہ گھرانا تھا اس لیے مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ یہ اور بات تھی کہ اردو فارسی تو بہت پسند تھی لیکن عربی سے الجھن محسوس ہوتی تھی اسی لیے جب بی اے کا امتحان قریب آیا تو عربی کی کمزوری نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ نظم و نثر کی ذرا بھی تیاری نہ تھی۔ اس نے اس مسئلے کے حل کی خاطر مولانا عبدالباری سے دوستی گانٹھی۔ مولانا شاہ عبدالباری ندوی اشرفی ندوہ میں پڑھ رہے تھے اور میٹرک کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو مشورہ دیا کہ آپ مجھے عربی سمجھائیں میں آپ کو انگلش کی تیاری کراتا ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کے معلم بن گئے۔ اس طرح اس نے 1912ء میں سیکنڈ ڈویژن سے بی اے کر لیا۔ ایم اے کے لیے اس نے فلسفہ منتخب کیا۔ ان دنوں فلسفہ کرسچن کالج بنارس یا علی گڑھ میں پڑھایا جاتا تھا۔ سو وہ 1913ء میں علی گڑھ جا پہنچا۔ وہاں استاد بھی یوں ہی سے ملے اور کتابیں بھی دستیاب نہ ہوسکیں نتیجہ یہ نکلا کہ امتحان میں فیل ہو گیا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ فکر معاش دامن گیر تھی۔ ایسے وقت میں مہاراجا محمود آباد سر علی محمد خاں نے تعلیمی اخراجات کی ذمے داری اپنے سر لے لی اور وہ مسیحی کالج سینٹ اسٹیفنس دہلی منتقل ہو گیا۔ وہاں پروفیسر شارپ اور سی ایف اینڈریوز جیسے قابل اساتذہ ملے۔ تعلیمی سلسلہ چل نکلا۔ ابھی کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ لکھنؤ سے دہلا دینے والی خبر آ گئی۔ جس بینک میں خاندانی جمع پونجی تھی، اس بینک کا دیوالیہ ہو گیا۔ وہ دہلی سے بھاگم بھاگ لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ آتے ہی وہ خاندان کی ایک لڑکی کی محبت کا اسیر ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح یہ شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بیوی سے جدائی برداشت سے باہر تھی اس لیے اس نے تعلیم سے منہ موڑ لیا۔ اب معاشی تنگ دستی سے آزادی کیسے ہو فکر کھانے لگی۔ ایم اے فیل کو کسی یونیورسٹی میں پروفیسری تو مل نہیں سکتی تھی اس لیے مختلف رسالوں کو فلسفہ پر مضامین لکھ لکھ کر بھیجنے لگے لیکن یہ کام بھی کچھ دنوں میں ٹھپ ہو گیا۔ ایسے وقت میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بہت ساتھ دیا۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے تصنیف و تالیف اور ترجمے کا کام دلواتے رہے۔ اس طرح چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ کچھ دنوں تک علی گڑھ میں بھی کام کیا مگر جی نہ لگا تو استعفیٰ دے کر واپس آ گئے۔ 1917ء میں سر راس مسعود اور بابائے اردو نے تار دے کر حیدر آباد بلایا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے والی تھی۔ ہر فن پر کتابیں تیار ہو رہی تھیں۔ وہاں تین سو روپے ماہوار پر گیارہ مہینے رہے لیکن مستعفی ہو کر واپس آ گئے اور مضامین لکھنے لگے۔ لندن کے سیٹرڈے ریویو، نیچر، بمبئی کے ایسٹ اینڈ ویسٹ، مدراس کے انڈین ریویو اپنی ایسٹ کے ماہنامہ تھیا سوفسٹ، کلکتہ کے ماڈرن ریویو، انڈین ڈیلی ٹیلی گراف، لیڈر، پائنیر، بمبئی کرانیکل، نیو انڈیا، اسٹیٹس مین جیسے اخبار و جرائد میں تواتر سے چھپتے رہے پھر ریڈیو کے لیے لکھنے لگے لیکن زندگی مذبذب سے بھری رہی۔ کبھی ملحد بن گئے تو کبھی پکے نمازی۔ لیکن 1928ء میں مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کرنے کے بعد پھر کسی اور طرف نہ دیکھا اور لوگ انہیں مولوی کہہ کر مخاطب کرنے لگے جب کہ آخر وقت تک عبدالماجد دریا آبادی خود کو جاہل مطلق کہہ کر مولوی کا خطاب دینے والوں کو رد کرتے رہے۔ ☆☆

☆عمران جونانی کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''انسان کے مختلف ادوار کی جانکاری کا نام تاریخ ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر ایک صدی قبل تک دریافت ایجاد پر غالب تھی۔ نئے نئے علاقے، دھاتیں، بوٹیاں، سیارے، افلاک دریافت ہوتے گئے لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے ایجادات کا زور شروع ہوا جنہوں نے زندگی کو جادوئی انداز میں بدل کر رکھ دیا۔ طارق عزیز نے ''اولین دریافت'' میں کمال خوب صورتی سے جن مہمات کا ذکر کیا ہے دراصل انہی کا تسلسل آج ہماری آسائشوں کی معراج ہے۔ ''بھید بھری زمین'' اسرار بھری کہانی زندگی سے بھرپور تحریر ہے۔ سلمٰی اعوان آپا! کمال لکھا آپ نے، ایک طرف خوب صورت سفر نامہ دوسری طرف دلگداز داستان جس کا خوشیوں بھرا اختتام دل خوش کر گیا۔ صداقت ساجد نے ''نیکیوں کا کرشمہ'' کی صورت ایک بڑی پیاری تحریر کا روانی سے ترجمہ کیا۔ بلاشبہ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں۔ منظر امام صاحب ''تاریخِ عالم'' صرف تاریخ کے طالب علموں کے لیے ہی نہیں ہم ایسے کم علموں کے لیے بھی خوب صورت تحفہ ہے۔ گل حمید کے بارے میں سرگزشت کے صفحات سے پہلے بھی دو تین مرتبہ ہلکی پھلکی معلومات مل چکی ہیں۔ شاہد جہانگیر کی تحریر انہی کی تکرار ہے۔ رنگیلا مرحوم کی ابتدائی زندگی طویل انتظار اور محنت سے بھرپور ہے۔ انور فرہاد صاحب کی طبیعت کیسی ہے اب؟ (تا دمِ تحریر سنبھلی نہیں ہے) اپنی ابتدا سے اب تک ''اس ماہ کی شخصیات'' کے ذریعے صائمہ اقبال سرگزشت کے نام کی لاج رکھ رہی ہیں۔ دماغ میں خوب صورت سا خلل، سفر کی محبت اچھی قسمت غرض یہ کہ ندیم اقبال صاحب آپ کی زندگی میں ایسا بہت کچھ ہے جس نے آپ کو کامیاب سیلانی بنایا۔ بڑی خوب صورت ابتداء ہے یہ نئے سفر نامے کی۔ پچھلی مرتبہ آپ نے بہلا پھسلا کر شاہ جی کو بکرا بنایا اور اس مرتبہ آپ کے بچپن کا تذکرہ پڑھا کہ معصوم کبابش دوست کو پہلے دریا خان اور پھر لاہور تک لے گئے۔ قرب و جوار کے لوگوں کو تو آپ سے بچ کر رہنا ہوگا، ہاہاہا۔ مالک کرے کاشف کا جنت میں اعلیٰ مقام ہو دریا کو کوزے میں بند کیا کرکٹ کی ابتداء سے لے کر آج تک کی کہانی، اتار چڑھاؤ، مستقبل کی پیشن گوئیاں سبھی کچھ دلچسپ پیرائے میں مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ مرحوم اپنے عروج کے دور میں دنیا سے چلے گئے۔ اولاد نیک ہو تو یونہی بڑوں کا نام اونچا کرتی ہے۔ مولانا حبیب شیرانی نے نہ صرف والد کی سخاوت کو زندہ رکھا بلکہ مزید ترقی دی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے اس مرتبہ ''صاحبِ دل'' نسبتاً مختصر لیکن جامع لکھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا مختصر زندگی نامہ بہت پسند آیا خاص طور پر ابتداء میں اس دور کے حالات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بڑا پسند آیا۔ ''شہرِ خیال'' کے دوستوں کو خاص سلام۔ فیروز عاجز! حق آپ کے بھائی کی کامل مغفرت فرمائے۔ رانا شاہد! بڑے عرصے بعد آئے ہو یار۔ اویس شیخ! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ احمد خان توحیدی، سعید احمد چاند، اویس شیخ، رومی انصاری، رضا احمد اعوان نے محبت سے ناچیز کو یاد رکھا۔ رضا اعوان! نماز کی پابندی تلاوت کی کثرت کر دو مسائل حل ہوں گے۔ طاہرہ گلزار، حکیم نقوی اور اعوان کے تبصرے بہت پسند آئے۔''

☆ محمد اشفاق نے سرائے عالمگیر سے لکھا ہے۔ ''کاشف زبیر کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ میں پچھلے چند سالوں سے سسپنس، جاسوسی صرف اور صرف احمد اقبال، کاشف مغل، نواب صاحب کی وجہ سے پڑھ رہا ہوں۔ یعنی میں صرف ان ہی رائٹروں کی تحریریں پڑھتا ہوں (ہر قاری کی اپنی پسند ہوتی ہے۔ ان تینوں کا اپنا مقام ہے، مخصوص انداز ہے)۔ ہاں سرگزشت ایک دوسری طرح کا رسالہ ہے، وہ سارا پڑھتا ہوں۔ جہاں تک ''سراب'' کی بات ہے میں نے ابھی تک سراب کی ایک بھی قسط نہیں پڑھی۔ ایک بات اور عرض کرنی تھی کہ مجھے تو اب احمد اقبال اور مغل صاحب کے علاوہ اور کوئی ایسا مصنف نظر نہیں آتا جو ''سسپنس'' کے آخری صفحات اور ''جاسوسی'' کے ابتدائی اور آخری رنگوں کا حق ادا کر سکے تو میرا مشورہ ہے کہ ادارہ عمیرہ احمد، نمرہ احمد اور فرحت اشتیاق سے رابطہ کرے تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے (آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ جاسوسی، سسپنس کے قارئین میں سے ہیں اور مشورہ ایسی خواتین رائٹرز کا دے رہے ہیں جو جاسوسی یا سسپنس کے مزاج کا لکھتی ہی نہیں)۔ ناہید سلطانہ اختر بھی اب آخری عمر میں ہیں وہ کتنا بوجھ اٹھائیں گی۔ ہاں اسماء قادری اور مریم کے خان بھی ہیں۔ خاص کر اگر مریم کے خان کو فل ٹائم مصنف بنائیں تو اچھا ہے (مصنف بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے اگر مریم کے خان لکھ سکتی ہیں تو صفحات حاضر ہیں) سرگزشت میں ندیم اقبال صاحب نے جو شمال کے سفر کا نامہ چار قسطوں میں لکھا ہے یا ادارے نے چار قسطوں میں شائع کیا ہے وہ اگر کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تو مہربانی ہوگی۔ ان کے اندازِ تحریر نے تارڑ صاحب اور ابن صفی مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے ......... ان کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے تو بہتر ہے۔''

☆سلیم رشید لاہور سے رقمطراز ہیں۔ ''محترم کاشف زبیر کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا فرمائے، (آمین)۔ لاہور میں گلشن اقبال پارک میں ایسٹر کے موقع پر بم دھماکے میں معصوم بچے، عورتیں، مرد و بوڑھے وغیرہ ہلاک و زخمی ہو گئے۔ خدا اس ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے، (آمین)۔ ''چور شاعر'' بہت خوب صورت تحریر ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ''سر'' کا خطاب واپس کیا کیونکہ معصوم لوگوں کا جلیانوالا باغ میں انگریز حکمرانوں نے قتلِ عام کیا تھا جب کہ ہمارے ملک میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو ''سر'' کا خطاب ملا اور بعد میں ذلیل ہوئے لیکن اس اعزاز کو قبروں میں ساتھ لے گئے۔ ''دیوانی کرکٹ'' جناب کاشف زبیر کا ایک مکمل مضمون ہے۔ کرکٹ اب ایک انڈسٹری بن گئی ہے اور ٹیسٹ کرکٹر ایک دو ٹیسٹ کھیل کر کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ کھلاڑی بک جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش اور انڈیا کا میچ جو کہ بنگلہ دیش جیتنے کی پوزیشن میں تھا اور برابر بھی کر سکتا تھا اگر کھیلنے والے بلے باز ایک رن بھاگ کر پہلے لیتے لیکن وہ تو میچ پکڑانے کے لیے آئے تھے اور تین بال میں ہار گئے۔ اسی طرح بعض میچ فکس نظر آتے ہیں۔ اب کرکٹ بھی مکمل جوا بن چکا ہے اور ہمارے کھلاڑی اس میں سزا یافتہ ہیں۔ شاہد جہانگیر پشاور والے بیمار ہیں اللہ ان کو شفا دے اور دیگر لکھنے والوں کو بھی شفایاب کرے تاکہ وہ اس رسالے کی رونق دوبالا کریں، (آمین) ''ذرہ بنا آفتاب'' رنگیلا صاحب مرحوم کے بارے میں ایک اچھا مضمون ہے۔ واقعی اس فنکار نے معمولی اداکار سے ہیرو، گلوکار، ہدایت کار، پروڈیوسر تک کی حیثیت حاصل کی۔ ''دلربا'' پڑھ کر گل حمید کی حیثیت معما دکھائی دی اور ان کی موت کی وجہ گتھلیاں بنیں یا واقعی ان کو زہر دیا گیا ان کی جوان موت افسردہ کر گئی۔ اسی طرح ''الناصر'' فنکار بھی اپنی خوب صورتی کی وجہ سے فلمی صنعت میں مشہور تھے اور ان کی بھی جوان موت تھی۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے، (آمین)۔ دوسرے مضامین پڑھ رہا ہوں اس لیے تبصرہ نہیں کر سکا۔''

☆انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے آمد۔ ''سرگزشت کے لیے خطرناک مجرم، علم کا گہوارہ، انتخاب قتل، کوپرا کار بچھو اور مدین کا آدم خور بھیج رکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی شائع نہیں ہوا۔ براہ مہربانی توجہ فرما دیجیے۔ (پلیز تحریر بھیجنے سے قبل پڑھ لیا کریں تاکہ سلیکشن کے لیے ہمیں دشواری نہ ہو اور صرف وہ تحریر ارسال کریں جو سرگزشت کے مزاج کی ہو)۔''

☆سدرہ بانو ناگوری کا اظہاریہ کراچی سے۔ ''سراب کی قسط پڑھی وہ سراب جو کاشف زبیر کی رخصتی کے بعد لکھی گئی۔ اچھی قسط تھی مگر یوں لگا جیسے جلدی میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سفیر کی اچانک واپسی، راجا صاحب کی میرا سے ملاقات، باسو کی شخصیت میں تیزی سے بدلاؤ، یوں لگا کہ جیسے یہ قسط......... نے لکھی ہے۔ (جس مصنف کا نام لیا ہے ان کا اندازِ تحریر بالکل الگ ہے۔ وہ چھوٹے جملوں کا استعمال کرتے ہیں اس لیے آپ فیل ہو گئیں)۔ کاشف زبیر سیدھے سبھاؤ وہ اپنے قارئین کو رشتوں کی محبت، محبتوں میں اعتدال، رشتوں میں توازن اور اخلاقیات کے پھیلاؤ کی تربیت دیا کرتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ''انتقام'' میں زوبیہ نے جو کیا وہ ایک ٹھکرائی ہوئی اولاد کو ترستی ہوئی نفسیاتی عورت کے عین مطابق تھا۔ پڑھنے والوں کو عجیب لگ رہا ہوگا کہ میں زوبیہ سے ہمدردی کر رہی ہوں تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا؟ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہوئی تاخیر تو سبب باعث تاخیر بھی تھا۔ ''زری کوری'' اور ''ہیں کواکب'' کچھ مختصر اور سادہ سے انجام کی کہانیاں تھیں۔ ''ہوشیار'' کے عنوان سے لکھی گئی کہانی ایک خاص سبق دیتی ہے خاص طور پر اس کا انجام بھی ہوتا تھا اگر اس کا انجام خوشگوار ہوتا تو بے شمار دوشیزہ اس اندھے رستے پر چل پڑتیں جس کا دروازہ اس بازار میں کھلتا ہے اور ہزاروں لاکھوں لڑکیوں میں کوئی ایک سلامت پار اترتی ہے۔ باقی سب مگرمچھوں کی خوراک بنتی ہیں۔ ''بھید بھری زمین'' اس شمارے کی خاص الخاص تحریر جو سیدھی دل میں اتر گئی۔ سلمٰی اعوان سرگزشت میں آئیں اور آتے ہی چھا گئیں۔ خوب صورت ادبی کہانی ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھی۔ گڑیا کے کیا کردار تھے۔ کیا جملے تھے اور کیا اتار چڑھاؤ اور ہر کردار کے لہجے کا انتہائی رچاؤ مرکزی کرداروں سے نفرت کرتے کرتے اچانک ہی بے تحاشا محبت ہو گئی۔ ماں نے کیا خوب فیصلہ کیا تھا ایسا فیصلہ جس میں کشتی ڈوب بھی سکتی تھی اور سب کچھ تباہ بھی ہو سکتا تھا مگر ماں کی دوربین نگاہوں نے جو دیکھا سوچے رب نے وہ پورا کیا۔ ماں کی دعاؤں نے کمال کر دکھایا۔ بہت خوب سلمٰی اعوان

محفل تو اس دفعہ آپ نے لوٹ لی ویلڈن۔ بیجوں کا کرشمہ یہ ہے وہ کہانی جس میں بے لوث جذبے کا سبق دیا گیا۔ ایک تحفہ مسرت و شادمانی کا سبب بنا اور قدم قدم پر حیرت و استعجاب کے در وا کرتا چلا گیا۔ ”ذرہ بنا آفتاب“ میں رنگیلا کی اسٹوری انکل انور فرہاد نے لکھی یہ بے مثال فنکار جب اپنی فنکاری کے جوہر دکھا رہا تھا اس وقت ہمارے والدین گڑیوں سے کھیلتے تھے اور مٹی کے گھروندے بناتے تھے۔ سو ہمارا ان سے تعارف آنے والے دنوں میں ہوا خاص طور پر انکل سفیان آفاقی نے ان کا تذکرہ خاص کیا اور ہمیں پتا چلا کہ رنگیلا صرف تاریخ کا حصہ ہی نہیں بلکہ ہمارے پچھلے دور کا ایک جیتا جاگتا کردار بھی تھا۔ رانا سجاد آپ نے کراچی کے حالات کے بارے میں پوچھا سو اس ضمن میں یہی کہوں گی کہ آرمی پبلک اسکول کے بچوں نے اپنی جان دے کر کراچی کو پہلے سے بہت بہتر بنا دیا ہے۔ کراچی کی رونقیں لوٹ رہی ہیں حکیم رضا صاحب ”روپ بہروپ“ پر میرا تبصرہ بھی پڑھ لیتے۔ سلیم قیصر میرے لفظوں سے آپ کو حوصلہ ملا مجھے اچھا لگا بس ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کیجیے اور اسی طرح لکھتے رہیں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

☆ خالد محمود کا تبصرہ ملتان کینٹ سے۔ ”کاشف زبیر کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ ان کا کرکٹ کے بارے میں مضمون پڑھ کر پرانی یادیں بحال ہوئیں۔ ہندوستان کی ہر معاملے میں شیطانیت بھی واضح ہوگئی۔ خدا تعالیٰ ان کو قبر میں خوشگوار زندگی عطا کرے۔ صائمہ اقبال کا ”اپریل کی شخصیات“ کے بارے میں مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ فلم نگری کے سلسلے میں محمد سعید خاں عرف رنگیلا کا تعارف بہت اچھا اضافہ ہے۔ انور فرہاد نے بہت تسلسل کے ساتھ ان کی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ میں نے ان کو پہلی بار 1953ء میں لاہور میں ایک نمائش میں خبریں پڑھتے دیکھا تھا۔ تب وہ پندرہ سال کے قریب ہوں گے۔ ایک ریڈیو اسٹیشن نمائش کے اندر قائم کیا گیا تھا۔ ان کی مزاحیہ خبریں آج بھی یاد ہیں۔ موسم کا حال بتاتے ہوئے فرمایا کہ آج ہوا پیدل چل رہی تھی۔ سبزی منڈی کے بھاؤ کے بارے میں خبر تھی کہ آلو دو آنے سیر، پیاز تین آنے سیر، کدو ایک آنہ سیر اور لیسے بینگن مفت۔ عام لوگ رنگیلا کو ایک کامیڈین سمجھتے ہیں حالانکہ وہ فلمی دنیا کی عظیم شخصیت تھی۔ وہ ایک بڑا ایکٹر، ڈائریکٹر، پروڈیوسر، سنگر اور اسٹوری رائٹر بھی تھا۔ اس وقت جانی واکر، گوپ، یعقوب، نذر، آصف جاہ، ظریف، منور ظریف، لہری اور ننھا بڑے نامور کامیڈین تھے مگر رنگیلا کی حیثیت منفرد ہے۔ دل ربا بہت مختصر تھا۔ گل حمید کی کسی فلم کا ذکر نہ تھا۔ ”بھید بھری زمین“ کا موضوع بہت شاندار ہے مگر خواہ مخواہ سسپنس پیدا کر کے الجھن پیدا کی گئی ہے۔ ”بدخصلت“ غالباً غلطی سے سرگزشت میں چھپ گئی کیونکہ اس میں جاسوسی طرز تحریر غالب ہے لیکن اس کے باوجود ایک بہت بڑے معاشرتی ظلم کو اجاگر کرتی ہے۔ دیگر سچ بیانیوں میں تعلیم و تربیت، دوسری شادی، ہیں کواکب، انتقام بہت پسند آئیں۔ عزت دینے والا ایک سبق آموز اور اللہ پر کامل یقین رکھنے والوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ آخر میں آپ کے ابتدائیہ صفحے پر غور کیا اور اب میں 77 سال کا ہو گیا ہوں اور بے شمار سیاسی اور غیر اخلاقی لوگوں کی کرتوتوں کو دیکھا بھی اور سنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی شکل میں مسلمانوں کو تحفہ دیا تھا اور یہودیوں کا امتحان لینے کے لیے اسرائیل وجود میں آیا۔ تقریباً ایک وقت میں دونوں ملک پیدا کیے گئے مگر ہمارے ملک کا غداروں نے ستیاناس کر دیا ہے۔“

☆ محمد خلیل چوہدری جہلم سے۔ ”محترم معراج رسول نے خود احتسابی پر بڑے جامع انداز میں اداریہ تحریر فرمایا۔ یک صفحی میں اپنے پسندیدہ رائٹر کے حالاتِ زندگی پڑھ کر تشنگی محسوس ہوئی۔ بہرحال سرگزشت کی اختصار نویسی کا کمال ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔ میری جنوری کی تجویز کہ یک صفحی داستانوں کو کتابی شکل میں شائع فرمائیں دیگر قارئین حضرات کیا رائے دیتے ہیں (نواب صاحب پر آپ نے خوب لکھا لیکن یہ تمام باتیں ”نواب پتی“ میں آچکی ہیں)۔ ”شہر خیال“ میں داخل ہوا تو بہن بھائیوں کی میٹھی میٹھی باتوں سے دل خوش ہو گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ ”سراب“ سے پہلے تک کی تمام تحریریں پڑھیں۔ وہ سچ بیانیاں بھی پڑھ چکا ہوں۔ انور فرہاد صاحب نے کمال کی تحریر لکھی ہے۔ کوئی تشنگی باقی نہیں رہی۔ میرے پاس ذکی کانپوری صاحب کی تمام کتب کا سیٹ ہے۔ انہوں نے بھی اتنے بلیغ و جامع انداز میں نہیں لکھا۔ منظر امام صاحب ”تاریخ عالم“ میں اپنا تحقیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سمندر سے موتی نکال کر لانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ تحقیق کوئی آسان کام نہیں اور پھر بکھری ہوئی تاریخ کو منظم انداز میں مرتب کرنا ان کی محنت اور کوشش قابلِ صد تحسین ہے۔ محترمہ صائمہ اقبال نے شخصیات میں کافی محنت کی ہے۔ انہیں ایک تجویز دینی تھی۔ اگر آپ پسند کریں تو شخصیت کے نام کے ساتھ ہی ابتدا میں تاریخ پیدائش اور اگر فوت شدہ ہے تو

**انتقال پُر ملال**

گزشتہ دنوں سرگزشت کے پرویز بلگرامی کی والدہ اور سسپنس کے اطہر علی کے والد انتقال کر گئے۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور قارئین سے مرحومین کی مغفرت کی دعا کا ملتمس ہے۔

تاریخ وفات بھی ساتھ ہی درج کر دیں تا کہ آغاز پر ہی پیدائش اور وفات کا پتا چل جائے۔“

☆ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بورے والا سے۔ ”معراج رسول صاحب نے اپنے اداریے میں جس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ عوامی نمائندے اب یہ کھیل عوام کے ساتھ کھیلتے رہیں گے۔ کیونکہ جب کرپشن اور مفادات کا ناسور ان نمائندوں کے خون میں شامل ہو جائے تو نجات مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ الیکشن سے پہلے اور الیکشن کے بعد ان سیاستدانوں کے رویوں پر غور کریں گے تو بہت کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ یک صفحی سرگزشت میں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ جس بڑے رائٹر کو نوبیل انعام ملا اسے بچپن میں چور شاعر کہا جاتا تھا۔ فیروز علی عاجز! اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ طاہرہ گلزار آپ کی سرگزشت کا انتظار رہے گا۔ شاہد جہانگیر شاہد! ہم آپ کی صحت کے لیے دعاگو ہیں۔ رضا احمد اعوان! ماں کے علاوہ دنیا کا کوئی رشتہ بھی بے لوث نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے بہن بھائیوں سے اپنا حق لیں اور پھر اپنا گھر بسا لیں۔ یہی سب سے بہتر حل ہے۔ احمد خان توحیدی کے خط میں آپ نے محی الدین نواب کی آپ بیتی کا لکھا ہے۔ یہ سرگزشت کے کس ماہ کے شمارے میں لگی تھی (فروری 1991ء)۔ پرویز بلگرامی کی کاشف زبیر کے بارے میں مختصر تحریر ان کی محبت کی کہانی سنا رہی تھی۔ کاشف زبیر کی کرکٹ کے حوالے سے ”دیوانی کرکٹ“ دلچسپ اور بھرپور معلومات لیے ہوئے تھی۔ صائمہ اقبال کی تحریر یقیناً بہت سی شخصیات کو یاد کرنے اور ان کے بارے میں جاننے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے قارئین سب سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کی ”دلربا“ گمنام سپر اسٹارز کے حوالے سے ایک اہم تحریر تھی۔ سرگزشت کی یہی خوبی ہے کہ یہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی قارئین کو معلومات فراہم کرتا ہے جن کے بارے میں اکثریت بالکل نہیں جانتی۔ منظر امام اپنی دلچسپ تحریر کے نویں حصے کے ساتھ موجود تھے۔ طارق عزیز خان کی ”اولین دریافت“ بھی معلومات کا خزانہ تھی۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور۔ ”سرگزشت مجھے اپنی سالگرہ کے دن یعنی یکم اپریل کو ملا۔ سب سے پہلے سرگزشت کھول کے اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر پر لکھا گیا دو صفحے کا مضمون پڑھا۔ تشنگی رہی لیکن ساتھ ہی دل سے ادارے کے لیے دعا بھی نکلی کہ کم از کم اتنے عظیم اور کم سن رائٹر کو یاد تو رکھا۔ اللہ تعالیٰ کاشف زبیر کی روح کو سکون عطا کرے، (آمین)۔ فہرست میں کاشف زبیر کے ساتھ اپنے شہر کے شاہد جہانگیر شاہد صاحب اور اپنے دو دوستوں صداقت حسین ساجد اور بھائی تفسیر عباس بابر کو دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ شاہد جہانگیر شاہد کو بھی اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا کرے، (آمین)۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے فیورٹ رائٹر محی الدین نواب انکل کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، (آمین)۔ معراج رسول کے پُرسوز دل اور حساس باتیں ہر بار کی طرح دل پر تیر کی طرح لگیں لیکن کیا کریں انکل ہماری بدنصیبی کہ ہم بے حس، ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ بے بس اور مظلوم بھی ہیں۔ ہم پندرہ کروڑ ہو کر بھی صرف 276 یا 280 لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا کریں انکل ہم خود بھی تو منافق، جھوٹے، خود غرض ہیں۔ یک صفحی میں معلوماتی تحریر ”چور شاعر“ پڑھی۔ نام دیکھ کے تو ہنسی چھوٹ گئی کہ اتنی عظیم شخصیت کو لوگ چور شاعر کہتے تھے۔ چلتے ہیں ”شہر خیال“ کی طرف لیکن ادارے کو کچھ کہنا ہے میں نے کبھی بھی اچھا یا جامع لکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بس ان دوستوں کو پڑھتے پڑھتے لکھنا شروع کیا اور آپ لوگوں کی محبت اور بڑا پن ہے کہ شائع کر لیتے ہو۔ صداقت بھائی ہمیں مہاتیر محمد سے بھی زیادہ عظیم لوگ ملے تھے لیکن ہم نے اپنے ہاتھوں پھانسی دے دی ورنہ آج پاکستان کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ میرے علاقے عمر زئی سے آکے تنگی سے عاجز صاحب حاضر تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، (آمین)۔ بھائی میں کسی کو نہیں بھولتی بس گھر میں ہی کچھ مسئلے تھے۔ رانا محمد شاہد بھائی آپ نے فرد وٹ والے کی بات بالکل صحیح کہی ہم دوسروں کے گریبان میں دیکھتے ہیں اپنے نہیں، کاش ہم سب یہ منافقت چھوڑ دیں لیکن ناممکن ہے۔ شاہد بھائی جب جب نواب انکل اور کاشف بھائی کے چلے جانے کا لفظ پڑھتی ہوں تو دل میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ ویلکم بھائی رانا محمد سجاد بہت خوب صورت تبصرہ لیے حاضر تھے۔ اب پھر غائب نہ ہو جانا۔ ادلیس شیخ بہت ہی زبردست اور شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ بھائی عورت جذا کی گناہ گار جو ہے اسی نے تو بابا آدم کو کہا تھا کہ مجھے مانگو ...... میرا سویٹ سا بھائی احمد خان توحیدی تفصیلی لیکن شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھا۔ سندرہ بانو ڈیئر آپ نے کاشف بھائی کے بارے میں جو کہا درست کہا اس کا سب سے اچھا کردار شہباز عرف شوبی کو کیسے بھول گئیں۔ باقی جیسے معمول آپ کا بہت ہی شاندار تبصرہ اچھا لگا۔ بھائی محمد سلیم قیصر میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ واہ بھائی فلک شیر ملک آپ ڈاکٹر ہیں سن کر خوشی ہوئی۔ میرے بھی دو بھائی اور ایک بہن ڈاکٹر ہیں بلکہ بھائیوں میں تو ایک آرمی کے ڈاکٹر ہیں۔ منیجر زاہد اللہ جان۔ کتنے سخت اور خوفناک واقعات گزرتے ہیں آپ لوگوں کے ساتھ، میرے بھائی نے ہمیں سیاچن کے جو واقعات بتائے پھر چار سال پہلے کوہاٹ سی ایم ایچ کے سامنے ایمبولینس پر جو راکٹ گرا میرا بھائی صرف دو منٹ پہلے ڈرائیور کے بار بار کہنے پر اتر کے اسپتال کے سامنے کھڑے تھے میری امی ان کی باتیں سن کے بہت روتی ہیں تو ہم ان کو کہتے ہیں کیا اوروں کے بچے نہیں ہوتے۔ ویسے بھائی فلک شیر مجھے آپ پر بھی فخر ہے کہ آپ پاک آرمی میں ہو اللہ آپ کو صحت دے، (آمین)۔“

☆ **ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے۔** ''اپنے پسندیدہ لکھاری کاشف زبیر کا پڑھ کر دھچکا لگا۔ آہ کاشف زبیر ہماری کتنی حسرتیں کتنی چاہتیں تھیں کہ کبھی آپ سے ملا جاتا مگر افسوس ہماری چاہت دل میں رہی۔ اس دفعہ سرگزشت میں ہمارے ''شہرِ خیال'' کے ساتھی چھائے ہوئے تھے۔ ''دل ربا'' شاہد جہانگیر شاہد کی کیا خوب صورت تحریر تھی۔ ایامِ علالت میں اتنی زبردست تحریر لکھی اگر صحت یاب ہوتے پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ ''ایجوں کا کرشمہ'' صداقت حسین ساجد، ایک نکٹ میں دو مزے کر رہے تھے۔ ایک تو صدارت کا مزہ اٹھا رہے تھے اور دوسرا ایجوں کا کرشمہ۔ بہر حال لکھنے کا انداز زبردست تھا اور یہ کہانی پڑھ کر ہمیں اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وہ حدیث یاد آ گئی، چار چیزوں سے محبت بڑھتی ہے۔ تحفہ دینے سے، سلام میں پہل کرنے سے، مجلس میں جگہ دینے سے اور پورا نام پکارنے سے۔ ''بدخصلت'' ہمارے شہرِ خیال کے قدیمی ساتھی تفسیر عباس بابر نے کیا کمال کہانی لکھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ صائمہ اقبال ''اپریل کی شخصیات'' کو باخوبی نبھا رہی ہیں اس تحریر میں رضا مراد نے معین اختر کے بارے میں چند الفاظ کہہ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ معین اختر اسٹیج کی دنیا میں ایسے ہیں جیسے عمران خان کرکٹ اور روٹیلپ کمار فلم کی دنیا میں، واہ کیا خوب صورت جملہ تھا۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' اگر فلم اسٹار رنگیلا کی سرگزشت کے ساتھ ان کی فلموں کی فہرست بھی شامل کر دیتے تو لطف آ جاتا۔ ویسے رنگیلا ہمارا اور ہمارے بڑے بھائی قیصر خان کا فیورٹ تھا۔ ''تاریخِ عالم'' مکمل ہونے پر پڑھیں گے۔ ''بھید بھری زمین'' میں مصنف نے سیاحت سے زیادہ آپ بیتی بیان کی ہے۔ ''دوسری شادی'' شازیہ خوش نصیب تھی، ورنہ خوش بختی صرف ایک بار دستک دیتی ہے۔ ''ہیں کو اک کچھ'' ایک نفسیاتی مریضہ سے نیکی کا کیا خوب اجر ملا۔ ''ری کوری'' پڑھ کر نانا پاٹیکر کا وہ ڈائیلاگ یاد آ گیا۔ ایک مچھر آدمی کو...... فیروز علی عاجز آپ کے بھائی کو اللہ فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے، (آمین)۔ رانا محمد شاہد اور رانا محمد سجاد کافی عرصے بعد نظر آئے۔ اولیس شیخ کا خط پڑھنے کے لائق تھا۔ احمد خان توحیدی کی باتیں قابلِ توجہ تھیں۔ طاہرہ گلزار نے کاشف زبیر کا ایسے ذکر کیا کہ دل اداس ہو گیا۔ سدرہ بانو تا گوری نے شاید ہمیں بھلا دیا ہے؟ بشریٰ افضل نے ہمیں ایسے یاد کیا جیسے کرسی صدارت کے ساتھ ہماری تصویر بھی لگی ہو۔ اعجاز حسین سٹھار، بھکر والوں کے بارے میں بجا فرما رہے تھے کیونکہ مارچ کے شمارے میں پانچ عدد مسمی پائے گئے۔ مرزا اطاہر الدین بیگ بڑا نام اور چھوٹا سا کلام تھا۔ عبدالجبار رومی انصاری اگلی صفوں میں نظر آئے۔ حکیم سید محمد رضا نقوی اور رضا احمد خان کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ وحید ریاست بھٹی دوست کہاں گم ہوتے جا رہے ہو۔ ڈاکٹر قرۃ العین نے لکھا کہ پُراسرار تحریریں دیتے رہیں بلکہ ہم تو ڈاکٹر صاحبہ سے ایک قدم آگے یہ کہتے ہیں کہ پُراسرار تحریریں جمع کرتے رہیں اور سال میں ایک دفعہ سردیوں اور دھند کے مہینے دسمبر یا جنوری میں قارئین کو سرما کا تحفہ دیا کریں۔ جس میں سچی کہانیوں کی تعداد زیادہ ہو حالانکہ ہم نے یعنی قارئین نے کبھی نہیں کہا کہ خاص نمبر میں معلوماتی مضامین زیادہ ہو۔ ہمارے شہرِ خیال کے رائٹر ساتھی کہاں گم ہیں۔ انجم فاروق ساحلی، ایاز راہی اور ردینہ نفیس انصاری کی گمشدگی کسی المناک خبر کی نشاندہی کرتی ہے۔ ویسے ہمارے فیورٹ رائٹر جیسے قلم کار کو محترم پرویز بلگرامی نے نہایت عمدگی سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے ویل ڈن بہت شکریہ۔''

☆ **ملک جاوید محمد خان سرکانی نے منچھچھ سے لکھا ہے۔** ''جناب معراج رسول اداریہ میں جمہوریت سے مایوسی کا اظہار فرما رہے تھے اگر سچ کہا جائے تو ہمارے ملک کی جمہوریت اور آمریت میں بس اتنا فرق ہے کہ آمریت فردِ واحد کے اقتدار کا نام ہے اور جمہوریت ایک ٹولے کا۔ یہاں کی جمہوریت ایسی بھینس ہے جس کا دودھ برسر اقتدار طبقہ ہی حاصل کر سکتا ہے یا ان سے وابستہ لوگ، عوام کے لیے تو ایسی جمہوریت سفید ہاتھی کی حیثیت رکھتی ہے اور یہاں کے جمہوری ڈھانچے کے پھیلاؤ کا موازنہ ان چار بڑے ملکوں سے کریں چین کی آبادی 135 کروڑ ہے اور 14 وزیر، بھارت 127 کروڑ اور 26 وزیر۔ امریکا اور برطانیہ 207 کروڑ کی آبادی کے لیے صرف 66 وزارتیں رکھتے ہیں اور وطنِ پاک میں صرف 17 کروڑ آبادی کے لیے 96 وزیر ہیں۔ یہ اعداد و شمار بھی 2010ء تک کے ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں ٹیگور کا خلاصہ زیست پڑھا ان کے آخری شاگرد سوبھو گیان چندانی بھی کچھ عرصہ پہلے کراچی میں فوت ہو گئے ہیں۔ بہن طاہرہ گلزار اور ناصر حسین رند صاحب یاد رکھنے کا شکریہ۔ شہرِ خیال میں غیر حاضری کی وجہ سرگزشت کا مہینے کی 29; 30 تاریخ کو ملنا ہے۔ اس کے بعد پڑھ کر تبصرہ لکھنا بھیجنا ناممکن ہو جاتا ہے (پندرہ تک خط موصول ہو جائے تو لگ جاتا ہے)۔ طاہرہ گلزار اللہ تعالیٰ آپ کی نانی مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ادبی دنیا کی بڑی قدآور شخصیات فاطمہ ثریا بجیا، انتظار حسین، محی الدین نواب اور کاشف زبیر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ ان کی تحاریر پڑھ کر گزرا۔ ان مرحومین کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا ہی کی جا سکتی ہے یہ سب شہر سے دور کے شہر سے لوگ اپنی ذات میں ایک خزانہ ایک دبستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ صاحبِ دل میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی داستانِ حیات پڑھی۔ اے کاش اپنا بھی کوئی ایسا کتب خانہ ہوتا کہ تشنگانِ علم آ آ کر سیراب ہوتے پر ایسے بڑے کام بڑے لوگوں کا نصیب ہوتے ہیں لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب بڑے بڑے اصحاب کو اس بڑے کام سے محروم دیکھتا ہوں۔ ایسے ہی بڑے کتب خانے کے مالک پٹنہ والے خدا بخش مرحوم کا بھی حق بنتا ہے کہ ان کی داستانِ حیات شائع کی جائے۔ کاشف زبیر مرحوم کی یہ بات ٹھیک ہے کہ ٹی 20 طرز کرکٹ کی ابتدا وطنِ عزیز میں ہوئی۔ شاہد جہانگیر دلربا کی اشاعت پر مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ منظر امام تاریخِ عالم میں کچھ غلطیاں کر گئے۔ غور خاندان ایرانی نژاد نہیں محمود غزنوی ایران الاصل تھے۔ ''ایجوں کا کرشمہ'' اور ''بھید بھری زمین'' بھی اچھی تحریریں ہیں۔ بھید بھری زمین جس میں مصنف نے بڑی خوبی اور خوب صورتی کے ساتھ جابجا پنجابی الفاظ کا استعمال کیا۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' اور ''شمشال سے نور زنو'' کا مطالعہ ابھی نہیں کیا۔''

☆ **عبدالجبار رومی انصاری کا خط لاہور سے۔** ''بچپن کا چور شاعر بھی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک نکلا۔ شخصیت کے حوالے سے نام ہی کافی ہے۔ ''شہرِ خیال'' کے بھی ستارے اپنے ذوق سے مزین تبصرہ نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ صداقت حسین، ساجد فیروز علی عاجز، رانا محمد شاہد، رانا محمد سجاد، سماج کی تلخ حقیقت پر رائے دیتے اولیس شیخ، طاہرہ گلزار، روپ بہروپ پر آئینہ دکھاتی سدرہ بانو دیلڈن بہترین تبصرہ ہے اور محمد سلیم قیصر، صائمہ نور، پہلے اپنے احتساب کے حق میں اعجاز حسین، فرزانہ نگہت، سیف احمد چاند، شاہد جہانگیر اور نیاز ملکانی رضا احمد اعوان سبھی نے اپنی تبصرہ نگاری میں بہترین رائے کا اظہار کیا۔ بہت اچھا لگا۔ موت کا جگری دوست شہباز جواب تہہ خانے میں پھنس گیا ہے اگلے شمارے میں یہ پہیلی حل ہو گی کہ وہ کیسے اپنے ساتھیوں سمیت بچ نکلا ہے۔ ''سراب'' کا مصنف چیخ ہوا۔ پھر بھی اچھا تاثر دے گئی۔ تعلیم و تربیت متاثر کن سچ بیانی تھی جو بے حد پسند آئی۔ اس کے لیے سونیا آیان مبارک باد کی مستحق ہیں اور یہ اسٹوری ہر لڑکی کے لیے قابلِ تقلید ہے اگر وہ اپنے لیے سمجھے تو اور قابلِ فخر ہیں وہ ٹیچر جنہوں نے پوری کلاس کو ایسی تعلیم اور تربیت دی۔ ''ہیں کو اک کچھ'' طارق عثمانی نے بھی سمجھداری کا ثبوت دیا اور نفسیاتی مریضہ فریحہ کو قبول کر لیا اور فریحہ بھی ٹھیک ہو گئی۔ ایسی دور کی سوچنے والے بھی بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ واہ ''نانگا پربت کا عقاب'' کی طرح ''شمشال سے نور زنو'' بھی زبردست سفرنامہ ہے مزہ آ گیا پڑھ کے۔ ندیم اقبال نے بہت اچھا لکھا ہے اور جہاں پر زمین کا سفر آتا ہے تو دل دھک دھک کرنے لگتا ہے کیوں کہ میں نے خود سیر و تفریح کی غرض سے ایسی زمین کے کئی سفر کیے اور خوب لطف اٹھایا ہے۔ ''اپریل کی شخصیات'' میں بڑے غلام علی، شان، نازیہ حسن، معین اختر اور ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت پر پڑھ کے اچھا لگا۔ اس کے علاوہ صاحبِ دل، دل ربا، مکافاتِ عمل، انتقام، عزت دینے والا اور اولین دریافت پڑھیں اور تحریروں کے مطابق اچھی لگیں۔ بیت بازی میں ثریا اکبر، عروبہ ناز، زرمینہ شاہ اور نوشین حجاب کے اشعار اچھے لگے۔''

☆ **صوبی شاہ کا خلوص نامہ ہری پور ہزارہ سے۔** ''خط دیر سے لکھ رہی ہوں پتا نہیں کب ملے آپ کو شائع بھی ہونہ ہو۔ دو باتوں نے اتنے محدود وقت میں بھی قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے ایک کاشف زبیر صاحب کی اچانک موت، دل صدمے سے بوجھل ہے اور ذہن ابھی تک شاکڈ۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ نمبر دو سچ بیانیوں میں دوسرے نمبر پر جو سچ بیانی ہے وہ پڑھ کر آنکھیں دھندلا گئیں۔ ہوشیار، جمیل حیدر کیا کہوں کیا لکھوں الفاظ نہیں میرے پاس۔ بڑھتی گئی سسکیاں اور آہیں بے آواز فریادیں عروج پر پہنچ گئیں اور ساتھ ساتھ دل سے دعا کی کہ یا اللہ کریم ہم سب کے بچے، بچیوں کو ہدایت نصیب فرما اور اپنی حفظ و امان میں رکھ میرے مالک (آمین)۔ کہانی اپنی بیٹی کو بھی دی اس نے بھی پڑھی اور بہت افسردہ ہوئی۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے لہٰذا تبصرہ محدود۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔''

☆ **محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا پیام۔** ''کاشف زبیر اور محی الدین نواب کے انتقال کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومین کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین۔ اپریل کا شمارہ وقت سے پہلے ہی موصول ہو گیا۔ اداریہ میں ایک تلخ حقیقت مختصر تھی۔ آخر کب تک؟ یک صفحی سرگزشت ''چور شاعر'' بہت خوب دریا کو کوزے میں بند کرنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں سب ساتھیوں کے خط بہت جامع اور خوب صورت تھے۔ ''شمشال سے نور زنو'' پڑھنے بیٹھے تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ''دیوانی کرکٹ'' مجھے کرکٹ کی سمجھ بوجھ تو ہے نہیں مگر پھر بھی پڑھی۔ پہلی سچ بیانی اچھی تھی۔ دیگر کہانیاں بھی بہترین تھیں جن میں ری کوری، ہوشیار، عزت دینے والا، ہیں کو اک اور بدخصلت ٹاپ پر تھیں۔ سلمیٰ اعوان کی ''بھید بھری زمین'' ایک بہت دلچسپ سفرنامہ تھا۔ پڑھ کر کتنی ہی دیر حیرت زدہ بیٹھے رہے اور سرگزشت کے مختلف صفحوں پر بکھری کترنیں بھی خوب تھیں۔''

☆ **فرزانہ نگہت کا خلوص نامہ اسلام آباد سے۔** ''میرا نام شاید آپ کے لیے اجنبی نہ ہو۔ ایک افسانہ اور دو خط پاکیزہ میں چھپے تھے۔ میں جس طرح پاکیزہ کی پُرجوش قاری ہوں اسی طرح سرگزشت کی بھی۔ یہ ہمہ صفت رسالہ اپنے پہلے شمارے سے ہی دل میں ایسا گھر کیے ہوئے ہے کہ کوئی اس کا مدِمقابل نہیں دکھائی دیتا۔ اس کی ہر چیز اپنی جگہ بے مثال ہے۔ معلوماتی مضامین، پُروقار تراجم، تحقیقاتی کام، اعلیٰ ترین اور متاثر کن سچی داستانیں عرصے سے تمنا تھی کہ میں بھی اس انتہائی پُروقار رسالے میں جگہ پالوں، اس کے مزاج، رنگ اور رویے کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ دو تحریریں تیار کی ہیں۔ آپ پڑھیے، رائے دیجیے (جلد پڑھ کر مطلع کر دیا جائے گا)''

☆ **اعجاز حسین سٹھار کی تشریف آوری نور پور تھل سے۔** ''فروری کا مہینا ادارہ کے لیے صدمے کے پہاڑ لے آیا اور قارئین بھی

اچانک اموات سے براہِ راست متاثر ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ تقدیر کے لکھے کو ٹالا نہیں جاسکتا لیکن شکوہ زبان پر ضرور آجاتا ہے کہ ابھی موت ٹل جاتی تو کیا جاتا تھا۔ اب کی بار اپریل کی شخصیات میں سب ہی محترم اور قابلِ فخر ہیں اور یہ سلسلہ اپنی مقبولیت کے ساتھ قارئین کی مکمل توجہ اور مطالعہ میں ہے۔ اس بار کی ''سراب'' لکھنے والے مصنف بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ روانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انشاءاللہ یہ شاہکار کہانی کامیابی سے اپنے اختتام تک پہنچے گی۔ سفیر پارٹی کی وادی میں آمد سے کئی موڑ آسکتے تھے لیکن شاید موجودہ حالات میں کہانی کو سمیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ''سراب'' کے بعد میرا پسندیدہ سلسلہ سچ بیانیاں ہیں۔ ''تعلیم و تربیت'' اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ سونیا جیسی لڑکی افسانوں یا خوش قسمت گھرانوں میں ہی مل سکتی ہے جس کو ایسی شریکِ حیات مل جائے تو کیا کہنے۔ جیسی تربیت اس نے اولاد کی کی، دیگر گھریلو ذمہ داریاں بااحسن طریقے سے نبھائیں کافی مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ ہر لمحہ بچوں کو نظر میں رکھنا، ادب و آداب، بات چیت، رہنے اور دوسروں سے برتنے کا ڈھنگ سکھانا گویا خود کو مار کر اور جذبوں کو پس پشت ڈال کر اپنا چین و آرام غارت کرنے والی بات تھی لیکن وہ ہر محاذ پر فتح یاب ٹھہری اور دعاؤں کے ساتھ داد بھی سمیٹی۔ ہوشیار، دوسری شادی، ری کوری، ہیں کوا کب کچھ، بھی پسند آئی۔

☆ فہمی فردوس احمد نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے۔ ''عرصہ دراز کی غیر حاضری کے بعد آج پھر سے حاضر ہوں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے گا کہ میں نے اس دوران سرگزشت پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ نہیں جناب۔ یہ وہ ماہنامہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لاکھوں کروڑوں تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتا ہے۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں پورا مہینا شدت سے سرگزشت کا انتظار کرتی ہوں اور جب رسالہ ہاتھ آتا ہے تو دو دن میں چٹ کر جاتی ہوں اور پھر اٹھائیس دن انتظار میں گزر جاتے ہیں۔ یہ والہانہ پن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتا جارہا ہے۔ مجھے اس کا ہر سلسلہ بہت پسند ہے۔ اس کی ہر تحریر دلچسپی اور معلومات سے بھرپور ہوتی ہے۔ میرے دو ناول ''دل دریا'' اور ''چاند جلتا رہا'' مارکیٹ میں ہے، تیسرا ناول بھی اب آرہا ہے۔''

☆ سعید احمد چاند کا تجزیہ کراچی سے۔ ''چور شاعر سے تعارف ہوا۔ نام تو بچپن سے ذہن میں تھا۔ علم تھا کہ وہ بنگال کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں اور شرمیلا ٹیگور کے دادا ہیں۔ آگے بڑھے پتا چلا کاشف زبیر دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) سچ بیانیوں میں پہلے سونیا ایان کی ''تعلیم و تربیت'' پڑھی۔ کہانی میں کہیں جھول نہیں ہے۔ اس کے بعد تمثیل حیدر کی ''ہوشیار'' پڑھی۔ اختر شہاب کی ''مکافات'' شازیہ لاہور کی ''دوسری شادی'' لہو بیب علی کی ''ری کوری'' ''ہیں کواکب'' طارق عثمانی کی جاندار تحریر تھی۔ دانیہ صدیقی کی ''انتقام''، تفسیر عباس بابر کی ''بدخصلت'' اظہر علی کی ''عزت دینے والا'' کہانیاں قریباً سبھی اچھی ہیں۔ جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا ان کا مشکور ہوں۔''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''اداریہ میں آپ اس بار گھسا پٹا سا موضوع لے کر آئے۔ میرا خیال ہے جمہوری نمائندے عوام کے ساتھ کیا کیا نہیں کر رہے، اس پر گفتگو بیکار ہے۔ سانحہ لاہور پر میرا دل چھلنی چھلنی ہے۔ ''چور شاعر'' کی کتھا بہت مزے والی تھی۔ رانا صاحب کی آمد نے محفل کی رونق بڑھادی۔ طاہرہ گلزار کی مردوں کے متعلق خیالات سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ کراچی سے سدرہ اپنے مخصوص مکتوب کے ساتھ حاضر تھیں۔ شاہد صاحب! خدا آپ کو صحت و تندرستی والی زندگی دے۔ شہرِ خیال سے گم قارئین میں غشی مے عزیز، عامر شہزاد اور شگفتہ مشتاق پلیز ایک بار محفل میں حاضری تو لگائیں۔ سفرنامے اور تاریخی واقعات پسندیدہ موضوعات میں شامل ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا سفر خدا کرے جاری و ساری رہے۔ الفاظ کی ایسی جادوگری کہ زبان خود بخود تعریفی جملے ادا کرے۔ ''اپریل کی شخصیات'' میں قلمی نام چھائے ہوئے تھے۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' موضوع جاندار تھا۔ ''تاریخِ عالم'' اگر اسی طرح جاری رہی تو اسے کتابی شکل ضرور دیجیے گا۔''

☆ محمد عباس، اوتھل ضلع لسبیلہ سے لکھتے ہیں۔ ''ماہنامہ سرگزشت سے شناسائی کی ایک ہی وجہ تھی سلسلہ وار کہانی ''سراب'' جس نے اپنے سحر میں جکڑ لیا لیکن قسمت نے وہ دن دکھایا کہ ہم سکتے میں رہ گئے یقین جانیے اس بار ''سراب'' ہم سے پڑھی ہی نہیں جارہی تھی۔ بہرحال جیسے تیسے کہانی کا مطالعہ کیا۔ اندازِ تحریر بے شک محترم کاشف زبیر کا نہ تھا لیکن پھر بھی پسند آیا ایسا لگا جیسے اس بار ''سراب'' ملک کے عظیم اور معروف قلم کار سے اعانت لی گئی ہے (صحیح نام جلد دیکھ لیں گے)۔ سرگزشت میں معلومات کا ایک جہاں ہوتا ہے۔ اپریل کی شخصیات، دیوانی کرکٹ اور مکافات کا ہی ابھی تک مطالعہ کرسکا ہوں جو کہ اپنی مثال آپ تھیں۔

تاخیر سے موصول خطوط: اکبر علی رند، جہانیاں۔ صفدر براس، کراچی۔ زاہد حسین کھمن، لاہور۔ نیاز احسن، زاہد شیخ، سیالکوٹ۔ باری خان، کوئٹہ۔ ظفر ساحل، جہلم۔ زرینہ کھوسو، حب۔ انیس حیات خان، گجرات۔ ظفر معراج، شادی پور۔ عباس علی، مظفر گڑھ۔ ایاز فرخی، بہاولپور۔ کائنات علی، کوٹ ادو۔ امتیاز جوکھیو، سکھر۔ عباس انصاری، حیدرآباد۔ فلک شیر ملک، شاہ گڑھ۔ آذر عباس شاہ، دریا خان۔ فاروق احمد، مظفر گڑھ۔ شائستہ نعیم، میرپور خاص۔ تسنیم زہرہ کاظمی، کراچی۔ حنیف ادیب، لاہور۔ شاہد اقبال شاہد، کراچی۔

# احوالِ نظر

ڈاکٹر ساجد امجد

اس کے لیے ہر موسم عذاب موسم تھا کیونکہ وہ جدھر چلی ہے ہوا ادھر نہیں جانا کے اصول پر کاربند تھا۔ وہ رقصِ سردارِ الم کا قائل تھا۔ ہر محاذ پر وہ اپنی ہی گھات میں رہتا جب کہ اس کے چاروں اطراف وہ لوگ تھے جو بولی لگ کر بکنے کو تیار بیٹھے تھے مگر وہ ہمیشہ عنوانِ ہستی بنا رہا کیونکہ اسے ستم گوارا نہ تھا اسی لیے بحرِ ہستی میں غم کا طوفان لیے درد کی ناؤ پر گزارا کررہا تھا۔

**موت** کے سناٹے ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے کہ دور دراز کے رشتے داروں کو ملک حبیب احمد مرحوم کی یاد آگئی جنہیں بیماری کی خبر نہیں پہنچی تھی انہیں انتقال کی خبر پہنچ گئی۔ تسلی کے دو بول، بول کر رشتے داری کا حق ادا کرنے آنے لگے۔

"ہمیں تو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ راولپنڈی میں تعینات ہیں۔" ایک نے کہا۔

"یہ تو آپ بہت پہلے کی بات کررہے ہیں۔ راولپنڈی سے ساہیوال آگئے تھے۔ پولیس لائنز میں کوارٹر مل گیا تھا وہیں رہائش پذیر تھے۔" ایک دوسرے صاحب نے ان کی تصحیح کی۔

"ساہیوال میں آمد کا ہمیں علم نہیں۔"

"علم کیسے ہوتا۔ انہوں نے کسی سے ملنا جلنا ہی نہیں رکھا تھا۔"

"ہاں بچوں میں گھر گئے تھے بے چارے۔ ایک مرتبہ میں کسی کام سے ساہیوال آیا تھا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ بیمار سے لگ رہے تھے۔"

"اسی بیماری نے تو انہیں قبل از وقت ریٹائر ہونے پر مجبور کردیا تھا۔"

"اوہو، یہ تو ہمیں معلوم ہی نہ ہوسکا ورنہ عیادت کو ضرور حاضر ہوتے۔"

"انہوں نے اس کا موقع ہی کہاں دیا۔ ان کے چچا زاد بھائی شیخ جان محمد ان کی عیادت کو گئے تو گھر کی حالت دیکھ کر بڑے متفکر ہوئے اور انہیں ساہیوال شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں آنے پر مجبور کردیا۔ شیخ جان محمد کے پاس ایک قطعہ اراضی موجود تھی۔ انہوں نے ترغیب دی کہ وہ اس زمین پر اپنا مکان تعمیر کرلیں۔ ملک صاحب نے اس تجویز پر عمل کیا اور یہاں چلے آئے۔ یہ وہی مکان تو ہے جس میں آپ لوگ بیٹھے ہیں۔"

"بڑی بات ہے جناب بھائی ہو تو ایسا۔"

"اس گھر میں انہیں زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔ دو سال ہوئے تھے کہ انتقال ہوگیا۔"

ملک حبیب احمد کی بیوہ ایسی باتیں روزانہ سنتی تھیں۔ یہ صرف باتیں ہی باتیں تھیں۔ کوئی یہ سوچنے کو تیار نہیں تھا کہ

حبیب احمد کے بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ رشتے داروں میں کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس نازک مرحلے پر اس خاندان کی کوئی مالی مدد کرسکتا۔

ملک حبیب احمد کے ایک چچازاد بھائی دین محمد بھی تھے جو قادیان (مشرقی پنجاب) میں رہتے تھے۔ صدموں کی دھوپ کسی حد تک ڈھل چکی تھی کہ وہ تعزیت کے لیے آئے۔ بیوہ تو عدت میں تھیں۔ وہ ملک حبیب احمد کی بیٹی مبارکہ بیگم کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ افسوس کے لیے لفظوں کا چناؤ کر ہی رہے تھے کہ ملک حبیب احمد کا بیٹا ظہور احمد جس کی عمر سات سال تھی سامنے سے گزرا۔

''یہ ظہور احمد ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں چاچا۔''

''کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو میں اس کی خوشی میں آیا تھا۔''

''ہاں چاچا وقت گزرتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔''

''یہ اسکول جاتا ہے یا نہیں۔''

''ابھی تو دوسری جماعت میں آیا ہے۔''

''گاؤں میں اسکول تو ہے نہیں۔ یہ کہاں جاتا ہے۔''

''ڈسٹرکٹ جیل کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔''

''وہ تو یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اتنا سا بچہ پیدل دو میل جاتا ہے اور دو میل آتا ہے۔ چار میل روز پیدل سفر کرتا ہے۔ یہ تو ظلم ہے اس ننھی سی جان پر۔''

''پیدل کہاں چاچا۔ منظور بھی اسی اسکول میں ہے۔ وہ گھوڑے پر جاتا ہے۔ ظہور بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں کبھی منظور چھٹی کرلیتا ہے تو ظہور کو پیدل جانا پڑ جاتا ہے۔ ویسے منظور چھٹیاں بہت کرتا ہے۔''

''بٹیا میں تمہیں ایک مشورہ دوں۔ ظہور احمد کو میرے پاس قادیان بھیج دو۔ وہاں اس کی تعلیم کا بہتر بندوبست ہو سکے گا۔ نگرانی بھی رہے گی۔ تمہاری دو بہنیں قادیان میں بیاہی ہوئی ہیں۔ ان کے پاس رہے گا تو اس کا دل بھی بہلا رہے گا۔ وہاں سے کچھ نہ کچھ بن کر نکلے گا اور اپنی ماں کا سہارا بنے گا۔''

''چاچا! اتنا بڑا فیصلہ میں کیسے کرسکتی ہوں۔ اس کے لیے تو اماں سے پوچھنا پڑے گا۔ وہ اسے خود سے جدا کرتی بھی ہیں یا نہیں۔''

''بیٹے کے مستقبل کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ یہاں کوئی مرد ظہور کی نگرانی کے لیے موجود نہیں ہے۔ وہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ بچے کو صرف پیار کی نہیں ڈانٹ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن اماں کو کیسے سمجھاؤں گی۔ ظہور احمد نو بہنوں کے بعد پیدا ہوا ہے۔ پورا گھر اس پر جان چھڑکتا ہے۔ اماں کا حال تو یہ ہے کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوجائے تو گھر سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ اتنی دور کیسے بھیج دیں گی۔''

''میں کچھ دنوں کے لیے پنڈی جارہا ہوں۔ واپسی میں چکر لگالوں گا۔ تم اپنی ماں کو سمجھا کر رکھنا۔''

ان کے چلے جانے کے بعد مبارکہ بیگم نے دین محمد کا پیغام اپنی ماں تک پہنچادیا۔ اس کا فوری ردِعمل وہی ہوا جس کی توقع کی جاسکتی تھی انہوں نے ظہور احمد کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

''گھر میں ایک ہی تو مرد رہ گیا ہے اسے بھی کہیں اور بھیج دوں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ گی ایک یہی تو ہے جو میرے پاس رہے گا۔''

''اماں چھوٹا بھائی انور بھی تو ہے۔''

''دونوں میرے پاس رہیں گے۔ دین محمد آئے تو اسے منع کردینا۔''

ظہور احمد کا حال بھی ماں سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ بھی ایک لمحے کے لیے ماں کا دوپٹا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ماں اور بہنوں کی ناز برداریوں نے اسے اپنی اہمیت کا احساس دلادیا تھا۔ وہ ان نعمتوں کو ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں سے تو وہ عبادت کی حد تک محبت کرتا تھا۔ وہ اپنی عبادت میں خلل ڈالنے کو تیار نہیں ہورہا تھا۔ وہ اگر کسی نئی جگہ چلا گیا تو اس کی فرمائشیں پوری کرنے والا وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

ظہور احمد کی ماں کا غصہ ذرا کم ہوا تو وہ دین محمد کی پیشکش پر سنجیدگی سے غور کرنے لگی۔ وہ کسی نتیجے پر پھر بھی نہ پہنچ سکی۔ وہ اتنا بڑا فیصلہ خود نہیں کرسکتی تھی۔ دماغ کچھ اور کہتا تھا دل کی کوئی اور رائے تھی۔ اس نے اس کشمکش سے بچنے کے لیے بعض رشتے داروں سے مشورہ کیا۔ ان سب کی رائے یہی تھی کہ ظہور احمد کو قادیان بھیج دیا جائے۔

ظہور کی ماں شوہر کی موت کے چند دن بعد ہی نازوں سے پلے بچے کو خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھی لیکن گھر سے اسکول تک کا فاصلہ بھی اس کے پیشِ نظر تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ اب اس کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ اگر ایک مرتبہ دل پر پتھر رکھ لوں تو بیٹے کا مستقبل بن جائے گا یہ تسلی بھی تھی کہ قادیان میں ظہور کی دو بہنیں ہیں جو اس کا خیال رکھیں گی۔

ظہور احمد احتجاج کرتا رہ گیا لیکن ماں نے اسے قادیان بھیج دیا۔

قادیان کی زندگی نظم و ضبط میں جکڑی ہوئی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ یہ نیا ماحول اور یہاں کی پابندی ظہور احمد کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

ادھر ظہور احمد کا حال یہ ہوا کہ وہ زبردستی یہاں بھیج تو دیا گیا۔ وہ بظاہر احتجاج تو نہ کرسکا لیکن اس کا غصہ جو اندر دب گیا تھا باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

یہاں پہنچتے ہی اس کا بستر کانٹوں کی سیج بن گیا۔ ماں کا خیال دل سے نکل کر چاروں طرف پھیل گیا۔ رات رات بھر جاگتا رہتا، دن کو کسی کونے میں بیٹھ کر اونگھتا رہتا اور سوچتا رہتا کہ اسے اس کی ماں سے جدا کیوں کردیا گیا۔ گھر سے نکلا تو قصبے کا ماحول بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ بہنوں کے آسرے پر اسے یہاں بھیجا گیا تھا جب کہ بہنوں کا خود یہ حال تھا کہ شوہروں کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔ کئی غصوں میں ایک غصہ یہ بھی شامل ہوگیا کہ اس کی بہنیں یہاں قید ہیں۔ اس کا غصہ نفرت میں تبدیل ہوگیا ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جو ماں سے جدائی کا سبب بنی ہوئی تھی۔

خاندان والے اس کی حالت سے بے خبر تھے۔ وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ عمر ایسی نہیں تھی کہ کھل کر اظہار کرتا اور برداشت کی طاقت بھی نہیں تھی۔

ان سب لوگوں سے انتقام لینے کی صورت اسے یہ نظر آئی کہ اس منصوبے کو پورا نہ ہونے دیا جائے جس کے لیے وہ یہاں لایا گیا ہے یعنی تعلیم حاصل نہ کی جائے اس خیال کے پیچھے یہ جذبہ بھی کہیں نہ کہیں موجود تھا کہ جب وہ تعلیم حاصل نہیں کرے گا تو اسے ماں کے پاس گاؤں بھیج دیا جائے گا۔ اس نے تعلیم میں دلچسپی لینا بالکل ہی چھوڑدیا۔ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اساتذہ کے مظالم کا نشانہ بننے لگا۔

جب اساتذہ مارتے مارتے تھک گئے تو گھر تک شکایت پہنچی۔ اب حال یہ ہوگیا کہ اسکول میں اساتذہ اور گھر میں عزیزوں کے ہاتھوں مار کھانا پڑتی۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب اس کے بہنوئی اسے مارتے تو اسے تکلیف نہیں خوشی ہوتی کہ وہ ان کے منصوبے ناکام کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ ان میں دم ہے تو مجھے پڑھا کر دیکھیں۔

ایک ذہین طالب علم، نالائق طالب علم میں تبدیل ہو گیا۔ اسکول، بستہ، کتابیں، اساتذہ، رشتے دار سب اس کی نفرت کے حصار میں آگئے۔

وہ اس نفرت کو مزید گہرا کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ ایک ترکیب یہ سمجھ میں آئی کہ ہر دوسرے تیسرے دن اسکول سے غائب ہوا جائے۔ اس نے بڑی باقاعدگی سے اس پر عمل شروع کردیا۔ دن بھر اِدھر اُدھر آبادی سے دور جنگلوں میں آوارہ گھومتا رہتا اور چھٹی کے وقت گھر چلا آتا۔

یہ خبریں گھر تک پہنچیں تو اس کے بہنوئی نے چھڑی اٹھائی اور پھر جسمانی سزا روز کا معمول بن گئی لیکن کوئی سزا اسے راہِ راست پر نہ لاسکی بلکہ گھر والوں کی طرف سے اس کی نفرت مزید گہری ہوگئی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول اسکول سے بھاگ کر ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے شانے پر کسی نے زور سے دھپ مارا اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی عمر سے کچھ بڑا لڑکا دانت نکالے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''کیا ہوا پارٹنر، اسکول سے بھاگ کر آئے ہو؟''

ظہور کچھ بھی نہ کہہ سکا بس اثبات میں گردن ہلادی۔

''اپنا بھی یہی حال ہے پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تو بھی اپنے جیسا ہے۔ جب بھی اسکول سے بھاگ کر آئے یہیں آجایا کر۔ میں نے تو اسکول جانا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''تمہارے گھر والے تمہیں مارتے نہیں۔''

''تھک گئے مارتے مارتے۔ تمہیں بھی تمہارے گھر والے ایک دن تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے۔''

اس کے بہنوئی اس کے حال پر تو نہ جانے کب چھوڑتے فی الحال تو اس کی پٹائی روز ہی ہورہی تھی۔ بہنوئی کا خیال تھا کہ پٹائی کے خوف سے وہ سدھر جائے گا لیکن اس کی آوارگی میں شدت آتی گئی۔ فیل ہونے کے بعد اس نے اسکول جانا بالکل ہی چھوڑ دیا۔

قصبے میں آوارہ لڑکوں کی کمی نہیں تھی۔ قادیان کی زندگی نظم و ضبط میں جکڑی ہوئی تھی لیکن برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی چند ایسے لڑکوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ بری صحبت میں رہ کر دنگا فساد، چوری چکاری روز کا معمول بن گیا۔

ایک لڑکے نے ایک بڑا سا چاقو بھی اس کی جیب میں

ڈال دیا۔

''ہم جس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں اس میں اس ہتھیار کی بڑی ضرورت ہے۔ اسے گھر والوں سے چھپا کر ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کر۔''

اس کے دوست اس کے دل کی کیفیت سے واقف ہی نہیں تھے۔ چاقو ملتے ہی اس کے دل میں نفرت کا چھپا جذبہ انتقام میں بدل گیا۔ اس کے سب سے بڑے دشمن اس کے بہنوئی تھے جو اس کی بہنوں پر بھی ظلم کررہے تھے اور اس پر بھی۔ چاقو ملنے کے بعد وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ چاقو کس طرح اپنے بہنوئیوں کے پیٹ میں اتار دے لیکن ابھی ایسی عمر نہیں تھی کہ یہ کام کر گزر سکتا۔ ذہین بچے سوچتے بہت ہیں۔ وہ بھی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کے آوارہ دوست اس کا ساتھ دیں گے لہٰذا انہیں زیادہ سے زیادہ خوش کیا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے لگا۔

اس کی عمر بڑھتی جارہی تھی۔ اب وہ تیرہ چودہ سال کا ہوگیا تھا۔ اس کے تیور ایسے ہوگئے تھے کہ بہنوئیوں کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ کہیں سے یہ خبریں بھی پہنچنے لگی تھیں کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے۔ اتنی سی عمر میں وہ نشے کا عادی ہوگیا تو عزیز و اقارب کو فکر ہوئی۔ انہوں نے خط لکھ کر اس کی والدہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور صاف لکھ دیا کہ اگر اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہو تو فوراً قادیان چلی آؤ۔ شاید تمہاری موجودگی اسے راہ راست پر لے آئے ورنہ اس کی طرف سے ہاتھ دھو رکھو۔

ظہور کی والدہ نے جوابیاً وحشت ناک خط پڑھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے اپنا مکان فروخت کیا اور قادیان چلی آئیں۔ انہوں نے قادیان پہنچتے ہی ظہور کو ایک کمرے میں بند کیا اور وہ تمام باتیں اسے بتائیں جو خط میں لکھی گئی تھیں۔ ظہور اب اتنا ہوشیار تو ہو ہی گیا تھا کہ بات سنبھال سکتا تھا۔ کچھ یہ کہ وہ سمجھتا بھی تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور روتے ہوئے اس نے بہنوئیوں کے مظالم ماں کے سامنے رکھ دیے کہ کس طرح اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے زبردستی اسکول سے اٹھالیا گیا ہے۔

عام ماؤں کی طرح انہوں نے ظہور کی بات کا یقین کیا اور تحقیق کیے بغیر اپنے دامادوں پر برس پڑیں کہ تم لوگ میرے بیٹے کے ساتھ زیادتی کرتے ہو۔

جھگڑا اتنا بڑھا کہ انہوں نے بہنوئیوں کے ساتھ رہنا بھی گوارا نہیں کیا اور الگ مکان کرائے پر لے لیا۔

وہ اپنی ماں، بہنوں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے لگا۔ اسکول جانے کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ والدہ مطمئن ہوگئیں کہ اب ان کا بیٹا یکسوئی سے تعلیم حاصل کرے گا۔

ماں کے آجانے سے ظہور کی ایک محرومی کا ازالہ تو ہوگیا لیکن محرومیاں اور بھی تھیں۔ باہر کے دوست اسی طرح موجود تھے۔ اس جھگڑے کے بعد اس کے بہنوئیوں نے اس کا داخلہ اپنے گھر میں بند کردیا تھا۔ انتقام کی آگ مزید بھڑک گئی۔ اس میں اب ایک عنصر یہ بھی شامل ہوگیا کہ اس کے بہنوئیوں نے اس کی ماں کی بے عزتی کی ہے۔

یہ جذبہ اتنا بڑھا کہ ماں کی محبت بھی اس میں کمی نہ کرسکی۔ اس کی آوارگی اسی طرح قائم رہی بلکہ اس میں مزید شدت آگئی۔ اسکول جانے کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر ختم ہوگیا۔ پہلے وہ دن میں غائب رہتا تھا۔ اب راتوں کو بھی غائب رہنے لگا۔

ایک روز رات بہت ہوگئی تھی۔ وہ گھر لوٹا تو دروازہ بند تھا۔ اس نے دیوار پھلانگ کر اندر جانے کی کوشش کی اسے دیکھ کر کتوں نے بھونکنا شروع کردیا۔ والدہ تو اس کے انتظار میں جاگ ہی رہی تھیں۔ وہ سمجھیں چور آگئے۔ کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ان کا چہیتا بیٹا دیوار پھلانگ کر صحن میں آیا ہے۔ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔

''کیا میں نے تمہیں اس لیے پیدا کیا اور پالا پوسا تھا کہ تم اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہو، میں نے تو یہ امید باندھی تھی کہ تم میرا سہارا بن کر مجھے سکھ دوگے مگر تم تو میرے بڑھاپے کا روگ بن گئے۔ تمام عزیز و اقارب تمہارا نام لے کر مجھے طعنے دیتے ہیں، اب میں کسی کو جواب دینے کے لائق نہیں رہی۔ تم نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔'' ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اماں ان عزیزوں کی بات مت کرو۔'' وہ چیخا۔ ''ان عزیزوں کی وجہ سے ہی میں اس حال کو پہنچا ہوں۔ میں ان سے انتقام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ایک ایک کرکے سب کو قتل کردوں گا۔''

''میرے بچے بدلے کی آگ میں کیوں خود کو جلاتا ہے۔ بدلا خدا پر چھوڑ دے۔ اپنے آپ کو سنبھال۔ تیری وجہ سے ہم سب برباد ہوجائیں گے۔''



باہر سے جو نشہ کرکے آیا تھا اس کے اثرات اب بھی باقی تھے۔ اس نے زیادہ الجھنا مناسب نہ سمجھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سو گیا ہے یا اپنے بارے میں کچھ سوچ رہا ہے۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو گھر کی فضا بدستور سوگوار تھی۔ ماں کی آنکھیں رات بھر جاگنے اور رونے کی وجہ سے سوجھی ہوئی تھیں۔

ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بڑی بہن ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی شاید رات بھر سوچتا رہا تھا اور اپنے کیے پر ندامت بھی۔ ماں سے لپٹ کر رو دیا۔

''اماں! اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تم جو کہو گی میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اب کچھ بھی ہو جائے میں تمہیں خوش رکھوں گا۔''

''اگر تو واقعی مجھے خوش دیکھنا چاہتا ہے تو اسکول برابر جایا کر، دل لگا کر پڑھ اور غنڈے دوستوں سے نجات حاصل کرلے۔''

اس نے بھی وعدہ کرلیا لیکن راستہ بدلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ غنڈے دوست اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس کی بدنامی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسکول والوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ اب مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ اس کی ماں کے سامنے اب ایک اور مرحلہ تھا۔ تمام رشتے دار ایک مرتبہ پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ طے ہوا کہ اسے کوئی کام سکھا دیا جائے تاکہ مصروفیت کے ساتھ آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی نکل آئے۔

اس کے بڑے بہنوئی اللہ بخش کا قادیان میں ایک پریس تھا جہاں جلد بندی اور فرمہ سازی کا کام ہوتا تھا۔ ظہور کی والدہ نے اپنے داماد کے ساتھ پریس پر کام سیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ نیک نیتی سے کام سیکھنے لگا لیکن اللہ بخش کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ وہ اسے طرح طرح سے پریشان کرنے لگے۔ وہ صحیح کام کرتا تو بھی ان میں کیڑے نکالے جاتے۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی اور اس کے ماضی کے طعنے دیے جاتے۔ رفتہ رفتہ اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو وہ اڑنے کے مواقع ڈھونڈنے لگا۔ پرانے ساتھیوں سے پھر رسم و راہ پیدا کرلی۔ ان ساتھیوں نے ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ ظہور احمد

## سوانحی خاکہ

نام: ظہور احمد
تخلص: ظہور نظر
والد: ملک حبیب احمد
پیدائش: پولیس لائنز منٹگمری (ساہیوال)
زوجہ: خورشید
تعلیم: آٹھویں
سن پیدائش: 22 اگست 1923ء
تاریخ وفات: 7 [illegible] 1981ء
تدفین: بہاولپور

## تصانیف

ریزہ ریزہ، وفا کا سفر، کلیات ظہور نظر، بھیگی پلکیں۔

ان کی باتوں میں آگیا اور پریس جانا ترک کردیا۔ پھر وہی آوارگی، روز و شب کا وہی پرانا انداز۔ اب اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح بہنوئی کو قتل کردیا جائے۔ اس کے لیے بدمعاش دوستوں کی مدد کی ضرورت تھی لہٰذا وہ دن رات انہیں خوش کرنے کے لیے ان کے ساتھ رہنے لگا۔ اب وہ چھوٹی موٹی چوریاں بھی کرنے لگا تھا۔ ان وارداتوں سے ملنے والی رقم کا کچھ حصہ ماں کے ہاتھ میں بھی تھما دیتا اور بہانہ کردیتا کہ وہ چھوٹی موٹی مزدوری کرکے یہ رقم کماتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا کہ ایک ہنگامی حالت درپیش ہوگئی۔

ظہور احمد کی ایک بہن منظور بیگم معذور تھی۔ اس کی شادی کا مسئلہ اس کی والدہ کو پریشان کیے رکھتا تھا۔ اسی اثناء میں ظہور کے بہنوئی کے خاندان کے کسی فرد کے لیے منظور بیگم کا رشتہ آیا۔ ماں تو جیسے تلی بیٹھی تھیں کہ رشتہ کہیں سے بھی آجائے وہ اس کے ہاتھ پیلے کردیں۔ انہوں نے یہ رشتہ جھٹ منظور کرلیا لیکن ظہور کو معلوم ہوا تو وہ غصے سے پھٹ پڑا۔

''آپ اس خاندان میں دو بیٹیوں کا رشتہ دے کر بہت خوش ہیں جو اب تیسری کو بھی وہیں جھونک رہی ہیں۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ میں کسی حالت میں اپنی بہن کا رشتہ وہاں نہیں ہونے دوں گا۔''

''یہ بھی تو سوچ تیری بہن معذور ہے۔ وہ اسے قبول

کر رہے ہیں یہی بہت ہے۔"
"وہ معذور ہے اسی لیے قابل رحم ہے۔ وہ ان لوگوں کے مظالم کیسے برداشت کرے گی۔"
"اس کی شادی کہیں اور ہو بھی تو نہیں سکتی۔"
"آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔ اس کے لیے رشتہ میں تلاش کروں گا۔"
"پھر میں کیا کہہ دوں ان لوگوں سے۔"
"آپ انکار کر دیں۔ منظور کی شادی کی تیاری کریں۔ رشتہ میں تلاش کروں گا بلکہ سمجھیں رشتہ تلاش کر لیا۔"

ماں کو ایسی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی جو اس وقت ہو رہی تھی۔ ظہور ایسی ذمّے داری کا مظاہرہ کرے گا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انہیں پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ ان کا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔

ظہور احمد نے واقعی ذمّہ داری کا مظاہرہ کیا اور بہن کے رشتے کے لیے سرگرم ہو گیا۔ جلد ہی ایک متوقع رشتہ اس کے ہاتھ آ گیا۔ اسے کہیں سے معلوم ہوا کہ مرزا ٹرنک ہاؤس کے مالک مرزا محمد احمد کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ اچھے نہیں ہیں اور وہ بہت جلد انہیں طلاق دینے والے ہیں۔ ان کے قریب ہونے کے لیے وہ ان کی دکان پر پہنچ گیا۔

"مرزا صاحب! میرا پڑھائی میں دل نہیں ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ سے ٹرنک سازی کا کام سیکھ لوں۔ آپ کا ہاتھ بھی بٹاؤں گا اور کام سیکھنے کے بعد میری آمدنی کا کچھ ذریعہ بھی بن جائے گا۔"

مرزا صاحب نے اسے کام سکھانے کی ہامی بھر لی۔ ظہور احمد ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لیے یہاں آیا تھا اس لیے سر دھڑ کی بازی لگا کر کام سیکھنے لگا۔ ہر وقت مرزا صاحب کی دلجوئی میں بھی لگا رہتا تھا۔ اس کی خدمت گزاری کو دیکھتے ہوئے وہ بھی اس کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آنے لگے۔ اس نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا کہ مرزا صاحب اپنے دل کی باتیں بھی اس سے کرنے لگے۔ دکان پر رہ کر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مرزا صاحب نیم اندھے ہیں۔ تیز روشنی میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ اپنے اسی نقص کی وجہ سے وہ بیوی کو طلاق دیتے ہوئے ڈر رہے ہیں کہ دوسری شادی مشکل ہو جائے گی۔

ایک روز ظہور کو بات کرنے کا موقع مل گیا بلکہ یہ موقع خود مرزا صاحب نے فراہم کر دیا۔ وہ غصے میں بھرے ہوئے گھر سے آئے اور آتے ہی بیوی کی برائیاں شروع کر دیں۔ جب وہ دل کا غبار خوب نکال چکے تو ظہور احمد نے دخل دیا۔

"مرزا صاحب معاف کیجیے گا۔ مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل تو نہیں دینا چاہیے لیکن آپ کی شرافت اور سادگی کو دیکھ کر رہا بھی نہیں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی بیوی کو برداشت کیسے کر رہے ہیں۔ طلاق دے کر دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ آپ پیسے والے آدمی ہیں کوئی بھی اپنی بیٹی دے دے گا۔"

"صرف پیسے سے کیا ہوتا ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تمہیں میرے نقص کا تو علم ہے مجھ نیم اندھے کو اپنی بیٹی کون دے گا۔"

ظہور احمد اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ ماری اور اپنی بہن کا ذکر چھیڑا۔ اس کی معذوری کے بارے میں بتایا مرزا صاحب اپنے نقص کو دیکھتے ہوئے فوراً تیار ہو گئے۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کل تمہارے گھر آ رہے ہیں اپنی والدہ کو بتا دینا۔"

مرزا صاحب اپنے چند عزیزوں کے ساتھ اس کے گھر آئے اور بہ خیر و خوبی یہ رشتہ طے پا گیا۔

یہ رشتہ طے ہو جانے کے بعد ظہور احمد کو اُمید ہو چلی تھی کہ وہ مرزا صاحب کے ساتھ رہ کر خوب ترقی کرے گا۔ ایک ایسا ہنر ہاتھ میں آ جائے گا جو اس کی آئندہ ترقی کا ضامن ہو گا لیکن افسوس کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اس کی بہن کا رشتہ اس کے بہنوئی کے خاندان میں طے ہونا تھا جو کہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس شادی کے بعد ان لوگوں نے دشمنی نکالی اور مرزا صاحب کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ اس کے ماضی کے حوالے سے ایک ایک بات انہیں بتائی۔ مرزا صاحب کا بھی مطلب نکل چکا تھا لہٰذا وہ ان باتوں میں آ گئے اور ظہور کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ بات بات پر اس کی آوارگی کے طعنے دینے لگے۔ اس کی بدچلنی کے قصے یاد دلا دلا کر خوب ڈانٹتے تھے۔ ظہور کا مزاج بھی یہ تھا کہ کسی کی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ وہ گھر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ قادیان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ قادیان سے نکلا اور لاہور آ گیا۔ یہاں اس کی بڑی بہن گلزار بیگم بیاہی گئی تھیں۔ وہ ان کے گھر پہنچ گیا۔ گلزار بیگم نے بھائی کو بہت دن بعد دیکھا تھا۔ وہ قادیان میں اس کی گزاری ہوئی زندگی سے بھی واقف نہیں تھیں۔ لہٰذا دل کھول کر ملیں۔

"ظہور اب تمہیں قادیان جانے کی ضرورت نہیں۔ یہیں میرے پاس رہو۔"

ظہور احمد کے بیشتر رشتے دار "احمدی" تھے لیکن یہ بہن سنی العقیدہ تھیں۔ ظہور احمد کو اپنے پاس روکنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کہیں وہ بھی احمدی نہ ہو جائے۔

والدہ کے خطوط برابر آ رہے تھے کہ وہ قادیان واپس چلا آئے اور وہ برابر انکار کر رہا تھا۔ ایک دن دیکھا تو وہ اسے لینے خود لاہور چلی آئیں۔

وہ برابر ضد کر رہی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ قادیان چلے لیکن وہ کسی صورت تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے بھی ہتھیار ڈال دیے لیکن سوال یہ تھا کہ یہاں رہ کر کرے گا کیا۔

"تمہارے ہاتھ میں تو کوئی ہنر تک نہیں۔ تعلیم بھی آٹھویں تک ہے یہاں رہ کر کرو گے کیا۔ سوائے اس کے کہ بہنوئی پر بوجھ بنے رہو۔ اچھا لگے گا کہ بہنوئی کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہو۔"

یہ ایسا طعنہ تھا کہ وہ لرز کر رہ گیا اور قادیان واپس جانے کو تیار ہو گیا لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ اسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

اس کے بہنوئی کے دو رشتے دار لڑکے کراچی سے لاہور آئے۔ انہیں کچھ دن قیام کرنے کے بعد "اسکول فار الیکٹریشنز" میں داخلے کے لیے لدھیانہ روانہ ہونا تھا۔

اس کی بہن کو روشنی کی لکیر نظر آئی۔ اس نے شوہر سے مشورہ کیا کہ ظہور کو بھی اس اسکول میں داخلے کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس مشورے کو سب نے پسند کیا۔ ظہور احمد بھی تیار ہو گیا۔ یہ 1940ء کا زمانہ تھا کہ وہ لدھیانہ پہنچا اور اس عزم کے ساتھ اسکول میں داخل ہو گیا کہ اب وہ پوری توجہ سے یہ کورس مکمل کرے گا اور اپنے گھر والوں کو مایوس نہیں کرے گا۔

لدھیانہ پہنچ کر قیام کا مسئلہ تھا۔ اس نے ایک سستی سرائے کا انتخاب کیا۔ قریب ہی اقبال ہوٹل تھا جہاں وہ بہت کم پیسوں سے کھانا کھا سکتا تھا۔

یہ انسٹی ٹیوٹ خاصا مشہور تھا لیکن یہاں داخل ہونے کے بعد اس پر یہ عقدہ کھلا کہ یہاں بیشتر نوجوان وہ ہیں جو بظاہر پڑھنے آئے ہیں لیکن ان کی دلچسپیاں کچھ اور ہیں۔ یہ

## خراج

شاعری میں صداقت کا علم بردار اور استقامت کی مثال ظہور نظر اردو شاعری کی ایک ایسی شخصیت ہے جسے شعر و فن کی دنیا میں ہمیشہ ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل رہے گا۔ وہ نظم اور غزل دونوں اصناف پر حاوی تھا اور دونوں میں اس کا اسلوب بے حد حسین اور مؤثر تھا۔ نظم آزاد کو پابند نظم کے قارئین کے لیے بھی دل نشیں بنانے میں جن باکمال شعرا نے یادگار خدمات انجام دی ہیں ان میں راشد کے ساتھ ہی ظہور نظر کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ (احمد ندیم قاسمی)

قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسندانہ نظریات اور شاعری کے حوالے سے فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد اگر کوئی بڑا اور اہم شاعر ہے تو وہ یقینی طور پر ظہور نظر ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کی شاعری اور بالخصوص غزل کے بارے میں جو تنقیدی اور تحقیقی کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ (ڈاکٹر انور صابر)

اگر ترقی پسندی سے مطلب نعرے لگانا ہے تو پھر شاید ظہور نظر ترقی پسندوں کی صنف میں نہیں آتا۔ اس کی آواز نعرہ نہیں بنتی بلکہ نرم نرم اور لطیف لطیف اور دھیمے دھیمے انداز میں دل میں اتر جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے فیض صاحب کی آواز ہے۔ آواز تو میرا جی کی بھی بہت لطیف ہے مگر ان کے موضوعات ان کی شاعری میں ایک اور ہی قسم کی جمالیات اور آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ فیض کی آواز لطیف ضرور ہے مگر پھر بھی اس میں دل کے قریب اتر کر چونکانے والی کیفیت اتنی تیز نہیں ہے کہ اپنائیت کا احساس اتنا شدید ہو جائے جیسے یہ سب انہیں کہہ رہے ہیں تاہم ظہور نظر کی شاعری میں غزل ہو یا نظم ایک پُراسرار سارس ضرور ہے جس سے انسان لطف بھی حاصل کرتا ہے اور آگہی بھی۔ (شہرت بخاری)

وہ نوجوان تھے جو کسی شعبہ تعلیم میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور گھر والوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے انہیں یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ ذرا ان کے قریب ہوا تو اسے لگا اس کا ماضی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ ان لڑکوں نے جب دیکھا کہ بڑی بڑی آنکھوں اور دلکش خطوط کا مالک ان کے قریب آنے کا خواہاں ہے تو انہوں نے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔ اس کی زندگی ایک بار پھر اسی راستے پر چل نکلی جس سے بھاگ کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ آوارہ مزاج دوستوں کی محفلیں اور شراب نوشی اس کے معمولات بن گئے۔

اس کے ان معمولات کی خبریں لاہور پہنچیں تو ماں تڑپ اٹھی۔ اس کی آوارگی کا یہی ایک سبب سمجھ میں آیا کہ اکیلے رہنے کی وجہ سے وہ بگڑنے لگا ہے۔ اگر بروقت اسے سہارا نہیں دیا گیا تو وہ مزید بگڑ جائے گا۔ اس کی والدہ بچوں کے ساتھ لدھیانہ پہنچ گئیں اور کرائے پر گھر لے کر رہنے لگیں ظہور احمد بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔

ماں کی آمد واقعی خوش آیند ثابت ہوئی۔ دوستوں کا ساتھ تو نہیں چھوٹا لیکن اس نے کورس مکمل کرلیا۔

☆......☆

دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ برطانوی حکومت کو جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ شہر در شہر فوجی بھرتی کی ٹیمیں نوجوانوں کو ترغیب دیتی پھر رہی تھیں۔ ایک ٹیم لدھیانہ بھی پہنچی۔ اس ٹیم نے رعایت دی کہ الیکٹریشنز اسکول سے سند یافتہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہو جائیں گے ان کے لیے چھ ماہ کی تربیت ضروری نہیں ہو گی۔

ظہور احمد کی آوارگی اور آزاد خیالی کو ایک اور راستہ نظر آ گیا۔ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر فوج میں بھرتی ہو کر انبالہ پہنچ گیا۔

اس جیسے خود پسند اور آزاد خیال کو فوجی زندگی کی پابندیاں کیا برداشت ہوتیں۔ جلد ہی پریشان ہو گیا اور دو تین ہفتوں میں وہاں سے بھاگ کر دلی جا پہنچا۔

وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ہی چلا گیا تھا لہٰذا رونا پیٹنا مچ گیا ماں کا صدمے سے برا حال تھا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا گیا۔ لاہور بھی خبر بھیجی گئی کہ شاید وہاں چلا گیا ہو لیکن کوئی سراغ نہیں ملا بالآخر اس کا خط ملا۔ ماں کی ممتا کو تسلی ہوئی کہ چلو کہیں بھی ہے، زندہ تو ہے۔

اس کی ماں اس سے محض رسمی محبت نہیں کرتی تھی بلکہ کوئی ماں بھی رسمی محبت نہیں کرتی ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی ماں اس سے عبادت کی طرح محبت کرتی تھی۔ اس نے محض دل کی تسلی کے لیے کہہ تو دیا تھا کہ وہ کہیں بھی ہے زندہ تو ہے لیکن اس کی ممتا کو یقین نہ آتا تھا۔ رات رات بھر سجدے میں پڑی رہتی تھی کہ میرا ظہور میرے پاس آ جائے۔ بالآخر اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ کچھ عرصہ بعد لدھیانہ واپس آ گیا۔

اس کی تلون مزاجی عجیب عجیب رنگ دکھا رہی تھی۔ کبھی تو وہ ایسا بے نیاز ہو جاتا تھا جیسے کسی کی پروا ہی نہ ہو اور کبھی ایسی ذمے داری کا مظاہرہ کرتا تھا کہ جیسے اس سے بڑا کوئی ذمہ دار ہی نہ ہو۔ اس مرتبہ وہ دلی سے لدھیانہ آیا اور گھر کی حالت دیکھی تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ جس بہن کی سلائی کڑھائی سے گھر کے اخراجات پورے ہو رہے تھے اس کی شادی ہو چکی تھی باپ کی تھوڑی بہت پینشن تھی۔ اس سے کیا پورا پڑتا۔ ماں نے غیرت دلائی تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ کہیں نوکری کرے گا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد اسے کپڑوں کے ایک کارخانے میں نوکری مل گئی۔ اس کی ماں ایک مرتبہ پھر خوش ہو گئی کہ اس کے بیٹے کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا لیکن یہ خوشی چند روزہ تھی۔ ظہور کی تلون مزاجی نے رنگ دکھایا اور وہ نوکری چھوڑ کے گھر بیٹھ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتی ہے۔ اس کام کی داغ بیل اس وقت پڑی جب ملازمت کی تلاش اسے اقبال ہوٹل تک لے گئی۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں وہ لدھیانہ آنے کے بعد کھانا کھانے جایا کرتا تھا اور ایک سرائے میں رہتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس ہوٹل کی طرف نکل آتا تھا۔ اس ہوٹل کے مالک سے اس کی اچھی دعا سلام ہو گئی تھی۔ ہوٹل کے مالک کو اپنے کاروبار کے لیے ایک مددگار کی ضرورت ہوئی تو اس کی نظر ظہور احمد پر پڑی۔ ظہور بھی چار پیسوں کی آمدنی کے لیے کوشاں تھا اس نے یہ پیشکش فوراً قبول کرلی۔

یہ ہوٹل لدھیانہ کے ادیبوں، شاعروں اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کا گڑھ تھا۔ اہلِ دانش کا مرکز تھا۔ کمیونسٹ ترقی پسند، لبرل سب ہی یہاں بیٹھتے تھے اور زوردار بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں کو رونق بخشنے والوں میں ساحر لدھیانوی، حمید اختر، احمد ریاض، حافظ لدھیانوی، گوپال متل، ابنِ انشا وغیرہ شامل تھے۔

جنگِ عظیم دوم اپنے عروج پر تھی۔ اس جنگ کے



واضح اثرات ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ اہلِ دانش کے حلقوں میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف نفرت تو پہلے سے موجود تھی۔ جنگ نے اس جذبے کو مزید ہوا دی۔ ترقی پسند تحریک بھی اپنے اثرات دکھا رہی تھی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر شاعری کرنے والوں کے نغموں میں انقلاب کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ یہاں جمع ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے یہی موضوعات تھے۔ یہاں ہونے والی گفتگو میں نئے نظام کی تشکیل اور پرانے استحصالی نظام کے خاتمے اور انقلاب کے موضوعات زیرِ بحث آتے۔ ظہور احمد کے لیے یہ باتیں نہایت مسحور کن تھیں۔ وہ ہوٹل کے کاموں سے نمٹنے کے بعد ان لوگوں کے قریب بیٹھ جاتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ لوگ اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس کے اندر نفرت اور غصے کے جو جذبات پوشیدہ ہیں یہ لوگ ان جذبات کو زبان دے رہے ہیں۔

ان شاعروں اور ادیبوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سرکش اور منہ پھٹ نوجوان ایک دن ظہور احمد سے ظہور نظر بن کر شاعری کی دنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔

وہ ان لوگوں کے قریب ہوا تو فاصلے گھٹنے لگے اور ذہنی ہم آہنگی آہستہ آہستہ دوستی کے رشتے میں ڈھلنے لگی۔

ظہور نظر کو ان کے کھلنڈرے پن، خوش طبعی، ادبی ذوق اور ذہانت کی بنا پر اس گروہ نے جلد ہی قبول کرلیا جس کے سرخیل ساحر لدھیانوی تھے۔

ظہور نظر اب اس گروہ کا ایک ایسا رکن بن گیا جو ان کے مقاصد کو سمجھتے ہوئے ان کی جدوجہد میں بھی شریک ہونے لگا۔

ظہور نظر نے اس وقت تک کوئی شعر نہیں کہا تھا۔ اقبال ہوٹل کی سازگار فضا میسر آئی تو اسے بھی شعر گوئی کا شوق ہوا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ شعر کہتے کیسے ہیں۔ دوسروں کو شعر سناتے دیکھ کر شعر کہنے کی سوچتا تو تلملا کر رہ جاتا۔

ایک روز حافظ لدھیانوی نے اس سے کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ مشاعروں میں جاتے ہو، رات رات بھر جاگتے بھی ہو۔ تم خود شاعری کیوں نہیں کرتے۔ تم بھی شعر کہا کرو۔“

”مجھے تو شعر کہنا نہیں آتا۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

## انداز تنقید

شاعری کے علم برداروں کا کہنا ہے کہ آج کا شاعر چونکہ تخلیق کا کام باطنی احساس اور تحت الشعور سے لیتا ہے اس لیے ابہام کا ہونا لازی ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے ایسا ہوتا تو ان شعراء کی غزلوں کو بھی نظموں کی طرح بھول بھلیاں ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں...... جانب داری پر محمول نہ کیا جائے تو اپنے اس یقین کا اظہار کردوں کہ نظم کو گورکھ دھندا بنانے میں جدید شعراء کے تحت الشعور سے زیادہ شعور کو دخل ہے۔

”کوشش تو کرو، میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم میں اچھا شاعر ہونے کے تمام اوصاف موجود ہیں، تم باتوں میں جو ذہانت ضائع کرتے ہو اگر وہ شاعری میں ڈھل گئی تو مجھے یقین ہے ایک دن معروف شاعر بن جاؤ گے۔“

حافظ لدھیانوی نے اسے ایک مصرعہ دیا کہ اس پر غزل لکھو۔

دوسرے روز علی الصباح حافظ صاحب کو لدھیانہ جانا تھا۔ ظہور نظر کے پاس ان کا سوٹ کیس تھا۔ وہ رات کو سوٹ کیس لینے اس کے پاس گئے تو دیکھا وہ لالٹین سامنے رکھے شعر کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”کوئی شعر ہوا یا نہیں؟“

”تین شعر تو ہو گئے۔ اب باقی شعر کہنے کی ہمت نہیں۔“

حافظ لدھیانوی نے چار شعر کہہ کر غزل مکمل کر دی۔

”بزمِ اقبال کے جلسے میں تنقید کے لیے پیش کر دینا۔“

اقبال ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے ”بزمِ اقبال“ کے نام سے ایک بزم بنائی تھی۔ اس کے تحت ادبی اجلاس ہوتے تھے۔ تنقیدی نشستیں برپا ہوتی تھیں۔

ظہور نظر نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی، کسی کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ شعر کہنے لگا ہے۔ وہ تو ادبی ذوق رکھنے والا ایک نوجوان سمجھا جاتا تھا جو شعرا کے درمیان بیٹھ کر ان کی باتیں سنا کرتا تھا۔ ادبی اجلاسوں میں شامل ضرور ہوتا تھا لیکن سامع کی حیثیت سے۔ سیاست پر اچھی گفتگو کر لیتا تھا لیکن ادبی گفتگو سے قاصر تھا اور اب اچانک غزل

تنقید کے لیے پیش کر رہا تھا۔

اس کی یہ پہلی کاوش تھی لہٰذا شعرا نے خوب ہمت افزائی کی اور اس کی غزل کو خوب سراہا۔

اب اسے بھی یقین ہونے لگا کہ وہ شاعر بن سکتا ہے۔ جب اتنے بڑے بڑے شاعر اس کی تعریف کر رہے ہیں تو اس میں یقیناً شاعری کے جوہر موجود ہوں گے۔ اسے بڑا شاعر بننے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ یہ سوال سامنے تھا اور اس لیے تھا کہ اس کی تعلیم معمولی تھی۔ وہ لچھے دار گفتگو کر کے اجنبی کو دوست تو بنا سکتا تھا۔ ادبی محفلوں میں اسے قبول تو کیا جا سکتا تھا لیکن وہ شاعری اور ادب کے بارے میں کوئی رائے دینے کا اہل نہیں تھا۔ جب ان محفلوں میں کلاسیکل ادب، فیض، جوش وغیرہ کی باتیں ہوتیں تو اسے اپنی جہالت کا شدت سے احساس ہوتا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی محفل میں اپنے آپ کو وقیع بنانے اور اچھی شاعری کے لیے مطالعہ ضروری ہے۔

حافظ لدھیانوی نے ایک مرتبہ پھر اس کی مدد کی۔ اسے نہ صرف مطالعے کا مشورہ دیا بلکہ اساتذہ کے دواوین اور دوسری کتابیں اسے فراہم کیں۔ اس نے سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتا رہا۔

اس نے اپنے محسوسات کا اوّلین فنی اظہار غزل میں کیا۔ ابتدائی زندگی میں اسے جس قسم کے تجربات کا سامنا ہوا تھا اس کے لیے غزل ہی موزوں ترین وسیلہ تھا۔ یہ عمر بھی ایسی تھی کہ اس عمر میں سب ہی اسیر غزل ہو جاتے ہیں۔ اس نے جن کلاسیکل شعراء کا مطالعہ کیا تھا ان کا سرمایہ غزل ہی تھا لہٰذا ظہور نظر نے بھی اپنے بطون میں پیدا ہونے والی کیفیات کے اظہار کے لیے ابتدا میں غزل کو اپنایا۔

ہمارے بس میں نہ تھی مرگ آرزو ورنہ
بہت جیے ترے افسونِ انتظار سے ہم
دوپہر کے جلتے ہوئے سورج اسے کہنا
بیٹھا ہے کوئی سایہ اُمید میں کب سے
پلکوں پہ ستارے ہیں تو آکاش پہ آنسو
آئی ہے عجب بھیس بدل کر شب ہجراں
فرقت میں تری اور تو ہم کچھ نہ کر سکے
لمحے شمار کرتے رہے ماہ و سال کے
جب دل میں تیری یاد گھرے ابر کی طرح
عالم تمام ہجر کا صحرا دکھائی دے

بخشی ہے تری سانس نے مہکار گلوں کو
پھوٹے ہیں تری زلف سے یہ سنبل و ریحاں

ابھی اس کی غزل داخلی اور انفرادی محرکات سے ظہور میں آ رہی تھی آیندہ اسے اجتماعی کرب کا آئینہ دار ہونا تھا

یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک نئے اور پرانے ادیبوں کے لیے زبردست قوت محرکہ بن رہی تھی۔ انفرادیت اجتماعیت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ نئے موضوعات نئے اسالیب سامنے آ رہے تھے۔ لدھیانہ بھی ان تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اقبال ہوٹل لدھیانہ کا منتظم ظہور نظر تھا اور یہاں بیٹھنے والوں کی اکثریت سوشلزم سے متاثر تھی۔ ساحر لدھیانوی سمیت تمام ہی نظریاتی لوگ تھے لہٰذا ظہور نظر کا ان سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اس کا فکری رخ متعین کیا اور اس کی شاعری کے لیے موضوعات کا تعین بھی کر دیا۔ اب اسے غم عشق میں غم دوراں کا سامنا تھا۔

اے جانِ نظر ہم کو تو راس آئی نہ دنیا
پہلے تھا غم عشق تو اب ہے غم دوراں

ظہور نظر کی شاعری نے جس فضا میں پہلی مرتبہ سانس لی اور جو لوگ اس کے ساتھی بنے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ عالمی ادب میں خیالات کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے نئے اسالیب اختیار کیے جا رہے تھے۔ نظم معریٰ (آزاد نظم) اسی ضرورت کے احساس کا منطقی نتیجہ تھا اور شعراء بھی اس نئی صنف سخن سے متاثر ہو رہے تھے۔ ظہور نظر بھی اسی قافلے کا مسافر تھا۔ اس نے بھی اس صنف کو اپنایا۔

کاش میں فرق کی دیوار کو پگھلا سکتا
کاش یہ جبر کی زنجیر گراں کٹ سکتی
کاش وہ لمحہ تنویر و طرب آ سکتا
جس کی چاہت کے لیے جس کی تمنا کے لیے
سال ہا سال سر راہ گزار
میں نے چھپ کر ترے سایوں کی عبادت کی ہے

اس کی ماں اس کی تلون مزاجی سے تنگ تھی لیکن کچھ ایسی دلچسپیاں تھیں جن کی وجہ سے اقبال ہوٹل کی ملازمت میں اس کا دل لگ گیا تھا۔ لہٰذا ماں کی ڈھارس بندھی تھی کہ اب اس کی آوارگی میں کمی آ گئی ہے۔

دوسری جانب اس کی شاعری اب ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بنی ہوئی تھی۔ ملک کا کوئی ایسا موقر رسالہ نہیں تھا جس میں اس کا کلام شائع نہ ہو رہا ہو۔ اس کی نظمیں تازہ ہوا کا جھونکا بنی ہوئی تھیں۔



اس سے پہلے آزاد نظم ترقی کی کئی مراحل طے کر چکی تھی لیکن ترقی پسند شعرا میں سے بیشتر کی نظمیں محض نعرہ بنی ہوئی تھیں۔ ظہور نظر نے اس میں رومانیت شامل کر کے انہیں دلچسپ بنا دیا۔ خارجی مسائل میں اپنے ذاتی دکھوں کو شامل کیا جس سے ان نظموں کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ بھی ہوا اور وہ خشکی بھی دور ہوئی جو عام قاری کے لیے عدم دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک نظریاتی فنکار تھا لیکن اس نے مسائل کے انبار میں فن کو قتل نہیں ہونے دیا۔

☆......☆

شہرت کی لذت سمیٹتے ہوئے 1945ء کا سال آ گیا۔ ہر ماں کی طرح اس کی ماں کو بھی اس کے سر پر سہرا دیکھنے کا اشتیاق تھا جب کہ اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب کمانے کے لائق ہو گیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ ظہور نظر کی ایک بہن اشرف بیگم بہاولپور میں مقیم تھیں۔ انہوں نے ماں کو لکھا۔

”میرے سسرالی رشتہ داروں میں ایک موزوں رشتہ موجود ہے اگر ظہور کو آپ یہاں بھیج دیں اور وہ یہاں ملازمت کر لے تو یہ رشتہ بہ آسانی طے ہو جائے گا۔ رشتہ بہت اچھا ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ صلاح الدین (ظہور کے بہنوئی) محکمہ انہار میں اوورسیر ہیں۔ ان کی کوشش سے ظہور کو ملازمت مل جائے گی۔ اس کام میں دیر نہ ہو۔ ظہور کو فوراً بھیجیں۔“

ظہور کی ساری دلچسپیاں لدھیانہ میں تھیں۔ وہ کسی قیمت پر یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا لیکن جب ماں نے بہت مجبور کیا تو وہ بہاولپور چلا گیا۔

دل میں شادی کا خیال دور دور تک نہیں تھا بس ماں کے کہنے سے سیر سپاٹے کی نیت سے بہاولپور چلا آیا تھا لیکن بہن، بہنوئی اور دیگر رشتے داروں نے اس محبت سے اس کا خیر مقدم کیا، اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ رشتہ داروں کی طرف سے اس کے دل میں جتنی نفرتیں تھیں سب دھل گئیں اور جب بہن نے بڑی منت سے گلے میں بانہیں ڈال کر یہیں رہ جانے کے لیے کہا تو وہ بہ خوشی تیار ہو گیا۔

جب اس نے یہاں رکنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ الیکٹریشن کی سند اس کے پاس تھی لہٰذا اُمید تھی کہ اس سند کے طفیل اسے ملازمت ملنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ یہ اُمید پوری بھی ہوئی اور ایک جگہ الیکٹریشن کی ملازمت مل بھی گئی لیکن وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا۔

## انتخاب کلام

پھر ایسی کوئی شام میسر نہ ہوئی جب
انگڑائی تری توس قزح بن کے تنی تھی
آپ تو بن کچھ کہے چپ چاپ اٹھ کر چل دیے
رات بھر دھڑکن میرے پہلو میں گھبرائی رہی
اس نے بھی چلمن اٹھانے سے کیا دن بھر گریز
کھول کر میں بھی دریچہ شام تک بیٹھا رہا
خوابوں سے تیری یاد نہ جائے گی حشر تک
یہ وہ زمیں ہے جس پہ فنا کا گزر نہیں
دیدہ وروں کے گھر پہ مسلط ہے تیرگی
اندھوں کی انجمن میں چراغاں ہے ان دنوں
دن ایسے یوں تو آئے ہی کب ہیں جو راس تھے
لیکن یہ چند روز تو بے حد اداس ہیں
نہ میری راہ میں تارے نہ میرے پاس چراغ
وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے
تمام دوش سیہ رات کو نہ دو یارو
سحر کے قتل میں ہاتھ آفتاب کا بھی ہے
وہ بھی شاید رو پڑے ویران کاغذ دیکھ کر
میں نے اس کو آخری خط میں لکھا کچھ بھی نہیں
اہلِ نظر ہیں تیرگی مصلحت میں گم
میں سوچتا ہوں بات یہ کیسے کروں رقم

ملازمت کی پابندیوں سے جلد ہی جی گھبرا گیا۔ ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا۔

اسے یہاں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے مل لے۔ اچھی طرح دیکھ لے تاکہ پھر رشتے کی بات چلائی جائے۔ اس کی بہن نے کسی کو کچھ بتائے بغیر ظہور نظر کو اپنے ان سسرالی رشتے داروں کے گھر میں متعارف کرا دیا جہاں وہ لڑکی رہتی تھی۔ ظہور نظر کا وہاں آنا جانا بھی ہو گیا۔ ابھی تک وہ لڑکی اس کی ماں اور بہن کی پسند تھی۔ اب اس میں اس کی پسند بھی شامل ہو گئی۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ لڑکی بھی اسے دل ہی دل میں پسند کرنے لگی ہو۔

اسے اس گھر میں آتے جاتے جب بہت وقت گزر گیا تو اس نے یہ دیکھا کہ دونوں خاندانوں کے درمیان معاشی فرق بہت زیادہ ہے لہٰذا اس نے اپنے معاشی مستقبل کو محفوظ بنانے کی سنجیدہ کوششیں شروع کر دیں۔

ان دنوں بہاولپور سے ہفت روزہ ''ستلج'' شائع ہوتا تھا۔ وہ بطور مدیر اس سے منسلک ہوگیا۔ یہ ملازمت اس کے مطلب کی تھی لہٰذا وہ یہاں ٹک گیا۔

صحافت میں آمدنی ہی کتنی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اتنی آمدنی پیدا نہ کرسکا جو سماجی مرتبے کی ضامن بن سکتی۔ معاشی فرق اب بھی برقرار تھا۔ یہی فرق ناکامی کی نوید بن گیا۔ رشتہ بھیجا ضرور گیا لیکن لڑکی والوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ لڑکے کا مستقبل محفوظ نہیں۔

وہ ہوائی محل دھڑام سے گر گیا جسے تعمیر کرنے کے لیے وہ بہاولپور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا

کب ضروری ہے کہ سب قافلے منزل تک آ جائیں
چاند کے سائے بھی ڈھل جاتے ہیں رفتہ رفتہ
تند طوفاں بھی سنبھل جاتے ہیں رفتہ رفتہ

اس کا دل ہی ٹکڑے نہیں ہوا تھا ملک کی سرحدیں بھی تقسیم ہوگئی تھیں۔ متحدہ ہندستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں اس کی ماں اور بھائی بہنیں بہاولپور آگئے تھے۔ اب بہاولپور میں اس کا دل لگ جانا چاہیے تھا لیکن دل ایسا ٹوٹا تھا کہ اس نے کہیں اور جا کر مقدر آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

ساحر، حمید اختر اور ابن انشاء لاہور آگئے تھے۔ اس کے پرانے کرم فرما اقبال ہوٹل لدھیانہ کے مالک محبت علی اقبال بھی لاہور آگئے تھے اور نسبت روڈ پر ایک مکان الاٹ کرالیا تھا۔ ظہور نظر بھی قسمت آزمائی کے لیے لاہور منتقل ہو گیا اور محبت علی اقبال کے ساتھ رہنے لگا۔

جب سجاد ظہیر بھی پاکستان آگئے اور ان کی ترغیب پر حمید اختر بھی ساہیوال سے لاہور آگئے تو تمام نظریاتی دوستوں نے یک جا ہو کر ترقی پسند تحریک کے لیے کام شروع کردیا۔

ابھی چند ہی اجلاس ہوئے تھے کہ یہ لوگ خفیہ پولیس کی نگرانی میں آگئے۔ ان ہوٹلوں کی نگرانی کی جانے لگی جہاں یہ لوگ بیٹھتے۔ خوف و ہراس پھیلانے کے لیے پوچھ گچھ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ساحر تو ایسا دل برداشتہ ہوا کہ بمبئی چلا گیا۔ باقی لوگ ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے۔ ظہور نظر بھی ان میں سے ایک تھا۔

اس نے اپنے لیے فکری راہ ڈھونڈ لی تھی لیکن دو وقت کی روٹی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سر پر گرفتاری کی تلوار الگ لٹک رہی تھی۔ اس کی شاعری بھی انقلاب سے دوچار ہونے کے لیے پر تول رہی تھی۔

زمین کے سینۂ صد چاک پر خزاں ہی رہی
بہار بیت گئی گنبدوں پہ منڈلا کر
جلائے تھے جو گئی ماندی آرزوؤں نے
وہ دیپ بجھ گئے خونی ہوا سے گھبرا کر
اداس راہ گزاروں میں یاس لیٹی ہے
لہو میں لتھڑی ہوئی زرد پاؤں پھیلا کر
نئے وطن کے مسیحاؤ کچھ اپائے کرو
فراز تخت پہ بیٹھے نہ ہائے ہائے کرو

☆......☆

اس کی نظموں نے جب یہ تیور دکھائے تو پولیس سرگرمی سے اس کو تلاش کرنے لگی۔ اسے خطرناک شاعر قرار دے دیا گیا۔ اس نے تنگ آ کر لاہور کو خیرباد کہہ دیا اور کراچی پہنچا۔

یہاں پہنچ کر اس کی ترقی پسندی نے پھر انگڑائی لی۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ ترقی پسند تحریک غیر فعال ہے۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جو اسے فعال کرسکے۔ لاہور میں سجاد ظہیر، حمید اختر، صفدر میر اور احمد راہی جیسے لوگوں کی موجودگی نے کام کو آسان کردیا تھا جب کہ کراچی میں صورت حال اس سے قطعی مختلف تھی۔ کراچی میں دانش ور بھی تھے اہم ترین شعرا بھی لیکن ان کے درمیان رابطے پیدا نہیں ہوسکے تھے۔ کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو ایک ہی جگہ جمع کرسکے۔ اس کمی کو ظہور نظر نے پورا کیا۔ وہ تو جہاں ہوتا تھا ہنگامہ برپا کردیتا تھا۔ بہترین انتظامی صلاحیت کا مالک تھا۔ اس کی کوششوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اس نے اس کام کی تکمیل کے لیے سخت محنت کی۔ ایک ایک نظریاتی شاعر کے گھر گیا۔ کراچی کی سڑکیں اس کے قدموں سے آباد ہوئیں۔ نتیجے میں موجودہ ایم اے جناح روڈ (بندر روڈ) پر ایک عمارت کا ایک کمرا کرائے پر لے کر انجمن کا دفتر قائم کردیا گیا۔ اسے سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں مضامین، کہانیاں اور نظمیں پڑھی جاتیں پھر ان پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔

انجمن کا یہی دفتر ظہور نظر سے مختلف لوگوں کے تعارف کا ذریعہ بنا۔ اس کے تحت ہونے والے جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں نے اسے معتبر شاعر بنایا۔ اس کی کوششوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین نے اتنی ترقی کرلی کہ کراچی کے خالقدینا ہال میں نہایت اہتمام سے ''یوم



غالب'' منانے کا اہتمام کرنے کے لائق ہوگئی۔ یہ اس کی محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ خالقدینا ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ نئی بات یہ ہوئی کہ مختلف مقرروں نے غالب کو ترقی پسند شاعر قرار دے دیا۔

یہ تو ہونا ہی تھا کہ یہ تقریب ترقی پسندوں کی طرف سے منائی گئی تھی۔

جب تک وہ لدھیانہ، بہاولپور حتیٰ کہ لاہور میں رہا، مشاعروں میں شریک ہوا۔ ادیبوں سے روابط استوار ہوئے لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کا عملی اظہار کراچی میں ہوا۔ اس کی انتظامی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔

شاعروں میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تحریک کے کاموں میں ہمہ وقت خود کو مشغول رکھے۔ یہ جنون تو ظہور نظر ہی کو زیب دیتا تھا۔ نہ شادی ہوئی تھی نہ بچوں کا جھمیلا تھا۔ کچھ مل گیا تو کھا لیا نہ ملا تو نہ کھایا۔ کبھی کبھی نوعمری میں سیکھے ہوئے ہنر کام آجاتے تھے اور دال روٹی کا بندوبست ہوجایا کرتا تھا۔

اس کی ماں کا اب بھی اصرار تھا کہ وہ شادی کرلے لیکن وہ سابقہ تجربے کی روشنی میں ٹالتا جارہا تھا لیکن قدرت نے یہ انتظام بھی کر رکھا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی ترک کرے اور ازدواجی زندگی گزارے۔

اس کا ایک دوست تھا جس کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ یہ قربت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ظہور نظر اس کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ اس دوست کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی جس کا نام خورشید تھا۔ یہ لڑکی پشتو کے سوا کوئی زبان نہیں جانتی تھی لہٰذا اس لڑکی سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ کبھی وہ سوچا تھا جو ہوگیا۔ اس کے دوست کا اچانک انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت ظہور نظر اس کے پاس تھا۔ اس نے مرتے وقت ظہور نظر کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خورشید میری بہن ہے۔ میرے بعد اس کا کوئی نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کا خیال رکھو گے۔''

''اللہ تمہیں زندگی دے، میں تمہاری خواہش کا احترام کروں گا۔''

دوست کے انتقال کے بعد وہ سوچنے لگا کہ خورشید کا خیال کس طرح رکھے۔ ایک جوان لڑکی کو ساتھ رکھتا تو سو باتیں بنتیں۔ اس نے خیال رکھنے کا یہی طریقہ سوچا کہ اس سے شادی کرلے۔ اس نے ماں اور چھوٹے بھائی انور کو کراچی بلا لیا اور ان کی موجودگی میں خورشید سے شادی کرلی۔ مزید دو سال گزر گئے۔ اس عرصے میں ترقی پسند تحریک حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگی اور بالآخر اس تحریک پر پابندی لگ گئی۔ اکثر ارکان زیر زمین چلے گئے۔ اسے بھی اپنا بچاؤ ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کراچی میں اب اس کے رہنے کا جواز بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی تمام مصروفیات تو اس تحریک ہی سے وابستہ تھیں۔ جب یہ نہ رہی تو وہ کراچی میں رہ کر کیا کرتا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بہاولپور چلا گیا۔ یہاں محبت کرنے والے بہن بہنوئی اور دوسرے رشتہ دار موجود تھے۔ اس سے قطع نظر دانش وروں اور ادیبوں کا بھی ایک ایسا حلقہ موجود تھا جس نے اس کی آمد پر بھرپور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

ادیب و شاعر تو محض اس لیے خوش تھے کہ ایک ہنگامہ پرور شخصیت ان میں شامل ہوگئی ہے لیکن اس کے گھر والے اس کے لیے کسی ایسے ذریعہ روزگار کے خواہاں تھے جس کے سہارے وہ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لائق ہوجائے وہ بھی اب ایک بیوی کا شوہر بن چکا تھا۔ اسے کوئی بھی کام کرنے میں عار نہیں تھا۔

اس کے بہنوئی شیخ صلاح الدین ٹھیکے دار تھے۔ انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے بھی اپنے ساتھ ٹھیکے داری کے کام میں شریک کرلیا جائے۔ انہیں بھی کام کی زیادتی سے کچھ فرصت مل جائے گی اور ظہور کی آمدنی کا ذریعہ بھی پیدا ہوجائے گا۔

شیخ صلاح الدین کے پاس ان دنوں وکٹوریہ اسپتال کے توسیعی کاموں کا ٹھیکا تھا۔ انہوں نے ظہور نظر کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔

ظہور نظر عملی آدمی تھے۔ بہت سارے نشیب و فراز دیکھ آئے تھے۔ آتے ہی تمام کام اس ہوشیاری سے سنبھال لیا کہ شیخ صلاح الدین بے فکر ہوگئے۔

آمدنی اتنی ہونے لگی کہ یہ دور اس کی معاشی آسودگی کا دور کہلایا جاسکتا تھا۔

خوش حالی ہوئی تو اس کی شاعری نے بھی پر پرزے نکالے۔ اس کی شاعری کے موضوعات اب بھی وہی تھے جو تقسیم ہند کے فوراً بعد ظہور میں آئے تھے۔ نئے وطن کی تشکیل کے بعد یہ اُمید ہو چلی تھی کہ اب ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے لیکن سیاسی رہنما اس طرف سے غافل ہو گئے۔ ظہور نظر اس حق تلفی پر خاموش نہ رہ سکا۔

تھم گئی ہیں نالہ و فریاد و شیون کی صدائیں

کلبلاتے چیختے خائف پرندے بھی ہیں چپ
منہدم دیوار ودر سے اٹھنے والی گرد بھی
کھا گئیں بے زار ظالم کی ہوائیں
جانے کب آئیں گے ملبے کی تہوں میں
دفن لوگوں کو بچانے والے لوگ
جانے کب آئیں گے پھر اس شہر
اس شہر غریباں کو بسانے والے لوگ

بہت جلد اس نے بہاولپور کو بھی لاہور اور لدھیانہ کے رنگ میں ڈھال لیا۔ جب ہوٹل تعمیر ہوا تو اس نے اسے اپنی بیٹھک بنالیا۔ اس کی پُرکشش شخصیت نے دوسروں کو بھی اس طرف کھینچا اور بہت جلد یہ ریستوران ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور کھلاڑیوں کی بحثوں اور قہقہوں سے گونجنے لگا۔

اس کی انتظامی صلاحیتوں نے یہاں بھی اپنا کام دکھایا۔ اس نے بہاولپور میں بڑے بڑے مشاعرے کرائے۔ لاہور اور کراچی کے اکثر شعراء محض اس لیے ان مشاعروں میں شرکت کے لیے آئے کہ ظہور نظر سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ خود بھی جب اسے فرصت ملتی لاہور اور کراچی کا چکر لگا لیتا۔ اس کے احباب بھی جوابی ملاقات کے لیے بہاولپور آتے۔ یہاں کوئی ادبی تقریب ہوتی تو اس میں شرکت کرتے اور چند روز ظہور نظر کے پاس قیام بھی کر لیتے۔

1956ء کا سال اس کے لیے اندوہناک تھا۔ اس کے اندر کچھ ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ اس پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ صرف 34 سال عمر تھی اور وہ فالج کا شکار ہوگیا۔

کہاں کی ٹھیکے داری کہاں کی شاعری۔ وہ بستر کا ہو کر رہ گیا۔ دوستوں کو تشویش تھی رشتے دار غم زدہ تھے لیکن وہ نہایت حوصلے کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کر رہا تھا۔

کئی ہفتوں کے بعد وہ بستر سے اٹھا تو اس طرح چاق و چوبند تھا جیسا کہ بستر تک آنے سے قبل تھا۔ اس کی قوت ارادی جسم کو مضمحل میں مزاحم ہوگئی۔

وہ کسی اُمید کی تلاش میں لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کا دوست احمد بشیر ایک فلم بنانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ظہور نظر کافی ہاؤس گیا تو اس کی ملاقات احمد بشیر سے ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہی احمد بشیر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی نکل آیا کہ لاہور میں رہ کر وہ کیا کر سکتا ہے۔

''میرے ہاتھ میں ہنر ہے اور پھر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کچھ نہیں تو احمد بشیر زندہ باد۔''

''اگر میں تجھ سے کچھ کام لینا چاہوں؟''

''مصیبت یہ ہے کہ تیرا کام کرنے کے مجھے پیسے نہیں ملیں گے۔''

''چل پھر دوستی میں ہی سہی۔''

''بول کیا کرنا ہے۔''

''میں ایک فلم بنا رہا ہوں۔ تو اس کے لیے گیت لکھ دے۔''

''میں نے ایک آدھ گیت لکھا ضرور ہے لیکن وہ ادبی نوعیت کا ہے۔ فلموں کے لیے کبھی نہیں لکھا۔ سنا ہے فلموں کے لیے دھن پر نغمہ لکھا جاتا ہے۔''

''اس میں کیا مشکل ہے اور اگر مشکل ہے تو دھن پر مت لکھو۔ تم گیت لکھو دو دھن بعد میں تیار کر لی جائے گی۔''

وہ تیار ہو گیا اور دو گیت لکھے

☆ ''گھڑیاں آئیں پیت ملن کی''

☆ ''ناز بھی جائے''

دو گیت بھی لکھے۔ فلم کا کچھ حصہ بن بھی گیا لیکن فلم تکمیل تک نہ پہنچ سکی اور زیادہ دکھ کی بات یہ ہوئی کہ دونوں کے تعلقات ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گئے۔

ظہور نظر نے اس کے بعد اشفاق ملک کی فلم ''وسلطی'' کے لیے گانے لکھے۔ کئی گانے مقبول بھی ہوئے لیکن فلم ناکام رہی۔ اس کے لکھے ہوئے گانے بھی پس منظر میں چلے گئے۔

اس ناکامی سے وہ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ لاہور چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر بہاولپور آ گیا۔

☆......☆

اس کی شاعری ترقی پسند تحریک کی چھاؤں میں سفر کر رہی تھی۔ ہر چند کہ اس تحریک کے زیرِ اثر دیکھے گئے خواب پورے نہیں ہوئے تھے لیکن ایک امید ضرور تھی۔ یہ اُمید اس وقت دم توڑ گئی جب نوزائیدہ ملک پاکستان مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا مارشل لا کے نفاذ تک آ گیا۔

تنگ دستی اور بے روزگاری اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ ذاتی محرومیوں نے اسے اجتماعی دکھوں کو محسوس کرنا سکھا دیا تھا۔ مارشل لا اجتماعی دکھ ہی تو تھا۔ وہ اسے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس کا قلم حرکت میں آیا اور نظم ''شب خون'' وجود میں آ گئی۔



اے جانِ جہاں دمِ صبح گیتی
مجھ سے تو یہ شب نہ کٹ سکے گی
یہ شب یہ اداسیوں بھری شب
یہ شب یہ وفا کی آخری شب
جذبوں کی اداس رہگزر پر
پھیلی ہوئی آرزو کی چادر
مجھ سے تو یہ شب نہ کٹ سکے گی

شب خون مارا جا چکا تھا۔ اس کے بعد اس کا داخلی کرب اپنی انتہا پر تھا۔ اس کیفیت کا اظہار اس نے اپنی نظم ''شب خون کے بعد'' میں کیا۔

شب خوں کے بعد حبس ہوا اس قدر شدید
جو فیصلے ہوا نے کیے سب اٹل ہوئے
تازہ ہوا کے غم میں گھٹی آدمی کی سانس
ہاتھی کے کان خر کے لیے مورچھل ہوئے
کل جن کو مسخرا بھی کوئی پوچھتا نہ تھا
وہ مسخرے ہمارے لیے بیربل ہوئے

☆

کہہ لیجیے کہ اس موجِ تجلی کے جلو میں
جو کچھ بھی نگاہوں کا تقاضا تھا وہ سب ہے
اے دیدہ ور دو پھر بھی یہ جھٹلاؤ گے کیسے
شب کیسی ہی زرتاب ہو پرنور ہو شب ہے

اس کی اسی بے باکی نے اسے بہت پیچھے دھکیل دیا۔ بعض معروف شعراء نے فوجی حکومت کی کھل کر حمایت کی۔ اس کے عوض ان پر سرکاری نوازشوں کی بارش ہوگئی۔ فوجی سرکار نے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کو نوازا۔ ان کو نوازنے کے لیے نئے نئے محکمے بنائے گئے۔ اہلِ دانش کو ان کرسیوں کی زیب و زینت بنا گیا لیکن وہ جہاں تھا وہیں رہا۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادبی اداروں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔ رائٹرز گلڈ پر بھی سرکاری شاعروں کا قبضہ تھا۔ اس ادارے نے بھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔ اس کی تصنیف ''ریزہ ریزہ'' تک کو انعام کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔

دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ بہاولپور میں اردو اکیڈمی قائم ہوئی تو کسی نے اسے مجلسِ عاملہ کا ممبر تک نہ بننے دیا۔ اس ادارے نے سیکڑوں کتب شائع کیں لیکن ظہور نظر کی ایک تصنیف بھی چھاپنے کی زحمت نہ کی۔

اس کی گھریلو ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گھر کے افراد بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ تین بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ روز کنواں کھودتا تھا اور بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس نے مستقل آمدن کا ذریعہ تلاش کرنے کے لیے ایک جدید ریستوران قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا پُرسکون گوشہ جہاں اہل دانش جمع ہو سکیں آمدنی بھی ہو اور شغل بھی ہاتھ آ جائے۔

مسعود الروف ڈپٹی کمشنر بہاولپور تھے اور اس کی شاعری کے قدر دان تھے اس نے جب یہ منصوبہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ اس منصوبے کی تکمیل تک اس کا پورا ساتھ دیا۔ ریستوران کا نام بھی ''ڈمپل'' انہوں نے ہی تجویز کیا۔ ایک عمارت کرائے پر لی گئی چھوٹے چھوٹے کیبن بنائے گئے۔ دیواروں پر دیدہ زیب تصویریں بنائی گئیں۔ کھڑکیوں کو دلکش تصویروں سے آراستہ کیا گیا۔ صاف ستھری وردیوں والے بیرے گاہکوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔

یہ بہاولپور جیسے چھوٹے شہر کی مناسبت سے نہایت پوش ریستوران تھا۔ وہ ہوٹل کی انتظامی باریکیوں سے خوب واقف تھا۔ لدھیانہ میں ہوٹل چلا چکا تھا۔ لہٰذا دوستوں کو یقین تھا کہ اس کاروبار میں وہ خوب چمکے گا۔ ابتدائی دو تین ماہ میں کاروبار چمکا بھی خوب۔ پھر اس ہوٹل نے دوستوں کی بیٹھک کی شکل اختیار کر لی۔ دوست احباب آتے اور گھنٹوں وقت گزاری کر کے چلے جاتے۔ کوئی اہم بحث چھڑ جاتی تو وہ خود بھی اس بحث میں شریک ہو جاتا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ یہ کاروبار ہے۔ دوستی نبھانے کی جگہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدن سے بڑھ گیا۔ عمارت کا کرایہ تک نکالنا مشکل ہو گیا۔ پھر وہی ہوا جو اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ ہوٹل بند ہو گیا۔ مخلص دوستوں کو افسوس ہوا لیکن وہ ان سانحات کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس نقصان کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔

☆ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔
☆ ہمیشہ قدر کریں، ان تین چیزوں کی۔ اعتبار، وعدہ اور رشتہ۔ یہ سب جب ٹوٹتے ہیں تو کوئی شور سنائی نہیں دیتا مگر دل میں ایک گہری خاموشی اتر جاتی ہے۔
از: عروبہ ناز، کوٹلی

وہ ایک مرتبہ پھر چھاؤں سے دھوپ میں آگیا۔ مفلسی کی دیمک پھر اسے چاٹنے لگی۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کا احساس محرومی اس سے دیکھا نہیں جاتا تھا لیکن اپنی کیفیت کو چھپا کر ہنستا رہا۔ پھر یہ بے بسی بھی اس کی تقدیر سے دیکھی نہیں گئی۔ اس کی حوصلہ مند ماں جس نے ہر مشکل میں اس کا ساتھ دیا تھا اس کے آرام کا خیال رکھا تھا اس سے خفا ہو کر نہیں عمر کے تقاضے سے بستر پر لیٹ گئی۔ اب تک وہ ماں سے شدید محبت کے باوجود اس کی طرف سے بے پروا رہا تھا لیکن اب ماں کی بے پناہ قربانیاں یاد آتی تھیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کے علاج میں لگ گیا۔

''میں نے ماں کو بہت دکھ دیے ہیں اب اس کا ازالہ اس لیے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی نیندیں اس پر قربان کردوں۔''

اسے یہ خیال شاید بہت دیر سے آیا تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔ اس کی ماں تھک چکی تھی اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ ظہور نظر نے ہر ستم ہنس کر سہا تھا لیکن یہ ستم نہ سہہ سکا۔ چند ماہ بعد ہی اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ تڑپا ضرور لیکن ساکت نہ ہو سکا۔ اس کی سخت جانی نے اس دورے کو بھی بے جان کر دیا لیکن طویل عرصے تک ذہنی کیفیت کو نہ سنبھال سکا۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ایک غائب دماغ شخص کی طرح اِدھر سے اُدھر گھومتا رہتا تھا۔ دوست فکر مند تھے کہ اب وہ زندگی کی طرف لوٹ بھی سکے گا یا نہیں، دوستوں کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا لیکن اس نے راستہ ڈھونڈ لیا۔ اندر کے زہر کو باہر نکالنے کے لیے اس کے پاس نظم کی صورت میں ایک راستہ موجود تھا وہ اسی راہ چل دیا۔ اس نے اس دور میں جتنی نظمیں لکھیں پوری زندگی میں نہیں لکھی ہوں گی۔

☆

ہیں دفن مجھ میں مری کتنی رونقیں مت پوچھ
اجڑ اجڑ کے جو بستا رہا وہ شہر ہوں میں
جو میرے دل میں سلگتی رہی وہ آگ ہو تم
جو میرے خون میں گھلتا رہا وہ زہر ہوں میں
کتا ہے خنجر خود آگہی سے دل تو کھلا
ترے لیے بھی تھا اپنے لیے بھی قہر ہوں میں
نظر عجیب ہیں دن رات جب سے جانا ہے
کہ اپنی ذات کے اندر خود ایک دہر ہوں میں

وہ دل کے شدید دورے کے بعد اٹھ تو گیا تھا لیکن ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی احتیاطوں پر عمل کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوستوں کے ساتھ سرِشام محفلیں اور سگریٹ نوشی جزو ذات بن گئی تھی وہ جاری رہی۔

وہ اپنی تمام بے اعتدالیوں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی مزاحمتی شاعری اور مارشل لا کی مخالفت کی بدولت اس پر ترقی کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے کہ ایک دروازہ کھل گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کے منشور میں مزدوروں، کسانوں اور استحصال زدہ طبقوں کا اس انداز میں ذکر تھا کہ بائیں بازو کے تمام طبقوں کے لیے نوید بن گیا۔ ظہور نظر کو بھی اس منشور میں اپنے خوابوں کا عکس نظر آیا۔ ظہور نظر نے ایک نظم ''بشارت'' لکھی جس میں اس پارٹی کا خیر مقدم کیا۔

چشمہ زیرِ زمیں
منتظر تھا جو نمود جوش کے ہنگام کا
موجِ اذنِ عام کا
پھوٹ کر ہر سمت و ساعت میں رواں ہونے کو ہے
انقلاب ناگہاں ہونے کو ہے

اعلیٰ سطح کے رہنماؤں سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ اسے پارٹی میں عہدوں کی پیشکش کی گئی لیکن اس نے جماعتی عہدے کے بغیر پارٹی کی تنظیم میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس کی کوششوں سے ذوالفقار علی بھٹو بہاولپور کے دورے پر آئے شاندار جلسہ ہوا جس کا اہتمام کئی اور لوگوں کے ساتھ مل کر ظہور نظر نے کیا۔

اسے بائیں بازو کی تحریکوں میں کام کر کے رنگارنگ تجربات حاصل ہو چکے تھے۔ یہی تجربات اس کے کام آئے اور اس نے بہاولپور جیسے شہر میں اس نئی پارٹی کی تنظیم و ترویج کے لیے بہت کام کیا لیکن جلد ہی اس کے خواب ٹوٹ گئے۔

وہ خواب ٹوٹ گیا ہے
جو میں نے دیکھا تھا
وہ خواب
جس میں فضائیں شفیق تھیں میری
وہ خواب
جس میں صداؤں نے میرا ساتھ دیا
وہ خواب
جس میں ہوائیں رفیق تھیں میری

وہ ایک سچا فنکار تھا۔ نہایت خلوص سے پارٹی کی



ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ پارٹی ان خطوط سے ہٹ رہی ہے جو اس نے اپنے عمل کے لیے وضع کیے تھے تو وہ چپ نہ رہ سکا۔

وہاں بھی مرے خوابوں کا شہر بستا ہے
وہ اک کھنڈر سا جہاں پر دکھائی دیتا ہے

حصول رزق کے راستے اسے پریشان کیے ہوئے تھے۔ کوئی راستہ ملتا بھی تھا تو اس کا اضطراب اسے بھٹکا دیتا تھا۔ اس میں ایک جگہ جم کر کام کرنے کی صلاحیت تھی ہی نہیں۔ وہ ہر نیا کام بڑے جوش و خروش سے شروع کرتا لیکن جلد ہی اس کے حوصلے پست ہو جاتے۔ وہ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کام کی طرف دوڑ پڑتا۔ اب اسے یہ سوجھی کہ مرغبانی شروع کرے۔ اس کی بیٹھک مرغی خانے میں تبدیل ہو گئی۔ دن کا بیشتر حصہ مرغ بانی میں تبدیل ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کبوتر پال لیے۔ چھت پر چھتریاں بنائی گئیں۔ پھر یہی ثابت ہوا کہ وہ شاعری کے سوا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے ذوق و شوق میں کمی آنے لگی۔ اس نے مرغی خانہ ختم کر دیا۔

ملک میں سیاسی سفر بڑی تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ پوری قوم امید و ناامیدی کے دوراہے پر کھڑی تھی کہ ایسے میں 1970ء کے عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ ظہور نظر کے دل میں ایک نئی امید کروٹیں لینے لگی۔

دیوانوں کے صحرا سے پلٹنے کی خبر پر
شہروں سے ہوا سنگ اڑا لے گئی اب کے
آثار خزاں سارے کے سارے ہوئے غارت
جو برگ بھی تھا زرد ہوا لے گئی اب کے
کیا کچھ نہ بگولوں نے کیا پھر بھی قفس میں
خوشبوئے چمن باد صبا لے گئی اب کے
جو گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے انہیں بھی
مقتل کی طرف میری ادا لے گئی اب کے

انتخابات کے نتائج آتے ہی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان جغرافیائی فاصلے بڑھنے لگے۔ خونیں ہنگاموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دردِ شب ہی نہیں تھا عذاب کے مانند
ہوا نزولِ سحر بھی عتاب کے مانند

یہ سانحہ ہی ایسا تھا کہ اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ اس نے کئی نظمیں تخلیق کیں لیکن ان نظموں کو جذبات کی نذر نہ ہونے دیا۔ فنکارانہ سطح یہاں بھی برقرار رکھی۔

میرا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو
کاٹنے میں رات دن مصروف ہے
روزنِ دیوار سے
آرہی ہے میرے بدکردار ہمسائے کے ہنسنے کی صدا
آسماں پر دائرہ در دائرہ
چیختی چیلوں کا غول
منتظر ہے میرے بائیں ہاتھ کا
اور بایاں ہاتھ کٹ گرنے کو ہے

اس کی شاعری کی دھوم تو تھی ہی وہ ایک اچھا نثر نگار بھی تھا۔ اخباری اداریوں اور ادبی رسائل میں اس کے تنقیدی تبصروں، اس کی صلاحیت کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس کی اس صلاحیت نے ڈراما نگاری کی طرف راغب کیا۔ بہ حیثیت ڈراما نگار ریڈیو ملتان سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا۔ ایک دو ڈراموں کے بعد وہ ڈرامے کے فنی رموز سے آگاہ ہو گیا۔ ڈراما نویسی اس کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ بن گیا۔ ریڈیو ملتان سے اس کے کئی ڈرامے نشر ہو کر مقبول ہو گئے۔ یہ اس کے فن کی نئی جہت تھی جو دنیا کے سامنے آرہی تھی چنانچہ جب بہاولپور ریڈیو اسٹیشن کا آغاز ہوا تو وہ بہاولپور چلا آیا اور اس نئے ریڈیو اسٹیشن سے منسلک ہو گیا۔

قلم کی یہ مشقت اسے ایسی راس آئی کہ آخری دم تک ڈراما لکھتا اور پروڈیوس کرتا رہا۔ ڈراما لکھتے وقت اسے سرکاری پالیسیوں کی پابندی کرنی ہوتی تھی جو اس کی طبع کے خلاف تھا لیکن وہ تھا کہ پالیسیوں کی پاسداری کرتا رہا۔ بعض اوقات موضوعات دے دیے جاتے جس کی وہ ڈرامائی تشکیل کرتا۔ اس کی نظمیں اور غزلیں ان پابندیوں سے آزاد تھیں۔ اس لیے بعض احباب کا یہ خیال تھا کہ وہ ریڈیو سے بھی بھاگ کھڑا ہوگا لیکن وہ جما رہا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ یہاں وہ دوست موجود تھے جن سے گپ شپ کے لیے وہ محفلیں سجاتا تھا۔ اب ان دوستوں کو ایک جگہ مل کر بیٹھنے کی مل گئی تھی۔ ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ڈراما نگاری اس کی معاشی مجبوری بن گئی تھی۔ یہ مجبوریاں اس سے قلم کی مشقت کراتی رہیں۔

اس کا قلم کیسے کیسے ادبی شہ پارے تخلیق کر سکتا تھا مگر اس کی محنت ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں خرچ ہوتی رہی۔ اسے ہر ہفتہ ایک ڈراما لکھنا ہوتا تھا۔ پورا دن اور شام کا کچھ حصہ دوستوں کے ساتھ گزر جاتا اور رات کو بیٹھ کر ڈراما لکھتا۔

اکثر رات بھر میں پورا ڈراما لکھ لیتا۔

اس کے خواب چکنا چور ہو رہے تھے۔ اس نے جن حکمرانوں سے اُمیدیں باندھی تھیں ان کا ہر عمل اس کی خواہشات کے برعکس تھا۔ اس کی تلافی کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ان حکمرانوں سے نفرت کا اظہار کرے اور عوام کے دلوں میں جدوجہد کا الاؤ روشن کرے۔ اس کی نظمیں یہی کام کر رہی تھیں۔ اس کے صلے میں وہ بیورو کریسی کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا تھا لیکن وہ اپنی راہ سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

قصیدہ کیسے لکھوں شب کے شاہزادوں کا
مجھے تو عشق بہت حرمت قلم سے ہے

☆

بن کر کیسے بگڑی بات بتائے کون
کون کٹائے بازو، ہاتھ اٹھائے کون
آپ مچانوں پر جو گھات لگائے بیٹھے ہیں
جنگل والو ان پر گھات لگائے کون
وہ پتھر دل جن کی آگ بھی پتھر ہو
ان کو تصویرِ حالات دکھائے کون
اک پل میں جو سو سو روپ بدلتا ہے
سارا جیون اس کے ساتھ نبھائے کون

☆

شہرت شمشیر قاتل سے ڈرے بیٹھے ہیں لوگ
موت کے آنے سے پہلے ہی مرے بیٹھے ہیں لوگ
شہر میں ہنسنا ہنسانا جرم ہے تقصیر ہے
اور درباروں میں بن کر مسخرے بیٹھے ہیں لوگ
شور ہے وہ پیڑ بھی گرنے والے ہیں نظر
عرصۂ دہشت میں جن کے آسرے بیٹھے ہیں لوگ
گھرا تھا ابر تو گرمی شدید کتنی تھی
پڑا نہ ایک بھی چھینٹا اُمید کتنی تھی
گلی گلی میں پھرے زلزلے کی صورت لوگ
گرا نہ ایک بھی ایوان شنید کتنی تھی

وہ مایوسی کی دلدل میں اتر کر خود میں سمٹا۔ اس جیسا قہقہہ باز اب مشکل سے ہنستا تھا۔ مایوسی کی یہ لہر اس کی نظموں میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

زہر کے شہر کے
راستوں پر مرے
لفظ زخمی ہوئے
درد گوڑھے ہوئے
زخم چھلنی ہوئے
خواب بوڑھے ہوئے
شعر کہنا بھی اب چار دن اور ہے
اور رہنا بھی اب چار دن اور ہے
الوداع جانِ من
الوداع جانِ من

یہ مایوسی اس کے اندر اترتی چلی گئی۔ اس کے قہقہے دم توڑتے رہے، یہ مایوسی پہلے باطن میں اتری اب ظاہر میں بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ اپنی جانب سے بے پروا ہو گیا۔ یہ بے نیازی اس کے لباس کے معاملے میں دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ بغیر سوٹ کے باہر نہیں نکلتا تھا اب یہ ہوا کہ جن کپڑوں میں بیٹھا ہوتا باہر نکل جاتا۔

ملکی حالات مزید آگے بڑھے۔ مارشل لاء پھر نافذ ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوگئی۔ یہ ظہور نظر کے آدرش کی پھانسی تھی۔ اب اسے حالات کے سنورنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔

یہ جنگل کون کاٹے گا
یہ جنگل
جس کو خون کے رنگ سے سینچا تھا ہم نے اس تمنا پر
کہ جب شہرِ شفق میں قحط رنگوں کا پڑے گا
اور افق سے تا افق ادبار کے کہرے
کی چادر پھیل جائے گی
تو ہم آدرش کے فولاد کی مضبوط آری سے
یہ جنگل کاٹ لائیں گے

..........................

ہمارے ہاتھ میں آدرش کی آری تو ہے
لیکن
یہ دندانوں سے عاری ہے
یہ جنگل کون کاٹے گا

☆

اس کی نظمیں ہی نہیں غزلیں بھی انہی جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں

کس نے دار پہ کھینچا ہے رہ گزاروں کو
یہ کس نے شہر کے دل میں چھری اتاری ہے

☆



وہی نہیں کہ جو آنسو چھلک کے بہہ نکلے
کیے جو ضبط انہیں ناگوار وہ بھی تھے

☆

اُمید اب نہیں صبحوں کی داگزاری کی
کہ مصنفوں نے بھی راتوں کی پاسداری کی

☆

کئی دنوں سے مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ میں
شکستہ ناؤ ہوں اور تند موجِ آب میں ہوں

وہ سخت بیمار تھا کہ اگست 81ء میں یوم آزادی کے موقع پر ایک ادبی انجمن نے اسلام آباد میں آل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کیا۔ دعوت نامہ ظہور نظر کے نام بھی آیا۔ اس نے اپنی بیماری کو نظر انداز کرتے ہوئے دعوت نامہ قبول کرلیا۔ شاید اس لیے کہ دوستوں سے ملاقات بھی متوقع تھی اور مشاعرے میں شرکت سے ہونے والی آمدنی بھی اس کی ضرورتوں کے لیے بہت تھی۔

وہ بہاولپور سے لاہور آیا۔ اسلام آباد جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچا تو پرواز میں تاخیر ہوگئی۔ اس کی بیماری کے لیے دو تین گھنٹے ایئرپورٹ پر پریشانی کے عالم میں بیٹھنا نہایت تکلیف دہ تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام آباد ایئرپورٹ اسے لینے کے لیے کوئی نہیں آیا بلکہ یوں کہیے لینے آئے لیکن اسے کوئی لے جا نہ سکا۔ ہوا یوں کہ حفیظ جالندھری بھی طیارے میں اس کے ساتھ تھے۔ دونوں ایک ساتھ اترے۔ ابھی وہ میزبانوں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک کار جھنڈا لہراتی آئی۔ وہ مضمحل طبیعت کے ساتھ قدرے پیچھے تھا حفیظ جالندھری آگے تھے۔ وہ یہ بھول ہی گئے کہ ظہور نظر بھی ان کے ساتھ تھا۔ لپک کر گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے جو ڈرائیور گاڑی لے کر آیا تھا وہ بھی غالباً یہی سمجھا کہ صرف حفیظ صاحب لاہور سے تشریف لائے ہیں۔

یہ بظاہر غلط فہمی تھی لیکن ظہور نظر نے اسے اپنی ذلت سمجھا۔ اپنی اس ناقدری پر اسے سخت دکھ ہوا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہوٹل تو پہنچ گیا لیکن اس نے مشاعرے میں شرکت سے انکار کردیا۔ وہ منتظمین پر سخت برہم ہوا۔

''جناب حفیظ صاحب مجھ سے بڑے شاعر ہیں اگر صرف انہی کو بلانا تھا تو مجھے کیوں بلایا گیا اور اگر بلایا تھا تو ہوٹل تک لے کر بھی آتے۔ میں اس ذلت کے ساتھ مشاعرے میں جانے کو تیار نہیں۔ آپ حفیظ صاحب کو

## ایک نکتہ

ایک نکتہ کی کم مائیگی پر نہ جائیں۔ یہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا نکتہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ یہ ایک نکتہ۔

☆ ''زحمت'' کو اللہ کی ''رحمت'' بنا سکتا ہے۔
☆ ''خرام'' کو ''حرام'' قرار دے سکتا ہے۔
☆ ''علوے'' کے ''جلوے'' دکھا سکتا ہے۔
☆ ''رقوم'' کو ''زقوم'' کی طرح خاردار بنا سکتا ہے۔
☆ ''رنگ'' کی خوش حالی کو ''زنگ'' لگا سکتا ہے۔
☆ ''رفیق'' کو ''رقیق'' القلب بنا سکتا ہے۔
☆ ''رمز'' کے ''رمز'' آشکارا کر سکتا ہے۔
☆ ''سفر'' کرنے والے کو ''سقر'' پہنچا سکتا ہے۔
☆ ''طاہر'' کو ''ظاہر'' کر سکتا ہے۔
☆ ''عذر'' کے لیے ''غدر'' تراش سکتا ہے۔
☆ ''فرض'' کو ''عرض'' کر سکتا ہے۔
☆ ''خلق'' کی ''حلق'' میں اٹک سکتا ہے۔
☆ ''فرح'' کو ''فرخ'' کی زوج بنا سکتا ہے۔
☆ انسان کو ''فریب'' کے ''قریب'' لا سکتا ہے۔
☆ ''فصد'' کا ''قصد'' دلا سکتا ہے۔
☆ ''فضا'' کی ''قضا'' پیدا کر سکتا ہے۔
☆ ''فرق'' کا ''فرق'' سمجھا سکتا ہے۔
☆ ''کنیز'' کو ''کنیر'' (زہریلا) بنا سکتا ہے۔
☆ ''فند'' (دھوکا) کو ''قند'' میں تبدیل کر سکتا ہے۔
☆ ''فرار'' ہو کر ''قرار'' پا سکتا ہے۔
☆ ''غلت'' (بھول) کو ''علت'' سے بچا سکتا ہے۔
☆ ''عسل'' میں ''غسل'' دے سکتا ہے۔
☆ ''غم'' کے ''عم'' میں نڈھال کر سکتا ہے۔
☆ ''غزال'' کو ''عزازیل'' میں پھینک سکتا ہے۔
☆ ''خلال'' کو ''حلال'' قرار دے سکتا ہے۔
☆ ''خر'' کو ''حر'' کی آزادی دلا سکتا ہے۔
☆ ''خلجان'' کی میزبان کو ''خلجان'' میں ڈال سکتا ہے۔

اس ایک نکتہ کو حقیر مت گردانیے۔ یہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔

مرسلہ: حسن رزاقی۔ کراچی

ایئرپورٹ سے لے کر آئے ہیں مشاعرے میں بھی انہی کو لے جایئے۔"

"ہم آپ سے معافی کے خواستگار ہیں لیکن یہ سب غلط فہمی میں ہوا۔ وہ گاڑی تو سب کے لیے تھی ہم یہ سمجھے کہ صرف حفیظ صاحب تشریف لائے ہیں۔"

منتظمین کے سمجھانے بجھانے پر وہ تیار ہو گیا اور مشاعرے میں چلا گیا۔ مشاعرے میں پہنچتے ہی اس کی ازلی شوخی لوٹ آئی۔ اپنی تھکن اور پریشانی بھول کر دوستوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

مشاعرہ ختم ہوا ہی تھا کہ اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اسے ایک منتظم اپنے گھر لے گیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا۔ رپورٹیں حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ وہ پھر بھی واپسی پر مصر تھا لیکن منتظمین نے اصرار کر کے اسے کچھ دنوں کے لیے ٹھہرا لیا۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ لاہور آ گیا۔ یہاں کچھ دن ٹھہر کر بہاولپور چلا گیا۔

طبیعت بظاہر ٹھیک ہو گئی تھی کہ 29 اگست 81ء کی دوپہر کو پھر دل کا دورہ پڑا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں پھر طبی معائنہ ہوا اور اسے داخل کر لیا گیا۔ حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی لہٰذا اس کے ان عزیز و اقارب کو اطلاع کر دی گئی جو بہاولپور سے باہر تھے۔

وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ بہاولپور میں کون تھا جو اسے نہ جانتا ہو۔ کئی ڈاکٹروں سے اس کا ذاتی تعلق تھا۔ اس کا علاج بڑی توجہ سے ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنے وسائل کے مطابق اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی حالت سنبھلنے نہیں پا رہی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا۔ وہ اگر زندہ تھا تو یہ دواؤں کا معجزہ تھا۔

6 ستمبر تک اس کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ دواؤں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس دن شام کو اسے خون کی قے ہوئی۔ اس کی بیوی اور بڑی بیٹی اس وقت اسپتال ہی میں تھے۔ اس نے اشارے سے انہیں اپنے پاس بلایا۔

"تم لوگ کیوں بے آرام ہوتے ہو۔ گھر جاؤ آرام کرو۔"

"آپ کی یہ حالت ہے میں کیسے گھر چلی جاؤں۔" بیوی نے کہا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے صبح آنے تک میں زندہ رہوں گا۔"

اس نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ وہ اس کی بیوی کو گھر جانے پر آمادہ کریں بلکہ اسے گھر چھوڑ کر آ جائیں۔ ان میں سے کسی دوست نے اس کی بیوی اور بیٹی کو سمجھا بجھا کر گھر چھوڑ دیا۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ظہور نظر بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ ڈاکٹر بار بار آ کر اس کا معائنہ کر جاتا تھا۔ دوست بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے کہ صبح آ کر دیکھ جائیں گے۔

صبح کے پانچ بجے تھے یعنی 7 ستمبر کا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اس نے رات گزار لی تھی اور اب صبح ہونے کو تھی۔ اس نے آخری بار اسپتال کے کمرے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ صبح کے چھ بجے تھے کہ ڈاکٹروں نے اس کی موت کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

ٹیلی فون دوڑنے لگے۔ کچھ احباب اس کے گھر پر جمع ہوئے کچھ اسپتال پہنچ گئے۔ اس کی میت اسپتال سے گھر لائی گئی۔ غسل دیا جا چکا تھا۔ میت گھر کے صحن میں رکھی تھی کہ مسجدوں سے اعلانات ہونے لگے۔

"ظہور نظر کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی جائے گی کیونکہ وہ احمدی بھی تھے اور دہریے بھی۔"

یہ اعلانات سب کے لیے لائق تشویش تھے کیونکہ نہ تو وہ احمدی تھا نہ دہریہ۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کے خاندان میں کئی افراد احمدی تھے۔ اس کی دو بہنیں احمدیوں میں بیاہی گئی تھیں۔ وہ خود بھی کچھ دنوں تعلیم کے سلسلے میں قادیان میں رہ چکا تھا لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا تھا کہ وہ خود بھی قادیانی ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس یہ واقعہ تو اس کے دوستوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب ایک مشاعرے میں لوگوں نے اسے دیکھ کر مرزائیوں کے خلاف نعرے لگائے اور خود ظہور نظر کو مرزائی اور قادیانی کہہ کر برا بھلا کہا۔ ظہور نظر بپھر کر اٹھا اور مائیک سنبھال لیا۔

"میں مرزا غلام احمد پر لعنت بھیجتا ہوں اور جو مجھے مرزائی کہے اس پر بھی لعنت بھیجتا ہوں۔" لوگوں نے ریڈیو کے نعتیہ مشاعروں میں اس کی نعتیں بھی سنی تھیں اور اب یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ قادیانی ہے۔

اس داغ کو کیسے دھویا جائے۔ کیسے ثابت کیا جائے کہ وہ قادیانی نہیں تھا۔ دوستوں نے اس پریشانی کا حل یہ نکالا کہ جمعیت علمائے اسلام کے ناظم مولانا اشعر سے فتویٰ حاصل کیا جائے۔ چند دوست مولانا کے پاس گئے اور ظہور نظر کی زندگی کے واقعات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائی نہیں تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ گواہی بھی دی کہ انہیں کم از کم عید کی نماز پڑھتے ہوئے تو انہوں نے بھی دیکھا ہے اس لیے دہریہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ گناہ گار ضرور تھے لیکن دہریہ نہیں تھے۔ کتنے ہی بے نمازی ہیں جن کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں پھر ظہور نظر کے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ وہ مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

مولانا اشعر پر یہ دلیلیں اثر کر گئیں۔

"مجھے یقین ہے وہ مرزائی نہیں تھے تاہم آپ لوگ احمدیوں کے ریکارڈ کیپر سے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں کہ ان کے رجسٹر میں ظہور نظر کا نام بطور احمدی درج ہے یا نہیں۔"

یہ لوگ ریکارڈ کیپر کے پاس گئے۔ اس نے ریکارڈ دیکھ کر سرٹیفکیٹ دے دیا کہ ہمارے پاس ظہور نظر کا نام بطور احمدی درج نہیں۔

اسی دوران ظہور نظر کا داماد ناصر، ظہور نظر کی نعتیں لے کر آ گیا جو مولانا اشعر کے سامنے رکھ دی گئیں۔

ایسا سنا کبھی نہ تھا
ایسا ہوا کبھی نہ تھا
خلق سے اس قدر قریں
پہلے خدا کبھی نہ تھا
ارض و سما کا فاصلہ
عرصہ وسعت تنقل
راہ سفر کا سلسلہ
وقت کا بے کراں جبل
اتنا غریب و مختصر
آپؐ کے واسطے ہوا
گنبد آسماں میں در
آپؐ کے واسطے ہوا
آپؐ کے واسطے ہوئیں
پیدا تمام نعمتیں
آپؐ کے واسطے بنیں
دونوں جہاں کی نعمتیں
آپؐ کے واسطے سے ہی
جوش میں آئیں رحمتیں
خالق کائنات کی
جتنی ہیں سب محبتیں
جتنی ہیں سب عنایتیں
آپؐ کے واسطے سے ہیں
جتنی ہیں سب فضیلتیں
آپؐ کے واسطے سے ہیں
صلی علیٰ رسولنا صلی علیٰ محمد
صلی علیٰ حبیبنا صلی علیٰ محمد

مولانا نے صفحہ پلٹا تو دوسری نعت ان کے سامنے تھی۔

کہیں یہ کچھ بھی نہ تھا ان کی ذات سے پہلے
عدم وجود میں بدلا گیا انہی کے لیے
ازل کا لفظ انہی کے لیے ہوا ایجاد
ابد کا دائرہ کھینچا گیا انہی کے لیے
انہی کے صدقے میں مجھ کو یہ ارضِ پاک ملی
انہی سے عرض ہے میری کہ اے رسولؐ خدا
یہ ارضِ پاک جسے آپؐ کے غلاموں نے
بہت مصائب و آلام سہہ کے پایا ہے
اس ارضِ پاک کو اپنی امان میں رکھیے

ان نعتوں کو دیکھ کر مولانا اشعر نے بلا تامل ظہور نظر کے مسلمان ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا۔

اس کے اکثر اقارب بیماری کے دوران ہی بہاولپور پہنچ گئے تھے۔ کچھ انتقال کی خبر ملتے ہی بہاولپور پہنچ گئے۔ دوست، مداح، شاعر ادیب صبح ہی سے اسے سفر آخرت پر روانہ کرنے کے لیے جمع تھے۔ مولانا اشعر کا فتویٰ ملتے ہی سب نے سکون کا سانس لیا۔

اس کی قیام گاہ فرید گیٹ محلہ غوث پورہ سے کچھ فاصلے پر ہائی اسکول کے گراؤنڈ میں اس کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ شام ہو گئی تھی یہی وہ وقت تھا جب وہ دوستوں کی محفلیں آباد کیا کرتا تھا۔ اس شام بھی تمام دوست جمع تھے۔ مداحوں نے اسے نم آنکھوں کے ساتھ دن یونٹ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

کس طرح تراشو گے تہمت ہوس ہم پر
زندگی ہماری تو ساری بے طلب گزری

**ماخذ**
ظہور نظر فن اور شخصیت
محترم ڈاکٹر خالق تنویر

سلمیٰ اعوان

احساسات کو خوب صورت الفاظ کا پیرہن ملے تو ماحول کی فسوں گری عروج پر نظر آتی ہے۔ انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی ابھرتی، نازک احساسات کو زبان دیتی، کومل جذبوں کی عکاس تحریر جسے ایک دور افتادہ مقام کے رسم و رواج کے زیورات سے مزین کر کے پیش کیا گیاہے۔ اسے آپ بھی بار بار پڑھ کر لطف لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ضلع پنیال کی وادی سنگل کی ملکہ جوان دنوں کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ میرے میزبان نے مجھے اُن کے بارے بتایا اور میں اُن سے ملنے سنگل گئی۔

سنگل خاصی بڑی وادی ہے۔ چار قدم آگے سنگل تھانہ اور آغا خان میڈیکل سینٹر ہے۔ دائیں بائیں دکانیں، سرکاری دفاتر، اسسٹنٹ کمشنر، تحصیل دار وغیرہ کی رہائش گاہیں ہیں۔ ان سبھوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں آگے بڑھ رہی تھی۔

گلیاں کہیں تنگ، کہیں کشادہ، اخروٹ کے درختوں کی بہتات تھی۔ گھروں کی دیواروں پر انگوروں کی بیلوں نے عام سے گھروں کے حسن کو بھی بڑھا دیا تھا۔ گلیوں میں کھیلتے سرخ و سفید بچے منہ اٹھا اٹھا کر جب دیکھتے تو مجھے اپنے بچے یاد آجاتے۔

لفظ پونیال ''پوپال'' سے نکلا ہے۔ جو سنسکرت میں پھلوں سے بھری تھالی کو کہتے ہیں۔ یہ وادی اپنے نام سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس وادی کے حسن کو نظروں سے کشید کرتی ہوئی میں اس حویلی نما مکان پر پہنچی۔

پھر ایک بڑے سے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ آنگن اتنا صاف ستھرا اور پھل پھلواری سے لدا پھندا تھا کہ سفر کی تھکاوٹ اور کلفت یوں اڑنچھو ہو گئی جیسے منڈیر پر بیٹھی چڑیا ذرا سی آہٹ پر اڑ جاتی ہے۔ گھر میں صرف ایک خوبصورت سی جوان لڑکی تھی۔ جس نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔ بقیہ لوگ قریبی کھیتوں میں گندم کی کٹائی کے لیے گئے ہوئے تھے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب دو عورتیں اور دو مرد اندر آئے۔ درمیانی عمر کی جس عورت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا اور میرا ماتھا چوما تھا اس کے خدوخال بلاشبہ ''لیونارڈو'' کی ''پہاڑی دوشیزہ'' جیسے تھے۔ نہایت شستہ اردو بول رہی تھیں۔ گلگت میں مجھے جس خاتون کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ یہی تھیں۔ ''ملکہ تاجور''۔

چائے نمکین تھی۔ لیکن سادی چائے کا تھرموس بھی موجود تھا۔ چینی الگ سے رکھی گئی تھی۔ اس صاف ستھرے گھر کے برآمدے میں پھلوں، پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں، نیلے آسمان اور اپنے اردگرد خوبصورت چہروں سے آنکھوں کی سکائی کرتے ہوئے مجھے نمکین چائے کی چسکیوں نے بہت لطف دیا تھا۔ میں نے ملکہ تاجور کے بار بار کہنے پر بھی چینی والی چائے پینی پسند نہ کی تھی۔

عصر کی نماز پڑھی۔ ظہر کے قضا سجدے بھی کیے۔ پتا نہیں مجھے اجنبی جگہوں پر سجدے کرنا کیوں اتنا پسند ہے؟ شاید میں ہر نئی مٹی پر ماتھا ٹیک کر اپنا کھاتہ وزنی کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ بوقت ضرورت کسی بڑی خواہش کی تکمیل کے لیے اس کا حوالہ دے سکوں۔ اس ضدی بچے کی طرح جو ماں سے اپنی کسی فرمائش کو پورا کرنے کے لیے اگلے پچھلے کئی چھوٹے موٹے کاموں کا احسان اس کے سر پر دھرتے ہوئے مچلتا ہے۔

یہ خاصا کشادہ گھر تھا۔ بڑے کمرے کی دیواریں پتھروں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بڑے بڑے تختوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کا درمیانی حصہ تکون نما گنبد کی شکل کا تھا۔ چھت کو اخروٹ کی لکڑی کے چار موٹے موٹے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ ان ستونوں پر نقش و نگاری کا کام ایسا عمدہ تھا کہ میں کتنی دیر تک ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتی رہی۔

اللہ آرٹ کے یہ نادر شاہکار اگر شہر والوں کی نظروں میں آجائیں تو وہ ان سیدھے سادے دیہاتیوں کو کیا نام دیں گے کیونکہ سب نام تو انہوں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔''

سردیوں میں گنبد کے نیچے آگ جلتی ہے۔ اس کے اردگرد گھر کے لوگ بیٹھتے ہیں۔ درمیانی جگہ کے آمنے سامنے گھر کے ضعیف افراد کے لیے لکڑی کے بڑے بڑے پلنگ نما تختے بچھے ہیں۔ دونوں طرف لکڑی کی خوبصوت الماریاں جس میں گھریلو برتن اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی نام شخصیت کی کس قدر بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ملکہ تاجور کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، گفتگو کرنے کے طور طریقے سبھوں میں انداز دلربائی بھی تھی اور وقار بھی۔ ذہانت آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ تجربہ، مشاہدہ اور علم کا خزانہ زبان کے راستے باہر آتا تھا۔

وادی سنگل کی سیر کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ وادی کے جلوؤں کا حال پنجاب کی اس الڑ مٹیار کی ناک میں لشکارے مارتے لونگ جیسا ہے جو چہرے کے ذرا سے رخ بدلنے پر یوں چمکتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ہوائیں جو دوپہر تک حرارت کے باعث خوشگوار اور سبک خرام تھیں۔ اب وہ بوجھل ہو کر جسم میں کپکپی کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

سنگل کے چھوٹے بڑے گھر، اُن گھروں میں کام کرتی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں، برآمدوں اور کمروں میں لٹکتی پرنس کریم آغا خان کی تصویریں۔ آنگنوں میں شراب بنانے والی ہوزریاں، خوبانی اور اخروٹ کے پیڑوں پر لٹکتے دل لبھاتے پھل، فضا میں بکھرتا دھواں اور پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں سب کسی حسین خواب کی طرح دل موہ لینے والی تھیں۔ ہوا میں گندم کے پکے خوشوں کی خوشبو چرائے پھرتی تھیں۔

مغرب کے وقت واپسی ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں اس چھوٹے سے کمرے میں آگئی جہاں لکڑی کے فرش پر گدے بچھے تھے۔ رضائیاں دھری تھیں۔ بجلی کا قمقمہ جلتا تھا پر جلنے سے زیادہ شرارتیں کرتا تھا۔ ملکہ تاجور نے ایک البم میرے گھٹنوں پر دھری رضائی پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''انہیں دیکھو میں ذرا کھانے کا جائزہ لے آؤں۔''

میں نے جلد کو پلٹا۔ پہلے صفحہ پر پوسٹ کارڈ سائز میں

سمسن جیسے ایک جری نوجوان کی تصویر تھی۔ دوسرے صفحے پہ اسی چہرے کے دو پوز تھے۔ قدیم دردِ نسل کا بہروپ، پاؤں میں کھلے پائینچوں کی پاجامہ نما شلوار' لمبا چوڑا فرغل، سر پہ اونچی ٹوپی' لمبی داڑھی، ہاتھ میں پکڑا اگلدان نما حقہ۔ میں آگے بڑھی۔ راجا کا درباری' کامدار چوغہ، کمر میں پٹکا۔ کھلی شلوار، ایک تصویر میں کرنل ڈیورنڈ بنا ہوا تھا۔ بند گلے کی کامدار جیکٹ جس کے سینے پر تمغے لٹکتے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، نفاست سے بنے ہوئے بال۔ صفحات پلٹے تو قدیم زمانے کا شکاری نظر آیا۔ کھسا نما جوتا جس میں پھنسی سیاہ اونی جرابیں گھٹنوں تک چلی گئی تھیں۔ گھٹنوں سے کمر تک ہندوانہ اسٹائل کی دھوتی نما شلوار کھلے بازوؤں کا کرتہ، جس پر تنگ بازوؤں کی اونی جیکٹ پورے سر کو ڈھانپتا ہوا عمامہ۔ ہاتھ میں تیر اور کمان۔

البم نہیں تھا لوک ورثہ میوزیم تھا۔ ایک عہد کی تاریخ محفوظ تھی۔

پھر اسی نوجوان کی شادی کی تصاویر نظر آئیں۔ یہاں ملکہ بھی تھی۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں مختلف جگہوں پہ یہ جوڑا اپنے حسن کے جلوے بکھیر رہا تھا۔

''ہوں تو یہ تاجور خان ہے۔ بڑا فنکار نظر آتا ہے۔ ایسے شوہر کی بیوی ایسی ہی ہونی چاہیے، میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔''

رات کا کھانا خاصا پُرتکلف تھا۔ مولی، پودینہ، سلاد کے پتوں اور ہرے دھنیے پر مشتمل سلاد گھر کی کیاریوں سے توڑ کر بنایا گیا تھا۔ سونے کے رنگ جیسے قہوے کی پیالی ہاتھوں میں تھام کر میں نے اپنی پشت پر رکھی رضائی سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک نظر سامنے دیوار پر ڈالی۔ جہاں مارخور اور ہڑیال کے سینگ لکڑی کے قلب میں لگے خوبصورت ڈیکوریشن پیس بنے ہوئے تھے۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ بعض انسان اور بعض جانور کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ زندگی میں بھی لوگوں کو پیچھے لگائے پھرتے ہیں اور مر کر بھی گھروں کی زینت بن جاتے ہیں۔

ملکہ میرے پاس آ بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور ہنس کر کہا ''آپ کے شوہر تو بڑے فنکارانہ طبیعت کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

گھائل کر دینے والی مسکراہٹ اُن ارغوانی ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔ ملکہ اپنی جوانی میں کس قدر حسین عورت ہوگی۔ اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ تصویریں بولی تھیں مگر اس شدومد سے نہیں جس کی ضرورت تھی۔ سرخی مائل سرمئی رنگ کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک دیکھنا مشکل تھا۔ اپنا آپ اپنے آپ سے چھنتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سنہری دراز بالوں کا روکھا پن یہ بتاتا تھا کہ کبھی ان کی چمک اور رعنائی آنکھوں کو سحر زدہ کرتی ہوگی۔ رنگ وروپ تو ابھی بھی دیے کی لاٹ جیسا تھا۔ جوانی میں تو آسمان پر اڑتے پرندے پھڑ پھڑا کر گرتے ہوں گے۔

''اتنی مختصر سی ملاقات کے باوجود آپ کی ذات کی انفرادیت کو میں نے پوری طرح محسوس کیا ہے۔ ایسی ذات جن حالات سے گزرتی ہے اور جو کچھ محسوس کرتی ہے وہ دلچسپ آپ بیتی کی شکل میں ایک خوبصورت کہانی بن جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس کہانی کو سننا چاہتی ہوں۔''

''اپنی دنیا کا چہرہ مجھے کسی کو دکھانا پسند نہیں۔ اس دنیا میں کسی کی شرکت خواہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی کیوں نہ ہو مجھے گوارہ نہیں، مجبوری یہ ہے کہ آپ مہمان ہیں۔ بہت پیاری سی مہمان۔ آپ کی بات ٹالنا مناسب نہیں۔ چلیے آئیے سناتی ہوں۔

☆☆☆

ملکہ کی پُرسحر سحر آفریں آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

''یورمس اگر شنا زبان کے نامور شاعر رحمت جان ملنگ کی محبوبہ تھی تو تاجور خان میرا محبوب تھا۔ یورمس کا چہرہ چاند کی کرنوں جیسا تھا تو تاجور خان کی پیشانی سے آفتاب پھوٹتا تھا۔''

میں اپنی انگنائی میں سیب کے پیڑ پر چڑھی ہوئی انگور کی بیلوں سے خورستانی انگوروں کا گچھا اتارتی، پاؤں کی ایڑیوں سے زمین بجاتی، گچھے کو ہاتھ میں پکڑ کر اپنا چہرہ ہندوکش پہاڑوں کی بانہوں میں سمٹے نیلے شفاف آسمان کی طرف کے منہ کھولتی اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ سے خورستانی انگوروں کا دانہ دانہ کھاتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی۔

ملنگ تم یورمس کے لیے اپنی ٹوپی میں سرخ گلاب لگاتے تھے اور میں اپنے تاجور خان کے لیے آفتاب رنگی اوڑھنی اوڑھتی ہوں۔ پر ایک بات ہے، تم جب آنکھیں بند کرتے ہوگے تو یورمس کے حقیقی پیکر کے کتنے رنگین جلوے تمہاری ذہنی سطح پر تھرتھراتے ہوں گے لیکن میرے پاس اپنے خیالی محبوب کے صرف خیالی پیکر ہیں۔

یہ پیکر کبھی حقیقت کا بھی روپ دھاریں گے یا نہیں میں نہیں جانتی۔ پر ایک دعا بھی ہے کہ تمہاری طرح میری محبت ایسے کا شکار نہ ہو کہ تم نے اپنے جذبات کو شاعری میں ڈھال لیا لیکن میں کیا کروں گی؟ ہاں کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیتے تو اپنی یورمس کو بھول جاتے۔



میں نے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا لیکن وہ موو ی میں نے کوئی دس بار دیکھی ہے جو میرا چھوٹا بھائی وہاں کے حسین نظاروں پر بنا کر لایا ہے۔ میں یقیناً دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری وادی پنیال کے سامنے وہاں کی خوبصورتیاں ہیچ ہیں۔

ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ بھرے پڑے شور شرابے والے اس گھر میں، میں اور میرا بڑا بھائی یامین عباس ہی سب سے الگ تھلگ اور مختلف تھے۔ یامین نہایت ذہین ضدی و سرکش اور روایات سے ٹکرانے والا لڑکا تھا۔ کچھ ایسی ہی عادت میری بھی تھی۔ ہم تب گلاپور میں رہتے تھے۔ یامین کا معمول تھا کہ وہ جو کچھ اسکول سے پڑھ کر آتا مجھے سناتا بھی اور سمجھاتا بھی۔ وہ اپنے ایک استاد دولت شاہ سے بہت متاثر تھا۔ اکثر اس کی باتیں کرتا۔ یہ دولت شاہ تھا جس نے اس کے دل میں عزت نفس کا احساس پیدا کیا۔ اپنے استاد کی طرح یامین کو بھی بچپن سے ہی راجگی نظام سے نفرت تھی جو ہمارے علاقے میں مسلط تھا۔

اس دن ابھی شام نہیں ڈھلی تھی۔ بابو (باپ) تھوداس (وادی یاسین کا گاؤں) اپنی بہن کے پاس گیا ہوا تھا اور میں تھرنگی (بکری کے چمڑے کا مشکیزہ جس میں دودھ بلویا جاتا ہے) میں ہفتہ بھر سے سیب کے پتے بھر بھر کر اسے کوٹتی رہی تھی اس وقت اس کی مہندی رنگی کھال کو یہ جاننے کے لیے سونگھ رہی تھی کہ اس کی بو ختم ہوگئی ہے یا نہیں۔ جب یامین گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں لال بوٹی ہو رہی تھیں۔ میں تھرنگی چھوڑ کر اس طرف بھاگی۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے بے چینی اور اضطراب سے پوچھا۔ ''گاکو (بھائی کو جب پکارا جائے) تمہیں کیا ہوا ہے؟ کسی سے جھگڑ کر آئے ہو۔ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟''

اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ مجھے اور مان (ماں) کو دیکھا۔ ہماری تشویش کو محسوس کیا اور دھیرے سے بولا۔ ''پنیال میں راجا کے خلاف زبردست احتجاج ہوا ہے۔ لوگوں پر گولی چلی ہے۔ آٹھ افراد شہید ہو گئے ہیں۔ شہید ہونے والوں میں امیر حمزہ کا باپ بھی ہے۔'' امیر حمزہ یامین کا دوست اور ہمارا رشتہ دار تھا۔ راجا کے لوگ تحریک کے لیڈر منشی یحییٰ غلام کو پکڑ کر لے گئے ہیں!

مان (ماں) نے سینے پر دوہتڑ مار کر کہا۔ ''یامین تیرے باپ کی خیر نہیں۔ وہ آج تیری پھپھی سے ملنے گیا ہے۔''

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے یامین کی سوچوں میں بغاوت پیدا کی۔ راجگی نظام سے اس کی نفرت میں شدت نمایاں ہوئی۔

ان دنوں جب درجہ حرارت منفی اعشاریہ صفر سینٹی گریڈ سے بھی نیچے ہوتا۔ وہ کمرے کے عین وسط میں بنے چولہے میں جلتی کائل کی لکڑیوں کے شعلوں کو گھورتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے کہتا۔ ''میں بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ لیکن بڑا بن کر چھوٹوں میں رہنے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آخر ایک طاقتور آدمی اتنے ڈھیر سارے بے کس و مجبور لوگوں پر محض اپنے مفاد کے لیے کیوں ظلم کرتا ہے؟ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟''

پھر وہ اپنا افسردہ اور مضطرب چہرہ اوپر اٹھا کر اس چھوٹے سے سوراخ میں جو ہمارے گھر کی چھتوں میں روشنی اور دھوئیں کی آمدورفت کے لیے بنائے جاتے ہیں سے آسمان کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہتا۔ ''اے خدا (اے اللہ) انہیں تیرا بھی ڈر نہیں۔''

اگرچہ میں اس سے دو سال چھوٹی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی سب باتیں سمجھتی اور کبھی کبھی جزبز ہو کر یہ ضرور کہتی۔ ''اتنا مت سوچا کرو۔''

پنیال کے مڈل اسکول سے جب اس نے آٹھویں کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تب تک اس کی اردو میں لکھی ہوئی کم و بیش سبھی کتابوں کو میں پڑھ بیٹھی تھی۔ انگریزی بھی تھوڑی تھوڑی جان گئی تھی۔

ہم ان دنوں سنگل میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ پنیال کی مرکزی وادی ہے۔ یہاں بیشتر آبادی اسماعیلیوں کی ہے۔ یہاں دنیا کا بہترین انگور اور شراب دونوں کی کل بھی بہتات تھی اور آج بھی ہے۔ ہم نے شراب کشید کرنے اور بیچنے کا کام شروع کر لیا تھا۔

ایک دن بابو (باپ) کے لیے راجا پنیال کا پیغام آیا۔ اسے حاضر خدمت ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ بابو جب ملاقات کے لیے گیا اس وقت میں یامین اور دوسرے بہن بھائی صحن میں بیٹھے کسر بیج گندم کو صاف کر رہے تھے جس کا بابو نے کھیت میں بیج ڈالنا تھا۔

کل ڈیڑھ بیگھہ زمین جس پر سال کے سات مہینوں میں ہم زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کی کوشش میں کولہو کے بیل بنے رہتے۔ لگان مالیہ راجا کے نذرانے اور دس افراد پر مشتمل خاندان کی کفالت۔ بابو حالات سے مردانہ وار لڑے جاتا تھا۔ پر یامین دل گرفتہ تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ حالات کے اس بدترین پہلو کو کیسے اور کیونکر پلٹا دے۔

تبھی بابو تھکے تھکے قدموں سے ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ یامین نے اُس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور کہا۔

''بابو راجا نے کہیں اپنے محل کی پہرہ داری کے لیے تیری ڈیوٹی تو نہیں لگادی۔''

بابو کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی تھکی تھکی سی تھی۔ ''راجا پنیال نہیں چاہتا کہ تم پڑھنے کے لیے گلگت جاؤ۔''

یامین نے ایک پل کے لیے حیرت سے بابو کو دیکھا۔ وہ کھڑا ہوا پر لڑکھڑایا یوں جیسے بعرہ کھیلتے ہوئے لڑکوں کا کبھی کبھی توازن برقرار نہیں رہتا۔ پھر جیسے وہ برفانی چیتے کی مانند اچھلا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیاں نکل رہی تھیں۔ ہمارے چھوٹے سے گھر کی فضا پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہم سب بہن بھائی دم سادھے بیٹھے تھے۔ یامین کی آواز کی گھن گرج شیر قلعہ کے پہاڑی نالے جیسی تندو تیز تھی۔ اس کا چہرہ چنار کے پھولوں جیسا سرخ تھا۔

ماں نے سہم کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھنا چاہا کہ اردگرد کوئی سن نہ لے۔ راجا کی عداوت مول لینے کا مطلب گویا خاندان کو پن چکی میں پسوانے والی بات تھی۔ بابو (باپ) بیرونی دروازے کو تالا لگانے دوڑا۔

لیکن بابو کا لگایا ہوا وہ مضبوط تالا شام کو ٹوٹ کر دور جا گرا تھا اور وہ کندھے پر ایک چھوٹے سے تھیلے کے ساتھ بگولے کی مانند دروازے سے نکل گیا تھا۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو امنڈے تھے جب اس نے میرے ہاتھ کے کڑھے ہوئے تھیلے میں اپنا ایک جوڑا کپڑوں کا اور چند کتابیں ڈالی تھیں۔ اس نے رخ پھیر کر مجھے دیکھا۔ میری آنکھوں میں چمکتے آنسو بھی اسے نظر آئے تھے تب اس نے میرے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا تھا۔ ''یامین کی بہن کو بہت دلیر ہونا چاہیے۔ آنسو بزدلی کی علامت ہیں۔''

بس تو میرے امنڈے ہوئے آنسو میری گھنی سیاہ پلکوں میں یوں اٹک گئے تھے جیسے برفانی چوٹیوں سے نیچے کی طرف پھسلتے برف کے ٹکڑے اچانک سرد ہواؤں کے چلنے سے وہیں کہیں ٹھہر جائیں۔

میں نے سر کو پشت کی طرف پھینکا اور آنسوؤں کو واپس آنکھوں میں لا کر انہیں جذب کرنا چاہا۔ پتا نہیں کیوں کسی نے میرے اندر سرگوشی کی تھی کہ یہ آنسو اگر بہہ گئے تو یامین اپنی جدوجہد میں ہار جائے گا۔

وہ چھ ماہ گلگت میں رہا۔ دن کو اسکول جاتا اور رات کو گھروں سے روٹیاں مانگتا۔ چھ ماہ بعد وہ کراچی چلا گیا۔

راجا پنیال نے بابو پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ کسی طرح بیٹے کو واپس بلائے۔ یامین جیسے دلیر اور ذہین لڑکے سے اس کے اقتدار کو غالباً خطرہ تھا۔ راجا یہ کب برداشت کرسکتا تھا کہ میرے بابو جیسے غریب کسان کا بیٹا پڑھ لکھ کر کسی اونچی جگہ بیٹھ جائے۔ جرگے کے ممبروں نے گلگت تک تعاقب کیا لیکن وہ تھا کب جوان کے ہاتھ آتا۔

جب خوبانی کے پیڑوں پر شگوفے کھلتے۔ جب چیری کی سبز شاخوں پر عنابی پھل لشکارے مارتا۔ جب انگوروں کی بیلوں سے اترے ہوئے ''کچوچی'' انگوروں کے ٹوکرے اٹھا اٹھا کر شراب بنانے والی ہوزری میں ڈالتی۔ جب نوروز کے تہوار کی گہما گہمی شروع ہوتی۔ جب میں پنوشا (گونگلو ساگ) پکاتی۔ جب میرا دل کچھ پڑھنے کو چاہتا اور مجھے کچھ نہ ملتا تب میں اُسے یاد کرتی اور میری آنکھیں اس کے لیے آنسو بہاتیں جو میرا بھائی تھا۔ میرا دوست اور میرا ہم راز تھا۔ بس تو ایسے ہی چار سال گزر گئے۔ چار سال جو انگوروں کے ترش دانوں جیسے تھے۔ جنہوں نے ہماری آنکھوں کو سرکے کا تحفہ دیا تھا۔

اور جس دن ہم لوگ شیشوگوٹ کا تہوار منا رہے تھے۔ شام کی ٹھنڈی، خوشگوار ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں اور بابو شرک (روغنی روٹیاں) لیے اپنے جو کے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً سبھی گھروں کے بزرگ اور ان کے بچے رنگ برنگے کپڑوں میں ہنستے کھیلتے آگے پیچھے کھیتوں کی طرف رواں دواں تھے۔ میرے بہن بھائیوں نے بھی اودھم مچا رکھا تھا۔

رواج کے مطابق بابو اپنے کھیت کے ایک کونے میں قبلہ رُو ہو کر دعائیں پڑھنے لگا۔ میری نظریں دور سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے یامین یاد آیا تھا اور میں نے کہا تھا۔ ''پروردگار کیا ایسا نہیں ہوسکتا آج میں یامین کی صورت دیکھوں یا اس کی طرف سے کوئی سندیسہ پاؤں۔''

یقیناً وہ دعاؤں کی قبولیت کا وقت تھا۔

دعائیں پڑھنے کے بعد بابو نے جو کی پکی فصل کے چند خوشے توڑے اور روغنی روٹیاں وہاں رکھیں۔ جب وہ کھیت سے باہر آیا تو میں نے دیکھا تھا وہ کچھ افسردہ سا تھا۔ اس نے میرے قریب آکر کہا۔ ''میں نے اللہ سے کہا ہے وہ مجھے یامین کی خیر خبر دے۔''

تب وہاں خوب ہلا گلا ہوا۔ ایک دوسرے کے کھانوں کو چکھا گیا۔ ہنسی مذاق ہوا۔ گھر آکر دودھ کی پیالیوں میں ان خوشوں سے چار چار پانچ پانچ دانے نکال کر ڈالے گئے جنہیں



ہم کھیتوں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پیالیاں بابو اور ماں کے ہاتھوں میں تھما کر میں نے ابھی رخ سیدھا کیا ہی تھا کہ ایک دراز قامت نازک اندام درمیانی عمر کا مرد جس کی نیلی آنکھوں میں بڑا ٹھہراؤ اور بڑی گہرائی تھی ہمارے گھر کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا۔

وہ گھمانی سے آیا تھا جو پنیال کی آخری وادی ہے۔ درمیانے سائز کا ایک بند پیکٹ اور ڈیڑھ سو روپیا آنے والے نے بابو کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ اس کے بیٹے یامین نے میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ بھیجے ہیں۔ یامین اس کے کراچی میں مقیم بھتیجے تاجور خان کا دوست ہے۔

بابو اور ماں کا اگر بس چلتا تو یقیناً وہ اپنی کھال اتار کر اس کے قدموں تلے بچھا دیتے۔ ایک تو وہ ان کے لیے وہ پھوار بن کر آیا تھا جس نے ان کے دکھوں کی آگ میں جلتے جسم و روح کو ٹھنڈک اور سکون بخشا تھا۔ دوسرے آنے والا ''رونو'' قبیلے کا ایک معزز فرد تھا۔ رونو قبائل کے لوگوں کا باپ کی طرف سے تعلق شاہی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ معاشرے میں بہت محترم خیال کیے جاتے ہیں۔ اس نے چھوٹے کوٹ پر دیسی پٹو سے بنی ہوئی فرغل اور بند پائینچوں کی شلوار پہن رکھی تھی۔

ہمارا جی چاہتا تھا کہ اس پیکٹ کو پھاڑ کر دیکھ لیں کہ یامین نے کیا بھیجا ہے؟ لیکن ایک معزز مہمان کا رعب مانع تھا۔ اس کی خاطرداری مکھن والی نمکین چائے اور اُس تازہ چھپٹی (کیک نما روٹی) سے کی گئی جو میں نے ابھی ایک دن پہلے بنائی تھی۔

اس کے گھر سے نکلنے کی دیر تھی کہ ہم پیکٹ پر یوں جھپٹے جیسے جنگلی بلی سیاہ خرگوش کو شکار کرنے کے لیے اس پر جھپٹتی ہے۔ پیکٹ گویا تحائف کا پٹارہ تھا۔ گھر کے ہر فرد کے لیے کوئی نہ کوئی چیز تھی۔ میرے لیے دس کہانیوں کی کتابوں کا سیٹ اُس زمرد کی طرح تھا جو بھیڑ بکریاں چراتے کسی چرواہے کو اچانک پہاڑ کی کسی کھوہ سے مل جائے اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر دیکھے کہ یہ خواب تو نہیں۔

پیکٹ میں سے خط بھی نکلا تھا۔ یامین کے ہاتھوں کا لکھا ہوا جسے ماں اور بابو نے کوئی دس بار چوما ہوگا۔ پندرہ بار کلیجے سے لگایا ہوگا۔ میں نے خط پڑھ کر انہیں سنایا اور پہلی بار ماں کو احساس ہوا تھا کہ یامین نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھا کر کتنا بڑا کام کیا تھا۔ ورنہ اس ٹھٹھرتی شام میں وہ غلام رسول کے گھر جاتی جو وادی کے آخری سرے پر تھا۔

یامین کا خط آدھے سے زیادہ تاجور خان کے ذکر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کا ممنون تھا جس نے اس اجنبی شہر میں اس سے محبت بھرا سلوک کیا تھا۔ بابو اور ماں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ یامین ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کے خط میں اچھے دنوں کی آمد کا پیغام تھا۔

خط میں نے توُن (لکڑی کا بڑا صندوق جس میں گندم رکھی جاتی ہے) میں رکھ دیا۔ سونے تک کے وقفے میں چھوٹے بہن بھائیوں نے کوئی دس بار مجھ سے ڈانٹ کھائی ہوگی کیونکہ وہ ہیر پھیر کر کتابیں دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

پھر میں نے کتابیں اپنے پہلو میں رکھیں۔ رضائی سے انہیں بھی یوں اچھی طرح ڈھانپا جیسے کوئی زچہ اپنے نومولود بچے کو سردی سے بچانے کے لیے مری جاتی ہے۔

یہ وہ پہلی رات تھی جس میں تاجور خان میرے خوابوں کے افق پر روشن ستارے کی مانند طلوع ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ یامین کے کبھی کبھار کسی کے ہاتھ بھیجے گئے خط میں تاجور خان کی محبت اور خلوص کی خوشبو مشک نافہ کی طرح مجھے مدہوش کر دیتی۔ ماہ و سال کے یہی وہ دن تھے۔ جب میں نے رحمت جان ملنگ کی شاعری کو سمجھا، اس کے درد کو جانا۔ اپنا اور پورس کا مقابلہ کیا۔

شنا شاعری کو سمجھنے میں میرے بابو نے بھی بہت ساتھ دیا۔ بابو نے اپنی جوانی کا کچھ وقت اس کے مطالعے میں گزارا تھا۔ ہمارے علاقے پنیال پر وادی اشکومن اور یاسین کا بہت اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں بولنے والی زبانیں فارسی، کھوار، بلتم اور داخی ہماری شنا زبان پر خاصی اثر انداز ہوئی ہیں۔

آتی سردیوں کے پُربہار دنوں میں جب بابو انگوروں کو اپنے پاؤں سے کچلنے کے لیے ہوزری میں چھلانگ لگاتا۔ انگوروں کے حسن و جوانی کو تہ تیغ کرتے ہوئے وہ ہماری قومی شخصیات کے کارناموں کو منظوم صورت میں لہک لہک کر گاتا۔ اس کی پاٹ دار آواز سارے گھر میں بکھری ہوئی ہوتی۔ چترالی شاعری نے شنا شاعری پر کیا کیا اثرات مرتب کیے یہ میں نے بابو سے ہی سمجھا تھا۔

اور وقت کے بہتے پانیوں میں دو سال اور بہہ گئے تھے۔ دو سالوں کے بے شمار دن جن کے ہر دن میں میں نے تاجدار خان اور یامین کے بارے میں سوچا تھا۔ ایسا بھی ہوتا جس دن میں نہاتی صاف کپڑے پہنتی۔ بالوں میں تیل لگاتی۔ اپنے سنہری لمبے بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھتی

کاڑھی ہوئی ٹوپی اوڑھتی۔ برآمدے کے چوبی ستون سے ٹیک لگا کر بیرونی دروازے کو دیکھتی۔ تب میرا جی چاہتا کہ یامین اور تاجور خان بھی بادام کے پیڑ کے شگوفوں سے پھوٹتی خوشبو کی طرح کہیں سے آ جائیں اور ہمیں مہکا دیں۔

وہ بڑی پیاری شام تھی۔ سورج کی کرنیں کوہ ہندوکش کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر غمسوری (اخروٹ کے درخت سے پھوٹنے والے پیلے پتے جن کا رنگ سنہری ہوتا ہے) جیسی خوبصورت لگتی تھیں۔ بابو اور میں کھیتوں سے لوٹے تھے۔ صحن میں بندھی خوش گاٹے نے مجھے دیکھتے ہی آوازیں نکالیں۔ میں نے اس کی تھوتھنی پر پیار کرتے ہوئے بابو سے کہا۔ ”بابو نسالو کے تہوار پر خوش گائے کو ذبح کرنے پر میرا دل نہیں۔ اس بار چھوٹا جانور کرلیں گے۔“

نسالو کا تہوار پورے شمالی علاقہ جات میں دسمبر کے پہلے ہفتے سے آخری ہفتے تک بہترین جانور ذبح کرنے سے منایا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سردیوں کے لیے گوشت اسٹور کرنے کا تہوار ہے۔

ماں ہنستے ہوئے بولی۔ ”اسے تو جو پال رہی ہے۔“

تبھی اچانک گھوڑے کی تیز ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک صحت مند گھوڑا عین ہمارے دروازے کے سامنے رکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان کے اس ٹکڑے سے جو میرے سر کے اوپر تھا۔ یکایک بجلی کڑکی ہو اور اس نے کشپور (راجاؤں کی اولاد) نسل کے دو شہزادوں کو ہمارے آنگن میں کھڑا کردیا ہو۔ میری آنکھوں کی چندھیاہٹ جب کم ہوئی میں نے جانا آگے والا میرا لاڈلا بھائی یامین تھا۔ اونچا لمبا خوبصورت۔ اس کے پیچھے یقیناً تاجور خان تھا۔ میرے خوابوں سے کہیں زیادہ بانکا سجیلا۔ وہ شاہ بلوط کے پیڑ کے مانند تنا کھڑا تھا۔ وہ سورج جسے میں ابھی اپنے کھیتوں میں دیکھتی آئی تھی اب جیسے میرے گھر کے دروازے سے طلوع ہو گیا تھا۔

مجھے نہیں پتا ایسا کیوں ہوا؟ لیکن یہ ہوا۔ میں دوڑ کر کمرے میں گئی اور کونے میں پڑی رضائیوں پر گر گئی۔ میرے سانس کی اتھل پتھل عجیب سی تھی۔ باہر ہجر کے دنوں کی خشک سالی کیسے اور کس انداز میں سیراب ہو رہی تھی؟ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ اس لیے کہ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور میرے کانوں کی شائیں شائیں کے شور و غوغا نے سب کچھ اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

تبھی یامین کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اٹھایا اور محبت بھری آواز میں کہا۔ ”کیا ہوا تمہیں؟ کیا تم میرے آنے سے خوش نہیں ہوئیں؟“

میں اس کے سینے سے چمٹی اور بلک بلک کر روئی۔ چار پانچ سال کے دکھوں اور اذیتوں کا لاوا پھوٹ پھوٹ کر میرے آنسوؤں کی صورت میں باہر نکلا۔ یامین میرے بالوں پر پیار اور میری آنکھوں سے زار زار بہتے آنسوؤں کو خشک کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”چلو چلو جلدی سے پھپھاؤں (بڑے پھلکے) بناؤ۔ میں تو انہیں کھانے کے لیے ترس گیا ہوں۔“

اس دن میں نے پنو دیتوشا (ایک طرح کا ساگ جس میں خوبانی کی گریوں کا گاڑھا دودھ اور آٹے کے باریک ٹکڑے ڈال کر پکائے جاتے ہیں) پکایا تھا۔

اس وقت جب وہ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اپنے چھپر نما برآمدے میں روشنی کم محسوس ہوئی تھی۔ میں نے کمرے سے ایک اور ردوخ (چیل کے درخت کی لکڑی جسے چراغ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے) لا کر روشن کردی تھی۔ چولہے پر سماوار میں قہوے کے لیے پانی پک رہا تھا۔ کیونکہ دونوں نے نمکین چائے کی جگہ قہوے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

رات تاریک تھی۔ فضا پر چھائے ہوئے سناٹے کو معمول کی طرح جھرنوں اور آبشاروں کا شور ہی توڑ رہا تھا۔ میں نے شاہ بلوط کے درخت سے پرے دیکھا۔ اس وقت مجھے تاریکی بولتی اور سناٹا جیسے گنگناتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

وادی پھسائی کا تاجور خان کم عمری ہی میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے تخت ہزارے کے رانجھے جیسا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ دونوں میں بھابیوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر گھر چھوڑنے کی مشترکہ وجہ کے سوا اور کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ اس وقت یہ خوبصورت شاہراہ ریشم نہیں بنی تھی۔ وہ مختلف غیر ملکی ٹورسٹوں کے ساتھ درہ بابوسر سے کاغان ناران کے ہوٹلوں پر چھوٹا گیری کرتا کہیں نیچے پہنچا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں تجربات نے اُسے سرد گرم سبھی ذائقے چکھا ڈالے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی جیسے شہر میں اُس نے یامین کے دکھوں کو اپنے دکھ اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنی مسرتیں جانا تھا۔

اور جب وہ گھونٹ گھونٹ قہوہ پیتے تھے۔ یامین نے پوچھا تھا۔ ”بابو فصل باڑی کا کیا حال ہے؟“

اور بابو نے ٹھنڈا سانس بھر کر اتنا کہا۔ ”بچہ کل جو اور گندم کی کٹائی شروع ہوگی۔ پون بیگھہ زمین پر گندم اور جو کی فصل کھڑی ہے۔ چوتھائی پر شفتل (جانوروں کا چارہ) سوچتا ہوں اب مکئی زیادہ بوؤں۔ مکئی اور چینا بھی کاشت کرنا پڑے



گا۔ تمہاری ماں اس بار چاول کا بھی کہہ رہی ہے۔ میں ہنستا ہوں۔ ایک بیگھہ پر کیا کیا ہو سکتا ہے؟ بس زندگی تو ایک بوجھ ہے۔ اٹھاتے اٹھاتے کمر دوہری ہو گئی ہے۔ لیکن اسے پٹخ کر نہیں پھینک سکتا۔

تبھی یامین نے کہا۔ ”بابو یہ شراب کشید کرنے والا کام اب بند کردیں۔“

اور بابو نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ہم جو دو وقت کا روکھا سوکھا کھاتے ہیں اس سے بھی محروم ہو جائیں؟“

یامین نے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی بابو کی گود میں ڈال دی یہ کہتے ہوئے۔ ”ہمارا مذہب اگر شراب پینے کو حرام کہتا ہے تو اسے بنانے اور بیچنے کے عمل کو کیسے پسند کر سکتا ہے؟“

بابو کی آنکھیں یقیناً پھٹنے کی حد تک پھیل گئی ہوں گی۔ اس کے دل کی دھڑکن یقیناً غیر معمولی تیز ہو گئی ہوگی۔ اس کے ہاتھ ضرور کانپتے ہوں گے۔ جب اس نے گڈی کے نوٹوں کو چھوا ہوگا۔ میں اس کے جسم و جاں اور دل و دماغ پر وارد ہونے والی سب کیفیات کو محسوس کر سکتی تھی۔ بے شک وہ میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔

اگلی شام جب میں اپنی کوٹ (مکان) سے مشرقی ہاتھ بہتی کوہل (چھوٹی کھال یا نالہ) سے پانی بھر رہی تھی۔ میں نے یامین اور تاجور خان کو سامنے سے آتے دیکھا تھا۔ آج سارا دن دونوں گھر کے سب افراد کے ساتھ کھیتوں کی کٹائی کرتے رہے تھے۔ صرف میں کھانا پکانے کے لیے گھر میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میرا دل وہاں جانے کو تڑپا تھا۔ پر یامین اپنے جگری یار کو اچھا کھانا کھلانے کا خواہش مند تھا۔

یامین ہماری ایک معمر رشتہ دار سے جو اپنے کھیتوں سے واپس آ رہی تھی۔ بات چیت کرنے رک گیا۔ تاجور خان آگے بڑھ آیا۔ وہ مجھ سے ڈھائی تین گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ میرے ہاتھ پانی سے کھیلنے لگے تھے۔ تب اس نے اچانک کہا۔ ”تم کل مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں گئی تھیں؟ کیا تمہیں میرا آنا برا لگا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ اس وقت میرا چہرہ سرخ تھا۔ میرا دل اور میرا وجود درخت کے کسی پتے کی طرح کانپا تھا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تمہارے لیے اجنبی ہوں لیکن تم میرے لیے نہیں۔ بخدا میں نے یامین سے تمہارے بارے میں اتنا کچھ سنا ہے کہ میرا خیال ہے میں تمہیں تم سے بھی زیادہ جانے لگا ہوں۔“

میں نے پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور یہ کہہ کر رخ پھیر لیا۔ ”بخدا میں بھی تمہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔“

ذرا آگے جا کر میں نے پلٹ کر جب پیچھے دیکھا تو وہ وہاں سنگی بت کی طرح کھڑا تھا۔ غالباً اسے سنگل جیسے گاؤں کی ایک نوعمر لڑکی سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی کسی غیر ترقی یافتہ ماحول میں ایسے بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے ذہنی افق میں اتنی بلندی اور کشادگی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی دنیا میں منفرد نظر آتے ہیں۔

یقیناً میرا اور یامین کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں نے گھر آ کر چائے چولہے پر رکھی۔ زمینی چولہے میں چھپٹی (کیک نما روٹی) تیار ہو رہی تھی۔ میں نے سلور کے کٹورے کے ڈھکن پر پڑے کوئلوں کو نیچے گرایا اور چھپٹی کو بڑی تھالی میں نکالا۔

وہ دونوں آ کر برآمدے میں لکڑی کی پیڑیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے پیالوں میں چائے ڈالی۔ نمکین چائے جس کی سطح پر مکھن تیرتا تھا۔ تازہ گرم خوشبو دیتی چھپٹی۔ تاجور خان نے ہنس کر کہا۔ ”یار میں نے کوئی دس سال بعد ایسی ذائقہ دار چھپٹی کھائی ہے۔ میری ماں بہت بہترین بناتی تھیں۔“

چائے پیتے پیتے انہوں نے سنگل کے قریبی گاؤں ”دباس“ جانے اور وہاں کے مشہور ٹھنڈے پانی کے چشمے پر مرغابی کے شکار کا پروگرام بنا لیا۔

اگلی صبح جب ہم ابھی سوئے ہوئے تھے وہ چلے گئے اور دوپہر کو مرغابیوں سے لدے پھندے واپس آئے۔

میں یامین کی شکر گزار تھی کہ وہ اپنی مروجہ روایات سے جی داری کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ تاجدار خان وادی یاسین کے قلعہ موڈوری اور بوبر گاؤں میں قدیم یادگار ڈمورا دیکھنے کا خواہشمند تھا۔

اس وقت جب میں خوبانی کی گریوں کا تیل نکالنے کے لیے انہیں بھون رہی تھی میں نے یونہی کہا تھا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں پچی (پھپھی) کے پاس ٹھہر جاؤں گی۔ عرصہ ہو گیا ہے انہیں ملے ہوئے۔“

اور اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ ”بھئی اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے تیاری کرو۔“

لیکن یہ بات جب ماں کو معلوم ہوئی تو اس نے خشمگین نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔ ”کیا باؤلے ہو گئے ہو جوان بہن

کو غیر مرد کے ساتھ لے جاتے ہو۔'' اس وقت وہ کمرے میں اپنے بریف کیس کو کھولے بیٹھا تھا۔ تڑپ کر اس نے رخ پھیرا اور غصے سے بولا۔ ''ماں تاجور خان کے لیے غیر کا لفظ بھی استعمال نہ کرنا۔ سمجھو وہ میں ہی ہوں۔''

بیٹے کی اس بات پر ماں کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے پر بیٹے لوگ کیا کہیں گے۔''

اور یامین نے بس اتنا کہا

''مجھے لوگوں کی ذرا پروا نہیں۔''

رات کو دو تندرست اور پلے ہوئے گھوڑے ہمارے دروازے پر بندھ گئے تھے۔ یہ یامین کی فرمائش پر اس کے ایک دوست نے بھجوائے تھے۔ ان دنوں ذرائع آمد و رفت دشوار ترین تھے۔ پنیال سے گوپس تک اور پنیال سے گلگت تک اتنی چوڑی سڑک تھی کہ اس پر جیپ چل سکتی تھی۔ لیکن جیپ تھی کس کے پاس؟ ایک بار کسی سرکاری افسر کی گاڑی گاؤں میں آئی تو پورا گاؤں اُسے دیکھنے دوڑا تھا۔

بابو چپ سا تھا۔ میں جانتی تھی۔ میرا جانا اسے بھی ناپسند تھا پر وہ کماؤ بیٹے کے سامنے مجبور تھا۔ البتہ رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے یہ ضرور کہا تھا۔ ''بیٹے اتنی سادگی اچھی نہیں۔ سیانے لوگ کہتے ہیں۔ ونات مکرے ساں تی کھت (دنیا کو مکر کے ساتھ کھا)

لیکن یہ بات یامین کے سر سے ہوا کی طرح گزر گئی تھی۔

ہم تینوں منہ اندھیرے جب دادی ابھی سوتی تھی بوبر جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ میں یامین کے پیچھے گھوڑے پر سوار تھی۔

یہ حیرتوں کا سفر تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے لیے جس کی دنیا کتابوں کے گرد آباد تھی۔ اس میں مسرتوں کی آمیزش تھی۔

میں نے اپنا چہرہ اور جسم بہت بڑی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ گھوڑے سرپٹ بھاگتے تھے اور میں خوف زدہ تھی۔ تاجور خان اچھا گھڑ سوار جان پڑتا تھا۔ بابو سرادر کا غان کی وادیوں میں اس نے کافی گھڑ سواری کی تھی۔ البتہ یامین کو اپنے بچپن میں اس کا موقع بہت کم ملا تھا۔ پھر بھی ان چند دنوں میں اس نے اچھی خاصی پریکٹس کر لی تھی۔

بوبر وادی پنیال کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں ہمارا ایک رشتہ دار رہتا تھا۔ اس کے گھر پڑاؤ ڈالا۔ دونوں میاں بیوی بوڑھے تھے۔ تعجب سے انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ ایک جوان لڑکی کا اپنے بھائی اور بھائی کے دوست کے ساتھ پھرنا معاشرتی اقدار کے مطابق گویا سنگین جرم تھا۔ انہوں نے برا منایا اور برملا اس کا اظہار بھی کیا۔

یامین نے قدرے سنجیدہ ہو کر کچھ سوچا اور کہا۔ ''اب ڈمورا کے کھنڈرات تو اسے دکھالائیں۔ بیچاری اتنا پینڈا مار کر آئی ہے۔''

گاؤں کے شمال میں یہ قدیم یادگار ریت کے ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ زمین دوز کمروں کا ایک سلسلہ مسمار ہوا پڑا تھا۔ سوائے اوپر والی منزل کے ایک کمرے کے، کمرے کی دیواروں میں قطار در قطار الماریاں ہیں۔ فرش پر جا بجا بکھرے انسانی ہڈیوں کے پنجر رگ و پے میں دوڑتے خون کو منجمد کرتے تھے۔

یامین نچلے کمرے میں اترنے والے راستے کے عین درمیان رُک کر دفعتاً میری طرف مڑا تھا کیونکہ میں نے دہل کر اُس کا بازو پکڑ کر کہا تھا۔ ''نیچے کہاں جاتے ہو۔ نکلو یہاں سے باہر۔ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔''

''لو دیکھنے کے لیے بھی مری جاتی تھی۔ اب دلیر بنو۔''

لیکن میں اتنی بہادر نہیں بن سکتی تھی۔ سر کی کھوپڑیاں، بازوں کی ہڈیاں اور انسانی اجسام کے پنجر بندے کو اس کا انجام بتا رہے تھے اور میں بالی عمریا کے اس دور میں اپنے بارے میں کسی ایسے اختتام کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور یہی وجہ تھی کہ میں ہڈیوں کو پیروں تلے روندتی باہر آ گئی تھی۔ کھلی فضا میں جہاں سورج چمکتا تھا اور آسمان نیلا شفاف تھا۔ تاجور خان کی نتھری ہوئی نیلگوں آنکھوں جیسا۔ برف سے لدی پھندی پہاڑوں کی چوٹیاں سورج کی کرنوں سے کیسے کیسے نقش بناتی تھیں۔ ٹیلے پر بیٹھ کر یہ سب دیکھنا بہت دلفریب تھا۔

مجھے نہیں پتا تاجور خان کب مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا؟ میری نگاہوں کو برفانی چوٹیوں میں پھنسا دیکھ کر اس نے یہ کہنا بہت ضروری سمجھا تھا۔ ''مت دیکھو اس طرح۔ برف بہت سفید اور چمکدار ہے۔ دھوپ میں شدت ہے۔ آنکھوں کی بینائی پر اثر پڑ سکتا ہے۔''

میں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ پر میری آنکھوں کے گرد نیلے پیلے دھبے رقصاں تھے۔

تبھی تاجور خان پھر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ ''بتاؤ تو ذرا تمہارے سامنے بھلا کون سے پہاڑ ہیں؟''

مسکراہٹ نے میرے چہرے کو بنی پر کسی شگفتہ پھول کی طرح کھلا دیا تھا۔ میرے چہرے پر تاجور خان کی نظریں تھیں۔ ان نظروں میں محبت بھی تھی اور وارفتگی بھی۔



میں نے دونوں کی زبان کو سمجھا تھا۔ اٹھلا کر ایک ادائے ناز سے اسے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ ''بتا دوں تو کیا انعام دو گے؟''

اس نے اپنی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کو شوخ انداز میں پھیلایا۔ ''فضا کو دیکھا اور کہا تاجور خان جیسے بیبے لڑکے کو تمہیں سونپ دوں گا۔''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اپنے گھٹنوں میں سر دے کر میں اتنا ہنسی کہ میرا سارا وجود کسی چلبلی نار کے کانوں میں پہنے خوبصورت جھمکے کی مانند لرزنے لگا تھا۔ جب میں نے سر اٹھایا۔ اس وقت یامین بھی وہاں آ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔ ''ارے اسے کیا ہوا ہے؟''

تاجور خان نے کہا۔ ''میں اسے ایک کہانی سنا رہا تھا۔''

تبھی وہاں ایک نوجوان لڑکا اپنی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چراتا اپنی لگن میں گیت گاتا آ گیا۔ اس کی پاٹ دار آواز نے اس ویرانے میں جہاں خوف و دہشت اور موت جیسی ظالم شے کا کربناک احساس پھیلا ہوا تھا کو ختم کر کے حسن و عشق کی ایک لطیف و سرور آگیں کیفیت کو جنم دیا۔

اس نے سرنئی بجائی اور ہم لوگوں نے دل کھول کر نہ صرف داد بلکہ پیسے بھی دیے۔

وہ ابدو نامی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ ڈمورا کے متعلق اس نے بے شمار حیرت انگیز اور انوکھی باتیں بتائیں۔ پر وہ میرے ذہن سے چپک گئیں۔

پرانے وقتوں میں لوگ جب شادی کرتے تھے تو دولہا دلہن کے کپڑے اور زیورات یہاں کسی محفوظ مقام پر رکھ جاتے تھے۔ ان کی موت کے بعد ان کے لواحقین یہ کپڑے اور زیورات انہیں دوبارہ پہنا کر اسی زمین دوز عمارت کے کسی حصے میں چھوڑ جاتے تھے۔

میں نے اس حماقت اور جہالت سے لبریز روایت پر ہنسنا چاہا پر میں ہنس نہ سکی۔ ہنسی میرے گلے میں مچھلی کے کسی کانٹے کی طرح پھنس گئی تھی۔ وہ بدنصیب دلہنیں اور دولہے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے جن کی ہڈیاں یہیں کہیں پڑی ہوں گی۔ کیا انہوں نے پہننے اوڑھنے بننے سنورنے کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ ایک دن کی بیاہی دلہنیں جن کے سینوں میں جانے کیسے کیسے ارمان مچلے ہوں گے۔ جب روایات نے بندھے ہاتھوں نے ان نوخیز تنوں سے زیورات اُتارے ہوں گے۔ آنسو آنکھوں سے ٹپکے ہوں گے۔ اور کیا پتا کسی منچلی نے کسی شوقین مزاج نے صرف دوبارہ یہ کپڑے اور زیور پہننے کے شوق میں ہی موت کی تمنا کی ہو اور خودکشی جیسی ظالم شے کو سینے سے لگایا ہو۔

بوبر گاؤں میں آباد ابدو قبیلے کی ایک اور خوفناک روایت اب چرواہے کے ہونٹوں پر تھی۔ اس برادری کا کوئی شخص جب مرنے لگتا ہے تو ایک شب پہلے اس کھنڈر سے ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ رشتہ دار اس کے مرنے کا انتظار کیے بغیر قبر کھودنا شروع کر دیتے ہیں۔

یامین نے بحث کی۔ ''بابا اگر وہ بچ جائے تو۔''

''بابو ایسا کبھی نہیں ہوتا''۔ چرواہے نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ڈھول کی آواز موت کی پیش گوئی ہے۔

''اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو۔''

میں نے فوراً یامین کا ہاتھ پکڑ کر خفگی سے کہا۔ ''احمقوں والی باتیں مت کرو۔ عقیدہ ہے ان کا۔''

ڈمورا اپنے اندر کیسے کیسے خوفناک اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہاں غیر ملکیوں کی آمد و رفت کا بڑا غلغلہ رہتا ہے۔

ڈمورا کی اس یادگار کو دیکھنے کے بعد ہم جب اپنے اس عزیز کے گھر آئے تو دوپہر کے سائے ڈھل گئے تھے۔ تاجدار خان نے واپسی کے لیے کہا تھا۔ یامین کا خیال تھا آگے ''یاسین'' کی طرف نکلتے ہیں۔ لیکن تاجور خان نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو یار پھر کبھی سہی۔''

ہم لوگ رات ڈھلے واپس سنگل اپنے گاؤں آ گئے۔

مجھے شدید غصہ تھا۔ وادی یاسین جانے کی تمنا اس آکاس بیل کی طرح تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں پھیلتی ہی جا رہی تھی۔

## اینڈریو جانسن

(1808ء۔1875ء)

امریکا کا سترہواں صدر، شمالی کیرولینا میں پیدا ہوا۔ غریب خاندان کا فرد تھا۔ 1843ء میں کانگریس کا ممبر منتخب ہوا۔ 1864ء میں نائب صدر اور لنکن کی وفات کے بعد صدر چنا گیا۔ علیحدگی پسند ریاستوں کے بارے میں نرم پالیسی کا حامی تھا۔ اس بناء پر 1868ء میں ریڈیکل پارٹی نے سینیٹ میں اس کے خلاف مذمت کی قرارداد پیش کی مگر وہ ایک ووٹ سے نامنظور ہو گئی۔

میرے حالات نے یاوری کی تھی مگر تاجور خان پہاڑ کی چوٹی سے ڈھلکا ہوا گلیشیر کا وہ تودہ بن گیا تھا جو اچھے بھلے رواں دواں دریا میں گر کر اس کے بہاؤ کے سامنے بند لگا دیتا ہے۔

مجھے سمجھ نہیں آئی تھی اس نے ایسا کیوں کیا؟

میں کھانا کھائے بغیر سوگئی تھی۔ میری پلکوں کی چھاؤں میں آرام کرتی وہ سب کہانیاں جو میں ''وقتاً فوقتاً'' پڑھتی اور سنتی آئی تھی ڈھیرے ڈھیرے میری آنکھوں میں اترتی آ گئیں۔

پتا نہیں یہ رات کا کون سا پہر تھا جب میں وادی یاسین کے مشہور گاؤں تھوو اس کے قلعہ ڈورکھن کی بھول بھلیوں میں تاجور خان کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی؟ وہ پتا نہیں کہاں تھا؟ میں اسے آوازیں دیے جارہی تھی۔

میری آنکھ کھل گئی۔ رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ ڈر کر میں نے چہرہ بازوؤں میں چھپالیا۔

نیند کا ہلکورا آیا تو میں پھر اس کے ساتھ تھی۔ وہ تھوکی میرے قدموں کے نیچے تھا۔ میرا دل چاہا میں داخان کی پٹی میں داخل ہو جاؤں۔ مایون پرندے کے اس گیت کو سنوں جو وہ چترال کی وادیوں میں بہار کے دنوں میں سناتا ہے۔

میری ساری رات اضطراب میں کٹی تھی۔ جان لیوا اور گھائل کردینے والا اضطراب۔ صبح روشن اور چمکدار تھی پر میرے لیے عجیب سی اداسی میں ڈوبی ہوئی۔ میں ناراض تھی۔ میرے گال یوں پھولے ہوئے تھے جیسے کسی نے ان میں مٹھی بھر مکئی کے دانے بھر دیے ہوں۔ دن میں دو بار سامنا ہوا۔ پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اگلے دن دوپہر کو میں باغیچے میں شتل (جانوروں کا چارہ) اور مکئی کے ڈنٹھل دھوپ میں سوکھنے کے لیے پھیلا رہی تھی تاکہ انہیں سکھا کر سردیوں کے لیے محفوظ کرلیں جب تاجور خان وہاں آیا۔

میں بے نیازی سے کام کرتی رہی اور وہ میرے قریب کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ملکہ تم مجھ سے ناراض ہو۔''

میرے جذبات اور احساسات کی شدت آنسوؤں کے موتی بن کر میری آنکھوں میں چمکنے لگی۔ تاجدار خان نے انہیں دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''تمہارے دل میں جو کچھ ہے مجھے بتاؤ۔''

چمکتے موتی میرے رخساروں سے پھسلتے میری چادر میں آ گرے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں اس آسمان زمین درختوں پرندوں اور جگہوں کو دیکھنے کی آرزومند تھی جو میری اس چھوٹی سی دنیا سے مختلف تو نہیں پر نئے ضرور تھے۔ مگر تم نے مجھے یہ سب دیکھنے نہیں دیا۔''

تاجور خان گم صم کھڑا تھا۔ کتنی دیر وہ ایسے ہی کھڑا رہا۔ پھر جھکا۔ میرے ٹھنڈے ہاتھوں پر اس نے اپنے سنہری بالوں والے سخت ہاتھ رکھے اور یوں بولا جیسے چیری کے درختوں سے پھول گر رہے ہوں۔

''مدتوں بعد اپنی سرزمین پر لوٹا ہوں۔ اس لیے چپے چپے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ پر میں اور یامین کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں مدتوں رہ کر اپنی معاشرتی اقدار کو بھول سے گئے تھے۔ تمہیں ساتھ لے جانا تو مناسب ہی نہ تھا۔''

وہ رکا، پھر مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ پر میں وعدہ کرتا ہوں کہ نئے آسمان نئی زمینیں نئے رنگ وروپ تمہاری معیت میں ہی دیکھوں گا۔ بہت جلد۔

پھر وہ اٹھا، مڑا اور باغیچے کی چار دیواری سے باہر نکل گیا۔ بیرونی دروازے تک پہنچنے کے لیے اس نے انیس قدم اٹھائے تھے۔ اعتماد عزم اور حوصلے سے بھرے پرے یہ قدم سکندر اعظم کے ان قدموں جیسے ہی تھے جب وہ اپنے گھر سے دنیا کی تسخیر کے لیے نکلا تھا۔

کوئی ہفتے بعد ایک جوڑا ہمارے گھر آیا۔ تاجور خان کا بھائی اور بھاوج، اس کی یہ بھاوج خوبصورت تو تھی پر آنکھوں سے مار کھا گئی تھی۔ باز جیسی مدقوق آنکھیں جو دیکھنے والوں کو خوامخواہ ہی عجیب سی کوفت کا احساس دلاتی تھیں۔

یامین کی موجودگی نے ہر مسئلے کو عمدگی سے حل کر دیا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ جونہی فصل کی کٹائی وغیرہ سے فرصت ملے، شادی کی رسم ادا ہو جائے۔

ماں سنگل کی کپڑے کی ایک دکان سے میرے لیے سفید سوتی کپڑا خرید کر لائی تاکہ اس پر مقامی رواج کے مطابق کڑھائی کر کے اسے عروسی جوڑا بنایا جائے۔ یامین نے اسے دیکھ کر کہا ''ہٹاؤ اس کفن کو۔ میں تو اسے سرخ جوڑے میں رخصت کروں گا۔''

اخروٹ اور انگور پک گئے اور جونہی ان کی اترائی کے دن شروع ہوئے۔ یامین نے اس کام میں خاص دلچسپی لی۔ اخروٹوں کو بوریوں میں اور انگوروں کو ٹوکروں میں بھر کر وہ انہیں گلگت شہر لے گیا۔ جہاں ان کی فروخت سے اس نے معقول پیسے کمائے۔

میں نے اس سرخ ریشمی کپڑے کو جو یامین میرے لیے



لایا تھا دن کی تنہائیوں میں ہزار بار دیکھا تھا۔ سرسر کرتے ریشم جیسے اس کے وجود پر ہاتھ پھیرتے رہے تھے۔ اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر اپنے آپ کو تاجور خان کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے خود پر واری صدقے ہوئی تھی۔

جس دن اس کی کٹائی ہوئی، آنگن میں میری سکھیاں اور رشتہ دار جمع تھیں۔ فراک نما قمیص، شلوار، چادر گلے اور بازوؤں کے کفوں پر خوش رنگ دھاگوں سے کڑھائی کی۔ چادر کو فیتہ لگایا۔ ٹوپی کو نفیس کڑھت سے مزین کیا۔

اکتوبر کا درمیانی ہفتہ شادی کے لیے طے پایا۔ رشتہ داروں کو سدا بھیجا گیا۔ یہ میرے بابو کے گھر کی پہلی شادی تھی۔ عزیزوں نے پندہ (شادی کے لیے نقدی جنس کپڑا) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری پھپی کی من گندم اور کپڑوں کا جوڑا لائی تھی۔ دونوں چچا دو بھیڑوں اور تین بکریوں کے ساتھ آئے تھے۔ خالہ پندرہ سیر چاول بیس روپے اور پھور (خشک خوبانی) کا ٹوکرہ لائی۔ بیاہ کی تقریب کا آغاز ہو گیا تھا۔

اندر باہر مہمانوں کی گہما گہمی تھی۔ تاجور خان برات کے ساتھ ہمارے گاؤں پہنچ چکا تھا۔ برات کش (برات کے ٹھہرانے کے لیے ایک گھر مخصوص کیا جاتا ہے) میں مقیم تھی۔

آنے والے دنوں کے حسین تصورات نے میرے وجود کو دھنک رنگوں سے سجا دیا تھا۔ میں یوں چمکتی تھی جس طرح مرغ زریں کے جسم پر حسین رنگی کلغی لشکارے مارتی ہے۔ میرے بھائیوں نے گھر کی دیواروں میں جگہ جگہ روخ (لکڑی کے چراغ) لگا دیے تھے۔ ان کی تیز بھڑکتی روشنیوں میں عورتوں کی پیشانیوں پر لٹکتے سلسلے (چاندی کا زیور جو ٹوپی کے ساتھ سلا ہوا ہوتا ہے) کس قدر چمک رہے تھے۔

رات کا کھانا خمیری روٹی اور گوشت کے شوربے پر مشتمل تھا۔ کھانے کی سینیاں ابھی اٹھائی بھی نہ گئی تھیں کہ باہر ڈوم (ناچنے بجانے والے) لوگوں نے ڈھول کھڑکانے اور سرنی بجانی شروع کردی تھی۔ اس آواز نے گویا کھلبلی مچادی۔ رسم تاؤ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آنگن کے ایک کونے میں پڑتل کی لکڑیاں جلا دی گئیں۔ بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں رقص و موسیقی کا کھیل شروع ہو گیا۔

بابو ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ دائرے میں آیا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن محبوب النساء اور اس کے شوہر کو رقص کی دعوت دی۔ میری پھپی کا عنابی سوٹ، اس کے گلے میں چمکتا مشی (گلے کا زیور) کانوں میں ہلکورے کھاتے چاندی کے کسوار بالے سینے پر سجے طوطے (بروچ نما زیور) ان طوطوں

سے لٹکتے لونگوں کے ہاران ہاروں میں الجھتی پھنستی اس کی دو چوٹیاں آنکھوں میں گلابی کاجل کے ڈورے سبھوں نے مل جل کر اسے کوہ قاف کی پری بنا ڈالا تھا۔

اور میں کھڑکی سے اُسے دیکھتے ہوئے سوچتی تھی کہ خالی خولی حسن سردیوں کی چاندنی راتوں جیسا سوگوار ہوتا ہے۔ بناؤ سنگھار اور آرائشی چیزیں اسے گرما کی چاندنی رات بنا دیتے ہیں جسے دیکھنے اور سراہنے کے لیے ہر کوئی باہر نکلتا ہے۔

میرے پپا چمکدار چوغے پر سرخ کمر بند (ٹپکا) باندھے سر پر تلوار رکھے رقص کرتے ہوئے جونہی دائرے میں داخل ہوئے، سیٹیوں اور تالیوں کا وہ شور مچا کہ کان پھٹنے والی بات ہوگئی تھی۔ لڑکے پھڑکتے گیت گا رہے تھے۔ تلوار میری پھپی کے ہاتھوں پر آ گیا تھا۔ وہ اسے رقص کے انداز میں صحن کے چولہے تک لے گئی۔ اسے اس پر رکھا۔ تین بار اُس پر سوکھا آٹا ڈالا پھر واپس ناچتے ہوئے دائرے میں مل گئی۔ اب باقی لوگ باری باری دائرے میں آ کر اپنے کمال دکھا رہے تھے۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ پر نہ ساز بجانے والوں نے ہمت ہاری تھی اور نہ ہی لوگوں کی ٹانگوں نے تھکن کا اظہار کیا تھا۔ قہوے اور نمکین مکھن والی چائے کا دور چل رہا تھا۔ جب کہیں صبح کا ستارہ آسمان کے سینے پر چمکا تب محفل اپنے اختتام پر پہنچی۔

دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی اُس وقت تلاؤ کی کی رسم ادا ہوئی۔ میں ساری رات جاگتی رہی تھی۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تو سرنی بجانے والوں نے ایسی ایسی دلکش دھنیں بجائیں کہ فوراً آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ گھر کا ہر فرد اپنی جگہ ساکت بیٹھا یا کھڑا یہ دھن سن رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ دھنیں بجیں۔ ان کا مقصد رات بھر کے جاگے ہوئے لوگوں کو تازہ کرنا تھا۔

دوپہر کو تاجور خان اپنے بھائیوں اور چچاؤں کے ساتھ ہمارے گھر داخل ہوا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا میری چھوٹی بہن بتاتی تھی کہ وہ سفید شلوار، ریشمی چمکدار سفید قبا، کامدار کھسے اور کلاہ میں اتنا خوبرو لگ رہا تھا کہ ماں نے آگے بڑھ کر اس پر پھونکیں ماریں کہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ رشتہ دار عورتوں نے انہیں اونی دری پر بٹھایا اور اشپری کی رسم شروع ہو گئی۔ لکڑی کی تھالیوں میں تلے تلے پھلکے جن پر دیسی گھی پگھلا کر ڈالا گیا تھا، ان کے آگے رکھے گئے۔ رواج کے مطابق انہوں نے تین تین نوالے کھائے۔ تاجور خان پر میدانی علاقوں میں رہنے کا اثر تھا۔ اس نے اُس پلیٹ میں جو میری بہن لائی تھی پانچ کا نوٹ رکھا تھا۔

''یہ تمہارے لیے ہے''۔ وہ محبت سے اس کی طرف

دیکھ کر مسکرایا تھا۔

میری بہن تھالی اور نوٹ اٹھا کر بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا اور بار بار کہے جاتی تھی۔ ''گاکی (بہن کو بلاتے وقت) تاجور گا کو یامین سے بھی اچھا ہے۔''

دراصل ان دنوں تھالیوں میں پیسے رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ تاجور کی اس حرکت کو سبھوں نے پسندیدگی سے دیکھا تھا اور اسے دریا دلی کا نام دیا تھا۔

پورے گاؤں کا ایک ایک فرد کھانے پر مدعو تھا۔ سینیوں میں گوشت کا شوربہ، اس میں ڈالی گئی خمیری روٹیوں کے ٹکڑے اور بوٹیاں یہ بابو جیسے غریب آدمی کی بیٹی کی برات کا کھانا تھا۔ نکاح ہوا۔ تاجور خان قبول ہے قبول ہے قبول ہے ان الفاظ کی تکرار یوں ہوئی کہ میرا شریر پگھل کر کھولتا ہوا وہ پانی بن گیا جس میں تاجور خان کے نام کی پتی ڈالی تو قہوے کی دم اڑاتی مسحور کن خوشبو نے مجھے پاگل سا کر ڈالا۔

''ہاں ہاں''۔

میرے ہونٹوں نے اونچی آواز میں کہنا چاہا پر جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شاید جذبے شدت پکڑ جائیں تو انسان پر پاگل پن کے دورے سے پڑنے لگتے ہیں۔ حواس کی گم شدگی شروع ہو جاتی ہے۔

سرخ جوڑا کیا پہنا، میں چنار کا سرخ پھولوں سے لدا ہوا درخت بن گئی تھی۔ سلسلے کی زنجیروں نے میری پیشانی پر گویا تاج سجا دیا تھا۔ دائیں بائیں سینے پر صدف کے ساتھ لونگ کے لٹکتے ہاروں کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھستی ہوئی بہت سے پیغام دے رہی تھی۔ مشتی کا زیور میرے گلے میں پہناتے ہوئے میری گہری دوست زینب نے کہا تھا۔ ''تو خوش قسمت ہے ملکہ، جسے چاہا اسے پالیا۔''

''اپنا چہرہ دیکھو'' لطف النساء بولی۔ ''چنور کی سبز پری نظر آتی ہو جسے ترکستان کا گمنام شہزادہ بیاہنے آیا ہے۔''

باہر میری بہنوں اور بھائیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ تال (دلہن کے ساتھ جانے والے لوگ) میں شامل ہونے کے لیے ضد کر رہے تھے اور ماں انہیں ڈانٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''کم بختو دم لو۔ سارا گھر تال بن جائے گا تو رشتہ دار کیا کہیں گے۔''

میں رونا چاہتی تھی۔ لیکن میرے دل کی زمین خوش رنگ پھولوں سے یوں کھلی ہوئی تھی کہ اگر چند لمحوں کے لیے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے جدا ہونے کے دکھ بھرے احساس کا کوئی چھینٹا ان پر گرتا بھی تو پتا ہی نہ چلتا کہ وہ کہاں گیا ہے؟

ایک شور مچا تھا۔ رخصتی کا وقت آن پہنچا تھا۔ ماں روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر باہر کے چکر کاٹ رہی تھی۔ باہر سازندوں نے ''چلا ہو'' کی دردناک دھنیں چھیڑ دی تھیں۔ میری چچیوں، پھپھی اور دیگر رشتہ دار عورتوں نے یاما گی (بابل کے گیت) گانے شروع کر دیے تھے۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسو یوں بہے جیسے بکرے کی کٹی گردن سے خون بہتا ہے۔ میں پالکی میں بیٹھی جسے کہاروں نے اٹھایا۔ میری سکھیاں سہیلیاں بہت دور تک میرے ساتھ ساتھ چلیں۔

ہولو سے آگے دریا تھا جسے جالو (مقامی کشتی) کے ذریعے پار کیا گیا۔ اس کی وادی پھسائی پنیال کا آخری گاؤں ہے۔ آگے اشکومن کی وادی شروع ہو جاتی ہے۔ دو میل کے فاصلے پر چٹور کھنڈ کا بازار ہے۔

میں ایک ایسے گھر کے سامنے کھڑی تھی جس کے بڑے بڑے دروازوں کو نیلا رنگ کیا ہوا تھا۔ میرے ارد گرد براتی اور تال کے لوگ کھڑے تھے۔ تاجور خان کے چچا نے زور سے آواز لگائی تھی۔ ''میری بیٹی ملکہ کے لیے تم گھر والے کیا دان کرتے ہو؟''

اندر سے آواز آئی تھی۔ ''دادی کے شمال کی سمت اترائی میں دو کھیت اس کے ہیں۔'' تب میں اندر داخل ہوئی۔ مجھے اور تاجور کو اکٹھا بٹھایا گیا۔ لکڑی کی تھالیوں میں اشپری آئی جسے ہم دونوں نے تین تین بار کھایا۔

اس کے بعد تاجور کی بہن ل (گندم کے آٹے کا نمکین حلوا) پکا کر لائی۔ تاجور نے چکھا اور اسے پیسے دیے پھر میں نے چکھا اور اسے نیگ دیا۔

''اچھا گھر ہے۔'' میری بہن نے میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

صبح میری پھپھی نے میرا ٹرنک کھولا۔ تاجور کے بڑے بھائی اور بھاوج کو سوٹ دیے۔ دوسری بھاوجوں کو ٹوپیاں اور چادریں۔ چھوٹے بچوں کے لیے خوبانیوں کی گریوں کے ہار اور کانٹے جو میں نے خود بنائے تھے۔ لڑکیوں کے لیے ٹوپیاں بھی کاڑھ کر لائی تھی۔ بچیاں مجھ سے یوں چمٹی ہوئی تھیں جیسے شہد کی مکھیاں چھتے سے۔

شادی کے اس ہنگامے کے ہر ہر لمحے سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔ سرشاری محسوس کی تھی۔ مگر وہ لمحے اس کا عروج تھے جب شام ڈھلے مجھے بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔



آگ جلتی تھی۔ کمرے میں خوشگوار سی حدت محسوس ہوتی تھی۔ میرے عزیز و اقارب اور ارد گرد کے سب لوگ وہاں موجود تھے۔ جلتے چولہے پر توا دھرا تھا اور مجھے روٹی پکانا تھی۔

ہوہا کا شور، گیتوں کی آوازیں، قہقہوں کی برسات، سب میرے اوپر برف باری کی پھوار کی مانند گر رہے تھے۔ میرے بالکل قریب بیٹھا تاجور خان مجھے شوخ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے ایک بار اتفاقیہ ٹکراؤ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ یہ بوکھلاہٹ مزید بڑھ گئی جب اس نے میری چادر میری پشت پر سے کھینچ کر میرا گھونگٹ چھوٹا کرتے ہوئے کہا۔ ''جانم روٹی ایسی پکنی چاہیے کہ آج تک کسی کی دلہن نے نہ پکائی ہو۔'' اس کی اس بات نے مجمع کو گویا پھلجڑی بنا دیا تھا۔

سسرالی لڑکیوں نے میرے بازوؤں کو بہانے بہانے سے کھینچا تاکہ روٹی خراب ہو جائے۔ میں نے اڑتے حواس ٹھیک کیے اور کمال ہوشیاری سے اُن کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ دونوں بازوؤں کو دونوں گھٹنوں میں سمیٹتے ہوئے میں نے روٹی آہستہ آہستہ بنائی توے پر جب ڈالی تو اس کی وضع قطع بہت اچھی تھی۔ میرے رشتہ داروں نے تالیاں بجائیں۔

اب تاجور خان کی باری تھی۔ اسے روٹی کو پلٹا دینا تھا۔ پلٹتے وقت روٹی اگر ٹوٹ جاتی تو گویا اس بازی میں یہ اس کی ہار تھی، ایک عورت کے ہاتھوں ہار۔

اس نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ہنسا اور بولا۔ ''دلہن مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن زندگی میں، میں نے ہارنے سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ بے شک یہ ہار ملکہ جیسی خوب رو دلہن کے ہاتھوں مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔''

اور اس نے برق رفتاری سے مہارت کے ساتھ روٹی کو پلٹا دیا۔ پھر وہاں تاجور کے نام کا وہ شور مچا کہ یوں لگتا تھا کمرا اڑ جائے گا۔

اس شب کے پہلے پہر تاجور کی بھاوج مجھے جس کمرے میں لے کر گئی وہ اگرچہ تھا تو چھوٹا سا پر صاف ستھرا تھا۔ چھت اور فرش لکڑی کے تھے۔ فرش پر دری اور دری پر موٹا گدا بچھا تھا۔ لالٹین کا شیشہ اتنا صاف تھا کہ اس نے اندر کی روشنی کو دو چند کر دیا تھا۔ کھونٹیوں پر تاجور کے کپڑے لٹک رہے تھے۔

میں نے نمکین چائے کا پیالہ پیا۔ رضائی کو اپنے گھٹنوں پر اچھی طرح پھیلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تاجور جب کمرے میں آیا۔ میں نے باہر قہقہوں کی آوازیں سنی تھیں۔ یہ یقیناً اس کی بھاوجیں اور گاؤں کی شوخ و شریر عورتیں تھیں۔

تاجور میرے پاس بیٹھا۔ اس نے گھٹنوں میں دیا میرا سر اٹھایا اور بولا۔ ''تمہارا گھونگھٹ تو میں یاسین کی کسی وادی میں اٹھانا چاہتا تھا پر رسم و رواج کے ہاتھوں تھوڑا سا مجبور ہو گیا ہوں۔''

میں نے بند آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے محبت کا سمندر تھا۔ جذبوں کی تڑپ تھی۔ بے اختیار میرا سر اس کے شانے سے جا لگا تھا۔ روایتی لڑکیوں کی طرح شرمانے سکڑنے کو میرے اندر نے پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ساری رات اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر ان کہانیوں کو سنانے میں گزاری تھی جو اس نے ان سالوں میں میرے متعلق سنی اور فرض کی تھیں۔

میں تال والوں کے ساتھ واپس اپنے میکے نہیں آئی۔ تیسرے دن ایک صحت مند پولو کھیلنے والا گھوڑا باہر خوبانی کے پیڑ کے ساتھ بندھ گیا۔ تاجور نے مجھے اونی پاجامہ اونی ٹوپی اور گرم سوٹ پہننے کو دیا جو وہ نیچے سے لایا تھا اور اس کے بکس میں بند تھا۔ اس نے خود بھی گرم کپڑے پہنے۔ بندوق کو صاف کیا۔ کارتوس کی پیٹی کمر میں ڈالی۔ ضروریات کی سب چیزیں ایک بڑے تھیلے میں رکھیں۔

ہم یاسین جانے کے لیے تیار تھے۔

گھوڑے پر پہلے میں بیٹھی پھر وہ۔ اس کی بھاوجیں ٹکر ٹکر میری صورت دیکھتی تھیں۔ شاید میرے نصیبے پر رشک کرتی تھیں۔ بھائی بھی پاس کھڑے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے کوئی بات کہہ سکے۔ وادی سے باہر آنے کے بعد تاجور نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ''ملکہ تمہیں یہ سب کیسا لگ رہا ہے؟''

میں نے بازو اس کی کمر کے گرد پھیلا کر سر اس کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرے خوابوں کو تعبیر مل رہی ہے۔''

چمکتا سورج ہمارے سر پر تھا۔ دکھی ہواؤں میں تیزی تھی۔ گھوڑا سرپٹ بھاگے جاتا تھا۔ وادیاں گزر رہی تھیں اور میں اس کی پشت سے سر ٹکائے اپنے مقدر پر رشک کر رہی تھی۔ تاجور میری کہانیوں کے ہیرو جیسا تھا۔

یاسین کے لیے گاہکوچ اور گوپس سے جانے کی بجائے اس نے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا۔ ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ وہ سب سے پہلے یاسین میں گوہر امان کے مزار پر اپنی عقیدتوں کے پھول چڑھائے گا۔

شام کے وقت ہم نے ایک چھوٹی سی وادی میں پڑاؤ کیا۔ تاجور خان گھوڑے سے چھلانگ مار کر اترا مگر میری ٹانگیں شل تھیں۔ میں نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

اس نے میری مشکل کو سمجھا۔ اپنے بازو بڑھا دیئے۔ میں اس کے بازوؤں میں سما کر اتری مگر میرے قدموں نے زمین پکڑنے سے انکار کر دیا۔

''مجھے چھوڑنا مت'' میں چلائی۔

وہ ہنسا اور اس نے کہا۔ ''ملکہ بھلا تمہیں چھوڑنے کو تھوڑی پکڑا ہے میں نے۔''

دیر تک وہ مجھے اپنے آپ سے لگائے کھڑا رہا۔ جب پیروں کی سنسناہٹ کم ہوئی تب اس نے مجھے چھوڑ کر گھوڑے کی طرف رخ کیا۔

یہ چھوٹا سا گھر تھا جہاں ہم نے رات گزاری۔ مخلص اور مہمان نواز لوگ تھے۔ جنہوں نے ہمیں سفر کے لیے انڈے ابال کر دیئے اور تھرموس کو چائے سے بھر دیا۔ علی الصبح ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ اور جب سورج نصف النہار پر تھا۔ ہم یاسین میں گوہرامان کے مزار پر کھڑے تھے۔

گلگت اور یاسین کا راجا گوہرامان۔ جس کی دہشت سے کبھی زمین کانپتی تھی۔ مٹی کا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ مزار کے اردگرد دیودار کے درختوں کا ایک جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان یوں تو ہوتے ہی ویران ہیں۔ پر یہاں اداسی اور ویرانی دوچند تھی۔ درختوں کے پتے اپنے اپنے ٹھکانوں سے بے گھر ہو رہے تھے۔ آسمان شندھور جھیل کے پانیوں جیسا نیلا اور شفاف تھا۔ مزار کے اطراف میں لگے ہوئے پتھروں میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ بیشتر اپنی جگہ سے سرک کر دور نزدیک پڑے تھے۔ مزار کے چاروں کھونٹ گڑی لمبی باریک لکڑیوں پر زائرین کے رومال ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔

میں نے فاتحہ پڑھی۔ تھیلے میں سے سرخ رومال نکالا اور اسے لکڑی کے ساتھ ٹانگ دیا۔ تاجور خان کی فاتحہ خوانی بڑی لمبی تھی۔ بہت کچھ پڑھنے کے بعد جب وہ اس جگہ آیا جہاں دھوپ کے رخ پر میں بیٹھی فضا کو دیکھتی اور دھوپ میں اپنے جسم کو پگھلا رہی تھی جو مکھن کے پیڑے کی مانند ٹھنڈا اور ماش کے آٹے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔

تاجور نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''راجا گوہرامان کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ''یہ تم ہر وقت میرا امتحان لیتے رہتے ہو۔ میں راجا غازی گوہرامان کے بارے میں بہرحال تم سے زیادہ جانتی ہوں۔''

''خوب! اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسا پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اس کے قہقہے اس ویران فضا میں بہت دور تک گونجے۔ وہ میری بات سے محظوظ ہوا تھا۔

میں نے تھیلے سے چھٹی نکالی۔ انڈے چھیلے۔ انہیں چھوٹے سے کپڑے پر رکھا اور تھرموس کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ وہ صاحب سیف وقلم تھا۔'' چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے بات کو جاری رکھا۔

''دوسری بات ایسا دلیر، ایسا بہادر، ایسا جیالا اور شہ زور تھا کہ سکھوں اور ڈوگروں کو نتھ ڈال دی تھی۔ اس کی ہیبت کی دھاک اس درجہ تھی کہ ڈوگرہ عورتیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو اس کا نام لے کر چپ کرواتی تھیں۔ اسلام کا سچا داعی جس نے ایک سو سال قبل اس چھوٹے سے خطے کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ کر کے ایک چھوٹے سے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔''

تاجور خان گنگ بیٹھا میری صورت دیکھتا تھا۔

اونی تھیلے میں سے گھر سے لائی ہوئی چھٹی نکالتے ہوئے میں زیر لب مسکرائی تھی۔ اس نے جب چائے کی پیالی اٹھائی تو کہا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ راجا گوہرامان کی شخصیت پر اس سے بہتر الفاظ میں خراج پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔''

اور جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ میں وادی یاسین کے مرکزی گاؤں تھوواس میں کھڑی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ میل چوڑی اور چار میل لمبی یہ وادی زمانوں سے میرے حواسوں پر سوار تھی۔ قلعہ ڈور کھن اب خستہ حالت میں ہے۔ اس کی سیر کرتے ہوئے میرے تصورات اور حقائق میں تصادم ہوا تھا۔ جو تصویریں میرے ذہن نے سن کر تراشی تھیں وہ یکسر فرق تھیں۔ اس کی بھول بھلیوں میں، میں نے ایک پل کے لیے بھی تاجور کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے یونہی وہم ہونے لگا تھا کہ کہیں میرا اس رات کا خواب سچا نہ ہو جائے۔

پولو گراؤنڈ اور ڈسپنسری کے اوپر سے ہوتے ہوئے ہم اس گھر میں آ گئے جہاں میری رشتے کی پھپھی رہتی تھی۔

وادی یاسین دفاعی اعتبار سے وادی اشکومن کی طرح خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے شمال اور شمال مشرق میں سطح مرتفع پامیر، روسی ترکستان اور واخان کا علاقہ، مشرق میں اشکومن آگے نکل کر چینی ترکستان، جنوب میں گلگت اور مغرب میں چترال واقع ہے۔

یہ بہت خوبصورت شام تھی۔ میری زندگی کی چند حسین شاموں میں سے ایک حسن ابر راگ ورنگ سے لدی پھندی شام جب وادی کے کئی لوگ ہم سے ملنے آئے تھے۔ پھنگ کے درمیانی حصے میں عین گنبد کے نیچے آگ جل رہی تھی اور اردگرد ہم سب بیٹھے تھے۔ اس ادھیڑ عمر آدمی نے جو درکوت درّے کی کسی وادی کا رہنے والا تھا جس کی مادری زبان پرانی فارسی تھی۔ اس نے کس مہارت سے ستار بجایا تھا۔ اس کی پُرسوز آواز فارسی جیسی شیریں زبان کا گیت اور ستار کی دلنواز دھنیں۔

میں تھکی ہوئی تھی۔ پر وہ گیت اور ساز میری تھکاوٹ کے لیے نکور جیسے ثابت ہوئے تھے۔ یاسین کی مقامی زبان بلتم اور کھوار ہے۔ ویسے فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ موسیقی سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ شام کے وقت تقریباً ہر گھر سے ستار کی دلنواز دھنیں سنائی دیتی ہیں۔ ساری شام گیتوں کی نذر ہوئی تھی۔ نہ سنانے والا تھکا تھا اور نہ سننے والوں کی تشنگی مٹی تھی۔

سندھی گاؤں یاسین سے صرف دو تین میل اوپر شمال کی طرف ہے۔ قلعہ موڈوری دیکھنے کے لیے ہم دونوں اس پہاڑی ٹیکرے پر کھڑے تھے جہاں قلعے کے آثار ملتے ہیں۔

''مسلمان قوم ہمیشہ اپنوں کی غداری سے تباہ ہوئی۔''

تاجور کی نظریں دور کھنڈرات میں گھمن گھیریاں کاٹ رہی تھیں۔ موڈوری کی لرزہ خیز داستان جائے عبرت ہے۔'' اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

''راجا گوہرامان کے مرنے کی دیر تھی کہ نگر کے راجا نے ڈوگروں کو گلگت پر حملے کی دعوت دے دی۔ انہوں نے گلگت کو فتح کیا تو یاسین پر نظریں جم گئیں۔ یاسین کے جیالوں نے سندھی میں قلعہ موڈوری تعمیر کیا۔ تمام لوگ اس میں قلعہ بند ہو گئے۔ آنے جانے کے لیے یہ طے ہوا تھا کہ رات کے وقت جس کی ٹوپی پر پھول ہو گا وہی قلعے میں داخل ہو سکے گا۔ یہ راز بھی ڈوگرہ فوج کو پنیال کی راجا فیملی کے ایک شخص ارسلا خان کی غداری کے ہاتھوں پہنچا۔ راتوں رات ڈوگرہ سپاہی ٹوپیوں پر پھولوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گئے۔ بڑی خوفناک جنگ ہوئی۔ پانچ ہزار یاسینی شہید ہوئے۔ بے شمار عورتوں کو ڈوگرے اور سکھ اپنے ساتھ لے گئے۔ حاملہ عورتوں اور بچوں پر اس قدر ظلم وستم ہوئے کہ ہلاکو خان کی یاد تازہ ہو گئی۔''

''اے میرے رب۔'' نیلے چمکتے آسمان کے نیچے تاجور خان نے اپنی آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ دعائی انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرے ملک کو سازشیوں، غداروں اور دشمنوں سے اپنی پناہ میں رکھنا۔''

4575 میٹر بلند درکوت درّے پر پہنچ کر مجھے اپنا اور یاسین کا بچپن یاد آیا تھا۔ جب وہ اپنے سبق کو گھوٹا لگا کر یاد کیا کرتا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بننے والے تنگ راستے کو درہ کہتے ہیں۔ درکوت تھوئی اور شندھور وادی یاسین کے درے ہیں جہاں سے واخان، یارخون اور چترال کو راستے نکلتے ہیں۔

میں آج اسی درکوت درّے کے دہانے پر کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس جگہ کو بھی دیکھا تھا جہاں وہ انگریزی سیاح جارج ہائی ورڈ قتل ہوا تھا۔

بیچارہ ہائی ورڈ ایک عظیم انسان کیسے منفی سیاست کی بھینٹ چڑھا۔

درکوت میں ہی وہ گرم چشمہ بھی دیکھا۔ جس کے گرم پانی میں انڈا ابلنے کے لیے صرف ڈیڑھ دو منٹ لیتا ہے۔ بھاپ اڑاتے اس چشمے کے کنارے بیٹھ کر تاجور خان نے مجھے شہری انداز کی چائے بنانا سکھائی۔ انڈے کھائے اور چائے پیتے فضا کے سناٹے کو اپنی رگوں میں اتارتے ہوئے دفعتاً تاجور نے مجھ سے پوچھا۔ ''جانتی ہو شہروں میں شادی کے بعد جب نوبیاہتے جوڑے ایسے سیر سپاٹوں کے لیے نکلیں تو کیا کہا جاتا ہے۔''

میں ہنس پڑی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے قہوے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور بولی ''میرے جسم کا ہر مُو یامین کا شکرگزار ہے کہ اس نے مجھے ہر موضوع پر کتابیں بھیج کر میرے ذہن کو وسعت اور کشادگی دی۔''

''تاجور خان ہم اپنا ہنی مون منا رہے ہیں۔''

اس نے مجھے اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ''سچ تو یہ ہے بابا تم کسی سقراط بقراط سے کم نہیں ہو۔''

نازبر کے اس چشمے کو دیکھنے کے لیے میں نے تاجور سے خود فرمائش کی تھی جس کا رنگ خون سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن وہاں پہنچ کر بڑی دہشت طاری ہوئی۔ بڑا ڈراؤنا ماحول تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں مار دھاڑ ہوگئی ہے اور انسانی خون یوں فراوانی سے بہنے لگا ہے۔ ہم لوگ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرے۔

گھر سے نکلے کتنے دن ہو گئے تھے میں نے انگلیوں پر گنے۔ ''اب واپسی ہونی چاہیے۔''

''پر جان شندھور جھیل دیکھے بغیر نہیں۔'' تاجور نے میرے سنہرے بالوں کی لٹوں کو سنوارتے ہوئے کہا تھا۔

سات آٹھ میل لمبی پانچ میل سے زیادہ چوڑی یہ خوبصورت ترین جھیل چترال اور گلگت کی سرحد کے قریب چاروں طرف پہاڑوں سے گھری آنے والوں کو اپنے حسن کے سحر سے مسحور کرتی ہے۔ اس کے کنارے پر برطانوی دور کا تعمیر شدہ ریسٹ ہاؤس بہت اچھی حالت میں ہے۔ ہم لوگ

اس میں ٹھہرے۔ دن چڑھتا اور ہماری کشتی نیلگوں سطح پر تیرنے لگتی۔ اس کا پانی میٹھا نکھرا ہوا اور آئینے جیسا شفاف ہے۔ تہہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ سب دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ٹراؤٹ مچھلیاں دل بھر کر کھائیں۔ تاجور نے مارخور کا شکار کیا اس کے گوشت کو ریسٹ ہاؤس کے عملے نے ضیافت کے طور پر اڑایا۔

''کاش اس جھیل سے نہریں نکالی جائیں۔ یہ چترال اور گلگت کے علاقوں کی خوشحالی کی ضامن بن سکتی ہیں''۔ تاجور نے کہا تھا۔

ہم پورے بیس دن بعد لوٹے تھے۔ سنگل میں اپنے گھر جہاں بابو یامین اور ماں تھے۔ چھوٹے بہن بھائی تھے۔ جنھوں نے مسرتوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہمیں خوش دیکھ کر نہال ہوئے تھے۔ پندرہ دن ان کے پاس رہنے کے بعد میں کراچی آ گئی تھی۔ جہاں تاجور نوکری کرتا تھا۔ پڑھتا تھا۔ محنت مزدوری کرتا تھا۔ جہاں اس کے شب و روز کولہو کے بیل کی طرح تھے۔

☆......☆

میں نے رضائی پرے پھینکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ملکہ کی گفتگو کا سحر ایسا تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ آپ بیتی میں اتنی دلکشی اور حسن تھا کہ ذہن اسی زمان و مکان میں قید ہو گیا تھا۔ انداز بیان کسی کامیاب داستان گو جیسا تھا کہ میں کہیں پیچھے چھپ گئی تھی۔

سچی بات یہ بھی تھی کہ اس کہانی میں مجھے اپنے وجود کا احساس دلانا کچھ ایسا لگا تھا جیسے لذیذ کباب کھاتے کھاتے اچانک ہڈی آ جائے یا کسی سنجیدہ سی محفل میں کسی فرد کی خوامخواہ ہی مداخلت پر کہا جائے۔ ''پرے ہٹ تو کی بچ پیا تلدا ایں''۔ (یعنی تم کیا بیچ میں فضول حرکتیں کرتے ہو)

لیکن کراچی پہنچ کر ملکہ کو جو فل اسٹاپ لگا اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے رضائی پرے پھینکی اور اٹھ بیٹھی۔ باہر ٹھنڈی ہوائیں دف بجاتی پھرتی تھیں۔

''آگے چلیں نا۔ تب سے اب تک کی زندگی میں تو بہت سے نشیب و فراز آئے ہوں گے کچھ ہمیں بھی بتائیں۔''

''فراز کہاں؟ نشیب ہی نشیب تھے۔ تاجور بہت بڑا فراڈ ثابت ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ہی گود میں پانچ ماہ کا بچہ دے کر فرار ہو گیا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دف بجاتی یخ ہوائیں دروازہ توڑ کر اندر آ گئی ہیں اور سارے میں انسانی حسیات کو سن کر دینے والا عمل جاری ہو گیا ہے۔ میرے اوپر دورے کی سی کیفیت طاری تھی۔

''کیا ہوا تھا؟'' میرا ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

''روڈ ایکسیڈنٹ میں اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی۔ چھ فٹی کبرو جوان کو منوں مٹی تلے دبا کر مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں کیسے زندہ ہوں؟''

وادی سنگل کی خاموشی میں ڈوبی ہوئی وہ رات میرے لیے بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ میرے ذہن میں اتھل پتھل تھی۔ ایک ٹک میں کھڑکی کے راستے باہر تاریکیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس اتنی خوبصورت کہانی کا انجام اتنا المناک کیوں ہے؟ پیدا کرنے والا بھی کبھی کبھی اذیتوں کی عنایت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔

پھر میں نے اس خوبصورت چہرے کو بار بار دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ سفر کیسے کٹا؟ پہاڑوں کی بیٹی تھی۔ پہاڑوں جتنا حوصلہ کر لیا۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے پانچ سو اڑتالیس دن رواں دواں ماہ و سال پر پھیلا دیے۔ جس دن کو چاہتی منہ میں رکھی چیونگم کی طرح کھینچ کر لمبا کیے جاتی۔

''یامین میرے پاس تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر۔ ہر روز کمرا اسی انداز میں سجاتی جو اُسے پسند تھا۔ شام کو اپنا کھانا اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتی۔ خود کلامی کی عادت میرے اندر یہیں سے پروان چڑھی۔ میں بالکل ایسے ہی باتیں کرتی جیسے وہ میرے سامنے بیٹھا ہو۔ دن بھر کی کارگزاری کی ایک ایک تفصیل بیٹے کی شرارتوں کا ذکر، اڑوس پڑوس کی باتیں۔ سب کچھ کہہ دینے کے بعد آنکھیں موند کر سو جاتی۔ بس یونہی اتنی عمر گزر گئی اور باقی بھی گزر جائے گی۔'' ہاں مالی تنگی کا بھی احساس نہیں ہوا۔ پہلے یامین نے سنبھالا دیا۔ بیٹا بڑا ہوا تو میں نے سلائی کڑھائی کا کام سیکھا اور اسکول چلایا۔ بہت پیسا کمایا۔ بیٹا ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کے لیے باہر گیا تو میں یہاں آئی ہوں۔ دیکھو مستقل ڈیرے ڈالتی ہوں یا واپس چلی جاتی ہوں۔''

''اور یامین'' میں نے پوچھا۔

''رحیم یار خان کا ڈپٹی کمشنر ہے آج کل۔''

میں نے رضائی میں منہ دے کر آنکھیں موند لی تھیں۔ مگر میں جانتی تھی مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میرا ہر مو سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔



# شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ جنھوں نے اس خوب صورتی کو رزقِ بصارت نہیں بنایا ان کے لیے یہ تحریر ایک تحفے سے کم نہیں، اپنے وطن کے کوہ و دمن سے آپ پیار کرتے ہیں تو انہیں لفظی تحریر کے آئینے میں دیکھیں، لطف اٹھائیں۔

ہم روئی کرکی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ راستہ خطرناک تھا اور پیاس سے زبان اکڑ رہی تھی۔ پانی کا نام و نشان نہ تھا کہ میری نظر ایک بوتل پر پڑی جسے کسی ٹریکر نے ادھر پھینک دی تھی، میں نے وہ اٹھالی۔ راستے میں ایک چینل (نہر) آئی اور اس میں کچھ پانی کھڑا تھا۔ میں نے بوتل میں پانی بھرا اور غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔ میرے بعد ان دونوں نے بھی میری تقلید کی اور اس طرح کم از کم خشک ہوتی زبانیں تر ہو گئیں۔ حلق میں پڑ رہے کانٹے نرم پڑ گئے۔ میٹھا پانی زندگی

کے قریب لے آیا۔

ازابیل شاہ نے پاکستان کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں پاکستان کے ہر شہر کا ذکر ہے۔ شمال کے ایک ایک ٹریک کی مکمل معلومات ہیں۔ وہ لکھتی ہے کہ دوئی کر کا ٹریک جان لیوا ہے اور راستے میں آپ پانی کے بغیر جانے کا سوچیں بھی نہیں۔ پھر بھی میں نے نہیں سوچا کہ وہ کتاب اس وقت تک میری نظروں سے نہیں گزری تھی اور ہمارا گائیڈ بقول شاہد ویسے ہی چھوڑو گائیڈ تھا۔

آگے ایک مقام ایسا آیا کہ خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ربن جیسا دیکھا، پتلا سا اور بھربھرا راستہ نیچے وہی التت گاؤں اور وہی میرے ڈگمگاتے، لرزتے اور کانپتے قدم۔ کہیں بہت نیچے گڑیوں کے گھروں کی مانند دکھتے مکانات کی چھتیں۔ ان مکانوں کے حجم ہی سے گہرائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ شاہد نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور میرا توازن خراب ہونے لگا۔ میں نے اسے روک دیا اور پھر میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا تیزی سے اس پر گزرتا چلا گیا۔ اس جیسے مقامات اور بھی آئے اور میں ان پر سے بھی بے خوف گزر گیا۔ دوئی کر پہنچ کر جب میں نے یہ راستہ دیکھا تو مجھے اپنے آپ پر یقین نہ آیا تھا کہ میں اس سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں۔

اس بار ٹریک پر آنے سے پہلے میں نے لمبی لمبی واک کی تھیں۔ میری ٹریک پر چلنے کی صلاحیت پہلے سے زیادہ تھی۔ میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو فٹ کر رہا تھا کہ مجھے تارڑ صاحب کے ساتھ جانا تھا اور مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ اپنے سفرنامے میں میرا مذاق اڑائیں گے مگر میں نے یہ دیکھا کہ تارڑ صاحب کو دو بندے آگے اور پیچھے سے سنبھال کر لیے چلے جا رہے ہیں۔ میں پھر بھی ان کو داد دیتا ہوں کہ وہ اتنے خطرناک ٹریکس پر آجاتے تھے۔

شاہد اور اشفاق دونوں مجھے داد دیتے کہ میں اس بار بہت اچھا چل رہا ہوں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میں اپنے آپ کو بار خور سمجھنے لگا تھا۔

جنگلی گلابوں کی جھاڑیاں پھولوں سے بھری تھیں اور پھول چلتی ہواؤں سے جھوم رہے تھے۔ خوبانیوں کے درختوں پر پھل ابھی کچے اور ترش تھے مگر اس کو کھانے سے میرے سر کے درد میں افاقہ ہوا تھا۔ میرے سر درد کی وجہ بلندی تھی، وہ یہ بھید مجھ پر اس دن کھلا کہ پہاڑوں پر سر درد کا بہترین علاج اچار کیوں ہوتا ہے۔ اگر اچار نہ رکھ سکیں تو وٹامن سی کی گولیاں لے لیں۔ اس سے رگوں میں دوڑتے خون کی بدن کو آکسیجن پہنچانے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔

ہمیں دوئی کر پہنچنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ خنکی سے کپکپی طاری تھی۔ میں اپنے آپ کو ہنزہ پیک اور لیڈی فنگر کے روبرو پاتا تھا۔ بادلوں نے ان دونوں کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ہوائیں شوخی ہوئی چلتی تھیں۔ وادی میں بھی بادل تیر رہے تھے۔ ایک شاندار منظر کو میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

دوئی کر میں ایگل نیسٹ کے نام سے بنا ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ ہم باہر کھڑے تھے کہ بادل برسنے لگے۔ ہم بھاگ کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آبیٹھے۔ لکڑی سے بنے خوبصورت ہال، زمین پر بچھے نرم کارپٹ اور دیواروں پر ٹنگے مقامی آرٹ کے نمونے، صاف ستھرے میز پوش اور ان پر سجی نفیس کٹلری ...... ہم ہواؤں کے شور سے بچ کر ایک اداس ماحول میں آبیٹھے۔ میں جگہ جگہ سجے نوادرات کو دیکھ رہا تھا اور بیرے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اشفاق نے مقامی زبان میں بات کی تو معلوم ہوا کہ نوادرات چوری کر کے لے جاتے ہیں اس لیے ملازمین ان پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ علی مدد اس ہوٹل کے مالک کا بیٹا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا ہوٹل اتنا زیادہ مہنگا کیوں ہے تو کہنے لگا کہ کریم آباد سے جیپ پر سامان یہاں لانے کے ہم آٹھ سو روپے ادا کرتے ہیں اس طرح اس ہوٹل پر لاکھوں خرچ کر چکا ہوں۔

وہ حساب کتاب بتا رہا تھا اور میں ہوٹل کے کیمپنگ میں اس خیمے کو دیکھ رہا تھا جس پر بارش کا پانی برس رہا تھا۔ ایسی دلکش جگہ ہو اور آپ ٹینٹ میں ہوں اس سے زیادہ پرکشش بات کیا ہو سکتی ہے۔ ہوا شیشوں سے ٹکرا رہی تھی اور ہم چکن کڑاہی کھا رہے تھے۔ یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت اس کا ذائقہ کیا تھا جب ہم بھوک سے نڈھال تھے اور باہر ہواؤں کا زور تھا اور بارش کا پانی فضا میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ نیچے بل کھاتے دریائے ہنزہ کے پانیوں کی چمک تھی۔ وادی نیچے تک ایک سرمائی ماحول میں ڈوبی تھی۔ سامنے اور پیچھے چھ ہزار سے سات ہزار میٹر تک بلندی کی چوٹیاں نظر آرہی تھیں مگر سب دھواں دھواں تھیں۔ راکاپوشی، میر شکار پیک، درن، شلنز، والٹر اور گولڈن پیک سب بادلوں میں ڈوبی تھیں۔ دوسری سائیڈ پر الترا، ہنزہ پیک اور لیڈی فنگر کی برفانی چٹانیں تھیں۔

میں خواب ناک ماحول کو جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی جگہیں آپ کو دنیا میں کم ہی ملتی ہیں۔ میں یہ سفرنامہ لکھ رہا تھا تو علی مدد کو فون کیا۔ کچھ معلومات لینی تھیں۔ وہ خوشی سے بتا رہا تھا کہ پہلے جب آپ آئے تھے تو آٹھ کمرے تھے اور اب تیس کمرے ہیں۔ دو ہوٹل اور بھی بن چکے ہیں۔ کچی سڑک یہاں تک آتی ہے اور اب تو بہت رش ہوتا ہے۔ یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی جگہیں شور کی کثافت سے پاک بھی رہے لیکن انسانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے اور انہیں بھی زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ زمین کا کوئی حصہ میرے جیسے آوارہ گرد کی خواہش پر ویران تو نہیں رہ سکتا۔

کچھ دیر میں بارش تھمی اور دھوپ چھاؤں کا کھیل شروع ہو گیا۔ ہم کھانے کے بعد باہر ٹیرس میں آبیٹھے۔ میں انتظار میں تھا کہ الترپیک اور لیڈی فنگر کی نکونی چٹان سے بادل چھٹیں اور میں اس کی تصویر لے سکوں۔ برفیلی ہوا کے جھونکے چلتے تو میری قمیص کا کالر پھڑپھڑاتا اور میں سردی سے بٹیر کی طرح کپکپاتا تھا۔ ہم کریم آباد سے پانچ سو میٹر کی بلندی پر تھے یعنی سطح سمندر سے تین ہزار سے زائد میٹر کی بلندی پر تھے۔

جب کسی ہیلی کاپٹر کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو ہمیں اسے ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس سے وادی کے پھیلاؤ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہم دوربین سے اور کھلی آنکھوں سے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ کسی مچھر کی مانند فضا میں جھنجھنا رہا تھا۔

ہم وہاں سے زیرو پوائنٹ کو آئے تو یہاں سے ساٹر پیک، شلنز، درن اور گولڈن پیک کی بلند برفانی چوٹیاں کہیں کہیں پڑتی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نیچے دوئی کر گاؤں کے سنہرے اور سبز کھیت بچھے تھے۔ دور کسی جنگل کے ساتھ شاہ آباد کا گاؤں تھا۔ زیرو پوائنٹ پر کئی ایک بڑے پتھر عجیب شکلیں اختیار کیے پڑے تھے کوئی گھوڑے جیسا اور کوئی اونٹ کی مانند۔ ایک دیوہیکل پتھر میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔ یہاں کچھ جاپانی خواتین دوربینیں لگائے حیرت سے یہ وسیع وعریض لینڈ اسکیپ دیکھ رہی تھیں۔ کہنے لگیں کہ ایسی دیوہیکل چٹانیں، اتنی بڑی اور اتنی زیادہ ایک ساتھ ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔ خواتین سے یہ ساری گفتگو ہمارا چھوڑو گائیڈ اشفاق کر رہا تھا۔

شام کے ساتھ ساتھ ہم بھی وادی میں اترنے لگے۔ ہمارا رخ کریم آباد کی طرف تھا ہم پیدل چل رہے تھے۔ بادل چھٹ کر دور کہیں نکل چکے تھے۔ ڈھلتی دھوپ کی کرنیں خوبانیوں اور اخروٹ کے درختوں سے چھن چھن کر زمین کے بوسے لے رہی تھیں۔ ہم کریم آباد پہنچے تو شام کا سایہ گہرا ہو کر کریم آباد کے بازار میں گھوم رہا تھا۔

میں اپنے ہوٹل میں آیا تو یورپین اینڈریو میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے آج صبح بلتت فورٹ کے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اسے فیری میڈو جانا تھا اور وہ مجھ سے کچھ معلومات لینا چاہتا تھا۔ شاہد اور اشفاق کمرے میں چلے گئے۔ اینڈریو اور میں ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ دن کی روشنی اب تاریکی میں بدل چکی تھی، ہنزہ کی شام اپنے سحر میں لپٹی میرے وجود میں آبیٹھی تھی۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے اینڈریو کو وہ ساری معلومات دیں جو میرے پاس تھیں۔ وہ پاکستان کے شمال سے کافی متاثر نظر آتا تھا۔ کہتا تھا کہ یہ کوئی جادو ہے جو یہاں آنے والے کو جکڑ لیتا ہے۔ ایک سادگی اور ٹھہراؤ سا ہے اس کے ماحول میں۔ وہ پہلی بار آیا تھا اور اکیلا تھا پرجوش تھا۔ مطمئن اور آسودہ تھا۔ یخ بستہ ہوا بازار میں چل رہی تھی اور پتوں کی سرسراہٹ قہوہ خانے کے اندر تک آرہی تھی۔

گلگت سے آئے ہوئے دانشور آج ہنزہ کے دربار ہوٹل میں تقریر کر رہے تھے۔ مجھے بھی تارڑ صاحب نے شامل ہونے کو کہا تھا اور یہ میرے مزاج کے خلاف تھا کہ میں کھلی فضاؤں کو چھوڑ کر کانفرنس ہال کے اور اکتاہٹ زدہ ماحول میں خشک تقاریر سننے کے لیے کرسی سے چپک جاؤں۔ بڑے بڑے لوگ آئے تھے جو گلگت بلتستان کی سیاحت کے فروغ کے لیے مقالے پڑھ رہے تھے۔ میرے لیے کشش دوئی کر کے ٹریک میں زیادہ تھی۔ کل ہمیں شمشال جانا تھا اور مجھے تارڑ صاحب سے ملنا تھا۔ سعید چودھری کا ہمارے ہمراہ جانے کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے دوسرے ساتھی بقا شیخ تھے۔ وہ تارڑ صاحب کے ساتھ پہلے بھی کئی سفر کر چکے تھے اور ابھی تک میں ان سے نہیں ملا تھا۔

میں دربار ہوٹل پہنچا تو ڈنر چل رہا تھا۔ کانفرنس کے شرکا اپنی پلیٹیں بھرے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں تارڑ صاحب کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لابی میں مارخور کے بڑے بڑے سینگ دیوار پر آراستہ تھے اور اس کے نیچے تخت پوش لگے تھے۔ میں تخت پوش پر بیٹھا آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی وزیر صاحب بھی آئے تھے۔ جس ہیلی کاپٹر کو ہم نے دوئی کر سے دیکھا تھا، وہ اسی میں تشریف لائے تھے۔ تارڑ صاحب وہیں سے گزر رہے اور مجھ پر نظر پڑی وہ سیدھا میری جانب آئے۔ کہنے لگے۔ ”ہم صبح سے تم کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم کہاں غائب تھے؟“ وہ مجھے شکایت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ ”کیا کھانا کھا لیا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو پکڑ کر مجھے وہاں لے گئے

جہاں بونے لگتے تھے۔ سب ڈونگے خالی تھے، میں نے سلاد سے پلیٹ بھری اور ہم دونوں دوبارہ مارخور کے سینگوں تلے آ بیٹھے۔ ''اب کہیں غائب نہ ہو جانا۔'' تارڑ صاحب نے کہا۔ میں نے سر ہلا کر پوری توجہ سلاد پر لگا دی۔

اتنے میں رحمت نبی بھی کہیں سے آ گیا اور وہیں براجمان ہو گیا۔ بقا بھی اپنی مونچھوں پر مسکراہٹ سجائے آ شامل ہوا۔ بقا سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ سعید چودھری صاحب بھی اپنی نفاست کے ساتھ پہنچ گئے۔ یہیں تارڑ صاحب نے میرے کان میں کہا کہ سعید صاحب واپس جا رہے ہیں۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ پہاڑوں میں نفاست نہیں چلتی۔ نزاکت کا سکہ کوہساروں میں کھوٹا پڑ جاتا ہے۔

تارڑ صاحب اور بقا شیخ دونوں پی ٹی ڈی سی کے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ پروگرام یہ بن رہا تھا کہ میں کل دو بجے سامان سمیت نیچے سلک روڈ پر بنے اس ہوٹل میں پہنچ جاؤں۔ گلمت کے راجا..... راجا بہادر خان اپنی جیپ پر گلمت جا رہے ہیں۔ وہاں ان کا ہوٹل ہے۔ مارکو پولو ان۔ گلمت دراصل پسو اور کریم آباد کے بیچ ایک قصبہ ہے۔ ہمیں وہ رات مارکو پولو ان میں گزارنی تھی اور دوسرے دن راجا صاحب کی جیپ ہمیں پسو چھوڑ آتی۔ وہیں سے کوئی ٹریک شمشال کے لیے نکلتا ہے جو ہمارے اس سفر کی منزل تھی۔

سعید چودھری صاحب اور بقا دونوں واپس ہوٹل چلے گئے اور تارڑ صاحب مجھے بل ٹاپ ہوٹل کی جانب لے آئے۔ بل ٹاپ کے ایک گمشدہ باغیچے میں کچھ لوہے کی میزیں لائن میں رکھی تھیں اور اس کے اردگرد کرسیوں پر تارڑ صاحب کے دوست شاہ خان، کرنل شیر خان، فضل خان اور اکرام بیگ بیٹھے تھے۔ پہاڑوں اور چوٹیوں کے قصے تھے۔ چیری کے درخت کے نیچے گرم قہوہ چل رہا تھا۔ شہتوت پلیٹوں میں رکھے تھے اور سب رغبت سے کھا رہے تھے۔ تارڑ صاحب کی محبت، ہر ایک سے میرا تعارف کرا رہے تھے، تعارف میں ایک ایک جملے پر خاصہ زور تھا کہ کچھ ماہ میں یہ کینیڈا کوچ کر رہا ہے۔

میں سر جھکائے سب سنتا رہا۔ مقابل مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتا اور میں خود میں سکڑ سمٹ جاتا۔ میں محجوب اس لیے تھا کہ ابھی تو میرا میڈیکل ٹیسٹ بھی نہیں ہوا اور چند ماہ میں کینیڈا روانگی خالانکہ یہ سن کر ایک نئی دنیا کا دروازہ مجھے کھلتا دکھائی دیتا تھا۔ میری کیفیت ہیجانی ہو جاتی تھی..... ..... کیونکہ مجھے دنیا دیکھنے کا ایک گیٹ وے محسوس ہوتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ کمبل

منگوائے گئے اور پھر سب اس میں لپٹے اپنے وقتوں کے قصے سنا رہے تھے۔ کریم آباد کی وادی پر بادل اتر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں پانی کے قطرے تیرتے ہمارے چہروں پر پھوار کی طرح پڑنے لگے۔ سب اپنے اپنے کمبل سمیٹ کر ہوٹل کے ایک کمرے میں آ بیٹھے۔ بحث ہنوز جاری تھی مگر مجھے ان کی ایک بات بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میرے ذہن کی اسکرین پر صرف کریم آباد کا جادوئی ماحول تھا، دھیمے سے برستی پھوار اور کپکپا دینے والی سرد ہوا کے بوسے تھے۔ میں ان سب کی باتوں سے علیحدہ بیٹھا تھا۔ نہ مجھے کچھ سمجھ آ رہا تھا اور نہ میں کچھ سمجھنا چاہتا تھا اور اگر میں سمجھنا بھی چاہتا تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا اور لطف کی بات تھی کہ کسی نے مجھے کچھ سمجھانے کی کوئی کوشش بھی نہ کی۔

میں کچھ بور ہونے لگا تو تارڑ صاحب سے اجازت مانگی جو انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے دے دی۔ میں برستی، ٹھہرتی، تھمتی اور بکھرتی پانی کی بوندوں کے درمیان اپنے ہوٹل کی جانب بڑھنے لگا۔

ہو کا عالم تھا کوئی ایک ٹمٹماتی روشنی کبھی کبھی جھائی دے جاتی۔ میں ٹہلتا ہوا اپنے ہوٹل کی جانب بڑھتا چلا جا رہا۔ کریم آباد سویا تھا۔ آسمان پر بادل تھے، کوئی تارا چمک نہیں رہا تھا۔ تمام تارے میرے اندر جگمگا رہے تھے۔ میں ہوش سے بیگانہ، اس ماحول میں غرق تھا۔ ذہن میں شمشال کی شبیہہ آتی اور غائب ہو جاتی۔ ایک اداسی اندر بھری تھی بچوں سے دور ہونے کی اور سمندر پار کے سفر کی..... جو میرے خواب بھی تھے اور ایک عذاب بھی۔

اشفاق اور شاہد دونوں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ وہ دونوں کسی پُراسرار ہنزہ واٹر کی تلاش میں سرِشام نکل جاتے اور واپس آ کر بستروں پر ڈھیر ملتے۔ بارش پوری رات ٹپ ٹپ برستی رہی۔ ہوائیں چلتیں تو سفیدے کے درخت شور مچانے لگتے۔ ہوا کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ اکھاڑنے میں جتی ہوئی تھی اور اپنی ناکامی پر زیادہ تلملا رہی تھی۔ میں سونے اور جاگنے کی کیفیت میں پوری رات جاگتا رہا۔

چند گھنٹوں بعد میں اٹھ بیٹھا۔ جو ہو رہا تھا اب نہیں تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ ہوا مدھم پڑ چکی تھی میں نے اپنے آپ کو کمبل سے نکالا اور ان دونوں کو سوتا چھوڑ کر گرم جیکٹ پہنی، موزے چڑھائے اور ایک بار پھر راکاپوشی کے معبد کے سامنے چھت پر آ بیٹھا۔ چوٹیوں پر سنہری کرنوں کا راج تھا اور نیچے ہنزہ تک کی وادی تاریکی میں تھی۔ ہوا مدھم رفتار سے مگر ایک روانی سے چل



رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں دِرن پیک اور راکاپوشی پر گاڑ دیں۔ میں آپ لوگوں کو کیا بتاؤں، کیسے بیان کروں کہ یہاں کیا طلسم ہے جو مجھے جکڑ لیتا ہے۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ میری سوچیں قراقرم اور ہمالیہ کو دیکھ کر مفلوج ہو جاتی ہیں۔ میں کتنی دیر ان نظاروں میں کھویا رہا، مجھے معلوم ہی نہ ہوا جب ہوٹل کا بیرا بھاپ اڑاتی کافی لے کر میرے ماحول میں مخل انداز ہوا تو میں چونکا۔ کافی مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ مجھے تو ٹرکوں کے اڈے والی ڈبل پتی کی چائے چاہیے تھی اور وہ کافی کا مگ لے آیا تھا۔

سورج کی کرنیں جب وادی میں پوری طرح پھیل گئیں تو میں کمرے میں آیا اور دوبارہ سو گیا۔ جب بیدار ہوا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اشفاق اور شاہد بیدار ہو کر میری نیند میں مخل ہونے کی بجائے کہیں نکل گئے تھے۔ وہی مانوس، ٹھنڈے پانیوں سے غسل کیا اور ناشتے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں آیا تو دونوں کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے مجھ سے میری رات کی داستان سنی جبکہ ان کی شام کا احوال ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

میں نے اپنا سامان پیک کیا۔ ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ رک سیک میں ترتیب سے رکھا۔ کیمپنگ کا سارا سامان میرے پاس تھا۔ گزشتہ سفر کے تجربے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس بار سامان کا حجم آدھا تھا۔

بس کمی تھی تو شاہ جی کی ان کے چٹپٹے جملوں کی۔

شاہ جی کی یاد آئی تو ہاتھ خود بخود فون کی جانب بڑھ گیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد انہوں نے ریسیو کیا۔ میری آواز سنتے ہی اتنی زور سے کان جھنجھنا اٹھا۔ وہ پوری قوت سے چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ ''اور بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔ کہاں ٹھہرے ہو، نو روف نے ستایا تو نہیں ہے۔ کیسے لوگ ہیں وہاں کے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہ جی ابھی تو میں شمشال کی تیاری میں ہوں۔''

انہوں نے خفا ہو جانے والے انداز میں کہا۔ ''میں سمجھا کہ تم پہنچ گئے اسی لیے زور زور سے بول رہا ہوں۔'' ان کے خیال میں پاکستان سے باہر باتیں کرنے کے لیے چیخنا ضروری ہے کیونکہ اب ان کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا اور میں دوبارہ سامان پیک کرنے لگا۔

سامان پیک کر کے ہم دربار ہوٹل آئے۔ کانفرنس کا آخری سیشن چل رہا تھا۔ پاکستان کے نامور ادیب یہاں موجود تھے۔ سلیقے سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں باہر انہی مارخوروں کے سینگوں کے نیچے پڑے تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں تارڑ صاحب، بقا شیخ، سعید چودھری وغیرہ بھی وہیں آ بیٹھے۔ چودھری صاحب ہنزہ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے، پر آگے جانے پر آمادہ نہ تھے۔ بقا بوسکی کے ملتانی کرتے میں کسی طور کوہ نورد نہیں لگتے تھے بلکہ کسی ملتانی عرس کے منتظم زیادہ لگتے تھے لیکن وہ پورے سفر میں بہترین ساتھی ثابت ہوئے۔

کانفرنس کے بعد میں نے اپنا سامان سوزوکی میں ڈالا اور پی ٹی ڈی سی کے ہوٹل آ گیا۔ کچھ دیر میں تارڑ صاحب اور بقا شیخ بھی آ گئے۔ یہیں شاہد اور اشفاق مجھ سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوئے۔ میں ان کا تہہ دل سے مشکور تھا۔ ان دونوں نے صرف میری خاطر مجھے اپنے قیمتی وقت سے نوازا تھا۔

ہم بہت دیر سے باہر کرسیوں پر بیٹھے راجا بہادر خان کا انتظار کر رہے تھے وہ اپنے کہے وقت سے لیٹ ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں نے اپنی مونچھیں بڑھالی تھیں۔ تارڑ صاحب بار بار کہتے کہ ان کو تراش لو، ایسے ہی جنگلی لگتے ہو۔ میں کہتا کہ یہ تب تراشوں گا جب ہم واپس گلگت پہنچیں گے۔ انہوں نے پیار، غصے اور مذاق کا ہر حربہ آزما لیا مگر میں بھی اڑا رہا۔ میں کہتا کہ میری زندگی ہے، جس طرح چاہوں میں گزاروں۔ چند سال پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ میں ایک گہرے تسواری رنگ کا شلوار قمیص کا سوٹ لایا۔ سب نے مذاق اڑایا کہ یہ کیا ہے؟ شادی کے لیے تو ہلکا رنگ چلتا ہے اور تم کون سے رنگ کا لباس سلالائے ہو۔ میں نے بھی اپنی ٹھان لی اور اپنے نکاح پر وہی سوٹ پہنا تھا۔ سب روکتے رہے مگر میں کہتا تھا کہ وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا۔ آج بھی وہی صورتِ حال بن آئی تھی۔ تارڑ صاحب بھی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اسی جنگلی حلیے میں پہاڑوں اور جنگلوں میں جاؤں گا۔

راجا صاحب اپنی جیپ سمیت پہنچے تو سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہم ہوٹل کے باہر کرسیاں لگائے بیٹھے تھے۔ راجا صاحب اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ ایک کرسی پر ڈھیر تھے۔ آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ کسی بات کا جواب اسی حالت میں دیتے۔ تارڑ صاحب نے پھر میرا تعارف کرایا۔ ''یہ ندیم ہے۔''

راجا صاحب کا آہستگی سے سر اثبات میں ہلا۔ مطلب یہ تھا کہ انہوں نے سن لیا ہے۔ وہ کسی طور بھی جاگنے پر تیار نہ تھے۔ پھر ان کے کان میں صور پھونکا گیا۔ ''یہ کچھ ہی مہینوں میں کینیڈا اشفٹ ہو رہا ہے۔''

راجا صاحب کی آنکھیں مدھم سی کھلیں۔ شعاعیں میری جانب لپکیں اور پھر وہ بھی گل ہو گئیں۔ راجا صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔ شام کے سائے لہرا رہے تھے اور لیڈی فنگر کی عمودی چٹان، سورج کی آخری کرنوں سے سنہری ہوتی جا رہی تھی۔

راجا صاحب کا جوان سال بیٹا حسین بھی ساتھ تھا۔ زیادہ تر باتیں میں اسی سے کر رہا تھا۔ تارڑ صاحب تو راجا صاحب کو جگانے کے جتن کرتے رہے اور وہ کسی طور ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔

ہمارا سامان جیپ کے پیچھے ٹھونسا گیا اور ساتھ ہی بقا شیخ کو بھی کہیں فٹ کر دیا گیا۔ راجا صاحب آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھے۔ پیچھے تارڑ صاحب، میں اور حسین بیٹھے تھے۔

جیپ روانہ ہوئی تو منظر میں ہزاروں رنگ اتر رہے تھے۔ ہنزہ کی شام اپنے جادوئی حسن کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھ رہی تھی۔ چوٹیاں برف اور سورج کی کرنوں سے روشن تھیں۔ وادی میں شام کے سائے لہرا رہے تھے۔

ایک پل کے پار اترے تو احمد آباد آیا۔ دریا ہنزہ ہماری بائیں جانب تھا۔ اب پہاڑوں نے اپنے طور طریقے بدلے۔ ہنزہ (کریم آباد) میں دبدبہ تھا اور یہاں پہاڑوں میں وحشت تھی۔ غیر معمولی حد تک بلند اور پُر اسرار چٹانیں آسمانوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ زمین سے رشتہ ان کا صرف اس حد تک تھا کہ ان کے قدم اس پر تھے۔ ورنہ وہ برف سے ڈھکی، کرنوں سے منور اور ڈھلتے سورج سے محوِ گفتگو تھیں۔

پھر این آباد آیا تو دریا کے پار اس خوبصورت کھیت کے بلندیوں تک جاتے بلند و بالا درخت، باغات اور اوپر چٹانوں سے جھانکتی برف تھی۔ قراقرم اپنے اصل روپ میں کریم آباد کے بعد آتا ہے۔ آپ کسی طلسم میں جکڑے جاتے ہیں۔ ایک مکمل تنہائی اور خاموشی کے گھیرے میں آپ آ جاتے ہیں۔ دور دور تک نہ کوئی آدم تھا اور نہ آدم زاد۔ جیپ میں مکمل خاموشی تھی اور صرف انجن کی آواز لگاتار ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کوئی بھی بول نہ رہا تھا کیونکہ راجا صاحب محوِ خواب تھے۔ ہلکی ہلکی آواز ان کے نرخرے سے برآمد ہوتی تو شائبہ ہوتا کہ وہ غنودگی میں ہیں۔ تارڑ صاحب بھی میری طرح بلندیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

اب پہاڑوں سے گرتی آبشاریں نظر آ رہی تھیں۔ گلیشیر پہاڑوں سے اتر کر سڑک تک آ پہنچے تھے۔ ایک خنک ہوا ان سے ٹکرا کر آتی اور ہمیں احساس دلاتی کہ ہم کسی برف خانے سے گزر رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد راجا صاحب میں ہلچل سی پیدا ہوئی اور پھر وہ اپنے تئیں بیدار ہو گئے۔ دائیں جانب بلند پہاڑوں کے بیچ دروں پر نظر پڑی تو اس جانب اشارہ کر کے ارشاد کیا۔ ”میں کئی بار ان پہاڑوں کے پیچھے مارخور کا شکار کرنے کے لیے گیا ہوں۔“

میں نے مرعوب نظروں سے اوپر دروں کی جانب دیکھا، بلندیاں ناپیں، برف دیکھی اور پھر شک بھری نظروں سے راجا صاحب کو دیکھا۔ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تارڑ صاحب نے میری نیت بھانپ کر مجھے ٹہوکا دیا اور میں خاموش رہا۔

ایک اور پل کراس کیا، راستہ کچھ اور سکڑا فاصلے مزید کم ہوئے اور شام کے ملگجے اندھیرے میں ہم گلمت پہنچے۔

یہ ایک بڑی آبادی والا گاؤں ہے۔ ان دنوں عطا آباد جھیل وجود میں نہیں آئی تھی۔ دریا ہنزہ کا پانی اپنی سرمستی میں دور کہیں بہتا تھا۔ گلمت کے سرسبز کھیتوں میں آلو کی فصلیں تیار ہو رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے پرانے ہوٹل تھے، جہاں سے ٹمٹماتی روشنی کبھی کبھار نظر آ جاتی تھی۔

ہم دائیں جانب ایک سڑک پر مڑے۔ گاؤں کے کھیت اور مکانات سڑک کی دونوں جانب تھے۔ کچھ دیر بعد ہم راجا صاحب کے مارکو پولو ان میں داخل ہوئے۔ اس ہوٹل کو ایک نظر دیکھ کر ہی میں راجا صاحب کے ذوق کا شیدائی ہو گیا۔ نفاست سے سجے سبزہ زار، جن کے پیچھے ہوٹل کی عمارت تھی۔ سبزہ زاروں کے ساتھ بائیں جانب ایک لائن میں کمرے تھے۔ مختلف رنگوں کے گلاب ایک خوش نما ماحول کو جنم دے رہے تھے۔ چیری کے درخت پھلوں سے اٹے ہوئے تھے اور قراقرم کی بلند چوٹیاں سایہ فگن تھیں۔

ہم سب ہوٹل کے لاؤنج میں آ بیٹھے۔ ہمارے لیے کمرے تیار ہو رہے تھے اور ہمارا سامان ان کمروں میں شفٹ ہو رہا تھا۔ لاؤنج میں ڈور دنڈوز لگی تھیں، جن کے بڑے بڑے شیشوں کے پار ہم رات کی سیاہی میں مختلف رنگوں کے پھول، پھلوں سے لدے درخت اور مخمل کی طرح سرسبز لان تھے۔ میز پر ہوٹل کے عملے نے خشک میوہ جات سے بھری طشتریاں سجا دی تھیں۔ یہ خوبصورتی، ماحول، سکون اور خاموشی، مجھے پہلے کسی اور ہوٹل یا موٹل میں نہیں ملی تھی۔

باہر سردی بہت زیادہ تھی۔ میں نے گرم جیکٹ پہن لی۔ اونی ٹوپی اور مفلر لپیٹا اور پھر میں اس خاموشی و سکون میں ڈوب گیا۔ ماحول کا لطف ہر موئے تن سے کشید کر رہا تھا کہ کسی نے آ کر اطلاع دی کمرے تیار ہیں۔“

ہم لاؤنج سے باہر نکلے۔ سرد ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ایک لان کے بیچ بنے پختہ راستے سے ہم اپنے کمروں میں پہنچے۔ آرام دہ کمرے، صاف ستھرا باتھ روم، جس میں خوش رنگ ٹائلیں لگی تھیں۔ آرام دہ بستر اور صاف ستھری رضائیاں۔ یہ کمرے دیکھ کر ہر کوئی تعریف کر رہا تھا۔

ہم تازہ دم ہو کر تارڑ صاحب کے کمرے میں رضائیوں میں جا بیٹھے۔ آتشدان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کمروں میں بھی ڈرائی فروٹ کی طشتریاں سجی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ لگے آرام دہ بستروں کے بیچ میز پر لوازمات تھے۔ تارڑ صاحب ایک بیڈ میں رضائی اوڑھے اگلے پروگرام پر بات کر رہے تھے۔ دوسرے بیڈ پر میں اور بقا رضائیوں میں لپٹے ڈرائی فروٹ کے مزے لے رہے تھے۔

مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کل کیا پروگرام ہے اور نہ مجھے معلوم کرنا تھا۔ تارڑ صاحب ہمیشہ اپنے پروگرام کے ایک ایک پہلو کو کسی بھی جھول سے پاک رکھنے کے عادی ہیں۔ اس لیے میں ان لمحوں میں الجھنوں میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنا پاکستان میں آخری ٹریک سمجھ رکھا تھا کیونکہ اس کے بعد میں ایک اور دنیاوی جدوجہد کا حصہ بننے جا رہا تھا۔ ایک مطمئن دھارے میں بہتی زندگی سے نکل کے کسی تیز دھارے میں چھلانگ لگا کر اپنا وجود برقرار رکھنا، کوئی آسان کام نہیں۔ میں ایک اور جدوجہد اور کشمکش میں غرق ہونے والا تھا۔ کینیڈا جا کر سب کچھ دوبارہ کھڑا کرنا تھا اس لیے مجھے ابھی اس کے بارے میں سوچنے کا بھی حوصلہ نہ تھا اور یہ سب کر گزرنا مجھے ان قراقرم کے پہاڑوں کو کھو کر کسی دودھ کی نہر نکالنے کے برابر تھا۔ سو میں اس ٹریک کی ذمہ داریاں تارڑ صاحب پر اور بقا پر ڈال چکا تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کافی تجربہ کار تھے اور میں ان کی باتوں میں دخل در معقولات کرنا بھی نہ چاہتا تھا۔ دوسرا یہ کہ میں... تارڑ صاحب کے سب سفرنامے پڑھ چکا تھا اور کئی مقامات پر وہ یہ کہتے کہ پہاڑوں میں کبھی کبھار ٹریکر کو اکیلے اور تنہا اپنے آپ کو رکھنا چاہیے۔ تاکہ وہ ان پہاڑوں سے اکیلے میں باتیں کرے۔ اپنے طور پر ان ویرانوں کو دیکھے۔ یہ بات میرے مزاج کے عین مطابق تھی اور میں خود تارڑ صاحب کے ساتھ چپکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں خود کو تنہا رکھنا چاہتا تھا اور باقی ٹیم کو بھی کہ سب اپنے ذہن اور اپنی پسند اور ذوق سے ان مناظر کے بھید جانیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری اس عادت کی وجہ سے ٹیم مجھ پر معترض ہو گی کیونکہ سفر کے دوران کچھ کچھاؤ رہا اور میں بے خبر ہی رہا مگر شکر ہے کہ ٹریک کے دوران ہی مجھے ان وجوہات کے بارے میں معلوم ہو گیا تو پہلے تو میں سر پیٹ کر رہ گیا اور پھر تارڑ صاحب کو اصلیت بتائی تو وہ خوب ہنسے اور اس ٹریک کے بعد ہماری دوستی مزید مضبوط ہو گئی۔ ماشاء اللہ اب بھی ہم بڑے اچھے طریقے سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

ہم کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بیرے نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہے اور راجا صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ سب کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم سب فٹافٹ تیار ہوئے۔ اپنے اوپر گرم کپڑے ڈالے اور لاؤنج کی طرف چل پڑے۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی سردی سے کپکپی طاری ہو گئی، ٹھنڈ سے بچنے کے لیے جلدی سے لاؤنج میں جا گھسے جہاں ایک میز کے گرد پانچ کرسیاں لگی تھیں۔ میز پر پلیٹیں سجی تھیں۔ راجا صاحب اور ان کا بیٹا حسین بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

راجا صاحب ہمیں بتا رہے تھے کہ اس علاقے میں واخی زبان بولی جاتی ہے۔ گلمت صدیوں پرانا قصبہ ہے۔ قدیم قلعوں کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ بلند گلمت کی کل آبادی دو سے تین ہزار ہے۔ یہاں سے آپ ایک دن ٹریک کر سکتے ہیں۔ یہاں کے خزاں کے رنگ پورے گوجال (اپر ہنزہ) میں مشہور ہیں۔

راجا صاحب یہاں کی تاریخ بتا رہے تھے اور میں باہر پھولوں بھرے لان دیکھ رہا تھا۔ رات مکمل سناٹے سمیت اتر آئی تھی۔ بقا بھوک سے کلبلا رہا تھا۔ تارڑ صاحب بڑے غور سے راجا صاحب کی باتیں سنتے تھے اور موقع ملتے ہی باہر کو اپنی نظریں دوڑا لیتے تھے۔

پہلے گرم گرم، بھاپ اڑاتا سوپ آیا۔ وہ ختم ہوا تو برتن سمیٹ لیے گئے۔ میں... سمجھا کہ یہی ڈنر ہے۔ وہ بیرے جو سوپ کے برتن اٹھا کر لے گئے تھے، دوبارہ نوڈلز لیے نمودار ہوئے۔ پھر برتن ہٹائے گئے۔ میز صاف ہوئی۔ درمیان میں کچھ باتیں چلتی رہیں۔ پھر چاول لائے گئے۔ میز سمٹی اور پھر بھنا گوشت لایا گیا۔ پھر نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈنر دینے کا یہ طریقہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک ایک چیز چکھتے اور ڈشیں اٹھالی جاتیں۔

ہم سیر ہو چکے تھے۔ اللہ اللہ کر کے یہ سلسلہ تھما اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ بقا کی حالت اس ناگہانی کھانے سے

خراب ہو چکی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ اسی میز پر سارا کھانا جو اس کے معدے میں ہے، کہیں دوبارہ سجا نہ دے۔ اس لیے بیٹھے سے پہلے میں اٹھ کر باہر لان میں درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ پھولوں کے درمیان بیٹھا۔ شیشے کے پار دیکھ رہا تھا گو کہ میں اس میز سے دور تھا جہاں ابھی من و سلویٰ اتر رہا تھا۔ میں نے شیشے سے اندر دیکھا تو بقا کی آنکھیں ابل کر باہر نکلی ہوئی تھیں۔ تارڑ صاحب جبر کیے بیٹھے تھے۔ راجا صاحب اور ان کے بیٹے نے مہمان نوازی کی ساری حدیں پار کر لی تھیں۔ یہ سلسلہ اندر جاری تھا اور میں سکون سے باہر بیٹھا ٹھٹھرتی سردی اور گلاب کی خوشبو میں شاد تھا۔ ساتھ ہی ندی بہہ رہی تھی جس کے پانی کا شور مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ اردگرد کے پہاڑ لگتا تھا کہ رات میں زیادہ بلند ہو جاتے ہیں۔ وہ سیاہ ہیولوں کی مانند دکھتے تھے اور میرے اندر خوف بھر رہے تھے۔

راجا صاحب نے مجھے اوقات سے زیادہ کھلا دیا تھا۔ تارڑ صاحب اور بقا اس کھانے کے مقابلے میں کامیاب ہو کر باہر نکلے تو فخر سے ان کے سر تنے ہوئے تھے۔ باہر آ کر وہ میری کرسیوں کے ساتھ پڑی کرسیوں پر گر سے گئے۔ اس سخت معرکے کے بعد کی تھکاوٹ ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ بقا تو بمشکل چل کر آیا تھا۔ تارڑ صاحب کے حوصلے بلند تھے۔ ساتھ بیٹھے تو مجھے سمجھانے لگے کہ میں پہلی بار ایک ٹیم کے ساتھ پہاڑوں پر آیا ہوں۔ یوں میرا میز سے اٹھ کر آنا انہیں اچھا نہیں لگا۔ تارڑ صاحب بڑے پیار سے مجھے سمجھا رہے تھے اور میں بڑے ادب سے ان کا کہا سمجھ رہا تھا۔ بسیار خور میں تو کبھی تھا رہا ہوں اور تارڑ صاحب بھی نہ تھے مگر کھانا اتنا اچھا تھا کہ ہاتھ نہ رک سکے تھے۔ میں نے ان کی باتیں بڑے احترام سے سنیں اور چند لمحوں بعد انہیں بھول بھی گیا۔ مجھے خود احساس تھا کہ میں کچھ کہے بغیر اٹھ کر کیوں آ گیا ہوں۔ میں دراصل سمجھتا تھا کہ پہاڑوں میں مہذب رہنا ممنوع ہے۔

میں اور بقا ایک کمرے میں تھے۔ تارڑ صاحب اپنے کمرے میں جا سوئے۔ بقا دیر تک اپنے پچھلے سفروں کے قصے سناتا رہا۔ میں اپنے آرام دہ بستر میں رضائی کے اندر لیٹا اس کا سفرنامہ سنتا رہا پھر جو نیند آئی تو صبح تک خبر نہ ہوئی۔

میں گہری نیند میں تھا جب بقا مجھے آوازیں دے کر اٹھا رہا تھا۔ ”اوئے اٹھ جا! باہر بہت خوبصورت مناظر ہیں تارڑ صاحب بھی اٹھ چکے ہیں۔“ بقا کی ہر بات میں تارڑ صاحب کا حوالہ ہوتا۔ جلدی چل تارڑ صاحب آگے نکل گئے ہیں، آہستہ چل تارڑ صاحب پیچھے رہ گئے ہیں، رک جا...... تارڑ صاحب بیٹھ گئے ہیں، سو جا، تارڑ صاحب بھی سو گئے ہیں۔ ناشتا کر لے، تارڑ صاحب بھی کر رہے ہیں! بقا بہت اچھا انسان تھا۔ بہترین ساتھی، سفر میں خیال رکھنے والا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا۔

میں بیدار ہو گیا۔ بقا کی آواز سے تو چنار پر بیٹھے پرندے تک پرواز کر جاتے ہوں گے۔ باہر آیا تو نکھری صبح کا نور پھیلا ہوا تھا۔ سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ چوٹیوں کی برف عجب کہانیاں سنا رہی تھیں۔ تازہ اور صاف ہوا کے جھونکے مجھے تر و تازہ کر گئے۔ پھول تر و تازہ ہو کر مہک رہے تھے اور دھیرے سے چلتی ہوا میں اپنی ٹہنیوں پر جھوم رہے تھے۔ سب سے زیادہ حیران کن اور میرے لیے نیا منظر پسو کونز کا تھا۔ بہت سی ہزاروں فٹ بلند مخروطی چٹانیں، اپنے آس پاس اور دائیں بائیں خاموشی کی حالت کھڑی، نجانے کیا تک رہی ہیں اور کب سے تک رہی ہیں۔ ان کی ڈھلوانیں اتنی شفاف کہ برف ان پر بمشکل ٹکتی ہے۔ بتورا اور پسو گلیشیئر سے جڑی یہ بیس ہزار فٹ سے بلند چٹانیں پوری دنیا میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے ایک مقام رکھتی ہیں۔ دنیا بھر سے سیاح انہیں دیکھنے اور اس کی فوٹو گرافی کرنے یہاں آتے ہیں۔ دیکھنے میں تنہا اور خوف بھر دینے والی کونز اپنے اندر اتنی کشش رکھتی ہیں کہ میں ان کا اسیر ہو گیا۔

قراقرم اور ہمالیہ کے اندر جانے کے لیے بھی ایک حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ اس میں پھیلی تنہائی آپ کو پاگل کر دے گی اور اگر آپ تنہائی کے متلاشی ہوں تو آپ کے لیے جنت یہی ہے۔ میں قراقرم کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ تنہائی مجھے اچھی لگتی ہے مگر یہاں تو دہشت اور افسردگی دونوں ہیں۔ دہشت اس چیز کی ہوتی ہے کہ کیا آپ زندہ یہاں سے نکل پائیں گے۔

میں بھی اسی خوف میں مبتلا رہا اگر مجھے کینیڈا نہ جانا ہوتا تو میرا خوف اتنا شدید نہ ہوتا۔ یہ میری آوارگی کا آخری سفر نہ تھا بلکہ میری آوارگی تو اس کے بعد شروع ہونے والی تھی۔ مجھے رشک آ رہا تھا تارڑ صاحب پر۔ وہ مدتوں سے ایسے سفر کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہر سفر کے دوران کہتے اس کے بعد میں نہیں نکلوں گا ایسے جہانوں میں مگر دوسرے سال کہیں اور پہنچے ہوتے ہیں۔ چند سال پہلے مجھے کہہ رہے تھے کہ اب میرے شمال کے سفر ختم ہو گئے۔ میں اب ساٹھ سال کا ہو رہا ہوں اور اب ہمت بھی نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ”تارڑ صاحب! ابھی آپ ماشاء اللہ فٹ ہیں آپ جا سکتے ہیں۔“ انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”میں اپنے آپ کو زیادہ جانتا ہوں یا تم؟“



یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ پچھلے سال پاکستان گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ بتا رہے تھے کہ اس سال راکا پوشی کے بیس کیمپ ایک چینل والوں کے اصرار پر گیا تھا۔ میرے خیال میں یہ شوق آپ کی زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ صحت اور استطاعت ہے تو آپ کہیں پہاڑوں میں جانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے میں بھی ویسے ہی لوازمات تھے جو رات کھانے میں تھے۔ راجا صاحب نے حد کر دی تھی۔ تارڑ صاحب ان سب چیزوں سے منع کرتے رہے پر راجا صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ناشتے کے بعد راجا صاحب کا ڈرائیور پندرہ کلومیٹر دور ہمیں پسو گاؤں چھوڑنے کے لیے جیپ لے آیا۔

راستے میں ایک پل کراس کیا تو دریائے ہنزہ ہمارے دائیں جانب آ گیا۔ اب تو ان علاقوں میں جھیل بن گئی ہے، ورنہ اس وقت دریا کا پاٹ چوڑا اور گہرا ہوا کرتا تھا۔ ہماری جیپ پسو گلیشیئر کے پاس آ کر رکی، اتر کر آس پاس، اوپر اور ادھر ادھر دیکھا۔ گہری سانسیں لیں، فوٹو بنوائے اور جیپ میں آ بیٹھے اور چل دیے۔ بقا کے پاس ویڈیو کیمرا ہے۔ جب بقا سے ویڈیو بنوانے کی خواہش کرتی ہو تو پھر بقا، بقا نہیں رہتا بلکہ وہ بقا بھائی بن جاتا تھا اور اپنے بھائی بنانے پر وہ انتہائی درجے کی سنجیدگی طاری کر لیتا، بھنوئیں اٹھا لیتا اور بڑی مشکل اور تکلیف کی کیفیت طاری کر کے اپنا کیمرا نکالتا اور چند سیکنڈ کا شاٹ لیتے وقت اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتا اور پھر منہ پھیر کر کیمرے کو دوبارہ سے پیک کرنے لگ جاتا۔

پہلے پسو کا چھوٹا سا قصبہ آتا ہے۔ چند دکانیں، چند ہوٹل، چند ہی موٹل اور سڑک سے دور ہو کر بلندیوں تلے چند گھر اور کچھ کھیت...... یہی پسو تھا۔ یہ قصبہ یا گاؤں جس تیزی سے آیا، اسی رفتار سے گزر گیا۔ ہمیں ”بتوراان“ میں رہنا تھا، جو پسو سے شمال کی جانب کچھ فاصلے پر ہے۔ بتوراان دراصل پہلے ان چینی باشندوں کی بیرکیں تھیں جو شاہراہ ریشم کا شمالی حصہ بنا رہے تھے۔

سڑک کے ساتھ ہوٹل کی لابی تھی۔ ایک بڑا ہال نما کمرا، جس میں آرام دہ صوفے لگے تھے۔ دروں پر مقامی دستکاروں کے نمونے سجاوٹ کے لیے لٹکے تھے۔ ستونوں سے قالینوں کے ٹکڑے لپٹے تھے۔ ایک دکان بھی تھی جہاں روزمرہ کی اشیا کے علاوہ دستکاریاں اور ظروف بھی رکھے تھے جو اس موٹل میں ٹھہرتا ہے تو پسو کی مارکیٹ سے دور ہوتا ہے۔ اس

لیے ضرورت کا سامان یہاں پر دستیاب ہوتا ہے۔ لابی کے پیچھے ایک میدان سا تھا اور جس سے پرے ایک لائن میں ہٹس بنے تھے۔ ہمیں ایک سو چار نمبر والا ہٹ ملا جو لائن کے آخر میں تھا۔ ہم جیپ پر صرف پندرہ کلومیٹر کی مسافت طے کر کے آئے تھے اور تھکاوٹ وغیرہ کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ اس لیے دھیرے دھیرے اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑا کمرا، اس میں تین بیڈ لگے تھے اور چند کرسیاں تھیں واش روم صاف ستھرا تھا۔ ہمارا سامان فرش پر بکھرا تھا۔

تارڑ صاحب آتے ہی سو گئے۔ باہر کرسیاں پڑی تھیں۔ میں تیز دھوپ کی پروا کیے بغیر ان پر جا بیٹھا۔ کافی دیر تک خنک ہوا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ بقا اپنے ویڈیو کیمرے کے لینز کا کور کہیں گرا بیٹھا تھا اور بوکھلایا ہوا اسے قراقرم کی وادی میں ڈھونڈ رہا تھا، جس طرح مجنوں ریگستان میں اپنی لیلیٰ کو ڈھونڈتا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ''بقا بھائی! ذرا ویڈیو تو بناؤ۔''

بقا بھائی غصے سے مجھے گھورتا رہا۔ شدید صدمے سے اس کی مونچھیں دونوں جانب لٹک چکی تھیں۔ ان دنوں ویڈیو کیمرا ایک قیمتی اور نایاب چیز تھی۔ جس کے پاس کیمرا ہوتا وہ آدھا فلم میکر کہلاتا تھا۔ بقا ہمارا وہ فلم میکر تھا جو اپنی فلم کا اسکرپٹ ہی بھول بیٹھا تھا۔

پسو کونز مجھے تک رہی تھیں۔ وہ ایک شاندار منظر میں نظر آتیں، یہ چٹانیں پورے پسو کیا ہنزہ تک کے منظر کو بھرتی تھیں۔ پسو کونز سے ایک درہ اندر کو نکلتا ہے کوئی بتا رہا تھا کہ شمشال کو جاتا ہے۔ وادی شمشال جس کو دیکھنے کے لیے ہم اتنی دور آئے تھے۔ تارڑ صاحب کا پہاڑوں سے عشق اتنا شدید تھا کہ وہ ہم سب کو یہاں لے آیا تھا۔ یہاں آکر محسوس ہوا کہ آپ کہیں بہت دور ہیں۔ یہ مقام آپ کا جانا پہچانا نہیں۔ آپ اس میں زبردستی گھس آئے ہیں۔ ہم کیا کرنے آئے تھے؟ کیوں یہ کرنے آئے تھے؟ یہ ہم نے سوچا بھی نہ تھا اگر سوچتے تو عشق کے دریا میں کیسے کودتے، عقل تو اکثر دغا دیتی ہے۔ ہم دل کی سن کر یہاں چلے آئے تھے۔

ایک دو بار میں نے چپکے سے کمرے میں جھانکا تو وہاں سے تارڑ صاحب کے خراٹے ابھر رہے تھے۔ میں دوبارہ خاموشی میں باہر آ بیٹھا۔ بقا معلوم نہیں کیا سوچ کر لینز کا کور ڈھونڈنے سامنے ایک پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔

تارڑ صاحب کے ساتھ شمشال جانے کا پروگرام پچھلے سال کا تھا۔ جون سے ستمبر تک میں ہر ہفتے ان کو فون کرتا رہا تھا اور ہر بار جواب ملتا تھا کہ ابھی تک کچھ فائنل نہیں ہوا، اگلے ہفتے معلوم کرنا۔ اسی طرح تین ماہ نکل گئے تھے۔ ستمبر میں تارڑ صاحب نے کہا تھا کہ اگلے اپریل میں معلوم کرنا۔ میں ان کے پیچھے پڑا رہا تھا جس کا نتیجہ اب جا کے یہ نکلا تھا۔ میں خالی خالی نظروں سے اس ویرانے اور تنہائی میں بیٹھا صرف ایک شخص کو دیکھ رہا تھا اور وہ بقا تھا۔ دور دور تک آسمانوں میں پھیلے قراقرم کے سنگدل پہاڑ تھے، سنسناتی ہوائیں تھیں اور میرا ایک پریشان حال دوست!

ساتھ والے ہٹ سے کچھ فرانسیسی بارآمد ہوئے۔ مجھے بیٹھے دیکھا تو ہیلو کہا۔ میں پچھلے سال فرانس گیا تھا۔ فرانس میں یہ لوگ انگلش کا ایک لفظ نہیں بولتے۔ گونگے بن جاتے ہیں۔ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین اسٹیشن پر میں پریشان کھڑا تھا اور ٹکٹ کلرک میری بات کا کوئی جواب نہ دے رہا تھا۔ آخر میں نے سرائیکی میں بولنا شروع کر دیا تو وہ یہ زبان سمجھ گیا۔ اس کے بعد میں ان سے سرائیکی میں بات کرتا رہا اور وہ میرا مطلب سمجھتے رہے۔ انہیں انگلش سے نفرت سی ہے۔ آپ ان سے کوئی اور زبان میں بات کر کے دیکھیں تو وہ اسے اشاروں کی زبان سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں مگر انگلش اگر بولیں تو خود بہرے بن جاتے ہیں اور اس دن مجھے ہیلو کہہ رہے تھے اور ساتھ ہی اشارے میں کچھ بتا بھی رہے تھے۔ وہ چین سے خنجراب کراس کر کے آ رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کنکورڈیا جانا تھا اور گشا برم کو سر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ گئے تو پھر وہی سناٹا...... میں کمرے میں آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

تارڑ صاحب کچھ دیر میں اٹھ بیٹھے۔ ''تارڑ صاحب! آپ کی ٹیم آپ کے بغیر بور ہو رہی ہے۔'' میں نے تارڑ صاحب سے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''میری آدھی ٹیم کہاں ہے؟'' تارڑ صاحب کا مطلب بقا شیخ تھا۔ میں نے کہا۔ ''آدھی ٹیم ہتھیار ڈال بیٹھی ہے کیونکہ اس کا لینز کا کور کہیں گر گیا ہے اور وہ یہاں بتورہ گلیشیر کی برف چھان رہے ہیں۔ اب وہ آزردہ حالت میں، کہیں آسمانوں کو تکے جا رہے ہیں۔''

تارڑ صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔ ''ایک تو تو اپنی یہ جانگلیوں والی مونچھیں کٹوا اور دوسرا بقا کے پیچھے مت پڑ، وہ میرے سفرناموں کا ہیرو ہے۔''

''وہی ہیرو اب زیرو ہے۔ تارڑ صاحب کہیں سے اس کے کیمرے کے لینز کا کور ڈھونڈ دیں۔ ورنہ وہ ہیرو ہم سب کو بھی زیرو کر دے گا۔'' تارڑ صاحب اسی کاہلی سے اپنے بستر سے اترے تو میں نے کہا۔ ''کیا آپ پہاڑوں پر بھی اسی رفتار سے چلتے ہیں، جس رفتار سے آپ بستر سے نیچے اترے ہیں۔'' تارڑ صاحب کی گھورتی ہوئی سرخ آنکھیں میری جانب اٹھیں مگر میں کمرے سے کھسک گیا تھا۔

یہ تو میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا تھا ورنہ جس رفتار اور کمال پھرتی سے تارڑ صاحب نے آگے کے سفر کیے، میں خود حیران رہ گیا تھا۔

ایک جیپ آئی۔ ڈرائیور شمشال کا رہنے والا اسحاق کریم تھا کل ہمیں شمشال کے درے میں چھوڑ کر آنا تھا لیکن آج وہ ہمیں پسو گاؤں چھوڑ آیا اور خود صبح چھ بجے پہنچنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔ پسو کا گاؤں چند دکانوں، کچھ ہوٹلز، ریسٹورنٹس اور کچھ کچے پکے گھروں پر مشتمل ہے جو اوپر کھیتوں میں بکھرے ہیں اور قراقرم ان پر اپنا سایہ رکھتے ہیں۔ پسو کی خاص بات کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے آپ کا اتنا سمجھنا ہی کافی ہوگا کہ کوئی بھی چیز سطح سمندر سے ڈھائی ہزار میٹر کی کم بلندی پر نہیں ہے۔ سات ہزار میٹر سے بلند شسپر پیک، پسو پیک اور بتورہ پیک اس علاقے کو آباد رکھتی ہیں۔ اسی بلندی کی پسو کونز کا تذکرہ سب سے بڑھ کر ہے اور دنیا سے سیاح ان چٹانوں کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔ پولر ریجن سے باہر دنیا کا پانچواں بڑا گلیشیر بتورہ، اپنی دم یہاں سلک روڈ پر رکھتا ہے۔ چھپن کلومیٹر طویل گلیشیر پوری دنیا میں اپنی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ساٹھ کلومیٹر لمبا پسو گلیشیر بھی یہیں سانسیں لیتا نظر آتا ہے۔ ایک کوہ نورد کو اس کے علاوہ پسو میں کیا چاہیے؟

تارڑ صاحب بہت سال پہلے یہاں آئے تھے۔ ماسٹر حقیقت صاحب نے ان کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ خلوص اور محبت سے بولے گئے چند الفاظ ہی تو سب سے بڑی آؤ بھگت ہوتے ہیں۔ ماسٹر حقیقت صاحب وفات پا چکے تھے۔ ہم نے ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر ان کے لیے فاتحہ پڑھی۔ شسپر پہاڑ کی مخروطی بلند چوٹی ان چند قبروں پر جھکی تھی جن کے پاس ہم کھڑے تھے اور تیز ہوا ہمارے چہروں کو چھو رہی تھی۔

میں نے تارڑ صاحب کا ایک سفرنامہ پڑھا تھا جس میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شسپر ان موٹل کے برآمدے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ رات کا وقت ہوتا ہے اور لالٹین جلتی ہے۔ اسی موٹل کی یادیں تازہ کرنے کے لیے تارڑ صاحب ہمیں شسپر ان لے گئے۔ میں انہی یادوں میں ادھر ادھر وہ لالٹین ڈھونڈتا رہا۔ وہ شام میرے اندر تارڑ صاحب نے بسا دی تھی۔

پھر ایک ریسٹورنٹ میں آئے۔ مالک کا نام غلام محمد ہے۔ تارڑ صاحب کے سفرناموں میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے مگر آج وہ کچھ سرد مہری سے ملا۔ ہر بندہ چاہتا ہے کہ سفرناموں میں وہ اچھے ہی انداز میں پیش ہو، جو ممکن نہیں۔ کچھ پھر خفا ہو جاتے ہیں۔ غلام محمد بھی اسی کیفیت میں مبتلا لگتا تھا۔ چند میز کرسیاں رکھی تھیں، ایک مستطیل نما چھوٹا سے ہال نما کمرا تھا۔ غلام محمد کاؤنٹر پر اپنے ہاتھ ٹکائے کچھ کہہ رہا تھا اور اپنے تاثرات چھپا رہا تھا۔ ہم انڈوں کے آملیٹ سے لنچ کر رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر دور بہتا ہنزہ کا دریا تھا اور اس کے پیچھے سلیٹی رنگ کے دیو کھڑے تھے، جن کے قد بہت اونچے تھے یہ قراقری دیو تھے۔

اتنے میں کوئی ٹورسٹ گاڑی آرکی۔ کچھ غیر ملکی سوار تھے اور ظاہر تھا کہ کچھ لڑکیاں بھی ہوں گی۔ کسی نے جھانک کر ریسٹورنٹ کی کھڑکی کے پار ہماری جانب دیکھا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر بقا بھائی فدا ہوتے گئے۔ اپنی اسٹک وہیں پھینکی اور سیٹیاں بجاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ اب اس گاڑی کے آگے پیچھے چکر لگانے لگے۔ مجھے یاد آگیا۔ پچھلے سفر میں بھی ایک ایسا ہی منظر نظر آیا تھا۔ ہوٹل کے باہر ایک وین آکر رکی تھی۔ اس سے تین چار ٹورسٹ لڑکیاں اتری تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی ریشہ خطمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی طرح وہ بھی ان لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرتے رہے تھے۔ صبح سے شام تک وہ ان کی خاطر داری میں لگے رہے تھے اور شام میں جب ان کی وین آگے کی جانب چل دی تو اس وقت ان کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ ان کے چہرے کی اداسی دیکھ کر کسی نے تان لگائی تھی۔ ''پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا۔'' اس وقت بھی جب وہ گاڑی نکل گئی اور بقا شیخ سیٹیاں بجاتے ہی رہ گئے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ آبیٹھے۔ ہم باتیں کرنے لگے اور جب جب کچھ وقفہ آتا تو ان کی سیٹی دوبارہ نکل جاتی۔

کچھ ہی لمحوں میں رجب شاہ اندر داخل ہوا۔ چیسٹ کوٹ میں بے تاثر چہرے کے ساتھ رجب شاہ نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پورے ٹریک میں رجب شاہ کے چہرے پر کوئی اور تاثر نہیں دیکھا۔ ایک ہی کہانی کھدی تھی، اس سرد چہرے پر اور کہانیاں سرد ہواؤں کی لکھی تھیں جو برفانی گلیشیر دل سے اٹھتی ہوں گی اور اس چہرے پر سالوں سے ٹکرا رہی ہوں گی۔ ان ہواؤں نے یہ چہرہ بھی سرد کر دیا تھا مگر اس کے اندر ایک نفیس انسان تھا۔ منافقت سے پاک کم گو مگر کسی گھڑی خود سے بے پروا نہ تھا۔

رجب شاہ کے بارے میں کیا لکھوں۔ کتنے لوگ اسے جانتے ہیں۔ کون کون اس سے واقف ہے۔ شاید بہت کم یا کوئی بھی نہیں۔ آج میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ میں شمشال میں بیٹھا اس سے انٹرویو کررہا تھا تاکہ اس کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ آج یہ وعدہ پورا کررہا ہوں۔

پہاڑوں کو سر کرنے والوں اور انہیں چاہنے والوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ چھوٹی سی مگر انتہائی خوبصورت۔ اس دنیا کا ایک کردار رجب شاہ ہے۔ پینسٹھ سال پہلے تک پاکستان میں موجود آٹھ ہزار میٹر بلند پانچ چوٹیوں میں ایک بھی سر نہ ہوئی تھی۔ جب میں اس سے ملا تو وہ پہلا پاکستانی تھا جو پانچوں چوٹیاں سر کرچکا تھا اور ایورسٹ سے دو سو گز دور رہ کر واپس آگیا تھا کیونکہ ایک برفانی طوفان نے پوری ٹیم کو واپس بیس کیمپ کی طرف دھکیل دیا تھا۔

اسے پاکستان اور دنیا بھر سے ایوارڈ ملے پذیرائی ملی۔ کوہ پیماؤں کے حلقوں میں شہرت ملی۔ مختلف ملکوں میں سرکاری مہمان بن کر گیا مگر جب بھی آپ اس سے ملیں گے تو انتہائی عاجزی سے ملے گا۔ مجھے ایسے لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے بھی واقف نہیں ہے۔ اسے یہ ادراک بھی نہیں کہ اس نے کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ شمشال کے لڑکوں کو راک کلائمبنگ سکھاتا تھا۔ اپنی طرح مضبوط رجب شاہ کا جوان، کڑیل بیٹا رحیم بھی باپ سے ٹریننگ حاصل کررہا تھا۔ انتہائی پھرتی سے وہ اونچی چوٹی پر چڑھ جاتا ہے اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ پیروں میں مقناطیس ہے۔ سیدھی سیدھی فخر سے گردن اکڑائے کھڑی چٹانوں کا غرور خاک میں ملانے کے لیے وہ جیسے چٹانوں سے چپک چپک کر چڑھتا چلا جاتا تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے بہت بھایا تھا۔ اس ٹرپ کے بعد میں کینیڈا چلا آیا تھا۔ ایک بار تارڑ صاحب سے فون پر بات ہوئی تو بتایا کہ رحیم راک کلائمبنگ کرتے ہوئے ہلاک ہوگیا ہے۔ میں نے فون بند کردیا تھا۔ کافی دیر تک ایک شدید صدمے میں رہا تھا۔ کچھ مہینے پہلے بی بی سی پر خبر چلی کہ دنیا کا مشہور کوہ پیما رجب شاہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ مرنا تو سب کو ہے مگر کچھ اموات دہلا دیتی ہیں۔ میں نے پاکستانی اخباروں میں، میڈیا میں اور تو اور سوشل میڈیا کو بھی کھنگالا مگر رجب شاہ کے انتقال کی کوئی خبر نہ ملی تو میرا دکھ زیادہ بڑھ گیا۔ کیا کوئی اپنے ہیروز کو بھی ایسے نظرانداز کرتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں حکمران ٹھیک نہیں ملے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قوم مجموعی طور پر ٹھیک نہیں ہے اگر ٹھیک ہوتی تو حکمران بھی ٹھیک ہوتے۔ کیا رجب شاہ کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ سرکاری طور پر اس کی خدمات کو الفاظوں ہی میں سراہا جاتا۔ آج میں آپ کو رجب شاہ سے لیے انٹرویو کے چند موٹے موٹے حصے مختصر کرکے بتاتا ہوں۔

شمشال ہی میں 1949ء میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کے والد صاحب زمینداری کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ شمشال میں اور کیا ہوسکتا تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ شمشال میں پورٹر اور گائیڈ کا کام سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ رجب شاہ نے بھی بیس سال کی عمر میں پورٹر کا کام شروع کردیا تھا۔ پہلا بڑا ٹریک اس نے بطور گائیڈ 1986ء میں کیا جب کینیڈا کی ایک ٹیم کو وہ بیافو گلیشیر پر لے کر گیا۔ اس کے بعد رجب شاہ نے Expedition شروع کردی اور باقاعدہ کوہ پیما بنانے لگا۔ خود تو کوہ پیمائی نہیں کرتا تھا بلکہ Porter High Altitude بن گیا۔ 1987ء میں پھر ایک کینیڈین، جاپانی، پولش اور جرمن ٹیم کے ساتھ سردیوں کے مہینوں میں اروکس سے کے ٹو بیس کیمپ تک کے ٹریک بنائے۔ میرے اپنے حساب سے یہ بہت مشکل کام تھا اور پھر اسی سال کے ٹو کے کیمپ 3 بطور پورٹر گیا۔ پہلی بار کے ٹو کو 1989ء میں پاکستان آرمی کے ساتھ سر کیا۔ 1990ء میں جاپانی ٹیم کے ساتھ گشابرم ون کو سر کیا۔ 1991ء میں جاپانی ٹیم کے ساتھ ٹرنیور پیک سر کرنے گیا مگر کیمپ فور پر برفانی طوفانوں نے سب کو پیچھے دھکیل دیا اور وہ ناکام رہے۔ اگلے سال گشابرم ون دوبارہ سر کی۔ 1992ء میں براڈ پیک کو جاپانیوں کے ساتھ سر کیا۔ اگلے سال شسپر پیک کو سر کرنے گیا مگر جاپانیوں نے اسے چوٹی کے نیچے کھڑا رکھا اور سر نہیں کرنے دیا۔ 1995ء میں پولش ٹیم کے ساتھ ایک بار پھر کے ٹو سر کیا۔ 1996ء میں پسو پیک پاکستانیوں سے مل کر سر کیا۔ 1997ء میں ایورسٹ سر کرنے گیا مگر خراب موسم کی وجہ سے نہ کرسکا۔ 1998ء میں جاپانی ٹیم کے ساتھ گشابرم ٹو سر کیا۔ نانگا پربت بھی سر کیا مگر سال لکھنا بھول گیا۔ رجب شاہ سادگی سے یہ سب بتا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ پاکستان کی سربلندی اور سبز پرچم کے لیے میں اپنی جان کو خطروں میں ڈالتا تھا۔ کہتا تھا کہ مجھے ستائش نہیں ملی۔ چھ بچے ہیں اور کسمپرسی کی زندگی ہے مگر پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے رب نے یہ سب مجھ سے کروایا۔ 1999ء میں جب یہ سب باتیں میں اس سے کررہا تھا تو اسی سال اس کا ایک بیٹا امان کے ٹو سر کرنے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کوئی اہم واقعہ جو ابھی یاد ہو تو بولا کہ کے ٹو سر کرکے ہم واپس آرہے تھے کہ ایک اور باہر کی ٹیم اوپر



جارہی تھی۔ ہم انہیں کیمپ فور میں ملے۔ اسی رات کوئی طوفان آیا اور ہمارے سامنے ان کے نو بندے ہلاک ہوگئے۔ پھر ایک بار جب ہم کیمپ ٹو میں رات بسر کرتے تھے۔ خیمہ لگایا اور رات بسر کی۔ صبح خیمہ اکھاڑا تو ایک جوتا ملا۔ برف کھودی تو ایک انسانی ٹانگ ملی اور کھودا تو معلوم ہوا کہ رات بھر ہم ایک لاش پر سوتے رہے۔

یہ میں مختصر کرکے بتا رہا ہوں۔ رجب شاہ اب ہم میں نہیں ہے۔ اس کی یادیں ہیں۔ اس کی سادگی سے سنائی گئی کامیابیاں ہیں۔ اس کی ایک تصویر میرے پاس ہے جو اس نے مجھے دی تھی مگر وہ نہیں ہے۔ منوں ٹنوں برفوں سے بچ نکلنے والا رجب شاہ اب منوں مٹی تلے سو رہا ہے۔

رجب شاہ ہمارے ساتھ لنچ میں شریک ہوا۔ باہر گھمنڈ سے کھڑی شسپر پیک نظر آرہی تھی جس پر جاپانیوں نے اسے چوٹی تک نہیں آنے دیا تھا۔ پسو کے بازار میں ویرانی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے شمشال کے پروگرام کو فائنل کررہے تھے۔ غلام محمد کاؤنٹر پر کھڑا ہمیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

رجب شاہ شام کو آنے کا بول کر کہیں چلا گیا۔ ہم تینوں اپنے ہوٹل کی جانب پیدل چل پڑے۔ پہلے بھی بتایا تھا کہ پسو ان گاؤں سے تین چار کلومیٹر دور ہے۔ یہ پیدل کا سفر ہمیں بہت تنگ کرتا تھا۔ پکی سڑک پر چلتے ہوئے ہم نڈھال ہوگئے تھے۔ بقا ابھی تک گا رہا تھا یا سیٹی بجا رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے زیادہ چلتے رہے۔ ہوٹل آیا تو بقا کو یاد آیا کہ وہ اپنی ٹریکنگ اسٹک تو غلام محمد کے ہوٹل میں ہی بھول آیا ہے۔ اب اس کی سیٹی مکمل طور پر موقوف ہوگئی اور وہ اپنے آپ کو گالیاں دیتا ہوا واپس ہوگیا۔ دو چار ناشائستہ الفاظ تو ہم نے بھی اس کی غیرموجودگی میں اس کے نام کردیے جب واپس پہنچا تو وہ کوئی اور بقا تھا مرجھایا، افسردہ، مضمحل سا بقا۔ شکر تھا کہ اسٹک اسے مل گئی تھی مگر تھکاوٹ سے وہ نڈھال تھا اور پھر پورے ٹریک میں اس نے سیٹی نہیں بجائی۔

ہوٹل کے منیجر کا نام اکرام تھا۔ اس کو تارڑ صاحب نے سامان کی لسٹ دی جس کی ہمیں شمشال ٹریک پر ضرورت تھی۔ اس میں چولہا، مٹی کا تیل، دیگچیاں، پلیٹیں، چمچے اور پتا نہیں کیا کچھ۔ نہیں اس بار اس جھنجھٹ سے آزاد تھا۔ تارڑ صاحب نے بقا کے ساتھ مل کر راشن کی خریداری مکمل کرلی تھی۔ دوسرا سامان ہم نے اکرام کو کہہ دیا تھا۔ اس نے کہا کہ صبح یہ سب سامان تیار ہوگا۔ تارڑ صاحب نے پھر تاکید کی اور اس نے پھر یہی جواب دیا کہ صبح کو سامان تیار ہوگا۔

پیدل چلنے سے تھکاوٹ بہت ہوگئی تھی۔ کمرے میں آتے ہی ہم سب سو گئے۔ بقا اب اپنی اسٹک ڈھونڈنے گیا تھا۔ اس کو لینز کا کور ابھی تک نہیں ملا تھا اور اب یہ دوسرا دکھ بھی اسے لگ گیا تھا۔ کچھ دیر ہی سوئے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں سوتا رہا۔ تارڑ صاحب نے دروازہ کھولا تو کچھ پولیس والے تھے۔ تارڑ صاحب سے کہنے لگے کہ آپ کے لیے ہمیں کسی نے بھیجا ہے کہ شمشال تک آپ کے ساتھ رہیں۔ تارڑ صاحب ان لوازمات کی پروا نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں یہ سب پسند تھا۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ میں آنکھیں بند کیے آدھی نیند میں تھا۔ تارڑ صاحب نے مجھ کو آواز دے کر اٹھایا۔ میں نیند ہی کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ وہ اصرار کررہے تھے اور تارڑ صاحب نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ آخر یہ معاہدہ طے پایا کہ تارڑ صاحب ایک تحریری بیان دیں گے کہ مجھے اپنی اور اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کسی پولیس کی ضرورت نہیں۔ اسی وقت وہ دستاویز لکھی گئی۔ دستخط ہوئے۔ انگوٹھے لگے اور اس کاغذ کو ایک پولیس والے نے لپیٹ کر پتلون کی جیب میں رکھا اور دروازہ کھول کر وہ سب نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی جس حالت میں بیٹھا تھا دوبارہ اسی حالت میں سوتا چلا گیا۔

پھر رجب شاہ آیا۔ بقا بھی اپنی اسٹک کو اپنے سینے سے لگائے واپس آچکا تھا۔ بند تھے سامان کو پھر سے کھولا گیا۔ ہر چیز کو رجب شاہ نے زور لگا کر سلیقے سے دوبارہ پیک کیا۔ ہمارے رک سیک اب کس کر باندھے جاچکے تھے۔ سامان تیار تھا۔ مسافر بھی تیار تھے شام اتر رہی تھی اور اب ہم باہر کرسیاں بچھائے گرم چائے پی رہے تھے۔ اب میں ذہنی طور پر تیار تھا کہ میں شمشال ٹریک پر جا رہا ہوں۔ خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی جس میں مبتلا تھا۔ تارڑ صاحب کی نظریں پسو کونز پر تھیں۔ میں بقا کو دیکھ رہا تھا اور وہ اپنی اسٹک سے زمین پر لکیریں کھینچتا چلا جا رہا تھا۔

صبح اٹھے اور کمرے سے باہر آکر دیکھا تو سورج پسو کونز کے پیچھے اپنی کرنیں ڈال رہا تھا۔ چوٹیاں جوان کرنوں کی زد میں تھیں، وہ سنہری ہو رہی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ طلوع آفتاب کا منظر پسو کونز کے پیچھے سے پورے گوجال میں شہرت رکھتا ہے۔ سورج نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی کرنیں کونز پر پڑ کر واپس آسمان میں منعکس ہو رہی تھیں۔ آجکل تو آوارہ گردوں کے لیے فوٹوگرافی کے بہت وسائل ہیں۔ ان دنوں جب فلم کیمرے تھے اور فوٹوگرافی ایک مہنگا شوق تھا میرے

لیے ایک ایک منظر کو شوٹ کرنا ممکن نہ تھا۔ آج کل ڈیجیٹل دور ہے۔ ایک سے ایک شاندار کیمرا موجود ہے۔ اس لیے فوٹوگرافی کے شاندار شاہکار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں اس منظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ نہ کرسکا اور اس کے لیے میں آج بھی ملال رکھتا ہوں لیکن خوشی یہ ہے کہ یہ منظر میں نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

جیپ آچکی تھی۔ اسحاق کریم ڈرائیور تھا۔ رجب شاہ بھی آچکا تھا۔ اپنی نگرانی میں اس نے جیپ پر سارا سامان لوڈ کروایا۔ ساتھ میں شمشال کا رہنے والا نوجوان قدرت تھا۔ اس کی شکل اور جسامت ہالی ووڈ کے اداکار کلنٹ ایسٹ ووڈ جیسی تھی۔ اس نے وزنی سامان اپنی پیٹھ پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بھی رجب شاہ کی طرح بلند پہاڑوں کا پورٹر تھا۔ اب وہ ہمارے ساتھ شمشال جارہا تھا۔ قدرت کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ وہ ایک بہترین دوست تھا۔ ہم رات گئے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کیمپ کے باہر ہو یا شمشال کے دو کمروں کے ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں، وہ بڑے دھیمے اور مہذب انداز میں پہاڑوں اور ویرانوں کے قصے سناتا تھا۔

وہ چینی سائیڈ سے کے ٹو بیس کیمپ ایک ٹیم لے کر گیا تھا اور وہیں سے واپس آرہا تھا۔ ایرک ایک مغربی کوہ پیما تھا۔ پچھلے سال وہ چینی سائیڈ سے کے ٹو آیا تھا اور شاید کسی حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی بہت روئی۔ پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ ایرک زندہ ہے اور بیس کیمپ کے آس پاس موجود ہے۔ وہ سیدھا پاکستان آئی۔ ایک ٹیم بنی جس نے کے ٹو کے بیس کیمپ جاکر ایرک کو ڈھونڈنا تھا۔ ایرک کی بیوی بھی ہمراہ رہی۔ قدرت نے بتایا کہ ہم نے بیس کیمپ کے آس پاس کے ویرانوں، کھائیوں اور غاروں کو چھان مارا مگر ایرک نہ زندہ ملا اور نہ ہی مردہ۔ اس کی بیوی پاگلوں کی طرح اس کو ڈھونڈ رہی تھی۔ قدرت نے بتایا کہ کئی بار میں بھی اس کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوا۔ دو ہفتے وہ بیس کیمپ کی خاک چھانتے رہے اور پھر ناکام ہوکر واپس ہوئے۔ اس کی بیوی بار بار مڑکر بیس کیمپ کو دیکھ رہی تھی۔ اکثر ہمارے یہاں یہ مشہور ہے کہ مغرب کے میاں بیوی وفادار نہیں ہوتے دونوں اپنے اپنے معاشقے چلا رکھے ہوتے ہیں۔ پہلے میرے بھی یہی خیالات تھے۔ قدرت کی سنائی کہانی کے بعد اور بعد میں مغرب میں رہ کر دیکھا کہ سب سے زیادہ وفا ان میں ہوتی ہے۔ جب تک وہ ساتھ رہتے ہیں۔ نہیں بنی تو علیحدہ ہوگئے۔ یہ نہیں کہ نہ بنی تو ساتھ بھی رہے اور اپنے چکر بھی چلاتے رہے۔ کوئی ایک واقعہ مختلف بھی ہوسکتا ہو مگر عمومی طور پر ہماری سوچ ان کے بارے میں غلط ہے۔

ہم نے ناشتا ہوٹل کی لابی میں کیا۔ سورج ابھی پسو کونز کے پیچھے تھا کہ ہماری جیپ روانہ ہوئی۔ اب ہم دریائے ہنزہ پر بنے ایک پل کو کراس کرکے دریا کے ساتھ ساتھ اس درّے کی جانب بڑھے جو آگے دو دن کی مسافت پر شمشال لے جاتا۔ پسو کونز اور دوسرے سربلند چٹانوں کے بیچ ہماری جیپ بے حیثیت ہوکر چلتی رہی، جیسے کسی وسیع و عریض صحرا میں کوئی چیونٹی۔ سورج کی کرنیں بلند چٹانوں کی چوٹیوں پر تھیں اور زمین ابھی سائے میں تھی۔

ہم درّے میں داخل ہوئے۔ چٹانوں کے معبد سنہری تھے۔ سورج طلوع ہوتا تو اپنی کرنیں چہار جانب پھینکتا۔ میں اور تارڑ صاحب، ڈرائیور اسحاق کریم کے ساتھ آگے والی سیٹ پر تھے۔ پیچھے قدرت، رجب شاہ اور بقا شیخ بیٹھے تھے۔ جیپ کے پیچھے سب کا سامان رکھا تھا۔ آگے بڑھے تو بائیں ہاتھ پر ایک چٹان کے نیچے قدرتی طور پر بنے کمرے نظر آئے۔ رجب شاہ نے بتایا کہ یہاں چلاس کے لوگ رہتے ہیں جو پہاڑوں سے سلاجیت نکالتے ہیں۔ اس علاقے کا نام جرجر تھا۔ اب ہم دوت کراس کرکے روڈ کیمپ تک جارہے جہاں تک سڑک بن چکی ہے۔ سن 88ء تک پیدل سفر پسو سے شروع ہوجاتا تھا۔ چھ گھنٹے بعد جرجر میں پہلا قیام ہوتا تھا۔ شمشال دریا کے ساتھ ہی وہ جگہ تھی جہاں ٹریکر پکنک مناتے تھے یا کچھ اور بھی کرتے تھے۔ پھر جرجر سے دوت تک پانچ گھنٹے کا ٹریک تھا اور دوسری رات دوت میں ہوتی تھی۔

ہماری جیپ تنگ درے میں چلتی رہی۔ دریا شمشال نیچے کسی کھائی میں بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر میں دوت کا علاقہ آیا۔ چند مکانات اور ان پر چھائی ویرانی۔ ویرانی کا سبب وہ سنگلاخ چٹانیں تھیں جو ان مکانوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی سبزہ ہو گا مگر میری نظر جیپ ٹریک پر زیادہ تھی۔ آگے روڈ کیمپنگ تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اس سے آگے سڑک نہیں جاتی اور اگر کسی کو جانا ہے تو وہ پیدل ہی جائے گا۔

روڈ کیمپنگ پر جیپ رکی۔ میں احتیاط سے اترا کیونکہ اگر میں رکتا نہیں تو میرا اگلا قدم کسی گہری کھائی میں جاسکتا تھا اس کھائی کی تہہ میں شمشال دریا کا پانی بہہ رہا تھا اور اتنا نیچے بہہ رہا تھا کہ پانی کا شور بھی ہم تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ ایک تو وہ بہت گہرائی میں تھا اور دوسرا وہاں بہت سے مزدور کام کررہے تھے۔ پتھر کوٹے جارہے تھے۔ فضا میں گرد تھی۔ مٹی ہر طرف اڑ رہی تھی۔ ایک گرد کا طوفان سا تھا جو ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔

میں زمین پر وہ ٹریک ڈھونڈ رہا تھا جس پر ہمیں سفر کرنا تھا۔ مجھے کسی ٹریک کے آثار تک نظر نہ آئے۔ نجانے کس خیال سے میری نگاہ اوپر بہت اوپر، ہزاروں فٹ بلند پہاڑوں کی سنگلاخ چوٹیوں پر پڑی اور پھر میں نے کچھ غور سے دیکھا کہ ایک پتلی پگڈنڈی تھی یا میرا شک، کوئی راستہ تھا جہاں صرف رسوں کی مدد سے کھینچا جاسکتا تھا اور وہی میرا ٹریک تھا۔ میں نے تارڑ صاحب کا بازو پکڑا اور کہا کہ ذرا دوربین لگا کر اوپر تو دیکھیں۔ وہ بولے "کیا مارخور ہیں؟"

"نہیں یا نہیں مگر ہمیں آج بننا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔ انہوں نے دوربین سے اس خودکش ٹریک کو دیکھا تو بولے۔ "آج مارے گئے۔"

بقا کہیں سے برآمد ہوا۔ اس کو میں نے وہ خون آشام راستہ دکھایا تو بقا بھی آسمان کی جانب چڑھتے راستے کو پریشانی سے دیکھنے لگا۔ رجب شاہ ہماری کیفیت دیکھ کر ہنسا اور ہم رجب شاہ کو ہنستے دیکھ کر قطعاً خوش نہ ہوئے تھے۔ یہ ایک اذیت تھی یا کوئی سزا تھی۔ ہنزہ کے میر یہاں اپنے خطرناک قیدیوں کو بھیجتے تھے۔ معلوم نہیں مجھ سے کیا جرم ہوا تھا کہ میں نے خود اپنے آپ کو کوئی سزا سنائی تھی جو اس آدم خور ٹریک کی جانب آنکلا تھا۔ جو بھی تھا میرا اپنا فیصلہ تھا اور اب مجھے خود ہی بھگتنا تھا۔

ان دنوں سینٹرل شمشال تک جانے کے لیے سڑک زیرِ تعمیر تھی اور آگے شمشال تک جانے کے لیے دو دن کا ٹریک تھا۔ پھر 2003ء میں یہ سڑک مکمل ہوئی۔ اب سنا ہے کہ ایک خطرناک راستے سے جیپ مسافروں کو وہاں لے جاتی ہے۔

وہاں بہت سے مزدور کام کررہے تھے جن کے لیے ایک کھوکھا دکان بھی تھی۔ مجھے وہاں سے ایک اسٹک مل گئی۔ دکان کے باہر دھول میں اٹے، نیلے پلاسٹک کے ڈرم پڑے تھے۔ ان میں مزدوروں کا سامان بند تھا۔ کچھ ڈرم شمشال والوں کے تھے۔ ان میں وہ اپنا سامان رکھتے تھے۔ رجب شاہ نے ایک ڈرم کے گرد لگی زنجیر میں لگا تالا کھولا۔ ایک شلوار قمیص کا جوڑا وہاں سے نکالا۔ پھر کسی تھیلے میں سوٹ تبدیل کر کے آگیا۔ سوٹ پھر ڈرم میں ڈالا اور پھر سے تالا لگا کر فارغ ہوگیا۔

اتنے میں ہمارے پورٹرز بھی آپہنچے۔ قربان شاہ، رہبر کریم، رضا کریم اور مہمان بیگ ہمارے پورٹرز تھے۔ قربان بلندیوں تک کا پورٹر تھا۔ وہ بھی آٹھ ہزار میٹر سے بلند چوٹیوں کو سر کرچکا تھا۔ اسے صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔ قدرت کا آج کل پہاڑوں کو سر کرنے میں بڑا مقام ہے اور دنیا کے مشہور کلائمبر میں اپنا نام بنا چکا ہے۔ اس کے کارنامے لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحے کالے ہوجائیں گے۔ آج کل شمشال کی ایک بیٹی ثمینہ بیگ نے دنیا میں اپنی دھوم مچارکھی ہے۔ وہ پہلی پاکستانی خاتون ہے جس نے ایورسٹ کو 2013ء میں سر کیا اور بھی بہت سے عالمی شہرت یافتہ کوہ پیما ہیں جو شمشال سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اگر ایک ایک کا ذکر کروں تو اپنے سفر نامے سے ہٹ جاؤں گا۔

روڈ کیمپ پر گرد کا طوفان تھا جس سے بچنے کے لیے ہم اس چھوٹی سی دکان کے اندر دروازے بند کیے بیٹھے تھے ایک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی اور انجانی راہوں کی مسافت کے سبب سب خاموش تھے۔ میں کسی دھواں دار اور خواب ناک ماحول کی توقع کررہا تھا مگر یہاں دھول تھی۔ سنگلاخ چٹانیں اور ایک وحشت ناک ٹریک ہمارا منتظر تھا۔ ہم اس دکان کا دروازہ بند کرکے چائے پی رہے تھے۔ دروازے کی درزوں سے روشنی کے ساتھ ساتھ دھول بھی آرہی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر روڈ کیمپ نے مجھے کچھ خوف زدہ کردیا تھا۔ میں اپنی مایوسی اور اداسی کو باہر نہیں لاتا تھا کیونکہ میں اس اُمید پر تھا کہ ہر خوبصورت مقام تک جانے کے لیے جو راستے ادھر کو جاتے ہیں وہ کوئی آسان نہیں ہوتے۔

باہر رجب شاہ سب پورٹرز کو سامان تول کر دے رہا تھا۔ چاروں کے حصے میں برابر سامان بانٹا گیا پھر سب نے اسے اپنی کمر سے کسا۔ میں نے اپنا چھوٹا بیگ پیک کمر سے لٹکایا، جس میں میرا کیمرا تھا، ایک ڈائری، پانی کی بوتل، کچھ ٹافیاں اور دیگر سامان تھا۔ بقا کے گرد سب کھڑے ہوئے۔ اس نے سفری دعائیں پڑھیں۔ ہم نے بھی اپنے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے، جو دل میں تھا اس سے مانگا اور پھر چل پڑے۔

میرا پہلا قدم کسی اونچائی کی جانب اٹھا اور پھر وہ تھما نہیں۔ ایک زگ زیگ کرتا راستہ متواتر اوپر کو اٹھتا چلا جارہا تھا۔ پہلے ارد گرد جھاڑیاں تھیں، جن سے ہم ذرا بچ کر چلتے تھے۔ پھر ہم کیمپ روڈ سے دور اور اوپر ہوتے گئے۔ راستہ پہلے مشکل تھا مگر خطرناک نہیں لگتا تھا۔ مگر پھر اچانک اس نے ایک موڑ کاٹا اور ایک بھربھری چٹان پر رینگنے لگا۔ دریائے شمشال ہزاروں فٹ نیچے بہہ رہا تھا۔ ہم جس راستے پر چل رہے تھے

اس پر سنگریزے تھے جو ہمارے پاؤں تلے آکر ڈھلوان پر پھسلتے جاتے تھے۔ ڈیڑھ دو فٹ کی پگڈنڈی تھی، جو اس ڈھلوان پر بنی تھی جہاں ایک کلومیٹر نیچے دریا تک سنگر ہی سنگر تھے۔ اگر چلتے ہوئے نیچے دیکھ لیا تو آپ کا دماغ گھومنے لگتا ہے اور چکر آنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ایک ستر کا زاویہ بناتی سنگریزوں سے بھری ڈھلوان تھی جس پر ایک بار لڑکھڑا گئے تو پھر دریا تک سنبھلنے کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ لڑھکنے والے اکیلے نہیں لڑھکیں گے، بلکہ لینڈ سلائیڈنگ کی طرح ہزاروں چھوٹے چھوٹے پتھر بھی ہم سفر ہوں گے اور جو درگت وہ راستے میں بنائیں گے تو اس کے بعد لڑھکنے والے کسی سے شکوہ کرنے کے قابل بھی نہ رہیں گے۔ میرا ذہن.... اس بارے میں بالکل شفاف تھا کہ یہاں سے پھسلنا سیدھی موت ہے۔ یہ راستہ بھی پھسلنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ قدم ذرا سا پھسلتا ہے اور موت اپنی گود میں کھینچ لیتی ہے۔ میں کئی ایک راستوں پر گھٹنوں چلا ہوں جہاں پاؤں تلے سنگریزے ہوتے ہیں مگر وہ راستے کسی بلندیوں پر ٹنگے نہیں ہوتے اور اسی لیے ان پر چلنے سے کوئی دہشت دل میں گھر نہیں کرتی ہے۔ یہاں کی کہانی ہی دوسری تھی۔ میں آپ لوگوں کو کیا مثال دوں کہ ڈر جائیں۔ بس یہی کہوں گا کہ میں بہت زیادہ سہما ہوا تھا، لرز رہا تھا اور کسی اور کو نہیں، بس اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ میرے پاس اس ڈر کا صرف یہی حل تھا کہ میں نیچے کھائیوں کی جانب نہ دیکھوں، صرف اپنے قدموں پر نظر رکھوں۔

لیکن تارڑ صاحب نے شاید لینڈ اسکیپ کی وسعت کو جانچنے کے لیے ایک بار نیچے دیکھا ہوگا، اس لیے وہ مجھے چکرا کر اسی پگڈنڈی پر بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے زمین تھام رکھی تھی اور معلوم نہیں کہ وہ کیا فرما رہے تھے، کیونکہ میرے کانوں میں تو صرف سناٹے ہی گونج رہے تھے۔ میں آگے نکل چکا تھا اور بقا کا کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تارڑ صاحب کنکروں کی دنیا میں پھنسے بیٹھے ہیں اور کپکپا رہے ہیں اور رجب شاہ جوان سے آگے آگے چل رہا تھا، وہ پھسلتا ہوا واپس جا رہا ہے۔ رجب نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور تھام کر تارڑ صاحب کو پھر سے اسٹارٹ کر دیا۔

قدرت میرے ساتھ تھا۔ وہ سامنے مجھے کوردن نامی پہاڑ دکھا رہا تھا۔ سات ہزار میٹر سے بلند یہ پہاڑ پہلے وقتوں میں شمشال آنے جانے کا راستہ تھا۔ لوگ اس کے پہلو سے گزر کر شمشال جایا کرتے تھے۔ قدرت کو اس کے بڑے بوڑھے لوگوں نے بتایا تھا کہ انہیں سات دن شمشال پہنچنے میں لگتے تھے۔

''اتنی مسافت پر یہ بستی کیوں بسائی تھی؟ اور کس نے یہ سب کیا تھا۔'' میرا اخاطب گم گو قدرت تھا جس نے بہت سارا سامان اپنی پیٹھ پر لادا ہوا تھا۔ ''تیرہ پشتوں پہلے ہمارے جد امجد، ماموں سنگ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ یہ ایک وسیع زرخیز وادی تھی۔ ساتھ میں شمشال دریا بہتا تھا۔ وہ آیا تو واٹر چینل کے آثار پہلے سے موجود تھے۔ اس کا ایک بیٹا ہوا۔ اس کا نام شیر تھا۔ پولو کا کھلاڑی تھا۔ پھر اس کی تین اولادیں ہوئیں اور یہ لوگ یہیں کھیتی باڑی کرنے لگے یہاں ان کے پاک تھے۔ بکریوں کے ریوڑ تھے۔'' قدرت اس بات کو گول کر گیا کہ اناج اور مویشیوں کا ٹیکس یہاں سے ہنزہ کے میر لیتے تھے۔ ان کا کوئی نمائندہ یہاں رہتا تھا، جس سے میر یہاں اپنا کنٹرول رکھتے تھے اور میر اپنے قیدیوں کو یہاں بھیج دیتے تھے، جس طرح گورے کالا پانی کو بھیجتے تھے۔ یہ ایک قسم کی جیل تھی۔ کوئی یہاں سے فرار کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یہاں پر 1960ء تک میر اپنا ٹیکس وصول کرتے رہے۔ 1960ء میں پاکستانی فوج پامیر پہنچی، کیونکہ یہاں چین کی سرحد تھی۔ فوج نے شمشالیوں کو پورٹر کے طور پر کام دیا۔ یہ پہلی بار شمشالی میر کے علاوہ کسی کا کام کرنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ زمانہ بدلتا گیا۔ آغا خان نے یہاں بہت کام کروایا۔ اسکول کھل گیا۔ لوگ تہذیب یافتہ ہوتے چلے گئے۔ پھر کوہ پیمائی کا دور یہاں شروع ہوا تو شمشال والوں کو اپنے جوہر دکھانے کا کھل کر موقع ملا۔ انہوں نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ آج بھی آپ شمشال جائیں تو آپ کو یہ دور افتادہ وادی نظر آتی ہے۔ یہیں سے کامیابی کے چراغ پھوٹ رہے ہیں۔

ایک خطرناک مقام پر بقا اپنی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے شیر ہو گیا تھا اور اپنا ویڈیو کیمرا نکال کر پہاڑوں پر فوکس کر رہا تھا۔ شرارت سے کہنے لگا۔ ''ندیم بھائی! یہ اپنا فلسطینی رومال چہرے سے ہٹاؤ میں آپ کی ویڈیو بنانا چاہتا ہوں۔''

میں ایک ایک قدم سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں پر بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ ایسے وقت میں ہر لفظ گالی جیسا محسوس ہوتا ہے اسی لیے میں نے پہلے پہاڑ کو دیکھا اور پھر میرے منہ سے کیمرے کی شان میں کوئی گالی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پھر بھی بقا نے وہ گالی لہجے سے باندھ لی اور ٹریپ میں جہاں کہیں اسے موقع ملتا، وہ پلو کھول کر بیٹھ جاتا۔ اس میں رنگ آمیزی کرتا اور ماحول کو تازہ دم رکھتا تھا۔ بقا کے مزاح نے کسی کو بھی بور نہ ہونے دیا۔

رہبر کریم کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اس عمر کے نوجوان کن کن مستیوں میں رہتے ہیں اور یہاں یہ نوجوانی کو پہنچتا رہبر کریم اپنے بوجھ سمیت ان خطرناک مقامات سے بے خوف گزرتا تھا۔ مہربان بھی چلتا چلتا راستے میں مجھ سے کہیں ٹکرا جاتا۔ میں اس سے گشا برم سر کرنے کے قصے سنتا اور پھر وہ سناتا سناتا آگے نکل جاتا اور میں اپنی تنہائی میں اکیلے چلتا رہتا۔ پوری ٹیم چیونٹیوں کی طرح ان بلند چٹانوں کی ڈھلوانوں پر رینگتی نظر آتی تھی۔ سب کوشش کر رہے تھے کہ ایک دوسرے کو نظروں میں رکھے رہیں۔

دو گھنٹے کی ہولناکی کے بعد راستہ کچھ ہموار ہوا تو ہم بے فکری اور بے خوفی سے چلنے لگے۔ یہ بے فکری ایک بار پھر خوف میں تبدیل ہوئی۔ ایک اور پہاڑ اس سے بھی بلند جس کو ہم سر کر کے آئے تھے، ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں یہاں منیر نیازی کے خوبصورت شعر کو اس طرح بیان کروں گا۔ جو ایک پہاڑ سے اترا تو میں نے دیکھا۔ میں نظریں اٹھائے اسے دیکھتا رہا۔ ایک اور پہاڑ کا سامنا تھا منیر مجھ کو۔ تارڑ صاحب رجب کے ساتھ آ پہنچے۔ تارڑ صاحب بھی ان بلندیوں کو تک رہے تھے۔ سورج تیرتے بادلوں کے پیچھے کبھی کبھی نظر آنے لگتا تھا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے اور خوف کے عالم میں اپنے سامنے کھڑے پہاڑ کو دیکھتے رہے۔ جس میں کوئی باریک سی لکیر کھینچ دی گئی تھی۔ رجب شاہ کہہ رہا تھا کہ یہی راستہ ہے۔ اب رجب کی بھی ہم نہیں سنتے تھے۔ میں نے کہا تم مسلمان ہو اور اگر تم قسم بھی اٹھاؤ کہ یہ راستہ ہے تو بھی میں یقین نہیں کروں گا۔ یہ کہنے پر اس کے چہرے کا دائمی تناؤ قدرے کم ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہنس رہا ہے۔

قدرت نے اہل عذاب یافتہ ٹریک پر اپنے قدم رکھ لیے تھے اور میں اسے چلتا پھسلتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے بقا سے فرمائش کی کہ ایک بار پھر دعائیں مانگ لی جائیں۔ سب نے پھر سے ہاتھ کھڑے کیے اور بقا قرآنی آیات کا ورد کرنے لگا۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اب کی بار بقا کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ میں نے اپنا سر اور گردن فلسطینی رومال سے ڈھانپ رکھی تھی۔ پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور اس صحرا میں قدم رکھ دیا۔

ایک تنگ اور خطرناک راستہ جو مستقل اترا اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا اس پر مجھے خاموش ہو کر چلنا تھا۔ کوئی راستے میں مل بھی جاتا تو خاموش رہتا۔ ڈر تھا کہ بولنے سے یہ سوتے ہوئے کنکر کہیں جاگ نہ جائیں اور خود بخود پھسلنا شروع ہو جائیں۔ میں اب خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ایک انچ کی بھی لغزش سیدھا موت کی وادی میں پہنچا دیتی۔ پہلی بار میں نے بہت سیریس ہو کر سوچا کہ میں آیا کیوں ہوں؟ میں کہیں ہنزہ کی قریبی وادی سے ہو کر واپس چلا جاتا۔ اپنے کینیڈا کے پروگرام کو آگے بڑھاتا۔ اپنا اور فیملی کا میڈیکل کروا کر ویزے کا انتظار کرتا اور اسی دوران کچھ کمپیوٹر سیکھ لیتا۔ اپنا کاروبار سیٹ تا یونیورسٹی سے چھٹی لینے کا کوئی انتظام کرتا۔ یہ وقت بچوں کے ساتھ گزارتا۔ مجھے اصل خوف یہ تھا کہ اب کی بار تو میں اس چٹان کو کراس کر لوں گا مگر یہی دریا مجھے واپسی پر بھی عبور کرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو کوستا۔ کہیں بقا ملتا تو اسے کھری کھری سنا دیتا۔ یہ سفر معلوم نہیں انہی سوچوں میں کتنی دیر جاری رہا کہ ہم آہستہ آہستہ اس چٹان سے اتر کر دریا کے ساتھ ساتھ، پتھروں بھرے ہموار راستے پر آ گئے۔ یہاں پہلے سے بیٹھے پورٹرز ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ نے تالیاں بجا کر مجھے خوش کرنے کی کوشش بھی کی اور میں قطعاً خوش نہ ہوا اور آرام کرنے کی غرض سے ایک بھاری پتھر سے ٹیک لگا کر سب کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب واپسی پر ہم یہ سب مراحل عبور کر کے شاہراہ ریشم پر پہنچے تو میں نے بے ساختہ کہا۔ ''تارڑ صاحب! شاہراہ ریشم مبارک ہو۔''

اس بات پر رجب شاہ سمیت سب لوگ بے تحاشا ہنس پڑے تھے اور بہت دیر تک اس بات سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔

دریا کنارے میرے ہوش واپس ٹھکانے کو آئے، جب ٹھنڈی ہوا دریا کی سطح کو چھوتی مجھ تک آئی تو جسم میں چھائی سردگی میں دوبارہ زندگی ڈال گئی۔ خوش گواری لوٹ آئی اور جب تارڑ صاحب نیچے اترے تو میں نے سب کے ساتھ تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا تو انہوں نے بھی سب سے منہ پھیر لیا۔

ہم دوبارہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ بائیں جانب شور کرتا دریا تھا اور اس کی تند لہریں۔ دریا کے پار اور ہماری دائیں جانب پتھریلی چٹانیں تھیں جو بلندیوں کو چھو رہی تھیں۔ اس پر پڑی کچھ برف نظر آ رہی تھی۔ ہر چٹان چار ہزار میٹر سے کم بلند نہ ہوگی۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ اب ہمیں بے خوف ہو کر تنہا چلنا

تھا۔ پوری ٹیم ایک ساتھ تھی۔ چلتے چلتے ہم سب دریا شمشال تک جا پہنچے۔ سامنے لکڑی کے تختوں سے بنا ایک پل تھا جو دریا پر ایک پینگ کی مانند ڈول رہا تھا۔

"تارڑ صاحب یہ کیا چیز ہے۔" بقا نے پوچھا۔

تارڑ صاحب نے سر سے پی کیپ اتاری اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولے۔

"یہ تو رجب شاہ ہی بتا سکتا ہے۔"

رجب شاہ سے پوچھا گیا۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ بڑی سادگی سے بولا۔ "پل ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا!......تو یہ پل ہے......تو چلو جلدی سے فوٹو بنواؤ تاکہ ہم آگے بڑھیں کیونکہ شام یہاں جلدی اترتی ہے۔"

تارڑ صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "یہ پل تمہارے فوٹو بنوانے کے لیے نہیں بنایا گیا، یہ اس ٹریک پر پڑتا ایک پل ہے اور تمہیں اس کے پار جانا ہے۔"

میں نے خوف کے عالم میں اس پل نما جھولے کو دیکھا جس کے نیچے دریا شمشال کی لہریں آپس میں ٹکرا رہی تھیں، شور کر رہی تھیں اور خوف کی لہریں ہر مسام میں بھر رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "کون کہتا ہے کہ یہ پل ہے؟"

بقا نے رجب شاہ کی جانب اشارہ کیا۔ سب ہنس رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ شمشال تو واقعی ایک جیل ہے جو ایک بار گیا تو اپنی مرضی سے واپس نہیں آیا۔

اس جھولے کے تختوں کے بیچ کہیں کہیں فاصلہ تین فٹ کا بھی تھا۔ تختے کیا تھے، ٹہنیوں کے ٹکڑے تھے، جن پر میں دونوں جانب لگے رسوں کو تھامتا ہوا ایک ایک قدم سوچ کر اور پھونک کر رکھ رہا تھا۔ کے ٹو سر کرنے والے پورٹر بھی نہایت احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ میں پار اترا تو مڑ کر دیکھا کہ رجب ہمارے لیڈر کو تھامے چلے آ رہے ہیں۔ بقا پار اترا تو ہا ہو کے نعرے لگانے لگا۔ وہیں ایک پتھر پر کسی نے تارڑ صاحب کو خوش آمدید کہتے ہوئے کوئی تحریر لکھی تھی۔ کچھ نوجوان شمشال پاس جا رہے تھے اور علاقے میں بات پھیلی تھی کہ تارڑ صاحب شمشال آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی محبت میں ان کے لیے یہ تحریر ثبت کیا تھا۔

شروع میں ہم سیدھے چلے جا رہے تھے مگر پھر اس پل کو پار کر کے دوبارہ دریا کے دائیں جانب آنا تھا۔ ان پلوں کا رخ اس لیے کیا گیا تھا کہ درمیان میں ایک پہاڑ آ رہا تھا جہاں سالوں سے پتھر گر رہے ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ مدتوں سے جاری ہے۔ لینڈ سلائیڈنگ کا پتھر کسی گولی کی مانند لگتا ہے۔ سر پر پڑے تو کھوپڑی چٹخ جائے۔ کہیں اور آ لگے تو شدید گھائل کر دے۔ چند سال پہلے لوگ یہاں سے بچ بچا کر نکلتے تھے۔ رجب شاہ بتا رہا تھا کہ وہ ایک بار پورا دن کسی چٹان کے نیچے دبکا رہا، کیونکہ سلائیڈنگ رک ہی نہیں رہی تھی۔ مشہور یہ ہے کہ شیطان اوپر بیٹھا پتھر برساتا ہے۔ میں نے غلطی سے بقا سے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ "بقا بھائی! شیطان کا لنچ بریک ہونے والا ہوگا ہے۔ آپ ذرا اس کی شفٹ تو کور کر دیں۔"

مجھے اندازہ نہ تھا کہ بقا اس کو سیریس لے نے گا اور باقاعدہ میری شکایت تارڑ صاحب کو لگا دے گا۔ جب تارڑ صاحب نے اسے جھڑکا تو منہ بسورے کھڑا ہو گیا۔ میں نے جا کر سوری کیا اور کہا کہ بقا بھائی اگر شفٹ کور نہیں کرنی تھی تو صاف انکار کر دیتے، یہ شکایت تو نہ لگاتے۔ اس نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا مگر میں سر ہلاتا آگے بڑھ گیا۔

شمشال والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت دو پل بنائے ہیں۔ ایک آپ کو دریا کے پار دوسری جانب لے جانے کے لیے اور ایک آپ کو واپس اپنے ٹریک پر لانے کے لیے۔ ہم نے دوسرا پل کراس کیا اور دوبارہ دریا کی دائیں جانب آ گئے (اسی پل کی تصویر گزشتہ قسط پر لگائی تھی) کچھ دیر چلے ہوں گے کہ ایک مقام آیا جہاں کچھ اونچائی پر دو کچے کمرے بنے تھے۔ کمروں سے ذرا اوپر، چٹان پر چھوٹی سی چار دیواری تھی اور کچھ رنگ برنگے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس مقام کا نام زیارت تھا۔ روایت ہے کہ کوئی اللہ کے برگزیدہ بندے شاہ شمس شمشال پاس سے آ کر یہاں رکے تھے۔ انہوں نے یہاں چلہ کاٹا تھا اور پھر آگے چلے گئے تھے۔

ایک کوٹھڑی کو تالا لگا تھا۔ چابی کسی پتھر کے نیچے پڑی تھی۔ رجب شاہ نے اس سے تالا کھولا اور بوسیدہ دروازے کے پٹ دھکیل کر اندر کی جانب کھول دیے۔ کچھ توقف کیا اور اندر داخل ہوا۔ ہم باہر کھڑے تھے جیسے کسی کے گھر میں داخل ہونے سے ہچکچا رہے ہوں۔ پھر ایک ایک کر کے اندر داخل ہوئے۔ وہی بھٹی انداز کا ماحول۔ درمیان میں ایک چولہے کی جگہ تھی اور چھت تک جاتا ایک فٹ کے برابر کسی دھات کا پائپ جو چولہے سے اٹھتا دھواں چھت سے باہر پھینکتا تھا۔ کمرے کے اندر چاروں جانب بنے چبوترے اور دیواروں سے لگی لپٹیں رضائیاں اور گدے پڑے تھے۔ چبوتروں پر



پرانی چٹائیاں تھیں۔ ماحول ایک دم بدل گیا۔ وقت تھم سا گیا۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رک گئیں اور سب نے اپنے جسے کے بوجھ اتار دیے۔

میں بھی اپنے بوجھ سے فارغ ہو کر تھکن اتار کر باہر آ گیا۔ سیدھا اس بلندی کی جانب چڑھا جہاں چار دیواری تھی اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ فاتحہ پڑھی اور نیچے اترا تو قربان شاہ کہیں سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو دریا کے پار آسمان سے باتیں کرتی چٹانی دیوار کی بلندی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اصل زیارت اوپر ہے۔"

میں نے اپنی نظریں اٹھا کر دیکھا تو انتہائی بلندی پر کچھ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ حیران کن حد تک بلند مقام پر وہ جھنڈے دیکھ کر میں ششدر تھا کہ یہاں جھنڈے لگانے کون گیا ہوگا؟ قربان شاہ سے پوچھا تو کہنے لگا کہ ہم میں سے کوئی اوپر نہیں گیا۔ ایک شمشالی نے منت مانی تھی کہ اگر میرا بیٹا پیدا ہوا تو میں شاہ شمس کی زیارت پر دیا جلاؤں گا۔ اللہ نے اس کو بیٹا دیا اور وہ اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اوپر گیا۔ دیا جلایا اور جھنڈے بھی لگائے۔

ہم سب ان چبوتروں پر رضائیوں سے ٹیک لگائے قدرت کو دیکھ رہے تھے جو آگے جانے کے بعد ایک دیگچے میں پانی ابال رہا تھا۔ پھر کے ٹو ہم سے ساتھ لائے نوڈلز اس میں ڈالے۔ کچھ دھواں پائپ سے نکل کر کمرے میں تیرنے لگا۔ رجب شاہ کے خراٹے جاری تھے۔ بقا آنکھیں موندے ہاتھ سیدھا باندھے لیٹا تھا۔ تارڑ صاحب اپنی دنیا و ذہن میں سجائے پہلو کے بل آرام کر رہے تھے۔ کمرے کی چنائی پتھروں اور گارے سے کی گئی تھی۔ درزوں سے سورج کی روشنی چھن چھن آ رہی تھی۔

کچھ دیر میں ہم گرم نوڈل سوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بدن میں ایک طاقت اور حرارت بھرتی چلی گئی۔ میں نے قدرت کے خلوص کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر میں ہم پر کاہلی اور سستی چھانے لگی۔ کوئی بھی یہاں سے اٹھنے کو تیار نہ تھا۔ یہ ایک شاندار مقام تھا جہاں رات گزاری جا سکتی تھی مگر تارڑ صاحب نے کوئی چھپکلی دیکھ لی تھی اس لیے وہ یہاں رکنے کا رسک نہیں لے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ باہر ٹینٹ لگا لیتے ہیں۔ رجب شاہ نے کہا کہ آگے ایک مقام شکار زدوئی ہے۔ وہاں درخت بھی ہیں، سبزہ بھی ہے اور پانی کے چشمے بھی ہیں۔ فاصلہ ایک گھنٹے سے کم کا ہوگا۔ ہم نے سامان پھر سے لادے اور روانہ ہو گئے۔

آپ شمشال ٹریک پر کیا شے ڈھونڈ سکتے ہیں جو آپ کے دل کو اچھی لگے۔ کوئی سبزہ نہیں جو آپ کی آنکھوں کو بھلا لگے۔ کوئی رنگ لیں۔ اس دن جب ہم اس میں چل رہے تھے۔ نہ کوئی برفوں سے لدی چوٹیاں تھیں اور نہ وادی میں بادل تیر رہے تھے۔ بس پتھریلی بلند ترین دیواریں دونوں جانب تھیں اور دریا شمشال ان کے بیچ بہہ رہا تھا۔ ویرانگی تھی اور الم کے پہاڑ تھے۔

پورے راستے میں کچھ سبزہ نظر آیا تو وہ شکار زدوئی تھا۔ درختوں کے جھنڈ تھے۔ بیچ میں چشمے بہہ رہے تھے۔ جنگلی گلابوں سے لدی جھاڑیاں تھیں۔ پرندے بھی ضرور ہوں گے کیونکہ ایک مرغ سے بڑا پرندہ تارڑ صاحب کی ٹانگوں سے ٹکرایا تھا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ شکار زدوئی کے چھوٹے سے ٹکڑے اور دریا کے بیچ ایک بڑا میدان تھا جس میں ہزاروں چھوٹے اور بڑی سائز کے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ شام ہونے میں بہت وقت باقی تھا۔ سائے نیچے ڈھل رہے تھے اور سامنے دریا کے پار ہزاروں فٹ سے بھی زیادہ اونچی، ایک پتھریلی دیوار سی تھی جس کا طول میلوں میں تھا۔

ہم نے خیمے لگائے۔ تارڑ صاحب اپنے خیمے میں فٹ تھے۔ میرے خیمے میں، میں تنہا۔ بقا کے خیمے میں پورٹر تھے۔ ایک خیمہ قدرت کا تھا۔

وہیں درختوں کے جھنڈ کے نیچے ایک چولہا بنایا گیا۔ لکڑیاں لائی گئیں۔ آگ جلی اور آہستگی سے شام اترنے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ رنگ بکھرنے لگے۔ میرے اندر کوئی مست ہوا تو میں اسی مستی سرشاری میں کسی تنہائی کو پانے کے لیے، جہاں میں اپنی سوچوں سمیت کچھ لمحے گزار سکوں۔ میں درختوں کی جھنڈ میں جا نکلا۔ خاموشی تھی اور میرے پاؤں تلے کسی چشمے کی نالیاں بہہ رہی تھیں۔ جھرنے گنگنا رہے تھے اور مترنم آوازیں سنائی دے رہی تھیں، شام کا سحر پھیلتا جا رہا تھا اور میں اس سحر میں گرفتار تھا۔ اب میں وہ نہ تھا جو کچھ گھنٹے پہلے بلندیوں پر اٹکا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ آج مجھ پر بھید کھل رہے تھے۔ میں جان رہا تھا کہ کوئی جگہ اپنی ذات میں خود کچھ نہیں ہوتی، بس ماحول اور وقت اسے حسین بنا دیتا ہے۔ شام کا وقت تو ہر ایک لیے جذبات رکھتا ہے مگر جب شام شکار زدوئی پر اترے تو کیا یہ منظر بھی بھلا سکتی ہے؟

میں درختوں کے اندر ندیوں میں گھوم رہا تھا کہ اچانک کسی کو بت بنے پتھر پر گنگناتے پانیوں کے بیچ بیٹھے دیکھا۔

پہلے تو یہ گمان ہوا کہ کوئی آسیب ہے۔ میں کچھ کرتا کہ اسی بت سے آواز نکلی۔ ”ابتم کدھر بھٹک رہے ہو۔“

آواز اور لہجہ جانا پہچانا تھا کیونکہ وہ ہمارے لیڈر تارڑ صاحب تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ اور پین تھا۔ وہ سفری نوٹس لینے کسی تنہائی میں نکلے تھے مگر وہ بھی منظر کا شکار ہو کر پتھر کے بت بن گئے تھے۔ ”وہ آدھی ٹیم کدھر ہے۔“

تارڑ صاحب بقا کو آدھی ٹیم کہتے تھے۔ وہ تو لیڈر تھے۔ باقی آدھی ٹیم میں تھا اور باقی آدھی ٹیم بقا بھائی۔ میں نے کہا۔ ”آدھی ٹیم آگ سلگا رہی ہے اور اس کا چہرہ دہک رہا تھا معلوم نہیں آگ کی وجہ سے یا کوئی اور وجہ ہے۔“

تارڑ صاحب ہنسنے لگے۔ ”اس کو یہ شکایت نہ ہو کہ تم اس کا ہاتھ نہیں بٹاتے۔“

میں ویسے حیران تھا کہ اس بار تارڑ صاحب نے کوئی کک اپنے ساتھ نہیں لیا۔ ان کا جواز بھی قابل غور تھا کہ تین بندوں پر کسی ایک کک کا خرچ بہت زیادہ ہو جاتا۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے رہے مگر تارڑ صاحب اٹھ گئے۔ شاید ان کا کام مکمل ہو گیا تھا مگر میرا دل اٹھنے پر آمادہ نہ تھا مگر جب شام کی سیاہی زیادہ پھیل گئی تو اٹھنا پڑا۔

ہم واپس اپنے خیموں کی طرف آئے تو دیکھا کہ یہاں بہت رونق لگی تھی۔ قدرت، مہربان اور بقا سب نے مل کر کوئی دیگچا چڑھا رکھا تھا اور اس میں کچھ تیار ہو رہا تھا۔ دھواں چولہے سے اٹھ کر درختوں کی ٹہنیوں میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک بے فکری تھی۔ کوئی خوشی تھی جو مجھے بھی چہکا رہی تھی۔ جنگل میں منگل تھا۔ گویا صحرا میں چلتے چلتے کچھ مسافر ایک نخلستان میں آ اترے تھے۔ ہم مدتوں سے پتھر ہی پتھر دیکھ رہے تھے کہ ہماری نظروں نے کچھ سبزہ دیکھا تھا۔ فسوں ساز منظر تھا۔ کچھ درخت اور ان کے بیچ بہتے جھرنے پر اٹھتا دھواں جو فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے کچھ برفانی چوٹیاں بھی تھیں اور شام کا سحر پھیل رہا تھا۔

تارڑ صاحب اور رجب شاہ خیموں کے قریب کھڑے تھے۔ میں ان کی طرف گیا اور پہلے تارڑ صاحب سے ہاتھ ملایا اور کہا تھینک یو سر۔ پھر رجب شاہ سے اور باقی پورٹرز سے۔ تارڑ صاحب اور رجب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ مجھ پر یہ ماحول غالب ہو رہا تھا۔ ان سے ہاتھ ملا کر میں دریا کی جانب بڑھا تو پیچھے سے لیڈر صاحب کی آواز آئی۔ ”اکیلے مت جانا، ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔“

شام اچانک اتری اور چھا گئی۔ اندھیرا پھیلا اور لالٹین روشن ہوئی۔ میں، قدرت، رجب شاہ اور تارڑ صاحب دریا کی جانب چل دیے۔ کچھ پتھر ایک ساتھ سر جوڑے بیٹھے تھے اور ہم ان کی محفل میں مخل ہوئے۔ پتھروں سے ٹیک لگائے اب ہم دریا کی لہریں گن رہے تھے ان کی گنگناہٹ سن رہے تھے۔ دور ہمارے ساتھی چولہے کے گرد بیٹھے تھے اور ان کی آواز کبھی کبھی تیرتی ہوئی ہماری جانب آ جاتی۔ آسمان صاف تھا۔ بادل کا کوئی ٹکڑا نہ تھا اور پھر دریا کے پار بلند فصیلوں سے پورے دنوں کا چاند جھانکنے لگا۔

چاندنی ایک نور کی صورت پورے ماحول میں ایک دم پھیلتی چلی گئی۔ پتھر کی فصلیں منور ہو گئیں۔ دریا کے پانی چھلکنے لگے۔ ہمارے آس پاس پھیلی ریت چاندنی کی چادر بنی۔ درخت جگمگا اٹھے اور ہم میں سرور کی سی کیفیت بھرتی چلی گئی۔ قدرت نے سگریٹ سلگائی اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ رجب نے کش لیا اور سگریٹ مجھے تھما دی۔

ہم بغیر نشے کے ملنگ بن گئے تھے کہ رجب شاہ نے قصے چھیڑ دیے۔ چاند چمکتا رہا اور رجب شاہ جنگلی جانوروں کی کہانی سناتا رہا جو اس نے اپنے ہاتھوں مارے تھے۔ میں نے لقمہ دیا اور کہانی طویل ہو گئی وہ کے ٹو، نانگا پربت اور براڈ پیک کے سر کرنے کے لمحے اپنے تجربات ہم میں بانٹتا رہا۔ قدرت نے اپنے چچا رجب شاہ کے احترام میں اپنی سگریٹ اسے تھما دی۔ قدرت کہتا تھا کہ یہ ماحول مجھے پہلے کبھی نہیں ملا اور اپنے چچا رجب شاہ کے سامنے میں نے پہلی بار سگریٹ پی ہے۔

وقت رینگتا رہا اور ہمارا ماحول عروج پر پہنچتا رہا۔ اتنے میں بقا کسی اندھیرے میں سلگتا ہوا نمودار ہوا۔ اسے گلا تھا کہ میں تو کھانا بناتا رہا اور میری جانب اشارہ کر کے بولا کہ کسی نے میری مدد بھی نہیں کی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ کھڑے کیے اور سب سے کہا کہ وہ بھی دعا کے لیے اپنے ہاتھ کھڑے کریں۔ جب دعا ہو تو سب کے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ میں نے بقا کے بچوں کو دعائیں دیں تو سب ہنسنے لگے۔

وہ محفل برخواست ہوئی سب اٹھ کر خیمے کے سامنے جمع ہوئے۔ پھر سب نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ آلو گوشت کے ساتھ گرم روٹیاں اور چشمے کا میٹھا پانی۔ لالٹین روشن تھی، حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ تارے چمک رہے تھے اور تھال کے برابر سائز کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ شہر میں رہنے والے دھوئیں اور گرد و غبار میں سانسیں لینے والے ایسے حسین مناظر کب دیکھ پاتے ہیں۔ مجھ پر تو گویا سحر طاری ہو گیا تھا۔ پوری طرح ماحول کے فسوں میں ڈوب گیا تھا پتا نہیں کب تھینڈ کو موقع مل گیا اور اس نے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔

صبح آنکھ اس وقت کھلی جب بقا اپنا سلیپنگ بیگ لپیٹ رہا تھا۔ میں نے بھی بقا کی تقلید کی اور پہلے اپنا سامان سمیٹا، کیونکہ بقا کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر میں خیمے سے باہر نہیں نکلا تو وہ مجھے بھی خیمے میں لپیٹ دے گا۔ باہر نکلا تو نظارے وہی تھے مگر ہمیں سامان لپیٹنے کی جلدی تھی اور سات بجے روانہ ہونا تھا۔ آج کا ٹریک لمبا تھا اور ہمیں دس گھنٹے پیدل کی مسافت طے کرنی تھی۔ ہمارا اگلا قیام ملنگٹی گلیشیئر تھا جو چار سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ملنگٹی گلیشیئر سے دستاغل سر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ آٹھ ہزار سے ایک سو فٹ کم دستاغل سر دنیا کی بیسویں بڑی چوٹی ہے۔ ملنگٹی گلیشیئر سے پانچ سے چھ گھنٹے کی مسافت پر شمشال ہے۔

ناشتا رات والے سالن اور گرم پراٹھوں سے کیا۔ چائے پی۔ تارڑ صاحب کی عادت ہے کہ ایک کپ چائے اٹھتے ہی پیتے ہیں اور ایک کپ تب پیتے ہیں جب سب ناشتے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ ایسا کیوں تو ڈانٹتے ہیں۔

سات بجے ہم روانہ ہو گئے۔ ان دنوں 1999ء کا کرکٹ ورلڈ کپ ہو رہا تھا۔ آج نیوزی لینڈ اور پاکستان کا میچ تھا۔ ہم بے قرار تھے کہ کیا رزلٹ آتا ہے۔

راستہ میدانی تھا۔ ہر طرف پتھر بکھرے تھے اور دھوپ چمک رہی تھی۔ میں نے گردن اور سر لپیٹ رکھا تھا۔ ہم جدا جدا ہو کر چل رہے تھے۔ میں اپنے خیالوں کی دنیا میں تھا۔ اگر آپ میں سے کسی نے ایسے ٹریک کیے ہیں تو وہ احساسات کو سمجھ رہے ہوں گے۔ یہ کوئی نتھیا گلی، ناران یا کالام کا کوئی ٹریک نہ تھا۔ وہ کم بلندی والے سبزہ زار ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کے مختلف علاقے ہیں۔ تنہا، ویران، بنجر، اداس اور خوفناک...... یہاں آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ انگریز شمشال کو انتہائی دور افتادہ مقام کہتے رہے۔ ان دنوں پسو سے سات دنوں کی مسافت پر ایک دشت تھا۔ کوئی ادھر کا رخ نہ کرتا تھا۔ حالات بدلے تو چند ایک نے یہاں آنا شروع کیا۔ سال میں دو تین ٹیمیں پہنچ جایا کرتی ہیں۔ چین کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ خنجراب نیشنل پارک بنے جڑا شمشال تب کسی کا خواب بھی نہیں تھا۔

ایک ندی پڑی اور سب رک گئے۔ سب سے مطلب ہم تین۔ شمشالیوں کے لیے تو یہ سال رو تھی۔ دائیں جانب گلیشیئر پگھل کر شمشال دریا میں گر رہے تھے۔ پانی زوردار تھے۔ قربان جو کے ٹو سر کر چکا تھا، مجھے پیٹھ پر لادے ندی پار کر رہا تھا۔ کمر سے اوپر پانی آ گیا تھا... وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ میرے شوز پانی میں بھیگ گئے تھے مگر دریا دور تھا، اس لیے مجھے ڈوبنے کا ڈر نہ تھا۔ ویسے تو میں بھی اسی طرح اپنے زور پر پار لگ جاتا مگر تارڑ صاحب کو جب شرمندہ دیکھا تو سوچا اگر لیڈر شرمندہ ہے تو میں بھی یہ تجربہ کر ڈالوں اس لیے قربان کا سہارا لے لیا۔ بقا پہنچا ہمارے فوٹو بنائے۔ اپنا وہ فوٹو بعد میں دیکھا تو مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ ایسا کہ جس طرح ایک پرانی کہانی میں باپ بیٹا لوگوں کے طعنے سن سن کر گدھے کو کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں، بالکل ایسا ہی تھا۔ ذرا تصور کریں کہ گدھا کتنا برا لگتا ہے اگر تارڑ صاحب اپنے سفرناموں میں اس طرح کی حرکات نہ کرتے تو شاید میں بھی اس طرح سوار ہونا پسند نہ کرتا اور وہ بھی اپنے ایک ہیرو کی پیٹھ پر جس نے کے ٹو بھی سر کر رکھی ہو اور صدارتی ایوارڈ یافتہ بھی ہو۔ مگر مجبوری تھی بہتے پانی سے زور آزمائی کبھی کبھی مہنگی بھی پڑ جاتی ہے۔ گلیشیئر کا پانی پوری طاقت سے دریائے شمشال سے ملنے کو دوڑ رہا تھا۔ راہ میں آنے والے چھوٹے چھوٹے پتھر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ یقیناً وہ پتھر قربان کے پیروں سے ٹکرا بھی رہے ہوں گے۔

ذرا تصور کریں ڈھلوان ہو تو پانی کس قوت سے بہتا ہے اس کا فورس کس قدر شدید ہوتا ہے۔ اس قوت سے کوئی پتھر آ کر پیروں سے ٹکرائے تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے مگر قربان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ کرب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شاید وہ ضبط کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ہم نے آدھا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ میں نے ایک نظر بہتے پانی پر ڈالی تبھی دماغ میں سرگوشی سی ابھری۔ اگر کوئی شخص پھسل کر گر پڑے تو پھر وہ سنبھل نہیں پائے گا۔ پتھروں پر جمی کائی بھی ہو گی جو اسے کھڑے ہونے نہیں دے گی اور وہ بہتا ہوا سیدھا شمشال ندی میں جا گرے گا۔ مجھے اپنے ہی خیالات سے خوف آنے لگا۔ میں نے ذہن سے خیالات کی یلغار کو جھٹکنے کی کوشش کی تبھی وہ کچھ ہو گیا جس نے پوری ٹیم کو دہلا دیا۔ جو آگے تھے وہ پیچھے مڑے اور جو پیچھے تھے وہ تیزی سے آگے بڑھے۔

سفر کہانی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں






WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

# احتجاج

کشمالہ حسن

احتجاج کرنا ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ دنیا بھر میں اسے جمہوریت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ احتجاج سے ہی رکے ہوئے مطالبات پورے ہوتے ہیں۔

احتجاج کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔

بچے کو بھوک لگتی ہے تو وہ رو کر احتجاج کرتا ہے۔ ہم جب چھوٹے ہوتے ہیں تو اپنی بات منوانے کے لیے ضد کرتے ہیں اور جب ضد پوری نہ ہو تو احتجاج کرتے ہیں۔

ناراض ہو جاتے ہیں۔ منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اپنی آواز پہنچانے کا ایک طریقہ ہوا کرتا ہے۔

پھر جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے ہیں ہمارا سیاسی اور سماجی

رابطہ مضبوط ہونے لگتا ہے۔ اپنی آواز پہنچانے اور احتجاج کے طریقے بھی مختلف اور شدید ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب کوئی بڑا مسئلہ ہو تو پھر ہمارا احتجاج انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوا کرتا ہے۔ ہم ایک گروپ کی صورت میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ احتجاج کے کون کون سے طریقے اس وقت پوری دنیا میں واضح ہیں اور اپنے مطالبات پیش کرنے کے لیے انسان کیا کیا کرتا ہے۔

Die in یعنی احتجاجی موت۔ احتجاج کی یہ منظم تحریک اور انداز ہے۔ اسے Lie in بھی کہا جاتا ہے۔

اس قسم کے احتجاج کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ جیسے عالمی امن کے لیے، ناانصافی کے لیے، ماحولیات کے تحفظ کے لیے، ایڈز کے خلاف، اسقاطِ حمل کے خلاف وغیرہ وغیرہ۔

اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ احتجاج کرنے والے پلے کارڈز لیے کسی سڑک، چوراہے یا کسی اہم سرکاری عمارت کے سامنے زمین پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جیسے مر گئے ہوں اور ہر طرف ان کی لاشیں بکھری ہوئی ہوں۔

اس احتجاج کا مقصد لوگوں کو اپنے مطالبات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ تاثر کو شدید کرنے کے لیے سرخ رنگ کی پٹیاں بھی باندھ لیتے ہیں جیسے بہت زخمی ہوں۔

اس قسم کا احتجاج پوری دنیا میں ہوا کرتا ہے۔ یہ پُرامن احتجاج ہوتا ہے۔ سب سے بڑا مظاہرہ 15 ستمبر 2007ء میں امریکا کے دارالخلافہ واشنگٹن میں ریکارڈ ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی تھی۔ یہ مظاہرہ عراق جنگ اور امریکا کی پالیسیوں کے خلاف کیا گیا تھا۔

زنجیری احتجاج، یا Lock-On پروٹسٹ۔

اس میں احتجاج کرنے والے اپنے آپ کو زنجیروں میں باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھوں کی انسانی زنجیر بھی بنائی جاتی ہے۔

اس قسم کے احتجاج کرنے والے کبھی کبھی اپنے ساتھ پلاسٹک کے پائپس بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان میں بھی انسانی زنجیر کے ذریعے احتجاج کیا جاتا ہے۔

یہ احتجاج بھی پُرامن ہوا کرتا ہے۔ جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا احتجاج ریکارڈ کروا دیا ہے تو پھر پُرامن طور پر منتشر ہو جاتے ہیں۔

قبضہ احتجاج

اس قسم کے احتجاج سے لڑائی جھگڑوں کے اندیشے ہوا کرتے ہیں۔

اس قسم کا احتجاج کرنے والے کسی عمارت یا فیکٹری میں داخل ہو کر وقتی طور پر اس پر قبضہ کر کے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔

عام طور پر فیکٹریز پر قبضے کے واقعات زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ احتجاج مزدوروں کی یونین کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔

1930ء میں انڈسٹریل ورکرز آف دی ورلڈ نے پہلی بار امریکا میں احتجاج کا یہ طریقہ ریکارڈ کروایا۔

اس کے بعد دوسرا قبضہ ارجنٹینا میں ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تاریخ بھی بہت طویل ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں اس قسم کا احتجاج ہوا ہے۔

Occupy movements

یہ احتجاج کی بین الاقوامی تحریک ہے جو معاشی اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف پوری دنیا میں اپنی آواز پہنچایا کرتی ہے۔

اس تحریک کا سلوگن ہے ہم ننانوے فی صد ہیں۔

اس لیے دنیا کے صرف ایک فی صد افراد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہمارے حقوق سلب کرے۔ ہمیں غربت کے اندھیروں میں دھکیل دے۔

یہ تحریک گلوبل فنانشل سسٹم (سامراجیت) کے خلاف ہوتی ہے۔ اس قسم کا پہلا احتجاج جس نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ وہ نیویارک کے زکوٹی پارک میں 17 دسمبر 2011ء کو ہوا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک دنیا کے 82 ممالک اور ہزاروں شہروں میں پھیل گئی۔ ایران، چین، جاپان ہر جگہ اس قسم کے مظاہرے ہوئے۔ اس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔ اس تحریک کے کئی مراحل ہوا کرتے ہیں، جیسے

1۔ قبضہ۔
2۔ پُرامن طور پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروانا۔
3۔ سول نافرمانی (یعنی حکومت کے معاشی مفادات کے خلاف)
4۔ مظاہرہ۔
5۔ اندرونی سرگرمیاں (پمفلٹ، کتابچے، تقاریر وغیرہ)
6۔ عام ہڑتال اور اگر پھر بھی بات نہ مانی جائے یا مقصد نہ پورا ہو تو براہِ راست ایکشن۔ عام طور پر اس قسم کے

مظاہرین پُرامن طور پر منتشر ہو جاتے ہیں۔

برصغیر میں اپنی آواز اور اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کے دو طریقے تھے۔ راستہ رد کو اور ریل روکو۔

اس میں راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی تھیں یا مسافروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا تھا۔ اس قسم کا احتجاج بھی کبھی کامیاب یا کبھی ناکام ہو جایا کرتا۔

راستہ رد کو کی طرح ریل روک تحریک بھی تھی۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوتا ہوگا۔ اس میں احتجاج کرنے والے ریلوے ٹریک پر لیٹ جایا کرتے اور ریلوں کی آمد و رفت بند ہو جاتی۔ حالیہ دنوں میں پاکستان میں بھی کئی بار اس قسم کا احتجاج دیکھا گیا ہے۔

بھوک ہڑتال

یہ بھی غیر تشدد مزاحمت یا دباؤ کا طریقہ ہے۔ جس میں شریک افراد فاقے کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اپنے مسئلے کی طرف مرکوز کرا سکیں۔

مسائل سیاسی، سماجی اور معاشرتی ناانصافیوں کے حوالے سے ہو سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہندوستان میں انا ہزارے کی بھوک ہڑتال نے عالمی شہرت حاصل کی تھی۔ اکثر بھوک ہڑتال میں ٹھوس کھانے سے پرہیز کیا جاتا ہے لیکن مائع سے نہیں۔

دھرنا Sit in

دھرنے میں شامل افراد اپنے مطالبات منوانے کے لیے کسی ایک مقام پر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کا یہ دھرنا اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک یا تو وہ گرفتار نہ ہو جائیں' انہیں منتشر نہ کر دیا جائے یا ان کے مطالبات تسلیم نہ ہوں۔

ان دنوں ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہی لفظ کی بازگشت ہے اور وہ ہے دھرنا۔ یہ وہ لفظ ہے جو بچے بچے کی زبان پر ہے۔ جینا ہوگا مرنا ہوگا دھرنا ہوگا۔

آپ اخبارات دیکھ لیں یا ٹی وی کے چینلز دیکھ لیں یا سماجی ویب سائٹ پر جائیں ہر جگہ دھرنا ہی دھرنا ہے۔

آئیں آپ کو دھرنے کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انگریزی میں اسے Sit in کہا جاتا ہے۔

دھرنے میں شامل افراد اپنے مطالبات منوانے کے لیے کسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔

انتظامیہ جب دیکھتی ہے کہ دھرنے کی وجہ سے روز مرہ زندگی کے معمولات میں خلل پیدا ہو رہا ہے تو وہ انہیں منتشر کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہے۔

جیسے پانی کا چھڑکاؤ (واٹر کینن)، آنسو گیس کی شیلنگ، ربڑ کی گولیاں اور جب زیادہ سختی کرنی ہو تو خالص گولیاں۔

اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

ہم آپ کو دنیا کے چند مشہور دھرنوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

اگست 1940ء میں افریقی امریکی اٹارنی سیموئل وجوٹ نے ایک دھرنے کا اہتمام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نسلی تعصب انتہا پر تھا۔

اس کے بعد یہ دھرنے تواتر سے ہونے لگے۔ عام طور پر یہ دھرنے کسی ہوٹل یا ریستوران کے مالکان کے خلاف ہوا کرتے تھے کیونکہ ان کی پالیسی نسلی امتیاز کی پالیسی ہوا کرتی تھی۔

پہلی دفعہ یہ دھرنے منظم طور پر فادر ڈیوائن نے انٹرنیشنل پیس مشن موومنٹس کے زیرِ انتظام کیے یہ دھرنے نسلی تعصب کے خلاف تھے۔

بعد میں کیفے ٹیریا ورکرز یونین بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ابتدا میں صرف 302 مقامی افراد نے ان دھرنوں میں شمولیت کی تھی۔

نیویارک ٹائمز کی اشاعت کے مطابق 23 ستمبر 1939ء کو 75 سے 100 آدمیوں کے ایک گروپ نے اپنے مطالبات کے حق میں دھرنا دیا۔ یہ دھرنا نیویارک کی اکتالیسویں اسٹریٹ پر دیا گیا تھا اور دھرنا دینے والوں کو بہت حیرت سے دیکھا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں یہ نئی چیز تھی۔

1942ء میں ایک دھرنا شکاگو کے 147 اسٹریٹ پر ہوا تھا۔ اس دھرنے میں کل 27 افراد تھے۔ انتظامیہ نے فوری طور پر پولیس کی مدد حاصل کر لی تھی لیکن کوئی گرفتاری اس لیے عمل میں نہیں آئی کہ یہ دھرنا بغیر کسی تشدد کے خود ہی ختم ہو گیا تھا۔ یعنی کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہیں ہوئی تھی۔

1955ء بالٹی مور میری لینڈ میں ایک دھرنا دیا گیا۔ یہ دھرنا مورگن اسٹیٹ کالج کے طالب علموں نے اپنے مطالبات کے لیے دیا تھا۔ یہ دھرنا ایک ایسے اسٹور کے خلاف تھا جو طالب علموں سے امتیازی سلوک رکھتا تھا۔ یہ ایک مختصر دھرنا تھا جو صرف ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد طالب علم خود چلے گئے تھے۔

ایک دل چسپ دھرنا 1957ء میں ڈرہیم نارتھ



کیرولینا میں ایک آئس کریم پارلر کے خلاف دیا گیا تھا۔ اس دھرنے کو رائل آئس کریم دھرنے کا نام دیا گیا تھا۔

یہ دھرنا 23 جون 1957ء میں دیا گیا تھا اور اس دھرنے میں کل سات افراد تھے جن میں سے چار مرد اور تین خواتین تھیں یہ دھرنا آئس کریم پارلر کے سامنے دیا گیا تھا۔

1958ء میں اوکلاہاما میں ایک دھرنا دیا گیا تھا۔ یہ دھرنا بھی ایک بڑے اسٹور کی پالیسیوں کے خلاف دیا گیا تھا۔ اس دھرنے کا آغاز یوتھ کونسل کی ایک لیڈر کلارا نے کیا تھا جو ایک ہائی اسکول کی ٹیچر تھی۔ یہ دھرنا بھی بغیر کسی تشدد کے ختم ہوا تھا۔

1969ء میں ویت نام کی جنگ کے خلاف دھرنا دینے والوں میں یوکو یونو اور اس کا شوہر لے نن بھی تھے۔

یوکو یونو ایک جاپانی آرٹسٹ اور سنگر تھا۔ اس نے ٹوکیو میں پرورش پائی۔ وہیں سے عملی زندگی کا آغاز کیا پھر یہ خاندان امریکا شفٹ ہو گیا تھا۔

لندن میں ہونے والی ایک میوزک کانفرنس میں اس کی ملاقات مشہور زمانہ بیٹلز گروپ کے لے نن سے ہوئی۔ دونوں نے 1963ء میں شادی کر لی۔

انہوں نے ویت نام کی جنگ کے خلاف دھرنا دیا تھا۔ اس دھرنے کی وجہ شہرت شاید یہی دونوں تھے۔ یکم فروری 1960ء میں امریکا میں سیاہ فام طالب علموں کی ایک جماعت نے دھرنے کی تحریک کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح پچپن شہروں تک پھیل گئی۔

اب ایک نظر اکیسویں صدی میں ہونے والے چند بڑے دھرنوں پر۔

چین

ماؤزے تنگ کی موت کے بعد چین میں مختلف موضوعات پر بے شمار دھرنے ہوئے۔ یہ دھرنے اظہار کی آزادی، زیادہ معاوضے، مزدوروں کی فلاح، ماحولیات، کرپشن، جبر اور خاص طور پر کمیونسٹ پارٹیز کی پالیسیوں کے خلاف ہوا کرتے۔

ان دھرنوں میں رائے عامہ کو جاننے کے لیے دستخطی مہم بھی چلائی جاتی۔

1989ء میں Tinanmen اسکوائر میں ہونے والا دھرنا آخر کار سخت قسم کا تشدد ہو گیا۔ ان لوگوں نے جمہوریت کے حق میں مظاہرہ کیا تھا۔ حکومت نے پولیس اور فوج کی مدد حاصل کی اور بے شمار افراد مارے گئے۔

1978ء میں ڈانگ ژی پنگ نام کے ایک ماہر اقتصادیات نے اپنا چار نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ جس کی پارٹی کی طرف سے مخالفت ہوئی۔

اس نے بیجنگ شہر کی ایک دیوار پر اپنا فارمولا چسپاں کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے سینکڑوں افراد نے اس دیوار پر کاغذ چپکائے اور اپنے دستخطوں کے ذریعے اس فارمولے کی تائید کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دیوار کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے اس طرح وہ دیوار دیوارِ اظہار کہلانے لگی۔

تبت

تبت میں 1959ء سے 2008ء تک حکومتی پالیسیوں کے خلاف دھرنے ہوتے رہے ہیں۔

مصر

حالیہ تاریخ میں مصر کے تحریر اسکوائر نے پوری دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ مصر کے صدر محمد مرسی کے خلاف 30 جون 2013ء میں بہت بڑے دھرنے کا آغاز ہوا۔ مطالبہ یہ تھا کہ مرسی استعفیٰ دیں۔

مرسی نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد تحریر اسکوائر پر جمع ہوتے چلے گئے۔ حکومت نے پولیس اور فوج کی مدد سے اس مظاہرے اور دھرنے کے خلاف 14 اگست کو شدید کارروائی کی جس میں 638 افراد ہلاک ہوئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ ہیومن رائٹس کے مطابق بارہ سو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ دھرنے کے شریک افراد فتح کا نشان کے طور پر ایک دوسرے کو رابطہ کا نشان دکھاتے تھے۔ یعنی چار انگلیاں کھڑی کر کے اور انگوٹھے کو ہتھیلی سے لگا کر۔

اس کے بعد اتنی سختی ہوئی کہ جو بھی شخص ایسا نشان بناتا ہوا دکھائی دیتا اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

پاکستان

ہمارے ملک پاکستان میں بھی دھرنوں کی تاریخ پرانی ہے۔ چھوٹے موٹے دھرنے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ہم بڑے دھرنوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

حالیہ گزشتہ برسوں میں پرویز مشرف کے دور میں چیف جسٹس کی بحالی کے لیے وکیلوں نے کراچی میں ایم اے جناح روڈ پر دھرنا دیا تھا۔ اس کی قیادت ریٹائرڈ جسٹس رشید اے رضوی اور سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے محمود الحسن، منیر اے ملک اور کچھ دوسرے کر رہے تھے۔ وکیلوں کا ساتھ دینے کے لیے سیاسی پارٹیز بھی میدان میں آ گئی تھیں۔ جیسے لیبر پارٹی پاکستان، تحریک انصاف، پاکستان ملی عوامی پارٹی اور سنی تحریک وغیرہ۔

کوئٹہ میں ہزارہ قبیلے کی آبادی میں بم بلاسٹ ہوا جس میں سو سے زائد افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس دھماکے پر احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے پورے پاکستان میں ہر چھوٹے بڑے شہر میں یا بڑے شہروں میں بیک وقت کئی کئی مقامات پر دھرنا دیا گیا جو تین شب و روز جاری رہا۔

اب آ جائیں پاکستان بلکہ شاید دنیا کی تاریخ کے ان دھرنوں کی طرف جو اپنے حجم اور اپنی مدت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔

بڑے دھرنوں کی ابتدا طاہر القادری نے کی، یہ دھرنا 2013ء میں اسلام آباد میں دیا گیا تھا اور راجا پرویز اشرف نے خود جا کر شرکاء کے مطالبات سنے تھے۔

یہ دھرنے ہیں آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کے۔

دراصل کوئی بھی دھرنا یا تحریک ایک دم نہیں شروع ہوتی۔ بلکہ مہینوں، برسوں سے لاوا پکتا رہتا ہے پاکستان میں ایسا لاوا الیکشن کے بعد ہی پکنا شروع ہو گیا تھا جب عمران خان نے نواز شریف پر دھاندلی کے الزامات لگائے۔ اس کے بعد پاکستان عوامی تحریک بھی اپنے مطالبات لے کر شامل ہو گئی۔ کیونکہ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں منہاج القرآن کے چودہ افراد شہید ہوئے تھے۔

اب کئی مطالبات تھے الیکشن کی دھاندلی، حکومت کی برطرفی، چودہ افراد کے قتل کی ایف آئی آر وغیرہ۔ ان سب نے مل کر ایک بڑی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور یہ طے پایا کہ لاہور سے جلوس روانہ ہو کر اسلام آباد پہنچ کر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دے گا۔

14 اگست 2014ء کو لاہور کے زمان پارک سے جلوس روانہ ہوا دوسرے شہروں کے لوگ آ کر ملتے رہے اور کارواں بنتا چلا گیا۔

آزادی مارچ کی قیادت عمران خان کر رہے تھے اور انقلاب مارچ کی ڈاکٹر طاہر القادری واضح طور پر دو دھڑے بن گئے۔

ایک طرف نواز شریف، شہباز شریف، چوہدری نثار علی خان، دیگر وزراء، پاکستان پیپلز پارٹی اور محمود خان اچکزئی تھے۔ حکومت کی طاقت تھی تو دوسری طرف عمران خان کے ساتھ شاہ محمود قریشی، جاوید ہاشمی، شیخ رشید، اسد عمر، اعجاز چوہدری اور جمشید دستی تھے۔

جب کہ طاہر القادری کے ساتھ چوہدری شجاعت، پرویز الٰہی، غلام مصطفیٰ کھر، آصف احمد علی وغیرہ تھے۔



# علاج

رابعہ اے خالد

مسیحائی کھیل نہیں۔ انسان کا ذہن الجھی ڈور ہے اور مرض کا منبع دماغ۔ جس معالج نے الجھی ڈور کا سرا پکڑ لیا اس کے لیے علاج کرنا بازیچۂ اطفال ہے۔ اس نے بھی اسی کلیہ کو آزمایا اور ایک نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ذہن میں زندگی کی جوت جگانے میں کامیاب ٹھہرا۔

**انوکھے انداز سے مسیحائی کا دلچسپ قصہ**

بدھ کی شام چھ بجے جان مجھ سے ملنے میرے کلینک پہنچا۔ میں اس وقت اپنے مریضوں کے ساتھ خاصا مصروف تھا۔ اس لیے اسے دو گھنٹے میرا انتظار کرنا پڑا۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے اسے اندر بلایا۔ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ خاصا پریشان تھا۔ جان میرے بچپن کا دوست تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھ سال سال بڑا تھا لیکن اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر ہماری دوستی قائم ہے۔ وہ ایک مہربان اور نفیس

انسان تھا۔ وہ ایک مالیاتی فرم میں چیف اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا، جان کی بیوی مارتھا ایک محبت کرنے والی عورت تھی۔ جان کے دو لڑکے تھے۔ بڑا جیری بائیوکیمسٹری میں ڈگری لے رہا تھا جب کہ چھوٹا لیری ابھی ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا۔ دونوں لڑکے لائق اور مہذب تھے۔ میں مہینے میں ایک بار جان کے گھر ضرور جاتا تھا اور مارتھا کے ہاتھ کے پکے کھانوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اسی لیے میں پریشان ہو گیا کہ اسے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور انتظار کے لیے معذرت کی۔ اس نے بے خیالی سے سر ہلا دیا۔ کافی وغیرہ پینے کے دوران بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ غائب دماغ اور تشویش زدہ سا ہے۔

''کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔''

''میں کافی پریشان ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' جان نے کہا۔

''تم کھل کر بات کرو۔''

''میں جیری کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' جان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جیری ٹھیک ہے۔'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''تم جانتے ہو پچھلے چھ ماہ سے اسے لگاتار صدمات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ انتہائی حساس لڑکا ہے۔ سب سے پہلے اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کی پنڈلی کی ہڈی میں فریکچر آ گیا لہٰذا اس کے دو سمسٹرز ڈراپ ہو گئے۔ وہ انتہائی ذہین لڑکا ہے اور ہر کلاس میں سب سے آگے رہا ہے لیکن اس حادثے کی وجہ سے وہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ بہر حال اس نے بڑی مشکل سے اس کمی کو پورا کیا۔ اسی دوران اس کی گرل فرینڈ جس پر وہ جان چھڑکتا تھا کسی اور لڑکے پر مہربان ہو گئی۔ جیری نے بڑی کوشش کی کہ وہ کسی طرح دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے لیکن وہ تو گویا پتھر کی بن گئی ہے۔ ایک دن میں نے جیری کو بہت سمجھایا کہ بہاری زندگی پڑی ہے۔ ایسی جیسی نجانے کتنی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں گی لہٰذا وہ اسے اپنے دل کا روگ نہ بنائے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بات جیری کی سمجھ میں آ گئی ہو کیوں کہ وہ کافی حد تک سنبھل گیا تھا لیکن اب جو صدمہ اس پر ٹوٹا ہے وہ سب سے بڑا ہے۔ وہ اپنے کالج کی فٹ بال ٹیم کا سرگرم کھلاڑی ہے لیکن اس کے کوچ نے اسے ٹیم سے نکال دیا ہے۔ دراصل حادثے کی وجہ سے اس کی پنڈلی میں جو فریکچر ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی اسے تکلیف دیتا ہے۔ خاص طور پر بال کو کک لگاتے وقت وہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اس صدمے نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ بالکل گم صم ہو گیا ہے۔'' اس نے سلسلہ کلام روک کر سانس لی پھر بولا۔ ''پرسوں مارتھا نے مجھے ایک بہت خوف ناک بات بتائی ہے۔ جیری کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اسے الماری کی دراز میں ایک خطرناک نشہ آور دوائی کی دو شیشیاں نظر آئیں۔ اگر جیری یہ استعمال کرنے لگا ہے تو اپنے آپ کو تباہ کر لے گا۔'' جان نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات ختم کی۔

''میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ تم کس کیفیت سے گزر رہے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ جیری کو کسی تجربہ کار ماہر نفسیات کے پاس جانے پر رضامند کرو۔ وہ اس سے بات کر کے بہتر محسوس کرے گا۔'' میں نے جان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم سے بہتر ماہرِ نفسیات کون ہو گا۔'' جان نے جلدی سے کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''ڈیئر میرا مشورہ ہے کہ جیری کسی اجنبی ڈاکٹر سے بات کرے کیونکہ وہ مجھے خاندان کا فرد سمجھتا ہے اور شاید میں بھی وہ پیشہ ور فضا قائم نہ رکھ سکوں جس کی جیری کو اشد ضرورت ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ جیری کو اس وقت کسی ماہر پیشہ ور ڈاکٹر کی ہی ضرورت ہے۔'' جان مضبوط لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں دو تین ماہر ڈاکٹروں سے وقت لے دیتا ہوں۔ یہ وہ پیشہ ور لوگ ہیں جو مایوس ترین مریضوں کو بھی اس دلدل سے باہر نکال لیتے ہیں۔'' میں نے جان کو مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اگلے دن میں نے پہلا کام یہی کیا کہ ڈاکٹر رالف سے جیری کے لیے وقت لے لیا۔ ڈاکٹر رالف ایک کامیاب ترین ڈاکٹر ہونے کے علاوہ میرے استاد بھی تھے۔ ویسے تو وہ خاصے مصروف ڈاکٹر تھے لیکن میری درخواست پر انہوں نے جیری کو اگلے ہفتے کا وقت دے دیا۔

☆.....☆

تین ہفتے کے بعد میں جان کے گھر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔



''اب جیری کیسا محسوس کر رہا ہے۔'' میں نے مشروب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''وہ بہتر ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے کمرے سے باہر نکلنا شروع کر دیا ہے۔ کل وہ لائبریری بھی گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے۔ وہ زندگی کی طرف واپس آ رہا ہے۔'' جان نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''جیری کہاں ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔ تم وہیں چلے جاؤ۔'' جان نے جواب دیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور جیری کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے ہیجان آمیز موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حالانکہ میری معلومات کے مطابق جیری دیسی اور علاقائی موسیقی پسند کرتا تھا۔ بہر حال یہ حقیقت تھی کہ اس وقت اس کی شخصیت تبدیلی کے عمل سے گزر رہی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور جیری کی اجازت سے اندر داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

''انکل ڈینی، آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں بھی تمہیں اتنی پُرجوش موسیقی سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خوش ہوا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ اندر سے سخت مضطرب ہو۔

''یہ اس سال کی سب سے مشہور البم ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب آگے تمہارا کیا ارادہ ہے۔'' میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔ شاید پڑھائی شروع کر دوں۔ یا یہ سمسٹر بھی چھوڑ دوں۔ ممی ڈیڈی نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔''

''ڈاکٹر رالف سے تمہاری ملاقاتیں کیسی جا رہی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ اچھے انسان ہیں۔ ایک مہربان ڈاکٹر۔ وہ میرا ہر لفظ اتنے غور سے سنتے ہیں جیسے میں درس دے رہا ہوں۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ کبھی مدھم نہیں پڑتی۔'' جیری نے

ہنستے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہا۔

☆......☆

میرے سوال پر ڈاکٹر رالف نے سر ہلایا۔ ''تمہاری تشویش بجا ہے۔ وہ لڑکا بہت حساس ہے۔ اسی حساسیت نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ بہرحال ڈیئر تم جانتے ہو میں معجزوں پر یقین نہیں رکھتا البتہ بہتری پر ضرور رکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر رالف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیری سے مل کر مجھے ایسا لگا جیسے وہ ابھی تک اپنے دکھوں کے انبار تلے دبا ہے لیکن ظاہری طور پر اپنے آپ اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ علاج وقت لے گا۔ ابھی جیری سے میری دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہ تیزی سے جذباتی تباہی کی طرف جا رہا تھا۔ بہرحال اب اس کی جذباتیت قابو میں ہے۔ مجھے اُمید ہے وہ مزید بہتر ہوگا۔'' ڈاکٹر رالف نے نرمی سے کہا۔

''میں بھی مایوس نہیں ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے مسائل اور غموں کا سامنا کرے.... انہیں نظر انداز کرے۔ صرف یہی قدم حقیقت میں اسے سنبھلنے میں مدد دے گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ خاص کیس ہے۔ ضرورت سے زیادہ حساس مریضوں کو بہت احتیاط سے ہینڈل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں بھی محتاط ہوں۔'' ڈاکٹر رالف نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں کسی حد تک ڈاکٹر رالف سے متفق نہیں تھا لیکن وہ جیری کے معالج تھے اس لیے میں خاموش رہا۔ میرے خیال میں کسی زخم کو ٹھیک کرنے کے لیے اس کو چھیڑنا ضروری ہوتا ہے۔ چاہے یہ مریض کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ اگر زخم کو چھیڑے بغیر خوب صورت طریقے سے ڈھک بھی دیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ زخم اندر ہی اندر خراب ہوتا رہتا ہے۔

☆......☆

رات کے تین بجے مجھے جان کی کال موصول ہوئی جو میں نے غنودگی کے عالم میں سنی۔ اس کی دہشت زدہ آواز سن کر میں ہوش میں آگیا۔

''جان ہمت سے کام لے کر مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''جیری نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا ہے۔ اس کے پاس میرا ریوالور بھی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ختم کرلے گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر جان جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور رونے لگا۔

''کسی بھی طرح اسے باتوں میں لگاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔'' میں نے بیڈ سے چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔

جان نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے فون بند کردیا۔ میں صرف دو منٹ میں تیار ہوکر آندھی طوفان کی طرح جان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی تیز رفتار ڈرائیونگ نہیں کی تھی۔ پندرہ منٹ بعد میں جان کے گھر موجود تھا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ جیری کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ مارتھا فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ ایک کونے میں لیری بھی فکرمند چہرے کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مارتھا کے رونے کی رفتار تیز ہوگئی۔

''ڈیئی خدا کے لیے میرے بچے کو کسی طرح باہر نکالو۔'' اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ صورت حال سنگین ہے لیکن رونے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔'' میں نے سختی سے کہا۔ مارتھا نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''تم نے پولیس کو اطلاع دی؟'' میں نے آہستہ سے جان کو کہا۔

''جیری کا کہنا ہے کہ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو شوٹ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگائے گا۔'' جان نے لرزتے لہجے میں کہا۔ میں نے سر ہلایا اور جیری کے دروازے کے قریب آیا۔

''جیری میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز چند منٹ کے تحمل سے میری بات سن لو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر جیری کی آواز آئی۔

''اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن ہر آنے والا دن میرے لیے مایوسی کا نیا سیلاب لے کر آتا ہے۔ بس اب میں جینا نہیں چاہتا۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔'' جیری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مارتھا دوبارہ رونے لگی۔

''ٹھیک ہے جیری، یہ تمہاری اپنی زندگی ہے اور تمہیں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔'' میں نے آرام سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' جان نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ انکل ڈیئی مجھے اُمید تھی کہ آپ میری اذیت سمجھ جائیں گے۔'' جیری نے اندر سے عجیب آواز میں کہا۔

''جیری میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی زندگی کے صرف دو گھنٹے مجھے دے دو۔ اس کے بعد تم فیصلہ کرنے میں پوری طرح آزاد ہوگے۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ ڈاکٹروں کے حربوں سے واقف ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ دو گھنٹوں میں میرے جذبات قابو میں آجائیں گے اور میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں گا تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔'' جیری نے چلاتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں میں جانتا ہوں کہ تم نے کئی مہینوں کی اذیت کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور تم اتنی آسانی سے اسے ترک نہیں کرو گے۔ میں صرف تمہیں کچھ دیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو تم چاہو گے۔'' میں نے انتہائی نرمی سے کہا۔

جیری خاموش رہا۔ یہ خاموشی بڑی اعصاب شکن تھی۔ اندر سے کبھی کبھی جیری کے بڑبڑانے کی آواز بھی آتی تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن اگر آپ نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی یا پولیس کو آگاہ کرنے کی کوشش کی تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو۔ میں ایسی کوئی احمقانہ کوشش نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم میرا فون اپنے قبضے میں کرسکتے ہو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ممی، ڈیڈی اور لیری کو کہیں وہ اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ آپ بھی دروازے سے ہٹ جائیں۔'' اس نے ہدایت جاری کی۔

میں نے سب کو اشارہ کیا۔ مارتھا نے پُراُمید نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے تسلی دی۔ جان کو مجھ پر پورا اعتبار تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مارتھا بھی ایک لفظ ادا کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جان اور لیری پہلے ہی جاچکے تھے۔

''جیری تم باہر آسکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

کچھ لمحوں بعد جیری کمرے سے باہر تھا۔ وہ انتہائی وحشت زدہ نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور کپڑے شکن آلود تھے۔ اس کے ہاتھ میں جان کا ریوالور موجود تھا۔ یہ مکمل لوڈڈ تھا اور ان لاک تھا۔

3۔ مندرجہ ذیل سبزیاں دھو کر اور کاٹ کر فریزر میں رکھی جاسکتی ہیں مثلاً بھنڈی، توری، کدو، ٹنڈے، چقندر، میتھی اور پالک وغیرہ بھی لیموں کو ثابت رکھ سکتی ہیں یا رس نچوڑ کر رس محفوظ کرلیں۔ لیموں جب استعمال کرنا ہو تو پندرہ منٹ پہلے گرم پانی میں ڈال دیں پھر استعمال کریں۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ بنا کر فریزر میں رکھ سکتی ہیں۔ چھلے ہوئے لہسن بھی محفوظ کرسکتی ہیں اور ادرک ثابت فریزر سے نکالنے کے بعد گھل جاتی ہے۔ ثابت ادرک کو زیادہ محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک گملے میں مٹی میں ادرک دبا دیں جب ضرورت ہو نکال لیں۔ مٹی صاف ستھری ہونی چاہیے۔ اس طرح اور ادرک بھی اُگ آئے گی۔

☆☆☆

''میں جانتا ہوں آپ مجھے اسی بوڑھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' جیری نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا رہا، آؤ چلیں۔'' میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ کچھ لمحوں کے تذبذب کے بعد جیری بھی میرے پیچھے ہولیا۔ میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا لیکن جیری میرے ساتھ بیٹھنے کی بجائے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ خاموش تھا لیکن کبھی کبھی اس کے تیز تیز سانس لینے کی آواز آتی تھی۔ وہ بار بار اپنے جسم کو حرکت دیتا تھا اور سخت مضطرب لگ رہا تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے گاڑی ایک عمارت کے سامنے کھڑی کی۔ یہ سادہ سی دو منزلہ عمارت تھی۔ میں نے گاڑی لاک کرکے قدم آگے بڑھائے۔ جیری میرے پیچھے تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ریوالور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ سخت بے چین ہے۔ عمارت کے آغاز میں ایک راہداری تھی جو ویران پڑی ہوئی تھی۔ رات کے اختتام کا وقت ہونے کی وجہ سے ہر طرف سکون طاری تھا۔ راہداری کے اختتام پر ایک کمرا تھا جس میں روشنی کی جھلک نظر آرہی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' جیری نے دہشت زدہ آواز میں پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں یہ ایک شیلٹر ہوم ہے۔ جہاں بے گھر لوگوں کو رکھا جاتا ہے لیکن یہاں جو بے گھر رہتے ہیں وہ ہم لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اب جیری کے وحشت زدہ چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میں کونے والے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک سادہ آفس نما کمرا تھا۔ اس کمرے میں چالیس بیالیس سالہ ایک دراز قد اور خوش شکل آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور میرے عقب میں ریوالور بدست جیری کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''ہیلو گریگ۔ یہ جان کا بیٹا جیری ہے۔ یہ آج اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینا چاہتا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں اس دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں رہا۔ پے در پے صدمات نے اسے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔'' میں نے کرسی پر بیٹھے گریگ سے کہا۔

اس نے غور سے جیری کو دیکھا اور افسوس سے سر ہلا کر کہا۔ ''مجھے افسوس ہوا۔ بہرحال میں اس نوجوان کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''ہم تمہارے ادارے کا ایک چکر لگانا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جیری ادارے میں مقیم لوگوں سے ملے۔'' میں نے کہا۔

''انکل یہ صرف وقت کا زیاں ہے۔'' جیری نے بےزاری سے کہا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ابھی اسے میلے کچیلے فقیر نما لوگوں کو دیکھنا پڑے گا جو نشہ آور چیزوں کے استعمال سے دھت پڑے ہوں گے۔

''تم مجھے دو گھنٹے دے چکے ہو۔'' میں نے جیری کو کہا۔ اس نے بےزاری کے احساس کے ساتھ دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''اگرچہ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے لیکن صورتِ حال کی نزاکت کی وجہ سے میں تمہاری درخواست قبول کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر ڈینیل کارسن گریگ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جیری کو گریگ کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی قدم بڑھائے۔ گریگ اب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں جا رہا تھا۔ اس منزل میں ایک طویل راہداری تھی۔ جس کے دائیں بائیں کمرے بنے ہوئے تھے۔ گریگ نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم دونوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جیری کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ یہ ایک سادہ سا صاف ستھرا کمرا تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کمرے کے وسط میں دھرے کشادہ بیڈ پر ایک شخص محو استراحت تھا۔ جیری ایک ٹک اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص بظاہر تو انسان تھا لیکن اس کی گردن کے اوپر دو سر تھے۔ دو مکمل سر۔ دو بالکل ایک جیسے چہرے۔ اس عجیب الخلقت شخص کی عمر بائیس تیئس سال سے زائد نہیں تھی۔ گریگ نے آگے بڑھ کر اس شخص کا کندھا ہلایا۔

''لینن تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' اس شخص نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور تھوڑی دقت سے اٹھ بیٹھا۔

''تم ڈاکٹر ڈینیل سے تو واقف ہی ہو۔ یہ ان کے دوست کا بیٹا جیری ہے۔'' گریگ نے ہمارا تعارف کروایا۔ لینن نامی شخص مسکرایا بلکہ اس کے دونوں چہرے مسکرائے۔ یہ خاصا خوفناک منظر تھا۔

''مجھے تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' لینن کا ایک چہرہ بولا۔ دوسرا خاموش تھا۔

لینن اور شتنن جڑواں ہیں اور پیدائشی طور پر ایسے ہی ہیں۔ ان کو سرجری سے الگ کیا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں کسی ایک کی موت واقع ہو جائے گی۔ لہٰذا ان دونوں کا یہی فیصلہ ہے کہ ایسے ہی زندگی بسر کریں گے۔ میرے عزیز جیری زندگی نے ان دونوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے لیکن یہ دونوں پھر بھی مطمئن ہیں۔ لینن نے خوب صورت آواز پائی ہے اور گلوکار بننا چاہتا ہے۔ جب کہ شتنن مصوری کے میدان میں کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی تصویروں میں زندگی اپنی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔'' گریگ نے مسکرا کر کہا۔

جیری خاموش رہا لیکن اب اس کا ریوالور والا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا۔

''آؤ چلیں۔'' گریگ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اگلے کمرے کا رہائشی جاگ رہا تھا۔ یہ مارک نامی بغیر بازوؤں اور ٹانگوں والا تھا۔ اس کے تقریباً دس انچ کے دھڑ کو سارے کمرے میں پھدکتے دیکھنا خاصا دلچسپ منظر تھا۔ مارک نے گرم جوشی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔

''مارک پیدائشی معذور ہے اور ایسا ہی ہے۔ اب سے چھ ماہ قبل یہ شدید بیمار ہو گیا۔ اس کا ایک گردہ بیکار ہو رہا



تھا اور اسے گردے کی اشد ضرورت تھی لیکن ہر ڈاکٹر اس کا نام گردے کے عطیے کے منتظر لوگوں کی فہرست میں سب سے نیچے درج کر لیتا تھا۔ ان کے نزدیک اس کی زندگی اتنی اہم نہیں تھی۔ جب کہ میرے نزدیک اگر یہ زندگی کی خواہش رکھتا ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیے۔'' گریگ نے اپنی بات ختم کی۔

میں نے جیری کو دیکھا۔ وہ مارک کو دیکھے جا رہا تھا۔ مارک نے گریگ کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور پھدک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''میں بغیر بازوؤں اور ٹانگوں کے شخص ہوں لیکن ایک وجیہہ چہرہ رکھتا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ گریگ نے سر جھکایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

جیری اب بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اگلے کمرے میں داخل ہوتے ہی جیری ٹھٹک گیا۔ وہ کچھ دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا۔ یہاں کھڑکی کے نزدیک ایک کرسی پر اٹھارہ انیس سالہ کمزور سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا چہرہ اتنا خوف ناک تھا کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب کا شخص بھی ایک لمحے کے لیے خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ اس کی ناک ہونٹوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ آنکھیں اتنی بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں کہ مصنوعی معلوم ہوتی تھیں۔ ہونٹ ناپید تھے۔ دانت سارے کے سارے نظر آ رہے تھے۔ سر کے بال غائب تھے اور کھوپڑی پر جابجا ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ لڑکی ہمیں دیکھ کر مسکرائی تو اور بھیانک لگنے لگی۔

''اے میرے خدایا۔'' جیری نے سرگوشی کی۔

''یہ ٹینا ہے۔ یہ ایک خوب صورت اور دلکش بچی تھی لیکن بارہ سال کی عمر میں ایک ذہنی مریض شخص نے اسے اغوا کر لیا۔ اس شخص کی بیٹی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اس شخص نے چھ سال تک ٹینا کے چہرے پر ہر وحشت آزمائی تاکہ اسے اپنی بیٹی کی شکل دے سکے لیکن ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ نتیجے کے طور پر ٹینا کا چہرہ ایسا ہو گیا۔ اس لڑکی نے لگاتار کئی سالوں تک اتنا درد سہا ہے کہ اس کے نزدیک درد کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ یہ ایک اسٹور میں نوکری کرتی ہے لیکن گودام تک محدود رہتی ہے کیونکہ لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ان مشکلات کے باوجود یہ حوصلہ مند اور بہادر لڑکی ہے۔'' گریگ نے کہا۔

ٹینا مسکرائی۔ ''میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تین چار سال تک میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو جائے گی کہ میں سرجری کے ذریعے اس قابل ہو سکوں کہ کوئی شریف لڑکا مجھے اپنانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔'' ٹینا نے جواب دیا۔

''ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' گریگ نے ٹینا کا سر سہلایا اور باہر نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اگلے کمرے کی طرف بڑھتا۔ جیری لڑکھڑایا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

''بس خدا کے لیے رک جاؤ۔ میں اور نہیں دیکھ سکتا۔'' اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ وہ اب کسی بچے کی طرح رو رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''شاید تمہارے نزدیک اس عمارت میں دنیا کی ساری بدصورتی جمع ہے جیری لیکن میرے نزدیک یہ دنیا کی خوب صورت ترین عمارت ہے کیوں کہ یہاں حوصلہ، ہمت اور بہادری کی دلکشی موجود ہے۔ ڈیئر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ زندگی ہمارے ساتھ کیسے پیش آتی ہے۔ اصل حل یہ ہے کہ ہم زندگی کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔'' میں نے جیری کا سر چومتے ہوئے کہا۔ وہ روتا رہا۔

☆......☆

میں نے گاڑی جیری کی سائیکل کے قریب روکی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''انکل آپ کی گاڑی میری چھوٹی سی سائیکل کو ٹکر مار کر گرانے لگی تھی۔'' اس نے اپنی سائیکل پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنی اسپورٹس کار چھوڑ کر سائیکل کی سواری شروع کر دی ہے۔'' میں نے گاڑی کی کھڑکی سے منہ نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں آج کل ورزش کے موڈ میں ہوں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میں سائیکلنگ میں بہت اچھا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھی بات ہے۔ ویسے تمہارے پاس کافی وقت ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہرگز نہیں میں آج کل مارک کے گردے کے عطیے کے لیے کام کر رہا ہوں۔ اس لیے میرا قیمتی وقت ضائع نہ کریں اور یہ کام اپنے مریضوں کے ساتھ کریں۔'' اس نے کہا اور اپنی سائیکل سمیت ہوا ہو گیا۔ میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔

# خواب

شیراز خان

خواب دیکھنا ہر ایک شخص کو اچھا لگتا ہے لیکن وہ خود بھی من پسند خواب نہیں دیکھ سکتا اور خواب دیکھنے سے خود کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا۔ آخر یہ خواب ہمیں نظر کیوں آتے ہیں۔

**ایک مختصر سا دلچسپ جائزہ بطور خاص خوش ذوق قارئین کے لیے**

خواب ہمارے زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔

ذہنی گھٹن کو دور کرنے کے لیے خواب دیکھنا بہت ضروری ہے۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ نا آسودہ خواہشات کی تکمیل خوابوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

خوابوں کا موضوع بہت وسیع ہے۔ خوابوں کے بے شمار پہلو اور بے شمار کیفیات ہیں لیکن اس مضمون میں ہم نے ان خوابوں کے حوالے سے بات کی ہے جو دنیا کے مشہور لوگوں نے دیکھے اور ان کے خواب سچ ثابت ہوئے۔

ان کے خوابوں کا ذکر مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔

تو آئیں سب سے پہلے حضرت یوسفؑ اور ان کے حوالے سے فرعون کا خواب دیکھتے ہیں۔

جس وقت زلیخا کے الزام لگانے پر حضرت یوسفؑ کو قید ہوئی تو ان کے ساتھ دو اور کو بھی قید کیا گیا۔ ایک فرعون کا ساقی تھا اور دوسرا ایک داروغہ۔ ایک رات دونوں نے خواب دیکھا اور حضرت یوسفؑ سے آکر بیان کیا۔ ساقی نے کہا کہ میں نے انگور کا ایک درخت دیکھا۔ اس کی تین شاخیں نکلیں اور اس کے پھل پھول آئے پھر انگور کے گچھے پک گئے۔ میرے ہاتھ میں فرعون کا پیالہ تھا۔ میں نے شراب کشید کی اور فرعون کو پلا دی۔

دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میرے سر پر تین ٹوکرے روٹیوں کے ہیں، اوپر کے ٹوکرے سے پرندے روٹیاں کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسفؑ نے ساقی کو خواب کی تعبیر بتائی۔ ''انگور کی 3 شاخوں سے مراد تین روز ہیں۔ سو تین روز کے بعد تو فرعون کو شراب پلانے کے عہدے پر بحال ہو جائے گا اور دوسرے سے کہا کہ 3 ٹوکروں سے مراد 3 دن ہیں۔ 3 روز کے بعد تجھے سولی دی جائے گی اور پرندے تیرا مغز کھائیں گے۔''

اور یہی ہوا۔ ساقی اپنے عہدے پر بحال ہو گیا اور دوسرے کو پھانسی دے دی گئی۔

اور اب فرعون کا خواب دیکھیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ چپ چاپ دریا پر کھڑا ہے کہ دریا سے سات موٹی اور خوب صورت گائیں نکلیں اور گھاس چرنے لگیں۔

ان کے بعد سات اور بدشکل اور دبلی گائیں دریا سے نکلیں اور ان موٹی اور خوب صورت گائیوں کو کھا گئیں۔

فرعون ان خوابوں سے بہت ڈر گیا۔ اس نے دربار میں اپنا خواب بیان کیا۔ اتفاق سے ساقی کو یاد آ گیا کہ جس وقت وہ قید میں تھا اس نے اور داروغہ نے خواب دیکھے تھے اور قید خانے میں موجود ایک قیدی یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتا دی تھی۔

فرعون نے حکم دیا کہ جاؤ میرے خوابوں کی تعبیر معلوم کرو۔

حضرت یوسفؑ نے تعبیر بیان فرمائی کہ وہ سات اچھی اور خوب صورت گائیں اچھی فصلوں اور غلے کی فراوانی ہیں۔ یعنی سات برسوں تک خوب اچھی فصل ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد سات گائیں یعنی سات سال ایسے آئیں گے جو قحط کے



ہوں گے اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔

اس لیے ہوشیاری اسی میں ہے کہ اچھے دنوں کی فصلوں کو تھوڑا سا بچا کر رکھا جائے تا کہ کام آسکیں۔

آپ خود حضرت یوسفؑ کا ایک خواب ملاحظہ فرمائیں۔

یہ خواب آپ نے اپنے آخری دنوں میں دیکھا تھا جب حضرت یعقوبؑ کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت یوسفؑ مصر میں بہت اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

آپ دیکھتے ہیں۔ ایک نہایت پُرفضا جگہ ہے۔ وہاں پر چند کرسیاں رکھی ہیں۔ ایک پر حضرت ابراہیمؑ ایک پر حضرت اسحاقؑ اور ایک پر حضرت یعقوبؑ تشریف فرما ہیں۔ جب کہ ایک کرسی خالی ہے اور ایک طرف یوسفؑ کی والدہ ماجدہ تشریف رکھتی ہیں۔

حضرت یوسفؑ وہاں پہنچتے ہیں اور سب ان سے لپٹ کر رونے لگتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ فرماتے ہیں۔ ''اے فرزند تو کب تک اپنے راہ دکھائے گا آ ہم تیرے انتظار میں ہیں۔''

آنکھ کھلی تو آپ کی روح پر اپنے بزرگوں سے ملنے کی سخت بے قراری تھی۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا فرمائی۔

''اے اللہ مجھے صالحین سے ملوا دے۔''

بس کچھ دنوں کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

ان خوابوں کا ذکر قرآن کے علاوہ ہماری مذہبی کتابوں میں بھی ہے۔

ایک اور مشہور خواب جولیس سیزر کی بیوی کیلی فورنیا کے حوالے سے ہے۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کا شوہر جب سینیٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچا تو چاروں طرف سے لوگ تلواریں لے کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سیزر کا دوست بروٹس بھی شامل تھا۔

فرانس بیکن

مشہور ادیب اور سائنس داں۔ پیرس میں مقیم تھا۔ جب کہ اس کا باپ لندن برطانیہ میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ ایک شب جب برطانیہ میں اس کا باپ قریب المرگ تھا بیکن نے خواب میں اپنا آبائی گھر دیکھا۔ جس کی دیواروں پر کالا پلاستر چڑھا ہوا تھا۔

اس سے اسے یقین ہوا کہ خونی رشتوں کے درمیان ٹیلی پیتھی کا رشتہ بہت ممکن ہے۔

آبائی مکان اس کے باپ کا تھا اور دیواروں پر آئی ہوئی سیاہی باپ کی موت تھی۔

آلیور کرامویل

اس شخص نے ایک رات دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اچانک کمرے کا پردہ ایک طرف ہٹتا ہے اور ایک خوب صورت اور باوقار عورت کرامویل کے سامنے آکر کہتی ہے۔ ''تم ایک دن انگلینڈ کے عظیم ترین انسان

گے۔'' اور ہوا بھی یہی۔

ملکہ میری ارطونیٹے

اس کو فرانسیسی انقلابیوں نے تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا تھا۔

اس نے ایک رات طلوع سحر کا منظر دیکھا جو دھاری دار تھا اور کسی عبادت گاہ کے ستون سے مشابہ تھا۔

اچانک وہ ستون بیٹھ گیا اور زمین پر گر گیا۔ اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ کوئی بڑی شخصیت چل بسے گی اور یہی ہوا خود میری ارطونیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔

مشہور شاعر شیلے نے سفر کر کے سمندر میں ڈوبنے سے پندرہ دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا۔

جس میں اس کے دوست اس کی خواب گاہ میں زخمی اور خون آلود حالت میں داخل ہو کر اس سے کہتے ہیں کہ تمہارا مکان سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ایک دوست ولیمز کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

پندرہ دنوں کے بعد یہ خواب سچ ہو گیا۔ شیلے اور اس کا وہ دوست جس کا گلا اس نے خواب میں گھونٹا تھا دونوں ایک ساتھ ڈوب کر مرے تھے۔

مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار چارلس ڈکسنز نے اپنا ایک خواب بیان کیا ہے کہ وہ کسی پارٹی میں ہے اور اس کے کچھ دوست ایک عورت سے اس کا تعارف کروا رہے ہیں کہ یہ مس نیپئر ہیں۔ چارلس اس عورت کو بالکل نہیں جانتا لیکن کچھ دنوں کے بعد بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک پارٹی ہوتی ہے جس میں نیپئر نام کی ایک عورت سے اس کا تعارف کروایا جاتا ہے۔

بسمارک انیسویں صدی کا جرمن مرد آہن تھا اس نے خواب میں دیکھا کہ دیگر جرمن صوبوں پر روس کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بعد میں درست ثابت ہوئی اور پہلی عالمی جنگ کا سبب بن گئی۔

مشہور امریکی صدر ابراہام لنکن کا یہ خواب بھی بہت مشہور ہے جس میں اس نے اپنی لاش کے ٹکڑے دیکھے تھے اور اس خواب کا ذکر کر دیا تھا۔

اڈولف ہٹلر نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ایک نوجوان کی حیثیت سے سب سے زیادہ غیر معمولی خواب دیکھے۔

وہ جرمن پیادہ فوج میں تھا اور فرانس کے محاذ پر ایک خندق میں گرا ہوا تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ زینے کے اندر دھنس گیا ہے اور پگھلے ہوئے لوہے کے نیچے دبا ہوا ہے اور بہت زخمی ہے۔

وہ نیند سے بیدار ہوا اور اپنے ساتھیوں کے منع کرنے اور دھمکانے کے باوجود خندق سے باہر نکل آیا۔

جوں ہی وہ اس کھلی ہوئی سرنگ سے نکل کر چند قدم چلا اس کے پیچھے ایک دھماکا ہوا اس نے مڑ کر دیکھا وہ سرنگ یا خندق بالکل مسمار ہو چکی تھی اور تمام سپاہی زمین میں دھنس چکے تھے اور سرخ دہکتی ہوئی دھات ان کے اوپر جمی ہوئی تھی۔

لارڈ ٹینی سن نے خواب میں دیکھا کہ پرنس البرٹ اس سے ملنے آیا ہے اور اس کے رخسار کا بوسہ لے رہا ہے۔

دوسرے ہی دن اسے درباری شاعر بنا دیا گیا تھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بہت سے ایسے خواب بھی ہیں جن میں سائنس دانوں کی رہنمائی کی گئی تھی اور انہوں نے اپنے خوابوں کے مطابق کامیابیاں حاصل کر لیں۔

ایک مثال لیبس پروکی کی ہے۔

یہ ایک ذہین انسان تھا۔ یہ دیکھا کرتا کہ کپڑے سینے والے (درزی) کتنی محنت سے کپڑے سیتے ہیں۔ یعنی ہاتھوں سے کپڑے میں کسی نوکدار سوئی سے سوراخ کرتے ہیں۔ پھر اس سوراخ کے برابر دوسرا سوراخ کیا جاتا ہے اور دھاگے کو دونوں سوراخوں کے درمیان سے گزارا جاتا ہے۔

بہت ہی پریشان کن اور دشوار صورت حال تھی۔

سوئی سے دھاگا نکل جایا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے ایک خواب دیکھا اس نے دیکھا کہ وہ کسی جگہ سے گزر رہا ہے کہ آدمی اس پر خنجر سے حملہ کر رہا ہے۔ وہ ایلس کے پیٹ میں خنجر ڈال کر جب باہر نکالتا ہے تو اس کے ساتھ ایلس کی آنتیں بھی باہر آ جاتی ہیں۔ وہ پھر خنجر ڈالتا ہے اور پھر آنتیں آتی ہیں۔

اس خواب نے ایلس کو خوف زدہ تو کیا لیکن اس خواب نے صدیوں پرانے ایک مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔ یعنی خنجر کی نوک پر اگر سوراخ ہو تو پھر بڑی آسانی سے دھاگا کپڑوں کے درمیان گزر سکتا ہے اور یہی خیال اس کو عظیم ایجاد کی طرف لے گیا۔

جانتے ہیں وہ ایجاد کیا ہے سلائی مشین۔ اس خواب نے ایلس کو سلائی مشین کی راہ بتا دی تھی۔

وہ ہالی ووڈ کا ایک عام سا ہدایت کار تھا۔ اس کے کریڈٹ پر کوئی خاص فلمیں نہیں تھیں۔ کبھی کبھی اسے کوئی کام مل جایا کرتا۔ پھر اس نے ایک خواب دیکھا اور اس خواب نے اس کی دنیا بدل دی۔

اس نے دیکھا کہ اس کا جہاز خلا میں پرواز کر رہا ہے اور کوئی مخلوق جہاز پر آ کر حملہ آور ہو جاتی ہے۔

اس نے یہ خواب 1981ء میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اس خواب کی تعبیر کے حصول میں لگ گیا اور کئی برسوں کے



بعد اس نے اس خواب پر منحصر ایک فلم بنا ڈالی جس کا نام ہے ''ٹرمینیٹر''۔ پوری دنیا میں دھوم مچا ڈالی اور اس ڈائریکٹر کا نام ہے جیمز کیمرون۔

آئن اسٹائن، کون اس کو نہیں جانتا۔ اس شخص نے تھیوری آف Relatively کا تصور اپنے ایک خواب سے ہی لیا تھا۔

وہ خواب کیا تھا۔ ایک چراگاہ ہے جس کے اندر بے شمار گائیں گھومتی پھر رہی ہیں۔ اس چراگاہ کے اطراف میں تاروں کی ایک ہلکی سی باڑھ ہے۔

وہ ایک طرف کھڑا ہوا یہ سوچ رہا ہے کہ اگر یہ مویشی بھڑک اٹھے تو تاروں کا یہ باڑھ انہیں روک نہیں سکے گا۔

پھر اس نے چراگاہ کے مالک کو دیکھا جو ایک طرف کھڑا ہوا اپنے مویشیوں کو دیکھ رہا تھا اچانک کسی وجہ سے مویشی بھڑک کر بھاگ اٹھے اور ان کا رخ باڑھ کی طرف تھا۔

چراگاہ کے مالک نے فوراً ہی ایک سوئچ دبا کر ان تاروں میں ہلکا کرنٹ چھوڑ دیا۔ اب وہ مویشی تاروں کے پاس آئے اور اچھل اچھل کر پیچھے بھاگنے لگے۔

آئن اسٹائن دیکھ رہا تھا کہ مویشی خوف اور تکلیف سے اچھل کود کر رہے ہیں لیکن چراگاہ کے مالک کی نگاہ میں یہ ان کی ایکسر سائز کا وقت تھا۔

آئن اسٹائن بیدار ہو گیا اور اس کے دھیان میں یہ بات آ گئی کہ کبھی کبھی ایک واقعہ دو مختلف پوائنٹس پر کھڑے ہوئے لوگوں کے لیے مختلف تصور اور ردعمل پیش کرتا ہے۔ یہیں سے اس نے تھیوری آف Relatively حاصل کی۔

تاریخ میں اس قسم کے بے شمار خواب ہیں۔ ایک خواب تو وہ ہوتے ہیں جو آنے والے واقعات کی خبر دے دیتے ہیں۔ دوسری قسم کے خواب وہ ہوتے ہیں جو علامات کے ذریعے اپنا اظہار کرنا، جیسے فرعون نے سات گائیوں کو علامات کے طور پر دیکھنا اور تیسری قسم کے خواب وہ ہوتے ہیں جو اس طرح پیش آتے ہیں جس طرح دیکھے گئے تھے۔

جیسے ہٹلر کا خواب کہ اس کی خندق زمین میں دھنس گئی ہے اور وہ سب پگھلے ہوئے لوہے کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

اس خواب میں فطرت نے علامت سے کام نہیں لیا بلکہ اس خواب کو اس انداز سے پیش کر دیا جس انداز سے وہ واقعہ پیش آیا تھا۔

خواب دراصل بہت ہی پیچیدہ اسرار ہیں۔ سائنس ابھی تک مکمل طور پر خوابوں کے بھید سے پردہ نہیں ہٹا سکی ہے۔

## جائزہ ارضی

### Geological Survey

زمین یا اس کے کسی حصے کا مطالعہ جس سے معلوم ہو سکے کہ اس کی ساخت کیسی ہے، معدنیات کس قسم کے ہیں۔ سطح کس طرح کی ہے اور مٹی کس خاصیت کی ہے۔ انسان نے ابتدائے آفرینش ہی سے اپنے اردگرد کی چیزوں کا جائزہ لینا اور ان کو اپنی بساط کے مطابق سمجھنا شروع کیا مگر پرانے زمانے کے لوگوں نے یہ باتیں نہ تو دوسرے لوگوں کو بتائیں اور نہ کوئی اس قسم کی یادداشت لکھی جس سے ان کی معلومات ہم تک پہنچتیں۔ جائزہ ارضی کئی وجوہ سے بڑا اہم اور ضروری ہے۔ اس سے انسان کو نئی نئی باتیں معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اپنے اردگرد جس زمین کو دیکھتا ہے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے متعلق معلومات جتنی زیادہ ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ فراست کے ساتھ وہ زمین کے وسائل کو استعمال کر کے اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرتا ہے۔ زمین کا اکثر حصہ چٹانوں کی صورت میں ہے جنہیں مٹی اور ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے ذرات نے گھیر رکھا ہے۔ یہ چٹانیں کئی قسم کی ہیں اور مختلف طریقوں سے بنی ہیں۔ آتشی چٹانیں، تہ دار چٹانیں اور متغیر چٹانیں ان کی بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ چٹانوں کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب یہ چٹانیں بنی اس وقت یہاں کی زمین کی کیفیت کیا تھی۔ جن چٹانوں میں پرانے پودوں اور جانوروں کے آثار اور پنجر ملتے ہیں اور جواب تبدیل ہو کر پتھر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس علاقے میں کون کون سے جانور پائے جاتے تھے۔ معدنیات کی مختلف قسمیں بھی مختلف چٹانوں میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔

مرسلہ: شیر گل۔ خوشاب

# تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالمِ رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

تاریخ کا یہ سفر اپنے آخری مراحل میں ہے۔
ہم 1300 عیسوی تک آچکے ہیں۔ اس معلوم تاریخ کے دوران وقت نے بہت کچھ دکھا دیا ہے۔ حکمرانی کے لیے جوڑتوڑ، ایک دوسرے کا خون بہانا، ظلم، بربریت۔

ایسا لگتا ہے جیسے پوری انسانی تاریخ ایک ایسا جنگل ہے جس میں ہر طرف خونی درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کے لیے گھومتے پھرتے ہیں۔

اس قسم کے جنگل میں کبھی کبھی کوئی چراغ بھی دکھائی



دے جاتا ہے۔ یہ چراغ پیغمبر ہیں، اولیاء ہیں، مفکر ہیں، دانش ور ہیں، سائنس داں ہیں، اہلِ علم ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اس تاریک اور اس خونخوار جنگل میں سکون کا درس دیتے نظر آتے ہیں اور ہر دور میں ایسے لوگ بہت کم رہے ہیں۔

بہرحال اب آجائیں 1200 عیسوی سے 1392 عیسوی تک۔ اس دور میں بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ دنیا بھر میں علمی وادبی تحریکیں پیدا ہوتی رہیں۔

1200 سے 1299 تک میں ہم نے روم، یونان، فرانس اور جرمنی وغیرہ کا ذکر کیا تھا جب کہ کئی اہم ممالک کا ذکر ابھی باقی ہے۔ جیسے برطانیہ، روس، سسلی وغیرہ۔

1300 سے لے کر 1399 تک میں جانے سے پہلے ایک نظر اگر ان اہم ممالک پر بھی ڈال لی جائے تو تاریخِ عالم کو سمجھنے میں بہت آسانی رہے گی۔ اس کے بعد ہم 1300 میں داخل ہوجائیں گے۔ آئیں سب سے پہلے برطانیہ کو دیکھتے ہیں۔

برطانیہ

عہدِ قدیم میں برطانیہ وحشی قبائل کا مسکن تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یورپ سے چند نئے قبائل جو سلٹیس کے نام سے مشہور تھے ان جزائر میں داخل ہوئے اور اصل باشندوں کو پہاڑوں میں دھکیل دیا۔

55 قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جو اس وقت فرانس کا گورنر تھا، برطانیہ کو فتح کرلیا لیکن مالِ غنیمت اور کئی ہزار غلام لے کر واپس چلا گیا۔

43 قبل مسیح میں کلاڈی کیس (41 سے 54) نے برطانیہ کو فتح کرلیا اور یہ جزائر اندازاً چار سو برس تک روم کے زیرِ نگیں رہے۔

روم کے بعد جرمن کے تین قبائل اینگلز، سیکنز اور جوٹس برطانیہ پر چھا گئے۔ یہ لوگ نہایت جاہل، اجڈ اور جنگ پسند تھے۔ گارے کے گھروں میں رہتے۔ کھالیں پہنتے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ان کے سردار الگ الگ تھے۔ دو ڈھائی صدیوں کے بعد ان میں الفریڈ نام کا ایک سردار اٹھا جس نے مختلف قبائل کو مطیع کر کے ایک باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یہ صاحبِ علم بھی تھا۔ اس نے لاطینی کی چند کتابوں کو انگریزی میں منتقل کیا۔

برطانوی سلاطین کا سلسلہ اس سے شروع ہوتا ہے۔
1۔ الفریڈ اوّل۔ 871 سے 901 عیسوی۔
2۔ ایڈورڈ اوّل۔ 901 عیسوی سے 925 عیسوی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ ہیرلڈ دوم تک آتا ہے۔ زمانہ ہے 1066 عیسوی۔ فرانس کے ولیم نے برطانیہ پر قبضہ کرلیا۔ موجودہ شاہی خاندان اسی ولیم کی اولاد ہے۔

ولیم اوّل (فاتح کے لقب سے مشہور۔ اس کا زمانہ 1066 سے 1087 تک کا ہے)۔

اس کے بعد پھر یہ سلسلہ ہنری سوم تک چلا جس کا زمانہ 1216 سے 1272 تک کا ہے۔

اس کے بعد جدول کے لحاظ سے 1300 عیسوی کے حکمرانوں کے نام آتے ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا لیکن اس سے پہلے ایک اور بڑی طاقت روس کو دیکھ لیں۔

روس

روس صدیوں سے اسلامی ممالک کا ہمسایہ چلا آتا ہے۔ اس کے جنوب میں افغانستان، بخارا، ایران وعراق واقع ہے اور جنوب مغرب میں ترکی۔

افغانستان کے سوا باقی تمام ممالک بارہ سو سال تک علم و ثقافت کا مرکز رہے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ روس ان ممالک کی تہذیب سے غیر متاثر رہا ہو۔

دریائے والگا کے دونوں طرف لاکھوں مسلمانوں کا وجود ہی اس بات کی شہادت ہے کہ اسلامی اثرات غربی روس کے اندرونی خطوں تک پہنچ گئے تھے۔

روس کی مختصر تاریخ کچھ یوں ہے۔

نویں صدی عیسوی سے پہلے روس میں کیا ہو رہا تھا اس کے بارے میں بہت کچھ نامعلوم ہے صرف اتنا معلوم ہے کہ یہاں بھی وحشی قبائل آباد تھے جن کے سردار جدا جدا تھے۔

سرداروں کا یہ سلسلہ تیرہویں صدی تک جاری رہا۔ چنگیز خان نے 1227 عیسوی میں روس پر حملہ کیا تھا اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرلی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کے وارثین اڑھائی سو برس تک حکومت کرتے رہے۔

اس کے بعد روس میں کیا ہوا اس کا ذکر 1300 عیسوی سے 1399 عیسوی تک میں آئے گا۔

اب ایک اور اہم ملک سسلی کو لے لیں۔ یہ ایک بڑا جزیرہ ہے۔ یہاں مسلمان بہت دنوں تک حکومت کرتے رہے ہیں۔

یہ جزیرہ اٹلی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ 9860 مربع میل ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اس پر یونانی چھا گئے۔ جن کے چھوٹے چھوٹے سردار صدیوں تک آپس میں لڑتے رہے۔ پھر یہ جزیرہ مغربی روم کا حصہ بن گیا۔ اس کے زوال کے بعد مشرقی روم میں شامل ہوگیا۔ جب اس

جزیرے پر مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تو یہ مشرقی روما کا ایک صوبہ تھا۔

پہلا حملہ 653 عیسوی میں حضرت عثمانؓ کے دور میں ہوا اور آخری حملہ 827 عیسوی میں ہوا۔ یہ کل تیرہ حملے تھے۔ پہلے بارہ حملوں میں مسلمان شریر عیسائیوں کی گوشمالی کے بعد واپس چلے جاتے رہے لیکن جب ان کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو قاضی اسد بن فرات کی کمان میں فوج روانہ کی گئی۔

یہ فوج 827 عیسوی میں سسلی پر اتری اور اہم مقامات پر قابض ہوگئی۔ یہ جزیرہ 916 عیسوی تک اغالب کے قبضے میں رہا اور 916 عیسوی سے 947 عیسوی تک فاطمی خلفاء کے تسلط میں۔ اس کے بعد یہاں بکس خاندان برسر اقتدار آگیا ان فرماں رواؤں کے چند نام یہ ہیں۔

1۔ حسن بن علی۔ 947 سے 954 عیسوی تک۔

2۔ احمد بن حسن 954 سے 968 عیسوی تک۔

مسلمان فرماں رواؤں کا یہ سلسلہ 1052ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ مختصراً یہ ہے کہ فرانس کے نارمنی تجارت کی غرض سے اٹلی کی جنوبی ریاستوں تک آنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے وہاں ایک ریاست قائم کرلی جس کا سردار روگر تھا۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو سسلی پر حملہ کرنے بھیجا اور ایک بڑی فوج اس کی کمان میں دے دی۔

سسلی کے مسلم سردار جو تیرہ برس سے باہم لڑ رہے تھے اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور ایک ایک کرکے ختم ہوگئے۔

البتہ ایک سردار ابن البلباج برسوں لڑتا رہا لیکن کہاں تک بالآخر 1591ء میں اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور چالیس برسوں کی جنگوں کے بعد پورا جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر نارمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔

نارمنی بادشاہوں کا سلسلہ 1091 عیسوی میں شروع ہوکر 1196 عیسوی تک گیا ہے۔ ولیم آخری نارمن بادشاہ تھا۔

اس کے بعد جرمن کے ہنری ششم نے سسلی کو فتح کرلیا تھا۔

ہنری ششم 1194 سے 1197 عیسوی تک۔

فریڈرک دوم۔ 1197 سے 1250 عیسوی تک۔

اس نے 1241ء میں تمام مسلمانوں کو سسلی سے نکال دیا تھا۔

اس کے بعد منفریڈ 1250ء سے 1266 تک۔

یہ تھا آخری جرمن بادشاہ۔ اس کے بعد سسلی پر فرانس کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت لوئیس ہفتم حکمران تھا۔ اس نے اپنے بھائی چارلس آف این جو کو سسلی کا فرمانروا بنادیا۔

1۔ چارلس آف این جو۔ 1266 سے 1285 عیسوی۔

2۔ چارلس آف این جو 1285 عیسوی۔

اس کے بعد سسلی پر اسپین قابض ہوگیا۔ ان بادشاہوں نے 1285 سے (1442) تک حکومت کی۔ پھر فرانس کا غلبہ ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ اسپین کے پاس چلا گیا۔

پورے چار سو سال کی افراتفری کے بعد یہ جزیرہ 1860 میں اٹلی کا حصہ بن گیا۔

یہ تھی یورپ کی مختصر تاریخ۔ اب ہم پھر اپنے ٹریک پر آجاتے ہیں۔ یعنی 1300 سے لے کر 1399 عیسوی تک کیا ہوتا رہا۔

ان سو برسوں کے اہم ترین افراد میں مارکوپولو شامل ہے۔

مارکوپولو کا سفرنامہ کلاسک میں شامل ہوتا ہے۔

اس دور میں یورپ کی جنگوں میں توپوں کا استعمال کیا گیا۔ یہ ایک انتہائی طاقت ور ہتھیار تھا۔ اس دور میں یورپ پر سیاہ موت طاری ہوگئی (طاعون) جس سے لاکھوں افراد کی جانیں چلی گئیں۔

اب دیکھیں کہ اسلامی دنیا میں ان برسوں میں کیا ہوتا رہا۔

1326 عیسوی سے 1359 عیسوی۔ عثمان کا بیٹا ارخان کو دارالحکومت بنا کر ایک آزاد عثمانی ریاست قائم کرتا ہے اور زوال پاتی ہوئی بازنطینی سلطنت پر غلبہ پالیتا ہے۔

1328 عیسوی۔ مصلح امام احمد ابن تیمیہ دمشق میں وفات پاجاتے ہیں۔

1334 عیسوی سے 1354 عیسوی۔ غرناطہ کا بادشاہ یوسف الحمرا تعمیر کرواتا ہے جس کو اس کا بیٹا مکمل کرتا ہے۔

1369 (1405 عیسوی) تیمور لنگ ثمرقند میں چغتائی منگول اقتدار بحال کرتا ہے اور مشرق وسطیٰ اور اناطولیہ کو فتح کرلیتا ہے۔ نیز دہلی پر بھی قابض ہوجاتا ہے۔ تاہم اس کی وفات کے بعد سلطنت بکھر جاتی ہے۔

تیمور لنگ نے ہندوستان پر یہ حملہ 1398 عیسوی میں کیا تھا۔ وہ دریائے سندھ عبور کرکے دہلی پر قابض ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں ناصرالدین محمود کی حکومت تھی۔ وہ بھاگ کر گجرات چلا گیا تھا۔ امیر تیمور نے پندرہ دن دہلی میں قیام کیا۔ اس کے بعد وطن واپسی کا ارادہ کرلیا۔ واپسی پر امیر تیمور نے خضر خان کو اپنا نائب اور لاہور کا صوبے دار مقرر کردیا تھا۔

1389 عیسوی۔ عثمانی فرمانروا ں کوسود کے میدان میں سربوں کو شکست دے کر بلقان کو زیر نگیں کرلیتے ہیں۔ وہ اپنے



اقتدار کو اناطولیہ تک وسعت دیتے ہیں۔

اب آجائیں ہند کی طرف کہ یہاں کی صورتِ حال کیا تھی۔

قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے بھائی شہاب الدین کو معزول کرکے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اس نے رعایا کو بے شمار مراعات دیں۔ ان کا خیال رکھتا۔

قطب الدین مبارک شاہ نے چار سال چار ماہ تک حکومت کی اور اسے 14 اپریل 1319 کو خسرو خان نے قتل کردیا۔

خسرو خان ہندوؤں کی نیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ بظاہر مسلمان ہوگیا تھا مگر دل سے ہندو تھا۔ برسر اقتدار آکر اس نے اعلانیہ طور پر مسلمانوں سے دشمنی ظاہر کی۔ کئی مسجدوں کو بت خانوں میں تبدیل کردیا۔ امرا اور مسلمان عوام اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے۔ غازی ملک نے فوجی تیاریوں کے بعد دہلی پر حملہ کردیا۔

خسرو خان کو شکست ہوئی۔ گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا۔

غازی ملک نے غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح برصغیر میں تغلق خاندان کی حکومت کا آغاز ہوگیا۔

8 ستمبر 1320ء کو غازی ملک سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ جولائی 1325ء کو اس کی موت واقع ہوگئی۔ 1325 عیسوی کو الغ خان سلطان محمد شاہ تغلق کے لقب سے تخت پر بیٹھا، بے انتہا سخی تھا۔ 30 مارچ 1351ء کو اس دنیا سے کوچ کرگیا۔ 1351 عیسوی کو فیروز شاہ تغلق نے تخت سنبھالا جو بے انتہا سخی، اعلیٰ پائے کا منتظم تھا۔ وہ اکتوبر 1388ء میں انتقال کرگیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا پوتا تغلق شاہ تخت پر بیٹھا۔ وہ ایک نااہل حکمران تھا۔ اس لیے قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد ابوبکر شاہ تغلق تخت پر بیٹھا۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ سال حکمرانی کی۔ محمد شاہ تغلق نے اسے 1390ء میں قتل کرکے حکومت بنالی۔

1390ء میں ناصرالدین شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کا انتقال 1396ء میں ہوا تھا۔ ناصرالدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ تخت پر بیٹھا لیکن وہ ایک ماہ بیمار رہ کر چل بسا۔ اس کے بعد ناصرالدین محمود تخت پر بیٹھا لیکن 1398ء میں امیر تیمور نے حملہ کردیا تھا۔

یہ تھی مختصری داستان سن 1201 سے لے کر 1399 عیسوی تک کی۔ اس میں ہم نے یورپ اور برصغیر کی خاص خاص باتوں کے احاطے کے علاوہ دنیا کے چند کرداروں کے بارے میں بھی بتادیا ہے۔

اس کے بعد تاریخ آگے بڑھتی ہے۔

1403 سے 1421 عیسوی۔ تیمور کی وفات کے بعد محمد اول عثمانی ریاست کو بحال کرتا ہے۔

1406 عیسوی۔ مشہور فلسفی اور تاریخ داں ابن خلدون وفات پاجاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن، ولی الدین ابن خلدون، جدید علم تاریخ کے بانی 1332ء میں تیونس میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین اشبلیہ سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ ان کی بے مثال کتاب العبر مشرق و مغرب ہر جگہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب کا مقدمہ عالم گیر شہرت رکھتا ہے اور مقدمہ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمے میں ابن خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کے اصول بتائے ہیں۔ یورپ میں ان کی کتاب العبر کے مختلف ایڈیشن نکلے اور مقدمے کے کئی تراجم ہوئے۔

1421 سے 1451 عیسوی۔ مراد اوّل ہنگری اور مغرب کے خلاف عثمانی اقتدار کو تسلیم کرواتا ہے۔

1453 عیسوی۔ محمد دوم فاتح قسطنطنیہ کو فتح کرلیتا ہے جو آئندہ استنبول کہلاتا ہے۔ وہ اسے عثمانی سلطنت کا دارالحکومت قرار دیتا ہے۔

1492۔ غرناطہ کی مسلمان بادشاہت پر کیتھولک بادشاہ فرڈینینڈ اور ایزابیلا فتح پالیتے ہیں۔

☆ توپوں نے قلعوں کو دقیانوسی بنادیا (یعنی توپوں کے استعمال سے دیواریں گرنے لگیں)۔

☆ ابتدائی پستول استعمال میں آئے۔

☆ گٹنبرگ نے متحرک سانچوں والا چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔

یہ چونکہ انسانی تاریخ کی ایک اہم پیش رفت ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ بتادیا جائے تو مناسب ہوگا۔

جوہن گٹنبرگ کا زمانہ 1398 سے 1468 عیسوی تک کا ہے۔

اس شخص کو چھاپہ خانے کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ اصل میں اس نے یہ کیا کہ پہلے سے زیر استعمال متحرک چھاپے کو اس انداز میں بہتر بنایا کہ اس سے بڑی تعداد میں اور زیادہ درستگی کے ساتھ طباعت کا عمل ممکن ہوا۔

گٹنبرگ کی سوانح حیات کے بارے میں ہماری معلومات نہایت کم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ 1400 عیسوی کے قریب جرمن میں مینز شہر میں پیدا ہوا تھا۔

طباعتی فن میں اس نے اس صدی کے قریب وسط میں یہ اضافے کیے جب کہ اس کا معروف کارنامہ گٹن برگ انجیل تھی جو 1454عیسوی کے قریب ہنز میں ہی طبع کی گئی۔

فرڈینیڈ اور ایزابیلا نے اسپین کو متحد کیا۔

☆اسپین مسلمانوں کے ہاتھوں سے جانے لگا (1475عیسوی)۔

☆روس نے منگولوں سے آزادی حاصل کی۔

☆کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔

اب 1400عیسوی سے 1499 عیسوی تک ہند کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔

1403ء میں ملد خان نے گجرات پر حملہ کردیا لیکن ناکام رہا۔ اس شکست کے بعد ناصرالدین محمود قنوج چلا گیا۔ کیونکہ دہلی میں اس کی حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ اس کے بعد ملد خان نے پنجاب پر حملہ کردیا لیکن خضر خان نے اسے شکست دی اس معرکے میں ملد خان مارا گیا۔

اس کے ساتھ ہی ناصرالدین محمود تغلق نے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کرلیا۔

1412ء میں سلطان ناصرالدین محمود بیمار ہو کر وفات پا گیا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی گویا شہاب الدین غوری کے غلاموں کی حکومت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ دولت خان لودھی تخت پر بیٹھا۔ اس نے ایک سال تین ماہ حکومت کی۔

اس کے بعد خضر خان نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ دولت خان گرفتار ہوگیا اور قید کی حالت میں وفات پائی۔ خضر خان نے تخت پر قبضہ کرلیا اور برصغیر پاک و ہند میں سادات کی حکومت کا آغاز ہوگیا۔

خاندان سادات کی حکومت۔

سید خضر خان۔ 1414 عیسوی میں وہ بادشاہ بنا۔ اس نے سات سال چار ماہ حکمرانی کی۔ وہ عدل و انصاف میں یکا تھا۔ 20 مئی 1420 عیسوی کو اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی موت پر پورے ملک میں سوگ منایا گیا۔ خضر خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ وہ انتہائی بااخلاق اور باکردار انسان تھا۔ اس کی موت کے بعد سید محمد شاہ پھر سلطان علاؤالدین شاہ نے حکومت کی۔ اس نے تقریباً سات برسوں تک حکومت کی اور انتالیس سال تک بدایوں کا حاکم رہا۔ 1478ء میں انتقال ہوا۔

اس کے انتقال کے بعد بہلول خاندان حکمران رہا۔ سلطان بہلول طورس ایک خدا ترس اور درویش صفت انسان تھا۔ اس نے اڑتیس سال اور سات مہینے حکومت کی۔ گوالیار کی مہم سے واپس آتے ہوئے وہ بیمار پڑ گیا اور 12 جولائی 1489ء کو انتقال ہوگیا۔

سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت پر بیٹھا۔ اس کی تاج پوشی 17 جولائی 1489ء کو ہوئی تھی۔ وہ انتہائی نیک خصلت انسان تھا۔ (انتقال 1517 عیسوی میں ہوا تھا)۔

ہمارا یہ سفر 1400 عیسوی سے ہوتا ہوا 1499 عیسوی تک آچکا ہے۔ اب اس کے بعد ہم 1500 سے لے کر 1599ء تک کا ذکر کریں گے۔

دنیا نے اور بہت کچھ دیکھا۔ بہت سے دیو قامت کردار سامنے آئے۔

پہلے تو ایک نظر بڑے واقعات پر ڈال لیں پھر ان واقعات اور کردار میں سے جو اہم ہوں گے ان کی مختصر تفصیل دے دی جائے گی۔

☆واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا رستہ کھوج نکالا۔ لوتھر نے پروٹسٹنٹ تحریک کا آغاز کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو پر قبضہ کرلیا۔ پزارو "پیرو" پر قابض ہوا۔ انگلستان میں الزبیتھ اوّل برسراقتدار آئی۔ اسی دور میں آتشیں اسلحہ کا استعمال ہوا۔ انگریزی بحری فوج نے ہسپانوی جنگی بیڑے کو شکستِ فاش دی۔ (یہ واقعہ 1575 عیسوی کا ہے)۔

اب آجائیں چند اہم واقعات کی طرف۔

واسکوڈی گاما ایک پرتگیزی مہم جو تھا جس نے افریقا کے گرد چکر کاٹ کر یورپ سے ہندوستان تک درست بحری راستہ دریافت کیا۔ اسے پرتگالی بادشاہ نے 1497 عیسوی میں بحری مہم پر روانہ کیا۔

وہ ایک معمولی رئیس تھا اور پرتگال کے شہر سائینز میں 1460ء کو پیدا ہوا تھا۔

واسکوڈی گاما 1524 عیسوی میں ہندوستان آیا۔ کالی کٹ کی بندرگاہ پر اترا تھا۔

اب ذرا اسلامی دنیا کی طرف آجائیں کہ 1500 سے لے کر 1599 تک کیا ہوتا رہا۔

1502 سے 1524 عیسوی۔ صفوی صوفی سلسلے کا سربراہ اسماعیل ایران کو فتح کرلیتا ہے۔ جہاں وہ صفوی سلطنت قائم کرتا ہے اور اب بارہ اماموں کی شیعت ایران کا سرکاری مذہب قرار پاتی ہے۔

1510 عیسوی۔ اسماعیلی ازبکوں کو خراسان سے نکال



دیتا ہے اور وہاں اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے۔

1514 عیسوی۔ سلطان سلیم اوّل جنگ میں شاہ اسماعیل کی فوجوں کو شکست دیتا ہے۔ جس سے عثمانی علاقے میں صفویوں کی پیش قدمی رک جاتی ہے۔

1517 عیسوی۔ عثمانی مملوکوں کو شکست دے کر مصر اور شام کو فتح کرلیتے ہیں۔ 1520 سے 1566 عیسوی۔ سلیمان جسے مغرب میں عالی شان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عثمانی سلطنت کو وسعت دیتا ہے۔ 1522 عیسوی۔ عثمانی ریوڈز کو فتح کرلیتے ہیں۔ 1524 عیسوی سے 1574 عیسوی۔ طہماسپ اوّل۔ ایران کا دوسرا صفوی بادشاہ صفوی حکومت مستحکم کرتا ہے۔ اس کا دربار فنون خاص طور پر مصوری کا مرکز بن جاتا ہے۔

1529 عیسوی۔ عثمانی حکمران ویانا کا محاصرہ کرتے ہیں۔ 1542 عیسوی۔ پرتگالی پہلی یورپی تجارتی سلطنت قائم کرتے ہیں۔ 1543 عیسوی۔ عثمانی حکمران ہنگری پر فتح حاصل کرتے ہیں۔

1552 سے 1556 عیسوی۔ روسی دریائے والگا پر واقع قازان اور استراخان کی منگولی ریاستوں کو فتح کرلیتے ہیں۔

1560 عیسوی۔ اکبر ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا ہے۔

1570 عیسوی۔ عثمانی قبرص کو فتح کرلیتے ہیں۔

1560 عیسوی۔ پرتگالی ہندوستان میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔

1588 عیسوی۔ شاہ جہاں اوّل ایران میں ایک عظیم الشان دربار تشکیل دیتے ہوئے ایران میں صفوی حکومت کو مضبوط کرتا ہے۔

1590 کی دہائی ڈچ ہندوستان میں تجارت شروع کردیتے ہیں۔

یہ تھا اسلامی دنیا کا مختصر سا جائزہ۔ اب ہم 1500 سے 1599 عیسوی تک کے ہند کو دیکھتے ہیں۔

ان برسوں میں ظہیرالدین بابر نے ہندوستان پر کئی حملے کیے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1505ء میں درۂ خیبر سے پیش قدمی کرتے ہوئے کوہاٹ کے راستے دریائے سندھ کے کنارے ڈیرہ غازی خان تک اپنی فوجوں کو لے آیا اور یہاں سے واپس چلا گیا۔

1507 عیسوی میں اس نے دوسرا حملہ کیا اور یوسف زئی قبیلے کی گوشمالی اور اس سے خراج وصول کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے باجوڑ کا قلعہ بھی فتح کرلیا اور خوشاب پر بھی قبضہ کرلیا۔ 1519 عیسوی میں اس نے تیسرا حملہ کیا اور پیش قدمی کرتا ہوا سیالکوٹ تک پہنچ گیا۔ سیالکوٹ والوں نے معافی طلب کر کے اپنی جان بچائی۔ 1520 عیسوی میں اس نے ایک بار پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ نوشہرہ تک پہنچ گیا۔ 1524 عیسوی۔ میں بابر نے برصغیر پر پانچواں حملہ کیا۔ لاہور سے کچھ فاصلے پر ابراہیم لودھی کی فوجیں اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے سامنے آئیں لیکن ناکام رہیں۔ وہ دیپال پور سے ساہیوال تک پہنچ گیا۔

یکم اپریل 1526ء کو ابراہیم لودھی کی فوجوں کے ساتھ پانی پت میں ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں ابراہیم لودھی کو شکست ہوئی اور بابر پورے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

1528 عیسوی میں بابر نے راجپوتوں کو شکست دی۔

1529 عیسوی میں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود خان لودھی سے معرکہ ہوا جس میں بابر کو زبردست فتح حاصل ہوئی۔ 26 دسمبر 1530 عیسوی کو بابر کی موت اس طرح ہوئی کہ اس کا بیٹا ہمایوں بیمار پڑ گیا۔ بابر نے خدا سے دعا کی کہ ہمایوں کی جگہ اسے موت آجائے۔ اس کی دعا قبول ہوئی۔ وہ بیمار پڑ گیا اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہوگیا۔

30 دسمبر 1530 عیسوی کو ہمایوں نے تخت سنبھالا۔

1531 عیسوی میں کالنجر کے قلعے کا محاصرہ۔ 1533 عیسوی میں جونپور پر چڑھائی کی۔ اس زمانے میں بہار میں شیر شاہ سوری نے اپنا تسلط برقرار کیا۔ 1534 عیسوی میں ہمایوں اور بہادر شاہ گجرات کی فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا بہادر شاہ فرار ہوگیا۔ 1534 عیسوی میں شیر شاہ سوری سے جنگ ہوئی جس میں ہمایوں کو شکست ہوئی۔ اس نے دریا میں کود کر جان بچائی۔ 1540 عیسوی کو شیر شاہ کی فوج سے پھر مقابلہ۔ اس بار بھی شیر شاہ کو کامیابی ہوئی اور وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ شیر شاہ سوری نے اپنے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں عوام کی فلاح و بہبود کے جو کام کیے وہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ شیر شاہ کا انتقال 1545 عیسوی کو بارود میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ہوا۔ اس دوران ہمایوں فرار ہو کر ایران اور افغانستان جاچکا تھا۔

1553 عیسوی تک سلیم شاہ کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ شیر شاہ کا بیٹا تھا۔ 1553 عیسوی میں اس کی وفات ہوئی۔ 23 جولائی 1555 عیسوی میں ہمایوں کی برصغیر پر دوبارہ حکومت قائم ہوگئی۔ 27 جنوری 1556 عیسوی میں سیڑھیوں سے گر کر ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ 14 فروری 1556 کو جلال الدین محمد اکبر نے تخت سنبھال لیا۔

مغل بادشاہوں میں اکبر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے مغل اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی زندگی مہمات، جنگ اور فتوحات میں گزری ہے۔

پھر وہ زمانہ آیا جب وہ پورے ہندوستان کا سب سے طاقت ور بادشاہ بن گیا کہ اس کے زمانے کو کشمیر کو صوبے کابل میں مدغم کردیا گیا تھا۔

اس کا نظام حکومت بہت زبردست تھا۔ اس کی شخصیت اور دورِ حکمرانی کے بارے میں بے شمار روایات ہیں۔

چونکہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اس لیے اس کے دماغ میں ایک نئے مذہب کا سودا سما گیا۔

اس مذہب کو دین الٰہی کا نام دیا گیا تھا۔ کیونکہ جب اکبر نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان کی فضا میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے گونج رہے تھے۔ ان حالات میں اس نے کبیر اور بابا گورونانک کی طرح ایک درمیانی راستہ تلاش کیا جس کو دین الٰہی کا نام دیا۔

1602 عیسوی۔ صوفی تاریخ دان ابوالفضل علامی کی وفات ہوئی۔ یہ ایک مورخ اور مغل بادشاہ اکبر کا سوانح نگار تھا۔

1625 عیسوی۔ احمد سرہندیؒ کی وفات۔

1627 عیسوی سے 1658 عیسوی۔ شاہجہاں مغل سلطنت پر حکومت کرتا ہے جو اس کے عہد میں اپنی نفاست و لطافت کے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ تاج محل تعمیر کرواتا ہے۔

1658 عیسوی سے 1707 عیسوی۔ آخری بڑا مغل بادشاہ اورنگ زیب۔ پورے ملک کو اسلامیانے کی کوشش میں ہندوؤں اور سکھوں کی مخالفت مول لے لیتا ہے۔

اکتوبر 1605 عیسوی میں نور الدین محمد جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تخت نشینی کا جشن منانے کے بعد جہانگیر کو شہزادہ خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑ گیا جو اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ خسرو کا ساتھ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے دیا تھا لیکن یہ بغاوت ناکام ہوئی اور خسرو گرفتار ہوگیا۔ جہانگیر نے گرو ارجن سنگھ کو بھی ہلاک کروادیا۔ یہاں سے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی شروع ہوگئی۔ 1611 عیسوی میں جہانگیر نے نور جہاں سے شادی کی اور اسے نور محل کا خطاب دیا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر جہانگیر پر مکمل حاوی ہوگئی۔

نور الدین محمد جہانگیر 22 برس تک برصغیر پر حکومت کرنے کے بعد 58 سال کی عمر میں 28 اکتوبر 1627 عیسوی کو وفات پا گیا۔

اس کی وصیت کے مطابق اس کی تدفین لاہور میں شاہدرہ کے مقام پر ہوئی۔

1627 عیسوی۔ شہاب الدین محمد شاہ جہاں اکتوبر 1627 عیسوی میں تخت پر بیٹھا۔ پہلے ہی سال میں بندیلا راجپوتوں نے بغاوت کردی۔ 1634 عیسوی میں شاہ جہاں نے اس بغاوت پر قابو پالیا۔ 1628 عیسوی میں ایک افغان سردار خان جہان لودھی کی بغاوت۔ خان جہاں نے شاہی فوج کے خلاف زبردست بہادری دکھائی لیکن یہ بغاوت بھی کچل دی گئی۔ جون 1631ء میں شاہ جہاں کی چہیتی ملکہ ممتاز محل کا انتقال ہوگیا۔ شاہ جہاں کو اس سے بہت محبت تھی۔ عظیم عمارت تاج محل اسی ملکہ کی یادگار ہے۔ 1657 عیسوی کو شاہ جہاں اچانک بیمار پڑ گیا تو اس کے چاروں بیٹوں کے درمیان حصولِ اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی۔

اس کے چار بیٹے تھے۔ دارا شکوہ، شجاع، اورنگزیب اور مراد بخش۔ دارا شکوہ پنجاب کا گورنر تھا۔ شجاع بنگال کا، اورنگزیب دکن کا جب کہ مراد بخش گجرات کا۔ ان میں سے ہر کوئی بادشاہ بننے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ان چاروں بھائیوں میں جنگ ہوئی۔ اورنگزیب اور مراد بخش نے اتحاد کرلیا۔ دارا شکوہ سے جنگ ہوئی۔ دارا شکوہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اورنگزیب اور مراد بخش نے آگرے کا رخ کیا اور شاہ جہاں کو قید کرلیا۔ شاہ جہاں کا انتقال قید خانے ہی میں ہوا تھا۔ سن تھا 1666 عیسوی۔

اورنگزیب عالم گیر

1658 عیسوی کو اورنگ زیب نے اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کی تھی۔ شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تھی۔ اورنگزیب نے سب پر قابو پالیا۔ 1658 عیسوی ہی کو اپنے بھائی شہزادہ مراد کو گرفتار کیا بعد میں اسے قتل کروا دیا۔ 1659 عیسوی کو دوسرے بھائی شجاع سے جنگ ہوئی۔ شجاع پسپا ہوکر اپنی بیوی بچوں کو لے کر فرار ہوگیا۔ اس کے بعد سے اس کا پتا نہیں چلا۔

1659 عیسوی ہی میں دارا شکوہ کو گرفتار کرلیا گیا اور اورنگزیب نے اس کے خلاف علماء سے بدعتی اور ملحد ہونے کا فتویٰ لے کر قتل کروا دیا۔ اورنگزیب کی وفات 20 فروری 1707 عیسوی میں ہوئی تھی۔ اورنگزیب کا کردار بہت دو طرفہ ہے۔ ایک جانب تو وہ بے رحم شخص تھا اور دوسری جانب شریعت کا پابند۔

(جاری ہے)



# چاند ستارے سیارے

الطاف شیخ / ابراہیم جمالی

افلاک کے جھومر، یہ چاند ستارے اور سیارے کن کن خوبیوں کے مظہر ہیں۔ ہم ان سے کس کس طرح استفادہ کرتے ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے۔ ایک انتہائی خشک موضوع کو رواں انداز اور آسان پیرائے میں رقم کیا گیا ہے۔

### [illegible]

کائنات میں موجود کئی ستاروں کے گرد کئی سیارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً عطارد، زہرہ، ہماری زمین، مریخ، مشتری، سرطان وغیرہ۔ بعض سیارے ایسے بھی ہیں جن کے گرد دیگر چھوٹے سیارے گردش کرتے ہیں۔ وہ رات کے وقت چاند کا کام دیتے ہیں۔ ہماری دھرتی کے گرد بھی ایک چاند محوِ گردش رہتا ہے جو رات میں ہمارے چراغ کے کام آتا ہے بلکہ کیلنڈر کے طور پر بھی کارآمد ہے۔ یہ سب اپنی مخصوص رفتار سے اپنے دائرے میں سیاروں، سورج اور دیگر ستاروں کے گرد

گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے درمیان حائل فاصلوں اور رفتار سے کائنات کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اسے جان کر انسان کی محدود سوچ اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

دھرتی کا قطر تقریباً 13000 کلو میٹر ہے۔ یعنی اگر قدموں کے نیچے سوراخ ڈرل کرنا شروع کیا جائے تو تقریباً 13000 کلو میٹر کے بعد دوسری سمت میکسیکو یا کیوبا کے اطراف میں جا پہنچے گا۔ ہماری دھرتی، سورج سے 15 کروڑ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور یہ اپنے محور کے گرد چوبیس گھنٹوں میں اور سورج کے گرد 365 دن میں گردش مکمل کرتی ہے۔ اسی طرح سورج کے قریب موجود دیگر سیارے کم وقت میں اور زیادہ فاصلے پر موجود سیارے طویل عرصے میں سورج کے گرد اپنی گردش مکمل کرتے ہیں۔ عطارد اور زہرہ سیارے ہماری زمین سے مختصر اور سورج کے قریب ہیں۔ مشتری کا ڈایا میٹر ہماری زمین سے دس گنا بڑا ہے۔ مشتری اور زمین کی وسعت کا موازنہ اس مثال سے کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک ریل گاڑی سو کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے مسلسل چلتی رہے تو زمین کے گرد اپنا سفر مکمل کرنے میں اسے 13 دن لگیں گے۔ یہی ٹرین اسی رفتار سے مشتری کے گرد اپنا سفر 122 دن یعنی تقریباً چار ماہ میں مکمل کرے گی۔

ایک جہازی نے یہ سن کر کہا تھا۔ ”شکر ہے کہ ہماری زمین مختصر ہے اگر یہ مشتری کے برابر ہوتی تو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بحری جہاز میں سفر کرتے ہماری نصف زندگی گزر جاتی۔“ یاد رہے بحری جہاز کی زیادہ سے زیادہ رفتار 25 کلو میٹر فی گھنٹا ہوتی ہے۔

بہرحال یہاں ان سیاروں کا سائز لکھنے کا مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ یہ جو ستارے ہمیں جگنو کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے ہیں یہ انتہائی جسیم اور ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کائنات کس قدر وسیع ہے۔

ان میں جو سب سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب سیارے ہیں ان کے درمیان بھی کروڑوں میل کا فاصلہ ہے۔ کئی سیاروں کے درمیان فاصلوں کو ناپنے کے لیے ہمارا عددی نظام جواب دے جاتا ہے۔ ایسے سیاروں کے درمیان فاصلے کا حساب میلوں کے ذریعے نہیں بلکہ نوری سال کی اصطلاح استعمال کیا جاتا ہے۔

بہرحال مشتری اور سورج کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دیگر سیارے جو سورج کے گرد گردش کرتے ہیں وہ مزید فاصلے پر واقع ہیں۔ مثلاً سرطان اور سورج کے درمیان ایک ارب 43 کروڑ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ دیگر سیارے جو سورج کے گرد گردش کرتے ہیں وہ مزید فاصلے پر واقع ہیں۔ مثلاً سرطان اور سورج کے درمیان ایک ارب 43 کروڑ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح نیپچون ساڑھے چار ارب کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یاد رہے نیپچون کے دو چاند ہیں۔ پلوٹو سیارہ ہمارے شمسی نظام سے سب سے دور یعنی چھ ارب کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ یہ کس قدر طویل فاصلہ ہے لیکن اگر اس فاصلے کا موازنہ دوسرے ستاروں سے کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے یہ چند قدموں کا فاصلہ ہو۔

گزشتہ سطور میں ذکر کیے گئے سیارے ہمارے ستارے (سورج) کی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں جو عرصہ دراز سے سورج کے گرد گردش کررہے ہیں۔ یہ کام صدیوں سے انتہائی Perfection انداز میں نہایت Smoothly طریقے سے مسلسل جاری ہے۔ عام آدمی کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ ہماری زمین بیک وقت اپنے مدار میں اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ سورج بھی اپنے محور میں اور وہ جس کہکشاں کا ممبر ہے۔ اس کے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔ یعنی سورج اپنے پورے خاندان کے ساتھ اپنی کہکشاں یعنی ستاروں کے جھمگٹے کے مرکز کا طواف کرتا رہتا ہے۔ اس میں ایک یا دو ہزار لاکھ یا دو لاکھ ستارے نہیں بلکہ ایک سو بلین سے بھی زیادہ ستارے موجود ہیں۔

یہ کہکشاں (جس کا ایک ستارہ ہمارا سورج ہے) ہمیں آسمان پر ایسے نظر آتی ہے جیسے پاؤڈر چھڑکا ہوا ہو یا دودھ گرا ہوا ہو۔ اس کی سفیدی ہمیں زمین سے نظر آتی ہے۔ اسے Milky way galaxi کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں سندھ میں اسے نوح نبی کی کشتی کی کھیر کہا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ کہ آسمان پر صرف یہی ایک کہکشاں نہیں بلکہ دور دور تک کئی دوسری بھی ہیں۔ ان میں بیضوی، اسپیرنگ نما اور Peculiar کہکشائیں عام ہیں۔ ہر ایک میں کروڑوں، اربوں ستارے ہیں۔

سورج، چاند، زمین اور دیگر سیاروں اور ستاروں کی حرکت کے بارے میں معلوم کیا جائے تو یہ بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ چاند ایک چھوٹا سیارہ ہے اور اس کی اپنی روشنی نہیں ہے۔ اس کا ڈایا میٹر 2160 میل یعنی 3476 کلو میٹر ہے۔ یہ زمین کے گرد 10 میل فی گھنٹا کی رفتار سے 27 دنوں میں چکر مکمل کرتا ہے۔ ہم زمین پر رہنے والوں کو اس کا صرف ایک حصہ نظر آتا ہے۔ راکٹ (خلائی گاڑی) کے ذریعے بنائی گئی چاند کی دوسری سمت کی تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں۔

بہرحال چاند کی گردش کی رفتار انتہائی سست ہے لیکن



ہماری زمین کا اپنے محور میں گھومنے اور سورج کے گرد گردش کرنے کی رفتار انتہائی تیز ہے۔ زمین تقریباً 1000 میل فی گھنٹا کی رفتار سے اپنے محور پر گردش کرتی ہے، یعنی جمبو جیٹ کی رفتار سے دگنی رفتار پر! یعنی ایک سیکنڈ میں اٹھارہ میل طے کرتی ہے۔ زمین کی گردش کی تیز رفتاری کا اندازہ اس مثال سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ صرف چھ سیکنڈ میں کراچی سے حیدرآباد تک کا سفر طے کرتی ہے اور ہم اس قدر تیز رفتار گاڑی میں موجود ہونے کے باوجود آرام سے چل پھر سکتے ہیں۔ 18 میل فی سیکنڈ کی رفتار یقیناً حیرت انگیز ہے لیکن اگر ہم اس رفتار کا موازنہ سورج کی رفتار سے کریں تو زمین کی یہ حیرت انگیز رفتار بھی کم معلوم ہوگی۔ کیونکہ سورج 140 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ہماری کہکشاں (Milky Way Galaxy) کے مرکز کے گرد گردش کرتا ہے۔ سورج اس مرکز سے 26000 نوری سالوں کے فاصلے پر گردش کرتا ہے۔ جس طرح ہماری زمین 365 دن میں گردش مکمل کرتی ہے اس طرح سورج کو اپنی گردش مکمل کرنے میں ڈھائی سو ملین سال لگ جاتے ہیں۔ سورج بیک وقت اپنے محور پر بھی گھومتا رہتا ہے۔ زمین اپنے محور پر یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل کرتی ہے۔

سورج کا قطر (Diameter) زمین سے سو گنا بڑا ہے اور یہ زمین سے 330,000 گنا زیادہ وزنی ہے۔ اس کا درمیانی حصہ (Equatorial) 25 دن میں ایک چکر مکمل کرتا ہے اور بالائی اور زیریں حصہ 36 دن میں مکمل کرتا ہے! یہ جان کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ سورج کے گول تھال کا کچھ حصہ 25 دن میں اور کچھ حصہ گردش مکمل کرنے میں اضافی گیارہ دن کیوں صرف کرتا ہے؟ یہ اس لیے کہ زمین اور چاند کی طرح سورج ایک ٹھوس گیند کی طرح نہیں بلکہ گیس کا گولا ہے۔ سورج ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس کی بڑی سی بال ہے۔ یہ گیسیں مسلسل جلتی رہتی ہیں۔

اس باب کی گزشتہ سطروں میں نوری سال کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب ہم ٹارچ یا بلب روشن کرتے ہیں اور اس کی روشنی جس رفتار سے آگے بڑھتی ہے وہ ہے تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ! اگر کوئی شخص انتہائی پاورفل ٹارچ روشن کرے اور دوسرا شخص تین لاکھ کلو میٹر دور موجود ہو تو اسے ٹارچ روشن ہونے کے ٹھیک ایک سیکنڈ کے بعد اس کی روشنی نظر آئے گی۔ چاند کی روشنی ہم تک سوا سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ کیونکہ چاند ہم سے 376300 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی طرح سورج کی روشنی ہم تک 500 سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ سورج اور زمین کے درمیان 150 ملین کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ 500 سیکنڈ یعنی ساڑھے آٹھ منٹ کے بعد پہنچنے والی روشنی والا سورج ہم سے کس قدر فاصلے پر ہے! دہیں ایک مہینے یا ایک سال بعد پہنچنے والی روشنی کا حامل ستارہ کس قدر فاصلے پر ہوگا۔

ایک نوری سال یعنی ایک سال کے سیکنڈ نکال کر اسے روشنی کی رفتار 300,000 کلو میٹر سے ضرب دیا جائے تو 9460730472580 کلو میٹر بنتے ہیں۔

آسمان پر ملین اور بلین ستارے موجود ہیں۔ ہماری زمین، سورج کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ سورج گویا ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ کیوں کہ سورج کے علاوہ دوسرا قریب ترین ستارہ بھی ہم سے سوا چار نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ یعنی اوپر دیے گئے اعداد کو سوا چار سے ضرب دی جائے تو قریب ترین دوسرے ستارے کا فاصلہ معلوم ہوگا۔ ہم جہاز چلانے والوں کو سمندر میں دوران سفر راستہ تلاش کرنے کے سلسلے میں عموماً ان کی مدد کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مختلف ملکوں اور مذاہب میں سورج کی پوجا کی جاتی ہے اور وہاں سورج دیوتا کے مختلف نام ہیں۔ قدیم مصریوں کے سورج دیوتا کا نام ”رے“ تھا۔ اس کا علامتی چہرہ باز سے مشابہ تھا اور اسے معبود سمجھا جاتا تھا۔ قدیم مصری عقائد کے مطابق رے دیوتا نے مصر کے دریائے نیل کے لیے چار مختلف موسم پیدا کیے تاکہ اس کے مطابق کھیتی باڑی کا کام ہوسکے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک نہیں بلکہ دس سورج ہیں جو باری باری طلوع ہوتے ہیں۔

جاپان میں ”اما تیراسو“ کو سورج دیوی سمجھا جاتا تھا اور موجودہ بادشاہ کے بزرگوں کو سورج کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔

ہندومت میں سورج دیوتا کا نام ”سریا“ ہے۔

اسلام میں سورج کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہے۔ سورج، چاند ستارے، یہ سب چیزیں قدرت کی نشانیاں ہیں اور انہیں دیکھ کر ان کے اسرار و رموز جان کر ان کے خالق کی عبادت کی جائے۔ اسلام سے قبل کئی عرب قبیلوں میں سورج کی پوجا عام تھی۔ اسی لیے اسلامی شریعت نے طلوع اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنے پر پابندی عائد کی ہے۔

سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کا ذکر اس لیے شروع کیا ہے کہ میں ایک میرینر ہوں، یعنی میرا تعلق پانی کا جہاز چلانے سے ہے۔ عربستان اور صحارا جیسے صحراؤں میں سفر کرنے والے مسافر اور سمندر میں سفر کرنے والے جہازی کے سامنے منزل کا فاصلہ معلوم کرنے کے لیے سنگ میل ہوتے ہیں اور نہ ہی عمارات اور ٹاورز وغیرہ جنہیں دیکھ کر وہ راہ کا تعین کر سکے اور

منزل کی جانب بڑھ سکے۔ سمندر کی سیاہ راتوں میں، طوفانوں اور بپھری ہوئی موجوں میں جب ہمارا جہاز کسی تنکے کی طرح ہچکولے کھا کر اپنی درست سمت کھو کر بے راہ ہو جاتا ہے تو ہم جہازی دوبارہ اسے ''سیدھے راستے'' پر لانے اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس وقت ہم سمندر کے کس حصے میں موجود ہیں ستاروں سے مدد حاصل کرتے ہیں یعنی ستاروں کی ترتیب کو ذہن میں رکھ کر بھٹکی ہوئی راہ سے اپنی منزل کی جانب رخ کرتے ہیں۔

اب جا کر سیٹلائیٹ نیوی گیٹر ایجاد ہوا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی سمندر پر راستہ تلاش کرنے کے لیے ہر جہازی دوربین (Sextant) کے ذریعے زیادہ روشن اور آسمان پر اہم مقامات پر موجود ستاروں پر نظر رکھتے ہیں اور جہاز کو درست سمت میں چلا کر منزل پر پہنچتے ہیں۔

عرب علم فلکیات کے ماہر گزرے ہیں۔ عرب کا بڑا حصہ صحرا پر مشتمل ہے جہاں ہوا کے جھکڑوں سے ریت پر بنے راستے بھی اپنا نشان کھو دیتے ہیں۔ ایسے صحراؤں، بیابانوں میں سفر کرنے کے لیے انہیں ستاروں کی ترتیب سے ہی مدد حاصل کرنی پڑتی تھی کہ مشرق کس طرف ہے اور شمال، جنوب مغرب کس جانب ہیں۔ عربستان میں سال کا طویل عرصہ آسمان صاف ہونے کے سبب ستارے واضح نظر آتے ہیں۔ اسی لیے عرب ستاروں کی معلومات اور ان کی حرکات سے زیادہ آگاہ رہے ہیں۔ کئی عربوں نے دور دراز کے ستاروں کو دریافت کیا اور ان کا جائزہ لینے کے لیے مختلف اقسام کی دوربینیں ایجاد کیں۔ ان کی حرکات کا حساب معلوم کرنے کے لیے انہوں نے عددی حساب (Maths) اور ٹرگنا میٹری کی ترکیبیں ایجاد کیں۔

دوران تعلیم ایسٹرانومی کے پیریڈ میں جب انگریز پروفیسر عرب مسلمان ماہر فلکیات کے کارناموں کا ذکر کرتے تھے تو ہمیں خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوتی تھی۔ ان کے تجربات اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے آج بھی دنیا کے جہازی، جغرافیہ دان اور ماہرین فلکیات استفادہ کرتے ہیں۔ مجھے تو ہر دوسرے ستارے کا نام عربی معلوم ہوتا ہے۔ کئی ستارے، کئی ایسٹرانومی اور ٹرگنا میٹری کے فارمولے، چاند پر موجود گڑھے (Crater) بھی عرب ماہر فلکیات کے ناموں سے منسوب ہیں۔ چاند پر موجود ایسے ایک دو گڑھوں (Craters) کے نام مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں مثلاً ''المراکشی کریٹر'' یہ ابن البناء المراکشی الآزدی نامی ایک عرب کے نام سے منسوب ہے۔ وہ 1256ء میں مراکش میں پیدا ہوئے تھے۔

اسی طرح Alpetragius crater ہے جو نورالدین البیتر وگی کے نام ہے۔ وہ مغرب میں ایپٹرجیس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جس طرح ابن سینا کو مغرب میں اوئسینا کہا جاتا ہے۔ بہرحال البیتر وگی نامی یہ عرب مورا کو میں پیدا ہوئے اور اندلس کے شہر سیوائل میں زندگی گزاری۔ چاند کے ایک گڑھے کا نام Arzachel crater بھی ہے۔ یہ ابواسحاق ابراہیم ابن یحیٰ النقاش الزرنگی نامی ایک عرب کے نام سے موسوم ہے۔ وہ 1028ء میں پیدا ہوئے اور 1087ء میں وفات پائی۔ انہوں نے زندگی کا طویل عرصہ اسپین میں گزارا۔ انہیں مغربی دنیا میں Argachel کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چاند کا ایک گڑھا (Dent) مرزا الغ بیگ کے نام پر بھی ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر میرے ایران کے سفرنامے ''ایران کی جانب پرواز'' میں کیا جاچکا ہے۔ الغ بیگ ہند، افغانستان ایران کے مشہور حاکم تیمور لنگ کے پوتے اور شاہ رخ کے بیٹے تھے۔ الغ بیگ اس مشہور خاتون گوہر شاد کے بیٹے ہیں جس نے مشہد میں امام رضا کے مقبرے کے قریب مسجد تعمیر کرائی تھی۔ وہ مسجد آج بھی انہی کے نام سے آباد ہے۔ مرزا الغ بیگ حکمرانی جیسے کام کے لیے موزوں نہ تھے۔ انہوں نے اپنی سلطنت کو مزید توسیع دینے کے بجائے اس کی سرحدیں مزید مختصر کردیں۔ البتہ وہ جیومیٹری، خاص طور پر ٹرگنا میٹری اور علم فلکیات میں قابل ترین شخص تھے۔ ان موضوعات پر ایم اے یا پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء مرزا الغ بیگ سے ضرور واقف ہوں گے۔ بہرحال ہم صرف عرب ماہرین فلکیات کی بات کریں تو وہ بھی خاصی تعداد میں نظر آئیں گے۔

ان میں اسپین سے تعلق رکھنے والے ایک عرب مسلمان ابومحمد جابر بن افلح بھی شامل ہیں۔ وہ 1100ء میں پیدا ہوئے اور 1150ء میں اسپین ہی میں وفات پائی۔ وہ اعلیٰ قسم کے حساب دان اور ماہر فلکیات تھے۔ ان سے یورپین بھی خاصے متاثر ہیں۔ وہ اپنے یورپی (لاطینی) نام Geber سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ ان کی عربی میں لکھی ہوئی کتابیں انگریزی کے علاوہ دیگر کئی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوچکی ہیں۔

اسی طرح آٹھویں صدی کے ماہر فلکیات ابو اسحاق الفرازی ہیں۔ وہ عباسی گھرانے کے خلیفہ ہارون الرشید کی عدالت کے حسابداں اور Astronomer تھے۔ ان کے بیٹے محمد الفرازی بھی قابل فلکی ہیئت داں تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی خواہش پر دونوں باپ بیٹے نے ہندوستان کی مشہور کتاب ''سندھ ہند'' کا ترجمہ کیا جو علم فلکیات کے متعلق ہے۔



عربی میں اس کتاب کا نام ''ازیج الاشنی العرب'' رکھا گیا تھا۔

نویں صدی کے ایک عرب علی ابن عیسیٰ یورپ میں Jesuoccculist کے نام سے مشہور ماہر فلکیات گزرے ہیں۔ انہوں نے زمین کے بیرونی دائرے Circumference کی درست پیمائش بیان کی تھی۔ ان کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ Notebook of the oculists انتہائی مشہور ہے۔

اسی طرح اسپین کے ایک عرب محی الدین المغربی کی ٹرگنا میٹری کے متعلق لکھی ہوئی کتاب بے حد مشہور ہے۔ یاد رہے ٹرگنا میٹری کے قاعدوں کے ذریعے ہم مختلف ستاروں کے درمیان فاصلہ معلوم کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندر میں چلنے والے جہاز کا 24 گھنٹوں میں طے کیا گیا فاصلہ بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاز سڑک پر چلنے والی کار یا بس کی طرح نہیں ہوتا کہ جتنا چلے گا اتنا فاصلہ طے کرے گا۔ سامنے اور عقب سے چلنے والی ہوائیں اور لہریں اس کے طے کیے جانے والے فاصلے میں کمی بیشی پیدا کرسکتی ہیں۔ اس کا حساب ٹرگنا میٹری کے ذریعے ایک یا دو ستاروں کا زاویہ معلوم کرکے فاصلے کا حساب کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات سامنے سے آنے والے طوفان اور زیر آب مزاحمت کرنے والی موجیں (Under Currents) جہاز کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی جانب دھکیلتی ہیں۔ ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز نے 24 گھنٹوں کے دوران تقریباً چار پانچ سو میل کا سفر طے کرلیا ہے لیکن جب زاویہ پیما (Sextant) کے ذریعے کسی ستارے یا سیارے کا زاویہ معلوم کرکے طے شدہ سفر کا فاصلہ دیکھا جاتا ہے تو انکشاف ہوتا ہے کہ جہاز نے محض 50 میل کا سفر طے کیا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ صورت حال میں جہاز 24 گھنٹے چلنے کے باوجود ایک دو میل آگے بڑھنے کے بجائے دس پندرہ میل پیچھے چلا جاتا ہے۔ یقیناً آپ کے ذہن میں یہ خیال آرہا ہوگا کہ طوفانی موسم اور بگڑے ہوئے سمندر کے دوران وہ پورا دن جہاز نہ چلایا جائے۔ تو جان لیں اگر جہاز نہ چلایا جائے تو پھر ایسی صورت میں جہاز دس پندرہ میل نہیں بلکہ 500 میل پیچھے چلا جائے گا۔ کیوں کہ سامنے سے آنے والی طوفانی لہروں میں بڑی طاقت اور قوت ہوتی ہے۔

علاؤ الدین ابوالحسن الشاطر 1304 میں پیدا ہوئے۔ وہ دمشق شام کی امیہ مسجد کے ٹائم کیپر بھی رہے۔ وہ ایک اعلیٰ قسم کے ماہر فلکیات گزرے ہیں۔ انہوں نے سیارہ مریخ کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے امیہ مسجد دمشق کے ایک مینار پر سورج کی روشنی کے ذریعے وقت معلوم کرنے کے لیے دھوپ گھڑی (Sundial) تیار کی تھی۔

اسی طرح 1423 میں پیدا ہونے والے ماہر فلکیات سبت المردنی گزرے ہیں۔ ان کے ماموں عبداللہ المردنی بھی آٹھویں صدی کے ماہر فلکیات تھے۔ سبت المردنی وہ ماہر فلکیات ہیں جنہوں نے قاہرہ کی الاظہر جامع مسجد میں عددی حساب اور علم فلکیات کی تعلیم دی۔ وہ اس مسجد کے ٹائم کیپر بھی تھے۔ انہوں نے عددی حساب، علم فلکیات اور اسلامی قانون کے موضوعات پر تقریباً 200 کتابیں تحریر کی ہیں۔

ایک اور عرب ماہر فلکیات تقی الدین الشامی السعدی نے علم فلکیات، علم نجوم، دوربینوں اور فلسفے پر 90 کتابیں تحریر کی ہیں۔ انہوں نے 1574ء کے لگ بھگ ایک ٹیلی اسکوپ بھی تیار کی تھی اور استنبول میں قائم ''علاؤ الدین رسدگاہ'' پر بھی 1577ء میں کام کیا۔ تقی الدین الشامی السعدی 1521ء میں ملک شام کے شہر دمشق میں پیدا ہوئے اور مصر کے شہر قاہرہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ قاہرہ میں قاضی بھی رہے۔ 1571ء میں استنبول چلے گئے تھے جہاں سلطنت عثمانیہ کے حاکم سلطان سلیم دوم نے انہیں اپنے دربار میں سرکاری طور پر عالم فلکیات مقرر کیا۔

انسان دن رات اپنے اوپر چھائے ہوئے آسمان کو دیکھتا ہے جس پر دن میں سورج اور رات کے وقت چاند اور بے شمار ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انسان انہیں دوربین کے بغیر دیکھ کر بھی متعجب ہوتا ہے لیکن اگر کسی طاقت ور دوربین کے ذریعے دیکھا جائے تو تب بھی اسے اس قدر وسیع و عریض کائنات نظر آئے گی جس کا کوئی کنارہ نہیں جس کا کوئی اختتام نہیں۔

اس وسیع و عریض کائنات میں ہماری زمین سے لاکھوں درجے بڑے اور عظیم الشان سیارے ٹینس بال کی طرح گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں گنا زیادہ روشن اور چمکتے ہوئے ستارے موجود ہیں۔ ہمارا یہ نظام شمسی (سورج، زمین، مریخ، مشتری وغیرہ وغیرہ) کائنات کی صرف ایک کہکشاں کے ایک مختصر سے گوشے میں موجود ہے۔ صرف اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے ستارے موجود ہیں۔ آج تک انسان جس قدر دوربینیں ایجاد کرچکا ہے ان کے ذریعے سے یہ معلوم کرکے انسانی ذہن دنگ رہ گیا ہے کہ اس کہکشاں جیسی کم از کم دس لاکھ کہکشاؤں کی موجودگی کی خبر مل رہی ہے۔ ان لاکھوں کہکشاؤں میں سے جو ہماری قریبی کہکشاں ہے جسے پڑوسی کہکشاں بھی کہا جاسکتا ہے وہ اس قدر فاصلے پر ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ

چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کر کے دس لاکھ برسوں میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ اس کائنات کے صرف اس حصے کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور مشاہدے میں آیا ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کائنات کے بارے میں انسانی علم اس پوری کائنات کے مقابلے میں اتنا بھی نہ ہو جتنا سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ ہے۔

حال ہی میں علم فلکیات کے ماہر سائنسدانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے بارے میں ان کا یہ اندازہ ہے کہ اس کی روشنی کی کرنیں جو اس وقت ہماری زمین تک پہنچ رہی ہیں وہ چار ارب سالوں سے بھی پہلے وہاں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔

یہی ایک سبب ہے کہ ایک تعلیم یافتہ اور سوچ بچار رکھنے والے سائنسدان خواہ ظاہری طور پر نہ سہی لیکن دل ہی دل میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ ایک عظیم طاقت ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے جو اس کی مالک ہے۔ جب کوئی ایسا شخص مسلمان ہوتا ہے تو ہم سے بہتر مسلمان ثابت ہوتا ہے۔ وہ صرف زبان ہی سے خدا کو رب اللعالمین نہیں کہتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی عظمت و حسن کو زیادہ Appreciate کر سکتا ہے۔ وہ جب اس قسم کی قرآنی آیات پڑھتا ہے تو انہیں دل سے قبول کرتا ہے۔

''اور کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتا؟ کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے! اور ہم نے اسے (ستاروں سے) سجایا ہے اور اس میں کوئی شگاف (رکاوٹ) نہیں ہے۔''

الزخرف (قرآن کی 43 سورہ) کی دسویں آیت میں ہے کہ اس زمین اور آسمانوں کو ایک زبردست (عظیم) اور علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ اسی نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا ہے۔

یعنی جس طرح ایک بچہ گہوارے میں آرام سے لیٹا ہوتا ہے اسی طرح یہ زمین کا گویا ہمارے لیے آرام وہ ہے۔ اس بات کو ایک سائنسدان زیادہ بہتر انداز سے سمجھ اور Appreciate کر سکتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ہماری زمین ایک جگہ ٹھہری ہوئی ہے لیکن دراصل وہ ایک ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے لٹو کی طرح اپنے محور پر گردش کر رہی ہے اور تقریباً 66 ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے کار کی طرح آگے دوڑ رہی ہے۔ یہ اس رفتار سے سورج کے گرد اپنا ایک چکر 365 دن یعنی ایک سال میں مکمل کرتی ہے لیکن اتنی رفتار کے باوجود رب پاک نے اسے اس قدر پُرسکون بنایا ہے کہ ہم ہلکا سا جھٹکا بھی محسوس نہیں کرتے۔ جس طرح چھپکلی چھت پر چلتی ہے ہم بھی اسی طرح زمین پر چلتے ہیں لیکن گرتے نہیں ہیں۔ قدرت نے زمین میں ایک ایسی مقناطیسی طاقت پیدا کی ہے کہ وہ ہمیں اپنے کشش کے شکنجاؤ میں رکھتی ہے اگر کسی راکٹ پر بیٹھ کر خلاء سے دیکھا جائے تو زمین پر چلتے پھرتے لوگ الٹے لٹکے ہوئے نظر آئیں گے۔

ایک نومسلم امریکن نے میری توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی تھی کہ جب مقناطیس کو گرم کیا جاتا ہے تو اس کی مقناطیسی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے اور اس سے لپٹے ہوئے لوہے کے ذرے بھی گر جاتے ہیں۔ اس نے مزید کہا تھا ''ممکن ہے قیامت کے دن سخت گرمی اور تپش کے سبب (قیامت کے دن کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے کہ سورج سوا نیزے پر آجائے گا اور اس کی حدت انتہائی درجے کو پہنچ جائے گی) زمین کی مقناطیسی خصوصیت ختم ہو جائے اور پھر واقعی یہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں۔''

ایک اور نومسلم ان کا تعلق ادارۂ موسمیات سے ہے، نے بتایا تھا کہ ہوائی جہاز خود بخود نہیں چل سکتا، اسے چلانے اور اڑانے کے لیے پائلٹ ہوتے ہیں۔ اگر پرواز کے دوران جہاز میں سے پائلٹ نکل جائے یا مر جائے تو جہاز زمین پر آگرے گا۔ کائنات میں لاکھوں سیارے اور ستارے بال کی طرح بڑی تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، نہ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنا مقرر کیا ہوا راستہ بھولتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک عظیم ''پائلٹ'' ہے ایک علیم و خبیر ہستی ضرور ہے، ایک انتہائی طاقت ور ہستی جس کی طاقت و دانش کا کوئی اختتام نہیں۔ اس کے حکم کے تابع یہ تمام سیارے، ستارے اس کائنات میں محو گردش ہیں۔ اسی عظیم حاکم کے حکم پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

''آپ مسلمان کیسے ہوئے؟'' میں نے ان سے پوچھا تھا۔

''ان تمام باتوں پر غور و فکر کرنے کے بعد میں نے دل سے تسلیم کیا کہ اس کائنات کو چلانے والا رب ہی ہے جو ہمیشہ سے ہے جس کا حکم سب پر چلتا ہے اور اسی کے حکم اور منشاء کے مطابق سب کچھ ہوتا ہے۔''

کئی باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم زبانی طور پر ضرور تسلیم کرتے ہیں لیکن ان پر غور نہیں کرتے۔ اگر ہم غور و فکر کریں اور سوچ و بچار سے کام لیں تو ہم اللہ کی عظمت اور اس کی بڑائی کو مزید دل کی گہرائی سے تسلیم کریں گے پھر ہمیں ہر شے سے اللہ تعالیٰ کی موجودگی محسوس ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں



کئی مقامات پر فرمایا ہے۔ ''بے شک اس میں کئی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔''

''اس طرح ہم نے نشانیاں واضح (ظاہر ظہور) پیش کی ہیں ان لوگوں کے لے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

''اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

''اس میں کئی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

ایسا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ ہمارے ہاں مشرق میں تصور کیا جاتا ہے کہ تعلیم خاص طور پر سائنس کی تعلیم حاصل کرنے سے لوگ خدا کے وجود سے منکر (کافر) ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان جتنا علم، عقل، سوچ و بچار سے کام لیتا ہے، اتنا ہی اسے خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے دل میں کینہ، بغض اور دوئی نہ ہو۔ وہ متعصب نہ ہو۔ میں نے بعض لوگ (یورپین اور امریکن) ایسے بھی دیکھے جو اپنے دل میں اسلام کے خلاف سخت کینہ اور بغض رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا وہ یہ کہ کسی بھی طرح اسلام کو نیچا دکھایا جائے لیکن بعد میں ان کے دل ایسے پھر گئے کہ وہ پکے مسلمان ہو گئے۔

ایک ایسے ہی یورپی مسلمان نے بتایا تھا کہ وہ عیسائیوں کے کلیسا کا خاص رکن تھا۔ اس کا کام ہی یہی تھا کہ اس بات کی تبلیغ کی جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اللہ کے فرزند تھے (نعوذ باللہ)۔ اور اس دنیا میں کیے گئے عیسائیوں کے گناہوں کی سزا انہیں قیامت کے دن نہیں ملے گی کیونکہ ان عیسائیوں کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر ہی سزا بھگت لی تھی (استغفر اللہ)۔ اسلام کے خلاف لیکچر دینے اور پروپیگنڈہ کے لیے اس نے قرآن اور حدیث کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ مطالعہ کرتا گیا اس پر واضح ہوتا گیا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ پھر وہ نہ صرف مسلمان ہو گیا بلکہ ایسا مسلمان ہوا کہ باقی زندگی اسلام کی تبلیغ میں گزار رہا ہے اور مجھ جیسے گناہ گاروں کو اس قسم کے یورپی اور امریکن نومسلموں کے لیکچروں اور لاجک نے خاصا متاثر کیا ہے۔

ایسی ہی ایک خاتون سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ وہ اسلام کی سخت مخالف تھی اور عیسائیت کا پرچار کرتی تھی۔ پھر اس نے ایک ایسی یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں اکثریت عرب، ایشیائی اور افریقی مسلمانوں کی تھی۔ اس خاتون نے ان مسلمان طلباء کو اسلام سے متنفر کرنے اور ان میں عیسائیت کا پرچار کرنے کی غرض سے پہلے خود اسلام کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تاکہ وہ اپنا موقف بہتر انداز سے بیان کر سکے۔ دیگر اسلامی کتب کے ساتھ ساتھ اس نے تفسیر کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیا۔ اس دوران اس کے اندر خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسلام ہی مکمل دین حیات ہے۔ اس میں ہر چیز حقیقت پر مبنی ہے۔ دوسروں کو دین اسلام سے ہٹانے کے بجائے وہ خود مسلمان ہو گئی۔ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کی اس قدر تعلیم حاصل کی کہ عیسائی اور یہودی خواتین کو اسلام کے متعلق سمجھانے اور لیکچر دینے لگی۔ اس کے شوہر کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی اور اس نے اسے طلاق دے دی۔

وہ خاتون خاصی دولت مند تھی۔ بعد میں اس نے مسجد کے ایک غریب پیش امام کے ساتھ شادی کر لی۔ افسوس کی بات یہ کہ شادی کے بعد اس شخص نے نومسلم عورت کی تمام دولت ہتھیا لی اور اسے چھوڑ کر کسی اور لڑکی سے شادی کر لی۔ میں سمجھا کہ یہ واقعہ اس عورت کے دل میں اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اس واقعے کو ایک انسان کا انفرادی عمل قرار دیا اور اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھہرایا۔ کئی برس گزر چکے ہیں وہ تنہا زندگی کے دن گزار رہی ہے اور ضروریات زندگی کے لیے ملازمت کرتی ہے۔ وہ آج بھی اسلام کی تبلیغ کرتی ہے۔ اس نے کئی یورپی خواتین کے دلوں میں اسلام کی شمع روشن کی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا ہرگز درست نہیں ہوگا کہ یورپ، امریکا اور مغرب میں صرف کافر ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں سے جانے والے مسلمان بھی وہاں پہنچ کر بے دین ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ستر کی دہائی میں سوئیڈن جیسے ملک میں میرا پہلی مرتبہ جانا ہوا تھا، جو بے راہ روی اور بے حیائی کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتا تھا لیکن بیس برس بعد 1993ء اور 1994ء دو سال مستقل وہاں مقیم رہا تھا اور وہاں کا ماحول دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ وہاں ہم ایشیائی اور افریقی مسلمانوں سے کہیں زیادہ تعداد مقامی مسلمانوں کی تھی۔ مالمو جیسی بندرگاہ میں کراچی کی میمن مسجد جتنی وسیع و عریض شاندار مسجد تعمیر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی مساجد بھی نظر آئی تھیں۔ جہاں نومسلم یورپی اور امریکی علماء کے لیکچر سن کر ہم جیسے کئی لوگ دین کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔

انگلینڈ کی طرح فرانس میں بھی سینیگال، کیمرون اور دیگر افریقی اور عرب ملکوں کے باشندے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے ملکوں پر فرانس کا راج تھا۔ ان میں

مسلمانوں کے سبب فرانس کے کئی شہروں میں مساجد تعمیر ہوئی تھیں۔ یہ آج سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں پورے فرانس میں تقریباً سو مساجد تھیں اور آج ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ ان مسجدوں میں صرف افریقی اور ایشیائی مسلمان ہی نہیں بلکہ مقامی فرنچ اور یورپی نومسلم بھی آتے ہیں۔ ایسے ہی چند یورپین نومسلم افراد کی باتیں میں اپنے ایک سفر نامے "جہاں برف گرتی ہے" میں تحریر کر چکا ہوں۔ مطلب یہ کہ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعلیم اور سائنس کی معلومات انسان کو راہِ حق سے ہٹاتی ہے۔ حقیقت میں یہ تعلیم انسان کو اللہ کے قریب لاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ کئی باتیں جنہیں ہم سائنس کی مدد سے آج ثابت کر رہے ہیں اسلام نے 1400 سال قبل انسان کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔

شہد میں شفا ہے۔ اسے اینٹی بائیوٹک کے طور پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ کھانے کی چیزوں میں شہد ہی ایک ایسی چیز ہے جسے جراثیم خراب نہیں کر سکتے۔ یہ باتیں گزشتہ صدی کے نصف آخر میں میڈیکل سائنس نے ثابت کیں جب کہ مسلمانوں کو اس بارے میں 1400 سال پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ آج کے یورپین تجربات کے بعد یہ کہتے ہیں کہ خنزیر کا گوشت انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ یہ بات 14 صدی قبل قرآن میں بیان ہو چکی ہے۔ ممکن ہے آئندہ چل کر انسانی ذہن اس قدر ترقی کر لے اور وہ تسلیم کر لے کہ خنزیر کا گوشت صرف صحت پر ہی نہیں بلکہ اخلاق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

آج سے تقریباً پچاس برس قبل ہم کئی غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کی زبان سے یہ سنتے تھے کہ آپ مسلمانوں کی کتاب (قرآن شریف) میں ہے کہ سورج اور ستارے حرکت میں ہیں جب کہ سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے اور زمین اور دیگر سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں اور بعد میں ایک دور ایسا بھی آیا یہ 1978ء یا غالباً 1979ء کی بات ہے۔ میں نے جاپان کے ایک انگریزی اخبار میں پڑھا تھا کہ نہ صرف زمین اور چاند بلکہ سورج بھی اس کائنات میں دیگر ستاروں کی طرح حرکت کرتا ہے۔

مغربیت کے زیادہ اثر ہونے کے سبب میرے دل میں بھی کئی باتوں کے متعلق شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد دیگرے میں نے اس قسم کی کئی باتیں پڑھیں، سنیں اور دیکھیں تو میرے دل نے شکوک و شبہات زائل ہو گئے۔ میرا یقین پختہ ہو چکا ہے کہ قرآن کتاب الٰہی ہے۔ اس میں جو کچھ بھی ہے صد فی صد حقیقت ہے۔ انسانی علم ناقص اور کمزور ہے اس لیے اسے کئی باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ ممکن ہے آئندہ چل کر سائنس اس قدر ترقی کر لے اور انسان کے دماغ میں مزید سمجھ اور عقل پیدا ہو کہ وہ قدرت کے چند رازوں اور رموز سے مزید آگاہ ہو سکے انہیں سمجھ سکے۔

قرآن شریف میں ہے کہ قیامت کے دن سمندروں میں آگ بھڑکنے لگے گی: "اور جب سمندر جلائے جائیں گے"۔

قرآن کی 81 سورۃ التکویر کی یہ آیت پڑھ کر مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ اللہ رب العزت بڑی طاقت والا ہے۔ وہ جیسا چاہے وہی ہوگا لیکن ظاہری طور پر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے ویسے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کو ہر بات اور ہر چیز کا علم ہو۔ انسان کو قدرت کی طرف سے جو علم ملا ہے وہ انتہائی قلیل ہے۔

وہ میرے ملائیشیا کے دن تھے۔ یعنی میں ملائیشیا میں مقیم تھا جب میں نے قرآن کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ملائیشیا میں آٹھ نو سال رہائش کے دوران مجھے دیگر ٹیکنیکس کے ساتھ Fire & Safety کے موضوع پر بھی لیکچر دینے ہوتے تھے۔ جہاز رانی کے امتحانات میں یہ سبجیکٹ انتہائی اہم تھا۔ اس میں جہاز پر اور مختلف مقامات پر مختلف چیزوں میں لگنے والی آگ پر قابو پانے کے طریقے سمجھائے جاتے ہیں۔ تیل میں لگنے والی آگ پر پانی ڈالنے کے دوران نہایت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ پانی آگ کو بجھانے کے بجائے اسے مزید بھڑکانے کا سبب بنتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ اس مثال کو لیجیے، گھر میں کڑاہی یا فرائی پین میں گرم ہوتے ہوئے تیل میں آگ لگ جائے تو اس پر پانی کے چھینٹے ڈالنے سے وہ بجھتی نہیں ہے بلکہ مزید بھڑکنے لگتی ہے۔

اس کا سبب کیا ہے؟ میں اکثر طلباء سے یہ سوال پوچھتا تھا اور آج بھی جہاز پر جانے والے نوجوان انجینئروں کی معلومات ٹیسٹ کرنے کی غرض سے ان سے پوچھتا ہوں، کیوں کہ جہاز کے مختلف حصوں میں لگنے والی آگ کو کبھی کبھی پانی فائدے کے بجائے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ مثلاً جہاز کی چمنی میں لگنے والی آگ کو پانی بجھائے یا نہ بجھائے لیکن قتل کو توڑ کر اس میں لگے ہوئے بوائلر (Exhaust Boiler) اور دیگر آہنی Structure کو کریک ضرور کر دیتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ گرم آہنی پرزوں پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے بجائے اس میں لگی ہوئی آگ کو بھاپ یا Foam سے بجھایا جائے۔

جہاز کے گودام میں رکھے ہوئے اناج (گندم، چاول



اور دیگر اجناس) میں لگنے والی آگ پر پانی کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے لیکن ایک دو دن کے بعد جہاز غرق ہو جائے گا کیوں کہ پانی اناج کو پھلا دیتا ہے۔ اناج میں پانی جذب کرنے کی صلاحیت ہے اور بھیگنے کے بعد زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ مزید جگہ نہ ملنے کے سبب گیلا اناج جہاز کی سائیڈیں پھاڑ دیتا ہے اور جہاز ڈوب جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں گودام کے دروازے بند کر کے آگ کو پھیلنے سے روکا جائے۔ یعنی آگ کو ہوا نہیں ملنی چاہیے۔ قریبی بندرگاہ تک پہنچتے پہنچتے دو چار دن میں اناج کا کچھ حصہ ضرور جل جائے گا۔ اسے جلنے دیا جائے۔ باقی سامان، جہاز اور عملے کے لوگ تو بچ سکتے ہیں۔

اسی طرح زیادہ تپش والی آگ مثلاً ڈیزل، پیٹرول وغیرہ میں لگنے والی آگ کا ٹمپریچر بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس پر پانی ڈالنے سے کبھی کبھی آگ بجھنے کے بجائے مزید شدت سے بھڑکنے لگتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ بہت زیادہ حدت کے سبب پانی پھٹ جاتا ہے اور اپنے اصلی اجزاء ہائیڈروجن اور آکسیجن میں Convert ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں گیسیں آگ بھڑکانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ہائیڈروجن گیس شعلوں کی صورت میں جلتی ہے اور یہ لکڑی، کپڑے اور تیل سے زیادہ طاقت ور ایندھن ہے۔ دوسری گیس آکسیجن آگ کو برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے آگ، ہوا کی موجودگی میں ہی لگ سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہوا میں 21 فیصد آکسیجن موجود ہوتی ہے۔ جب 21 فیصد آکسیجن اس قدر تباہی لا سکتی ہے تو وہاں پانی کے پھٹنے سے پیدا ہونے والی 100 فیصد آکسیجن کس حد تک خطرناک ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پانی کی ظاہری تاثیر یہی ہے کہ وہ ٹھنڈا، شفاف، دلکش اور فرحت بخش ہے جب کہ یہ دو خطرناک مادوں "ہائیڈروجن اور آکسیجن" کا مرکب ہے جن سے خوفناک اور پھیلنے والی آگ لگ سکتی ہے۔

میں اسی طرح جہاز چلانے والے انجینئر طلباء کو سمجھاتا تھا لیکن افسوس کہ میں قرآن کی آیت میں سمندر میں بھڑکنے والی آگ کا ذکر پڑھ کر متعجب ہوتا تھا اور اپنے دماغ میں درج بالا لاجک کو پرکھنے اور اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ پھر ایک دن کلاس روم ہی میں لیکچر کے دوران مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے ذہن پر سے کوئی پردہ اٹھ گیا ہو۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا تھا کہ میں اس بات پر حیران اور متعجب ہوتا رہا ہوں کہ پانی میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟ جب کہ قدرت نے پانی میں اجزاء ہی ایسے رکھے ہیں جو آگ پکڑنے اور پھیلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا یہ بات عجیب بلکہ عجیب ترین نہیں ہے کہ رب پاک نے ایسے خطرناک اجزاء "ہائیڈروجن اور آکسیجن" کو ملا کر ایک ایسی چیز "پانی" تیار کی ہے جو حیات بخش ہے۔

مجھے یاد ہے کلاس روم میں یہ خیال اچانک میرے ذہن میں آیا تھا اور میں لیکچر دیتے ہوئے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ کلاس روم میں موجود ہونے کے باوجود گویا میں چند ثانیوں کے لیے ذہنی طور پر غیر حاضر ہو گیا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں خیالات کی بھرمار ہو گئی تھی۔

اللہ کی قدرت کا محض ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ پانی کی یہ ترکیب تبدیل ہو جائے اور دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور آگ بھڑکانے کے کام میں مشغول ہو جائیں جو دراصل ان کی بنیادی خصوصیت ہے۔

اس وقت میری کلاس میں چینی، عیسائی اور تامل ہندو جہازی انجینئر بھی موجود تھے۔ لہٰذا اس وقت اس موضوع پر بات کرنے کے بجائے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آئندہ کبھی اس سلسلے میں بات کی جائے۔ کلاس ختم ہونے کے بعد چائے کے وقفے میں ملائی مسلمان انجینئروں کے ساتھ میں نے اس بات کا ذکر کیا۔ ان میں سے ایک انجینئر نے بھی اپنے تجربے میں آنے والی اس قسم کی بات بیان کی جو وہ قرآن میں پڑھ چکا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ بظاہر معمولی باتوں میں قدرت کی جانب سے بڑی حکمت اور معجزات پوشیدہ ہیں۔ اس نے دودھ کے بارے میں بتایا تھا کہ دو بے کار چیزوں یعنی خون اور گوبر کے درمیان انسان کے لیے دودھ جیسی اعلیٰ چیز موجود ہے۔

ملائیشیا کے اس جہازی انجینئر کا اشارہ سورہ النحل کی جانب تھا۔ جس کی آیت نمبر 66 میں رب پاک فرماتا ہے۔ مفہوم: اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے شکم میں سے گوبر اور خون کے درمیان میں سے ہم تمہیں ایک چیز پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔

"گوبر اور خون کے درمیان میں سے" کا مطلب یہ ہے کہ جانور جو چارہ کھاتے ہیں اس سے ایک طرف تو خون بنتا ہے اور دوسری جانب گوبر۔ لیکن اسی جانور کی مادہ جنس میں اسی چارے سے ایک تیسری چیز بھی پیدا ہوتی ہے جو خاصیت، رنگ، بو، فائدے اور مقصد میں دیگر دونوں چیزوں (گوبر اور خون) سے بالکل مختلف ہے۔ بھینس اور گائے میں تو اس قدر زیادہ مقدار میں دودھ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچھڑوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان کو بھی ایک اعلیٰ غذا فراہم کرتی ہیں۔

(جاری ہے)

# ذرہ بنا آفتاب

انور فرہاد

اس نے نامساعد حالات میں زندگی کی ابتداء کی تھی. غربت کی گود میں پل کر جوان ہوا لیکن ماحول کی محبوبیت نے اس کے اندر ایک ایسا فنکار تراش دیا تھا جس نے اسے بیکل بنا دیا. روح میں ایسی بے چینی بھر دی کہ دل بے چین رہنے لگا. دل کے تار گنگنا اٹھنے کی چاہ میں اسے اکسانے لگے. تب اس نے روح کی اذیت کوشی سے آزادی کے لیے ایک نئی دنیا میں پناہ لے لی اور ایسی ایسی حرکتوں کو جنم دیا جو اسے امر بنانے کے لیے کافی ہیں.

اس سے پہلے کہ ہوٹل کی اس ملازمت کے بارے میں مزید باتیں بتاؤں۔ میں ایک بار پھر اس کی عظمت اور بڑائی کے گن گاؤں گا جس نے عزت اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے کے بعد بھی برے دنوں کو فراموش نہیں کیا اور جب بھی اسے موقع ملا اس کا برملا اظہار کیا جب کہ عام طور پر جب لوگ بڑے ہو جاتے ہیں۔ عزت اور شہرت حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے ماضی کے ان دنوں کو جو غربت اور عسرت میں گزرے۔ ان کا ذکر نہیں کرتے مگر اس نے اپنے عروج کے دور میں بھی ان کے بارے



میں بتایا کہ کیسے اس نے اس منزل تک رسائی حاصل کی؟ اس نے اپنے ابتدائی دور کی یہ باتیں خود بتائیں، جبھی آج ہم انہیں بیان کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آج اس کے عزیزوں، دوستوں اور اولادوں کو یہ باتیں بری لگیں کہ اتنے بڑے فنکار کے بارے میں ایسی باتیں نہیں لکھنی چاہئیں مگر میں یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ باتیں اس نے خود بتائیں جب ہی ہم تک پہنچیں۔ ہمارے خیال میں یہ اس کی عظمت اور بڑائی کی معراج ہے کہ اس نے اپنے ماضی کے کسی گوشے کو عوام سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس کی زندگی ایسے لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو زیرو سے ہیرو بننے کا عزم و ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے رزق حلال کے لیے کسی محنت مزدوری سے انکار نہیں کیا اور اپنے مخصوص اسٹائل میں اپنی زندگی کی گاڑی رواں دواں رکھی۔ اس کی کامیابی اور کامرانی کا یہی راز ہے۔

ہوٹل کی ملازمت تو اس نے کر لی مگر جلد ہی اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا اس نے سوچا تھا۔ جب کام کرنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی کہ گاہکوں کی ناز برداری کے ساتھ ساتھ پرانے بیرے بھی اس پر حکم چلاتے ہیں۔ دس بارہ گھنٹوں کی ڈیوٹی کے دوران گاہکوں کو سرو کرنے کے علاوہ میزوں کی جھاڑ پونچھ اور جھوٹے برتنوں کی صفائی اور دھلائی بھی اس کے ذمہ کر دی جاتی تھی۔ اسے یہ سخت ڈیوٹی اتنی زیادہ نہیں کھلتی تھی جتنی یہ بات بری لگتی تھی کہ پرانے بیروں سے زیادہ وہ کام کرتا ہے لیکن ان کی طرح اسے تنخواہ نہیں دی جاتی اگرچہ اسے پیسوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا اصل مسئلہ پیٹ بھر کر کھانا تھا جو اسے مل جاتا تھا۔ اس کے باوجود ہوٹل والوں کا یہ طریق کار اسے اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا ایک مہینے کی ٹریننگ ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی ہی تھے کہ اس نے یہ کام چھوڑ دیا۔

''ایسی کی تیسی اس نوکری کی۔'' اس نے جھنجلا کر اپنے آپ سے کہا۔ ''مجھے نہیں کرنی ایسی نوکری جس میں بندہ گھن چکر بن کر رہ جائے اور شام کو گھر جاتے وقت ہاتھ میں ایک پیسا بھی نہ ہو۔''

وہ گھر سے یعنی مسجد سے نکلا تو ہوٹل جانے کے لیے ہی تھا مگر اس حتمی فیصلے کے بعد ہوٹل نہیں گیا۔ بے مقصد شہر کی سڑکوں میں ادھر ادھر گھومتا پھرا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی گرم کھوپڑی ٹھنڈی ہوئی تو وہ سوچنے لگا۔

''میں نے ہوٹل کی نوکری تو چھوڑ دی مگر اب کروں گا کیا؟ کچھ کیے بغیر پیٹ کیسے بھرے گا؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ ''یہ پیٹ بھی عجیب مصیبت ہے۔ خالی ہو جائے تو گنگی کا ناچ نچانے لگتا ہے۔ اسے تو بھوک کی آگ بجھانے کے لیے روٹی چاہیے مگر روٹی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ روٹی کے لیے کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ جو کر رہا تھا اسے تو جذباتی فیصلے کی لات رسید کر دی۔''

اب اسے ایک دم اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ اپنے تھوبڑے پر ایسا مکا رسید کرے کہ...... اچانک اس کے غصے پر جیسے بریک لگ گیا اور اسے کالے خان یاد آ گیا اور اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کا مشورہ بھی یاد آ گیا۔ جو مشورہ کم تھا، حکم زیادہ تھا۔ اس نے میکلوڈ روڈ پر رتن سینما کے قریب واقع پینٹنگ کی دکان پر جانے کو کہا تھا مگر اس نے وہاں جانے کی بجائے کالے پہلوان کے ہوٹل میں بیرا گیری شروع کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خوشگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کالے خان! اس وقت تو میں نے تیرے کہنے پر عمل نہیں کیا تھا مگر اب تیرے بتائے ہوئے پتے پر ضرور جاؤں گا اور تیرے جاننے والے سے تیرا نام لے کر نوکری کی درخواست ضرور کروں گا۔ سمجھو مجھے نوکری مل گئی۔'' اس نے اپنے آپ سے کالے خان کے انداز میں کہا اور مسکراتے اور گنگناتے ہوئے میکلوڈ روڈ کی طرف چل پڑا مگر رتن سینما کے قریب پینٹنگ کی دکان کے پاس جا کر اس کی کھوپڑی ایک بار پھر الٹ گئی۔ ''میں ان کے پاس جا کر کہوں گا مجھے کالے خان نے بھیجا ہے۔''

وہ مجھ سے کہیں گے۔ ''کون کالے خان؟ وہ تو نہیں جو بدمعاش ہے غنڈہ ہے۔''

''جی ہاں۔ وہی۔''

وہ مجھے انتہائی نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھیں گے اور کہیں گے۔ ''اچھا تو تم بھی کوئی بدمعاش ہو، غنڈے ہو؟''

اگر وہ ایسی بات نہیں بھی کہیں گے پھر بھی یہی سمجھیں گے کیونکہ چور کا بھائی گرہ کٹ ہی ہو سکتا ہے۔ غنڈے کا ساتھی بدمعاش ہی ہو سکتا ہے مگر میں غنڈہ تو نہیں...... بدمعاش بھی نہیں۔ پھر میں اپنے بارے میں اس طرح کسی کو غلط سوچنے کا موقع کیوں دوں؟ مانا کہ میں اپنے امام مسجد باپ کی طرح بہت نیک اور بہت اچھا بندہ بھی نہیں ہوں۔ پھر بھی کالے خان کی طرح برا آدمی بھی تو نہیں ہوں۔ لہٰذا میں کسی برے آدمی کے حوالے سے اپنا تعارف کیوں کرواؤں؟ اپنے بارے میں غلط تاثر کیوں قائم ہونے دوں؟

”اے لڑکے! اس طرح کیا دیکھ رہا ہے؟“

اس آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ لکڑی کے فریم پر چڑھے کپڑے کے بینر پر فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصویریں بنانے والے نے اسے ٹوکا تھا۔

”آپ لوگوں کا کمال دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے ٹیڑھے میڑھے چہرے پر تعجب کے اثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”واہ! کیا کمال ہے آپ لوگوں کا ہوبہو فلم والوں کے چہرے مہرے بنا رہے ہو۔“

”چلو پیسے نکالو۔“ تصویریں بنانے والوں میں سے ایک بندے نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”پیسے...... کیسے پیسے؟“

”یہ جو تم ہمارا کھیل تماشا دیکھ رہے ہو۔ کھیل تماشا دیکھنے کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ تم ہمارا کھیل دیکھ کر پیسے نہیں دو گے؟“

”پیسے بھی دینے پڑیں گے؟“ کراہنے والے انداز میں اس نے کہا اور اپنا ہاتھ اپنی جیب میں ڈال دیا۔ پھر ہاتھ جیب سے نکال کر انہیں دکھایا۔ ”میرے پاس تو ایک پیسا بھی نہیں ہے میں آپ لوگوں کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔“

اس نے کچھ ایسی معصومیت اور مظلومیت بھرے انداز میں کہا کہ بینر بنانے والوں کو اس پر رحم آ گیا۔ ان میں سے ایک نے اپنے اس ساتھی کو ہلکے سے ڈانٹ پلائی جس نے اس سے تماشا دیکھنے کے پیسے مانگے تھے۔ ”ابے کیوں تنگ کر رہا ہے اس غریب کو؟“ پھر لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟“

”پردیسی ہوں حال ہی میں ننگر ہار سے آیا ہوں۔“ اس نے اپنے چہرے پر مزید مظلومیت طاری کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جان بوجھ کر پشاور کا نام نہیں لیا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”محمد سعید خان۔“

”کہیں کوئی کام کاج کرتے ہو؟“

”نہیں جی۔“ اس نے زبان کے ساتھ سر کو زور سے نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”بے کار ہوں۔“

”ہمارے ہاں کام کرو گے؟“

”کیا کام کرنا ہوگا مجھے؟“ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”یہی...... جو ہم کرتے ہیں۔“

”یہ کام......!“ وہ بڑے زور سے چونکا۔ ”یہ کام تو...... یہ کام تو...... بڑا مشکل ہے...“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر حیرت سے کہا۔ ”یہ کام میں کیسے کروں گا؟ مجھے تو نہیں آتا۔ بالکل بھی نہیں آتا۔“

”ہم تمہیں سکھا دیں گے۔“ اس نے بڑے پیار، بڑی شفقت سے کہا۔

اس نے اپنے ٹیڑھے میڑھے چہرے پر حیرت اور مسرت کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی جو ایسا مضحکہ خیز تھا کہ وہاں موجود سارے لوگ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

اور پھر اسے اسی دن اور اسی وقت سے ملازم رکھ لیا گیا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا جس نے اسے کاکے خان کی سفارش کے بغیر یہ نوکری دلوا دی تھی اور اس کی عزت نفس پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔ بے شک وہی عزت دینے والا ہے۔ وہی ذلت دینے والا ہے۔

وہ اپنے چہرے، اپنی باتوں اور حرکات وسکنات سے بے وقوف نظر آتا تھا مگر اتنا بھی بے وقوف اور احمق نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اس میں سوچنے سمجھنے اور بھلائی برائی کی تمیز کرنے کی صلاحیت تھی۔ لہٰذا جب جب اور جہاں جہاں اسے محتاط قدم اٹھانے کی ضرورت پڑتی اس پر اپنی سوچ اور فکر کے مطابق عمل کرتا۔ یہ نئی ملازمت حاصل کرنے کے بعد بھی اس نے اسی طرح سوچ سمجھ کر اپنے بارے میں ان لوگوں کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی کہ اسے بھی تصویریں بنانے کا شوق ہے۔ وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ تصویریں بنا سکتا ہے اور یہ کام وہ ان کی تھوڑی سی رہنمائی سے کر لے گا۔ اس نے ان لوگوں پر یہی ظاہر کیا کہ اس کو پینٹنگ کی الف ب سے بھی واقفیت نہیں۔ وہ تصویر بنانے کے بارے میں بالکل کورا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ لوگ اسے بالکل ابتدائی سبق سے سکھانے لگے۔ اس نے اپنے طور پر جو کچھ سیکھ رکھا تھا وہ محض شوق کی بنا پر تھا۔ اس سلسلے میں جو قاعدہ قانون اور طریق کار ہے جو مروج سبق ہے۔ اس کا اسے سچ مچ کوئی علم نہیں تھا۔ لہٰذا وہ ان کی ہدایات پر عمل کر کے ایک اچھے طالب علم کی طرح فیض یاب ہونے لگا۔ اس کے اندر تو ایک آرٹسٹ پہلے سے موجود تھا۔ جسے ان کی ہدایت میں نکھرنے اور سنورنے کا بہتر موقع ملا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے بارے میں محسوس کرنے لگا کہ اس فن میں اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہو گئی ہے۔ اس احساس کے بعد بھی اس نے ایک دم اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کیا۔ آہستہ آہستہ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ ظاہر کرتا کہ یہ سبق اسے اس حد تک یاد ہو گیا ہے اس بارے میں وہ اتنا سیکھ گیا ہے اس طرح دکان والے یہی سمجھتے رہے کہ لڑکا بہت ذہین ہے اور اس میں سیکھنے کی لگن بھی ہے۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں اتنا اچھا آرٹسٹ بن گیا ہے۔ وہ سکھانے والے استادوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور اسے سکھانے والے آرٹسٹ بھی اس سے بڑی محبت اور شفقت کرنے لگے۔ ابتدا میں وہاں بھی کچھ دنوں تک اسے کھانے اور چائے پر کام کرنا پڑا تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ کام سیکھتا گیا اس کی دہاڑی بھی مقرر کی جانے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب اس کے استادوں نے اسے اس بات کی یقین دہانی کرا دی کہ اب وہ باضابطہ اور مکمل آرٹسٹ بن گیا ہے۔ اسے اس بات کی خوشی حاصل ہوئی تھی کہ بچپن اور لڑکپن کے شوق نے اسے مستقبل میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کا ایک روشن راستہ دکھا دیا۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے مولا کریم کا شکر ادا کیا اور تصویر سازی کا سبق پڑھانے والے استادوں کو بھی دعائیں دیں۔ ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔

”اس میں تمہارے شوق اور تمہاری لگن کا بھی دخل ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اگر تم اتنی دل جمعی کے ساتھ کام نہیں کرتے، اس کام میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے تو ہرگز اتنی جلدی اتنے اچھے آرٹسٹ نہیں بنتے۔“

یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ جب تک شوقیہ فنکار تھا، شکلیں اور مناظر بنا تو لیا کرتا تھا مگر اس فن کے اصولوں سے نا آشنا تھا۔ جب اس نے اس کی تعلیم حاصل کی اسے استادوں کی رہنمائی ملی تو اسے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کا موقع ملا۔ اگرچہ اس کے استادوں نے اسے مکمل آرٹسٹ ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا مگر اب بھی اسے مزید سیکھنے کی پیاس تھی۔ وہ سوچتا مجھے ابھی اس فن کو اور بھی سیکھنا چاہیے۔ اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ اتنا سیکھنا چاہیے کہ اس کے بعد مزید سیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ایک دن اس نے اپنے استادوں سے بھی اس کا اظہار کر دیا۔ ”میں اس فن کو اس کی اصل روح کے ساتھ سیکھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم اس فن کی گہرائی تک جا کر اسے دیکھنا چاہتے ہو اور صحیح معنوں میں ایک مکمل آرٹسٹ بننا چاہتے ہو۔“

”بتایئے...... اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا پڑے گا۔ کوئی ایسا استاد فن جس کی شاگردی اختیار کر کے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں؟ کیا ایسا کوئی استاد ہے؟“

”ہاں ہے۔ یوں تو یہاں لاہور میں ایک سے بڑھ کر ایک اچھے استاد ہیں لیکن آزاد صاحب کی ٹکر کا کوئی آرٹسٹ نہیں۔“

”یہ صاحب وہی تو نہیں جو فلموں میں اداکاری کرتے ہیں؟“

”ارے نہیں بھائی۔ یہ فلمی اداکار نہیں۔ ہماری تمہاری طرح تصویریں بنانے والے آرٹسٹ ہیں لیکن بڑے پہنچے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔“

”کہاں پہنچے ہوئے آرٹسٹ ہیں؟“

”ارے یار! پہنچے ہونے کا مطلب ہے اس فن کی بلندیوں تک پہنچے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔“

”اچھا اچھا اب سمجھا۔“ اس نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس اوندھی کھوپڑی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ ہر بات جھٹ پٹ سمجھ لے۔“

اس کے مخاطب ہنس پڑے۔ ”نہیں تمہاری کھوپڑی ایسی نہیں ہے تم بڑے گہرے آدمی ہو۔ بے وقوف بن کر دوسروں کو بے وقوف بناتے ہو۔“

اس نے اپنے استادوں کی بات سن کر انہیں حیرت سے دیکھا۔ پھر اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھا پھر مسکرانے لگا۔ ”نہیں جی...... میں ایسا بندہ نہیں، میں استادوں کے ساتھ استادی نہیں کر سکتا۔“

اس کے استاد جانتے تھے کہ وہ طبیعتاً ذرا مخولیا ہے۔ ہر وقت ہنستا مسکراتا ہی نہیں رہتا دوسروں کو ہنسانے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہے۔ بہرحال انہوں نے بخوشی استاد آزاد کے پاس جا کر مزید ٹریننگ حاصل کرنے کی اسے اجازت دے دی۔ وہ اپنی پہلی فرصت میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے ملاقات کی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ استاد آزاد نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا کچھ سوچا پھر بولے۔ ”تم آرٹسٹ ہو؟“

ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہے ہوں ایسا اول جلول قسم کا آدمی جو خود بھی ڈھنگ سے بنا ہوا نہ ہو وہ دوسروں کی تصویریں اچھی طرح کیسے بنا سکتا ہے؟

”جی ہاں۔ میں آپ کی دعا سے پینٹر ہوں۔ تصویریں بنا سکتا ہوں۔“

”ہوں۔“ کہہ کر استاد آزاد کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔ ”پہلے تم مجھے یقین دلاؤ۔ میرا مطلب ہے کام کر کے یہ بتاؤ کہ یہ کام واقعی کر سکتے ہو۔“

”کام دیجیے اور بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

استاد آزاد، آخر استاد تھے۔ اسے ایسا کام دیا جو قدرے

الجھا ہوا تھا۔ خام اور نو آموز آرٹسٹ اس کام کو صحیح طور پر بہت کم کر سکتے تھے۔ سعید خان نے تھوڑی دیر میں اپنے کام کا نمونہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آزاد صاحب نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کے کیے ہوئے کام کا جائزہ لیا۔ اس میں نقص نکالنے، خامی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے نہ صرف اس بات کا یقین آگیا کہ تم آرٹسٹ ہو بلکہ یہ کہنے میں کسی بخل سے کام نہیں لوں گا کہ اچھے خاصے آرٹسٹ ہو۔ پھر بھی تم میرے پاس آئے ہو اور مجھ سے یہ فن سیکھنے کے متمنی ہو۔ اتنا کچھ تو سیکھے ہوئے ہو اب اور کیا سیکھنا چاہتے ہو؟''

اس نے ذرا سوچا...... کچھ غور کیا...... پھر بڑے احترام کے ساتھ بولا۔ ''آرٹسٹ آپ بھی ہیں اور میں بھی ہوں مگر مجھ میں اور آپ میں کچھ فرق ہے ناں؟''

آزاد صاحب نے اس اول جلول قسم کے نوجوان کو گھور کر دیکھا۔ جو کچھ وہ نظر آرہا تھا اس سے کہیں بڑی اور گہری بات اس نے کہہ دی تھی۔ استاد کو اس طرح غور و فکر میں دیکھ کر اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''استادِ مکرم! میں اس فن کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی روح تک پہنچنا چاہتا ہوں اور یہ مقصد آپ جیسے استاد کی رہنمائی سے ہی حاصل کرسکتا ہوں۔''

استاد نے اسے قریب بلا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اچھا زمانہ تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ آرٹ اور فن کی قدر کرنے والے لوگ تھے۔ فن کی پیاس بجھانے والوں سے محبت کرنے والے لوگ تھے۔ استاد آزاد نے سعید خان کو اپنے فن کدے میں بطور طالب علم رکھ لیا۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے فن کی باریک بینی سے آگاہ کرنے لگے۔ اس کی محنت اور لگن مہمیز کرتی رہی اور وہ مستند استاد کی رہنمائی میں خوب سے خوب تر کی سند حاصل کرتا گیا۔ پھر ایک دن استاد نے اس سے کہا۔

''سعید خان! اب تم استادوں کی صف میں شامل ہو گئے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ بجائے کسی کے ساتھ کام کرنے کے خود اپنا کام شروع کردو۔ اس طرح تم میں زیادہ سے زیادہ اعتماد پیدا ہوگا اور تمہارے کام میں مزید گہرائی پیدا ہوتی جائے گی۔''

استادِ مکرم کے مشورہ کے مطابق اس نے جلد ہی شاد باغ کے علاقے میں پینٹنگ سے متعلق اپنی ذاتی دکان کھول لی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اچھا کام خود منہ سے بولتا ہے۔ اس کے لیے کسی پبلسٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کچھ ایسی ہی بات تھی کہ اس کے کام کی وجہ سے جلد ہی اس کی دکان کی شہرت ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ نئی فلموں کی نمائش کے بینرز اور ہورڈنگز کا کام اچھی تعداد میں اس کے پاس آنے لگا۔ جو اس سے ایک بار کام کراتا دوسری بار اس کے پاس ضرور آتا۔ اس کے کام کے ساتھ ساتھ اس کے اچھے اخلاق سے بھی فلم والے متاثر ہوتے تھے۔ اس کی ایک اور بات بھی اس کے گاہکوں کو پسند تھی کہ وہ جس وقت کا کمٹمنٹ کرتا تھا اس سے بال برابر بھی انحراف نہیں کرتا تھا۔

حرکت میں برکت والی بات غلط نہیں ہے۔ جب وہ کچھ نہیں کرتا تھا تو مسجد میں مفت کی روٹی توڑتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لیے وہ کرے بھی تو کیا کرے؟ لیکن مسجد کے امام صاحب نے جب اس میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے اسے فیروز سنز کی دکان پر بھیجا تو وہ دن بھر گھوم پھر کر اللہ کا کلام، اللہ کے بندوں کو پہنچانے لگا۔ پھر اس نے ہوٹل میں بیرا گیری کی اور پھر بچپن کے شوق کو عملی صورت میں کیش کرانے لگا تو اسے احساس ہوا کہ کچھ کرنے سے ہی کچھ بنا جاسکتا ہے اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تو کچھ بھی نہ بن سکتا۔ شاد باغ میں اپنی دکان کرنے کے بعد بڑی تیزی سے اس کے حالات میں تبدیلی آگئی۔ خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی گزارنے لگا۔ جب تک بندہ حالات کا مارا ہوتا ہے اپنے بارے میں اسے سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کی ساری توجہ روٹی کے حصول پر مرکوز ہوتی ہے کہ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے کہاں سے اور کیسے روٹی حاصل ہوگی؟ لیکن جب روٹی کے ساتھ ساتھ زندگی کی دیگر ضروریات آسانی سے دستیاب ہوں تو بندے کو آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کی مہلت مل جاتی ہے اور آئینے کو دیکھ کر اپنی ذات میں دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔

محمد سعید خان جب آسودہ حال ہوا تو اسے بھی اپنی ذات پر توجہ دینے کا خیال آیا۔ وہ آئینے کو مخاطب کر کے کہتا۔ ''تم مجھے یہ کس کا عکس دکھا رہے ہو؟''

''مجھ میں تو دیکھنے والے ہی کا عکس نظر آتا ہے۔'' اسے آئینے کا جواب ملتا۔

''اچھا یہ میں ہوں اگر واقعی میں ہوں تو لعنت ہے مجھ پر۔'' وہ مختلف زاویوں سے شیشے میں اپنے آپ کو دیکھ کر سوچتا۔ اگر لوگ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں ہنستے ہیں تو غلط نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا چاہیے۔ ہنسنا اور ہنسانا اچھی بات ہے لیکن دوسروں پر ہنسنے کا مطلب مذاق اڑانا ہے۔ لوگ مجھے دیکھ کر اگر ہنستے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ میرا تمسخر اڑاتے ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا



کہ اسے ہڈیوں کے اس ڈھانچے کی اوور ہالنگ کرانی چاہیے۔ اس پر گوشت کی تہہ جمانی چاہیے۔ جس طرح اس نے اپنی معاشی حالت بنانے کے لیے جدوجہد کی ہے اسی طرح اپنے بدن کی نشوونما کے لیے بھی مناسب تدبیر کرنی چاہیے اور اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ اس نے باڈی بلڈنگ پر توجہ دی۔

اقبال بٹ نے اسے کسرت کرتے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ تم باڈی بلڈنگ کا خبط چھوڑ دو اور فلموں میں اداکاری شروع کردو۔ جلد ہی بہت کامیاب کامیڈین بن جاؤ گے۔''

اس نے اپنے استاد اقبال بٹ کو گھور کر دیکھا اور سوچا۔ بٹ صاحب مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے ہیں؟ مگر انہیں سنجیدہ دیکھ کر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ مذاق نہیں ہے۔ شاید قدرت نے مجھے فلمی اداکار بننے ہی کے لیے پیدا کیا ہے اگر باڈی بلڈرز کے مقابلے میں مجھے دیکھ کر لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوسکتے ہیں تو سنیما کی اسکرین پر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کرسکیں گے۔

اداکار بننے کا شوق تو اسے اس وقت سے بے چین کرتا رہتا تھا جب سے اس نے فلمیں دیکھنا شروع کی تھیں۔ اس کا یہی شوق تھا یہی خواہش تھی جس نے اسے فلم ''دشمن'' میں کام کرنے پر مجبور کیا تھا مگر وہ فلم بری طرح ناکام ہوگئی اور اس ناکامی کو اس نے اپنی ذات سے، اپنی اداکاری سے وابستہ کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے فلم ناکام ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی اداکاری نہیں کرسکتا مگر بٹ صاحب نہایت سنجیدگی سے اس خیال کی نفی کررہے تھے۔

فلموں میں کام کرنے کی اس کی سوتی ہوئی خواہش ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی۔ اگرچہ اس نے ''دشمن'' کے فلاپ ہونے کے بعد توبہ کرلی تھی کہ اب وہ اور کسی فلم میں کام نہیں کرے گا مگر استاد اقبال بٹ نے یہ کہہ کر اس کے ارادے کو متزلزل کردیا۔

''شاید خدا نے مجھے لوگوں کو ہنسانے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''

لفظوں کی جادوگری بھی بڑی عجیب ہوتی ہے اور اگر جادوگر کوئی معتبر اور مستند بازی گر ہو تو اس کا اثر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ استاد اقبال بٹ کی بات اس کی رگ رگ، ریشے ریشے میں اثر انداز ہوئی تھی۔

''میں اداکار بنوں گا۔ فلموں میں کام کروں گا۔ لوگوں کو ہنساؤں گا۔'' اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ کہا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی راہیں تلاش کرنے لگا۔

جب وہ پینٹنگ کی دکان میں کام کرتا تھا ان ہی دنوں بہت سے فلم والوں سے ملنے کا اسے موقع ملا تھا۔ پھر جب اس نے اپنی ذاتی دکان کرلی تو فلم انڈسٹری اور ٹریڈ سے وابستہ بہت سے لوگ اس کی دکان پر آنے جانے لگے۔ اس سے کام کرانے لگے۔ اس طرح فلم والوں سے اس کی شناسائی کا حلقہ اور وسیع ہوگیا تھا۔ جب اس نے فلموں میں کام کرنے کا ارادہ نئے سرے سے کرلیا تو سوچنے لگا۔ ''کسی دن...... کسی مناسب فلم والے سے اپنی خواہش کا اظہار کروں گا۔''

فلم والے تو روز ہی اس کے پاس آتے تھے لیکن کچھ تو وہ اپنے کام میں اس قدر الجھا رہتا تھا کہ اس ضمن میں بات کرنے کی مہلت نہیں ملتی تھی اور اگر ملتی بھی تھی تو وہ سامنے والے کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرے۔ استاد اقبال بٹ تو اس کے شوق کو مہمیز لگا کر اپنے کام دھندوں میں مگن ہوگئے تھے جب کہ ان کی لگائی ہوئی آگ میں وہ اندر ہی اندر جھلستا رہتا تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے۔ عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہونے والی نئی فلموں کا کام اس کے پاس بہت آیا۔ رمضان کی ابتدا ہی سے جو کام شروع ہوا تھا وہ چاند رات تک بڑی خوش اسلوبی سے جاری رہا۔ اسے محاورتاً نہیں سچ مچ سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ اگرچہ ریلیز ہونے والی فلموں کے کئی بڑے اور مستند فلمساز و ہدایت کار اس کی دکان پر اپنے کام کے سلسلے میں آئے مگر اس کا جی نہیں چاہا کہ کام کے رش میں ان سے اپنی کسی ذاتی خواہش کا اظہار کرے۔

عید کے دن وہ نہا دھو کر اور نیا جوڑا زیب تن کر کے عید کی نماز پڑھنے کے لیے شاہی مسجد گیا تو بس اسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ جہاں جا کر بیٹھا تھا وہاں ایم جے رانا صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایم جے رانا صاحب اس دور کے بہت بڑے اور مشہور ہدایت کار تھے۔ ان کی حیثیت اور مرتبے کے بارے میں وہ بخوبی واقف تھا جب کہ رانا صاحب بھی اسے ایک اچھے آرٹسٹ کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ اس کی دکان سے کام بھی کراتے تھے۔ شاہی مسجد میں انہیں اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا۔ ''بس اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہوگا۔ رانا صاحب سے آج عرضِ مدعا کر ہی دوں گا۔''

عید کی نماز کے بعد لوگوں سے بغلگیر ہونا، گلے ملنا، رسم دنیا بھی ہے دستور بھی ہے جس کی ابتدا اپنے ساتھ عید کی نماز پڑھنے والوں سے ہوتی ہے۔ ہزار انجانے ہوں، اجنبی ہوں

یوں محبت سے ملتے ہیں جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ ایم جے رانا صاحب سے تو اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ امام صاحب نے جیسے ہی دعا ختم کی وہ ان کی طرف لپکا۔ رانا صاحب یہی سمجھے کہ وہ بغلگیر ہونے والا ہے مگر اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور سعید خان نے ان سے گلے ملنے یا عید مبارک کہنے کی بجائے ان سے کہا۔

"رانا صاحب! مجھے اداکاری کرنے کا بہت شوق ہے۔ آپ مجھے اپنی کسی فلم میں چانس دیں۔"

ایم جے رانا ایک سلجھے ہوئے اور باشعور انسان تھے۔ انہیں اس کا یہ بے دھڑک اظہار مدعا کرنا اچھا نہیں لگا۔ لگنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے سلام کیا نہ گلے ملا، نہ ہی عید مبارک کہی۔ چھوٹتے ہی اپنی خواہش کی توپ چلا دی۔ انہوں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ "تم اپنے ہوش وحواس میں تو ہو؟ یہ بھلا فلم میں کام مانگنے کی کون سی جگہ ہے؟ کون سا موقع ہے؟"

رانا صاحب کی بات اور لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت برہم ہیں ان کا موڈ بہت خراب ہے مگر اس دیوانے نے ان کے موڈ مزاج کا خیال کیے بغیر اپنے مخصوص انداز میں چہرے پر خوشگواری کے تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اُمید ہے۔ آپ مجھے ضرور چانس دیں گے۔"

اس کے بعد اس نے انہیں السلام علیکم کہا اور وہاں مزید نہیں رکا آگے بڑھ گیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نوجوان سعید خان مزاجاً ایسا بندہ تھا کہ کبھی کبھی اپنی کھوپڑی سے بالکل آؤٹ ہو جاتا تھا۔ سامنے والے کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ وہی سعید خان ہے جو اتنا بڑا اتنا اچھا اور سمجھ دار آرٹسٹ ہے؟ اس وقت بھی وہ اسی کیفیت میں تھا جب رانا صاحب سے مخاطب تھا۔ اس نے تمام تر اخلاقی اور روایتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا گھر پہنچ کر بھی اس کی ذہنی کیفیت وہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔

"میں نے رانا صاحب سے فلم میں کام مانگا تھا۔ عیدی تو نہیں مانگی تھی۔ زکوٰۃ دینے کو تو نہیں کہا تھا۔ پھر ان کا موڈ کیوں خراب ہو گیا؟ یہ فلمساز و ہدایت کار بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ بڑے اداکاروں اور اداکاراؤں سے خوشامد کرتے ہیں کہ میری فلم میں کام کر لیجیے۔ ان کو منہ مانگے معاوضے دیتے ہیں۔ ان سے کام کے دوران ان کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں اور ہم جیسے شوق کے مارے ان سے چانس دینے کی درخواست کرتے ہیں تو ہمیں جھڑک دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں پہچانتے ہیں میں نگار خانوں میں چکر لگانے والا کوئی بندہ بھی نہیں۔ اس کے باوجود رانا صاحب نے مجھے جھاڑ پلا دی۔ میری تو قسمت ہی کھوٹی ہے۔ میں نے سوچا تھا وہ بڑی فراخ دلی سے کہیں گے۔

"سعید خان! تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا تجھے فلموں میں اداکاری کرنے کا شوق ہے۔ تیرے لیے تو میرا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ میں تجھے چانس نہیں دوں گا تو کسے دوں گا؟ تو تو میرا سوہنا پتر ہے۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت دکھی ہے مگر کہنے کے بعد مزید کچھ نہیں کہا۔

آج عید کا دن تھا لیکن وہ بہت اداس اور ملول تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "مگر رانا صاحب فرماتے ہیں یہ کون سا موقع ہے فلم میں کام مانگنے کا؟" گویا وہ چاہتے ہیں، میں ان سے فلم میں کام کرنے کی بھیک مانگنے کے لیے ان کے پروڈکشن آفس کے چکر لگاؤں، ان سے گڑگڑا کر ان کے گرد جمع درباریوں کے ہجوم میں ان سے درخواست کروں۔

"میں بڑا مجبور ہوں بادشاہ سلامت میرے حال پر رحم کیجیے۔ مجھے اپنی فلم میں چانس دیجیے۔"

کچھ دیر تک وہ ایسے ہی اوٹ پٹانگ قسم کے خیالات کے تھپیڑے میں ہچکولے کھاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت معمول پر آگئی اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "چھوڑ یار سعید خاناں! اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ فلموں میں چانس نہیں ملے گا اداکاری نہیں کر سکوں گا تو کیا فرق پڑے گا؟ وہ جو استاد آزاد کبھی کبھی کہتے تھے کہ گلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا۔ تو ہم جیسے لوگوں کے لیے بھی یہی بہت ہے کہ مولا کریم پیٹ بھر کے دو وقت کی روٹی کھلا دیتا ہے۔"

عید کی چھٹیاں گزر گئیں تو اس کی دکان کھل گئی اور وہ ساری باتیں بھول کر ایک بار پھر اپنے کام دھندوں میں کھو گیا۔ وہ فلموں میں کام کرنے کا خیال اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر نکال دینا چاہتا تھا۔ کسی بے وفا محبوبہ کی یاد کی طرح اس خواہش کو بھی بھلا دینا چاہتا تھا لیکن جس طرح محبوبہ کی یاد آسانی سے بھلائی نہیں جا سکتی، اس کی باتیں اس کی یادیں آتی ہیں تو دل سے ہُوک سی اٹھتی ہے کچھ ایسی ہی کیفیت سعید خان کی بھی تھی۔

ایک دن وہ اپنی دکان پر ایک فلم کے سین پر اس دور کے معروف کامیڈین نذر کا چہرہ بنا رہا تھا تو اس کے دل سے ایک ہُوک سی اٹھی۔

"کاش! میں بھی کبھی ایسا ہی ہنسانے والا اداکار بن جاؤں۔"

"سعید خان! تو پھر بہکنے لگا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ خواہش...... یہ تمنا...... یہ آرزو...... دل سے نکال دے تیرے چہرے مہرے کی طرح تیری قسمت بھی بے ڈھنگی ہے۔ فلموں میں کام کرنے کے بعد نام اور مقام اچھی اور سوہنی تقدیر والے ہی کو ملتے ہیں۔"

"محمد سعید خان کس کا نام ہے؟"

اس آواز پر اس کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ اس نے چونکتے ہوئے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ سوال کرنے والا ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ اس نے گھور کر لڑکے کو دیکھا اور اس کی رگِ شرارت جاگ اٹھی۔ "اگر میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ یہ نام میرا ہے تو تم کیا کر لوگے؟"

لڑکا بھی اس سے کچھ کم شرارتی نہیں تھا۔ اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔ "میں واپس جا کر ایم جے رانا صاحب کو بتا دوں گا۔ آپ کے دیے ہوئے پتے پر محمد سعید خان کے نام کا کوئی آرٹسٹ لڑکا نہیں ہوتا ہے۔"

رانا صاحب کا نام سن کر وہ چونکا اور پھر کچھ سوچ کر ایک دم نرم پڑ گیا۔ بڑے مہذب لہجے میں لڑکے سے پوچھا۔ رانا صاحب نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے، کیا کہہ کر بھیجا ہے؟

لڑکا رانا صاحب کے پروڈکشن میں کام کرتا تھا۔ ایسے لڑکے بڑے چلتے پرزے ہوتے ہیں۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ سعید خان کا اشتیاق دیکھ کر پل بھر میں بھانپ گیا کہ وہ رانا صاحب کا نام سن کر ایک دم ریشہ خطمی کیوں بن گیا؟ اس نے وہاں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "گرمی سے برا حال ہو رہا ہے۔ اتنی دور سے چل کر آرہا ہوں پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے۔ پہلے ذرا پانی تو پلاؤ۔ حلق تر کر لوں تو بتاؤں۔"

لڑکے کو پسیجتا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ خاطر مدارات کرائے بغیر وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے گا۔ لہٰذا اس نے اپنی دکان میں کام کرنے والے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا۔ "چھوٹے! ذرا بھاگ کر ایک ٹھنڈی بوتل تو لے آ۔"

ٹھنڈی بوتل آئی اور رانا صاحب کا پیغام لے کر آنے والا لڑکا مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ جب دو چار گھونٹ لے چکا تو سعید خان نے اسے ٹوکا۔ "پیارے بھائی! تم نے بتایا نہیں۔ رانا صاحب نے کیا پیغام دے کر تمہیں بھیجا ہے؟"

لڑکے نے اب بھی ترنت جواب نہیں دیا۔ مزید دو چار گھونٹ پینے کے بعد بولا۔ "رانا صاحب نے تمہاری دکان کا پتا بتانے کے بعد کہا۔ "وہاں جا کر محمد سعید خان کو کہو مجھ سے مل لے۔"

"اچھا...... ملنے کو کہا ہے؟ کیوں ملنے کو کہا ہے؟ یہ تو تم کو معلوم ہوگا؟"

اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ لڑکے کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ لڑکے نے اس پچویشن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "مجھے کیا پتا کیوں بلایا ہے تمہیں، تم جا کر خود ہی پوچھ لینا۔"

سعید خان کو اس کی بات کا جواب نہیں ملا تو اسے مایوسی ہوئی مگر اس احساس کو دباتے ہوئے بولا۔ "ایسی بات ہے تو چلو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

"ارے یار! تمہیں میری پیٹھ پر سوار ہو کر تو نہیں جانا ہے۔ نہ ہی رانا صاحب نے تمہیں اپنے ساتھ لانے کو کہا ہے۔ مجھے اور بھی کچھ کام ہے، کہیں اور بھی جانا ہے۔ تم کل خود اسٹوڈیو آ کر ان سے ملاقات کر لینا۔"

لڑکا کل جانے کا کہہ کر چلا گیا تو کل کے انتظار میں اس کا ایک ایک پل پہاڑ بن گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ایم جے رانا صاحب نے مجھے اپنی فلم میں چانس دینے ہی کے لیے بلایا ہے۔ اس خیال نے اسے بے حال کر دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت اڑ کر رانا صاحب کے پاس پہنچ جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ رانا صاحب کے موڈ مزاج سے واقف ہو گیا تھا۔ عید کی نماز پڑھ کر اپنے بے لگام شوق کا اظہار کیا تو وہ ایک دم برس پڑے تھے۔ اگر میں کل کی بجائے آج چلا گیا تو کہیں پھر ڈانٹ ڈپٹ شروع نہ کر دیں۔ کہیں اس ناراضی میں یہ نہ کہہ دیں۔ "جاؤ میں تم جیسے غیر مستقل مزاج آدمی کو کوئی کام نہیں دوں گا۔"

اس طرح تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ لہٰذا کھیل کو بگڑنے سے روکنے کے لیے اس نے اپنی بے صبری کو سختی سے روکا۔ اگرچہ یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کے لیے کل تک صبر کرنا کسی عذاب سے کم نہ تھا مگر یہ عذاب اسے بہرحال جھیلنا پڑا۔

اگلے روز وہ خوب بن ٹھن کر فلم اسٹوڈیو پہنچ کر سیدھے رانا صاحب کے پروڈکشن آفس گیا اور انہیں دیکھ کر بڑے مؤدب انداز میں السلام علیکم کہا۔

رانا صاحب نے بڑی شفقت سے اس کے سلام کا جواب دیا اور بولے۔ "لو بھئی سعید خان! میں نے اپنی زیرِ تکمیل فلم "جنتی" میں تمہارے لیے ایک پچویشن نکال ہی لیا ہے۔"

مارے خوشی کے اس کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ اس عالم

میں وہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ کیسی اوندھی سیدھی حرکت کر گیا۔ اس کا اسے احساس نہیں ہوا۔ رانا صاحب اور ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ اس کی اس خوشی اور بوکھلاہٹ سے بہت محظوظ ہوئے۔

ایم جے رانا صاحب نے اپنی جس فلم ''چنی'' میں اسے چانس دیا تھا اس کی کاسٹ میں سدھیر، مسرت نذیر، ظریف، نذر اور ایم اسماعیل کلیدی کردار ادا کر رہے تھے۔

جب سعید خان کو کام کرنے کے لیے سیٹ پر بلایا گیا تو اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ پہلا اور آخری سین ہے جس میں اسے کام کرنے کے لیے سیٹ پر بلایا گیا ہے۔ یہ جان کر اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ''اس ایک انٹری کے سین میں کام دے کر رانا صاحب نے بڑا احسان کر دیا مجھ پر۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا جی چاہا انکار کر دے کہہ دے مجھے اتنا مختصر رول نہیں کرنا مگر جلد ہی وہ اپنا غصہ پی گیا اور اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے سوچا۔ مسجد کے امام صاحب کہتے تھے۔

''جو تھوڑے پر صبر و شکر کرتا ہے اللہ اسے بہت دیتا ہے۔''

میں یہ ایک سین کا کردار ٹھکرا دوں گا تو یہ کفرانِ نعمت ہو گا۔ ایک سین کا رول ہے تو کیا ہوا، ایک بڑے اور مستند ہدایت کار کی فلم تو ہے۔ فلم ہٹ ہو گئی تو میں بھی ہٹ ہو جاؤں گا اور زیادہ اچھے اور بڑے کردار ملنے لگیں گے یہ باتیں سوچ کر اس نے ہنسی خوشی یہ کردار قبول کر لیا۔

اس کا یہ سین اس وقت کے سپر کامیڈین نذر کے ساتھ تھا۔ بڑے اداکاروں کی طرح نذر بھی بڑا اکڑ چڑھا تھا، سیٹ پر کچھ زیادہ ہی ناز نخرے کرتا تھا۔ دوسری طرف یہ نیا ایکسٹرا اداکار کچھ زیادہ ہی اوور اسمارٹ واقع ہوا تھا۔ اس کی حرکتوں سے کئی بار ری ٹیک ہوا تو نذر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے نئے اداکار کو وہ کچھ کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے تھا جب کہ رانا صاحب نے سعید خان کی اوٹ پٹانگ حرکتوں کا بالکل برا نہیں منایا۔ برا منانے کی بجائے اس کی حرکتوں سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے اس ایک سین کے علاوہ اس کے لیے ایک نیا سین بھی بنایا۔

اس نئے سین میں اسے ہوٹل کے بیرے کے روپ میں پیش کیا گیا۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ ظریف ہوٹل میں آتا ہے اور اس بیرے سے پوچھتا ہے۔

''تمہارے ہوٹل میں آج کیا پکا ہے؟''

وہ مختلف ڈشز کے نام گنوا کر آخر میں کہتا ہے۔ ''ماں کی دال اور پیو کی بھاجی بھی تیار ہے۔'' یہ آخری جملہ اسکرپٹ میں موجود نہیں تھا۔ اسے اسی وقت سوجھا تھا اور اس نے بے اختیار اسکرپٹ کے مکالمے میں اسے جوڑ دیا تھا۔ اس کے اس فی البدیہہ جملے کو سب نے پسند کیا اور دل کھول کر اسے داد دی۔

اس منظر کی عکس بندی کے بعد ظریف نے رانا صاحب سے کہا۔ ''رانا صاحب! آپ یہ لڑکا کہاں سے لائے ہیں؟ آپ کی اس دریافت میں تو بڑی صلاحیت ہے بڑا ٹیلنٹ ہے۔''

ظریف اس دور کا ایک بڑا اور وراسٹائل کامیڈی فنکار تھا۔ اس کی ٹکر کا پھر کوئی اداکار پیدا نہیں ہوا۔ مزاجاً گرم تھا لیکن فن کی اہمیت بھی جانتا تھا۔ ایسے فنکار کی زبان سے تعریفی کلمات جب سعید خان نے سنے تو بے حد خوش ہوا۔ اس کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ رانا صاحب نے مسکراتے ہوئے ظریف کو جواب دیا۔ ''بھئی! ہم اچھی فلمیں ہی نہیں بناتے، اچھے ٹیلنٹس بھی روشناس کراتے ہیں۔ آنے والے دنوں کے لیے فلم انڈسٹری کو اچھے اداکار بھی دیتے رہے ہیں۔''

یہ حقیقت ہے کہ ماضی میں ایم جے رانا صاحب کی طرح کئی ایسے فلمساز و ہدایت کار تھے جو لوگوں کے اندر جھانک کر دیکھ لیتے تھے کہ کس میں کتنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ سعید خان جو اس وقت بظاہر ایک اول جلول سا لڑکا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آنے والے دنوں میں وہ پاکستانی فلموں کا ایک سپر کامیڈین ہوگا۔ ایم جے رانا صاحب کی فن شناس نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ آج یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے والا لڑکا مستقبل میں کیا کارنامے انجام دینے والا ہے۔ ان کی فن شناسی کا بین ثبوت تھی۔ ''چنی'' جب مکمل ہونے کے بعد نمائش پذیر ہوئی تو اس سین کو فلم بینوں نے بہت پسند کیا اور نئے ایکسٹرا اداکار کو خوب داد دی۔ فلم بھی بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ جب کہ عوام کے ایک طبقہ کی طرف سے اس فلم پر اعتراض بھی کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نام سے جاٹوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اگرچہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں تھی پھر بھی اس فلم کے تخلیق کاروں نے عوامی تنقید کے بعد اس فلم کا نام تبدیل کر کے ''چنی'' رکھ دیا۔ اس اعتراض یا نام کی تبدیلی سے فلم کی کامیابی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایم جے رانا صاحب کی دوسری فلموں کی طرح اس فلم کو بھی بھرپور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

یہ عجیب اور انوکھی روایت ہے کہ کسی فلم کی کامیابی یا ناکامی کا اثر فلم میں کام کرنے والے تمام افراد پر پڑتا ہے۔ فلم



کامیاب ہوتی ہے تو اس سے تعلق رکھنے والے سارے لوگ کامیاب گردانے جاتے ہیں۔ اسی طرح ناکامی کی صورت میں سب پر ''ناکام'' ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ ''چنی'' سپر ہٹ ہوئی تو اس سے وابستہ لوگوں کی بھی خوب واہ واہ ہوئی۔ سعید خان جیسے نئے ایکسٹرا اداکار کو بھی تماشائیوں نے دل کھول کر داد دی۔ اخباروں میں فلم پر تبصرہ لکھنے والوں نے محض دو سین میں اداکاری کرنے والے سعید خان کا بھی اچھے لفظوں میں ذکر کیا۔ اس پذیرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نئے اداکار کے لیے فلموں کے دروازے کھل گئے۔ دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی اسے ایکسٹرا کے طور پر چھوٹے موٹے کرداروں میں کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ اچھے فلم والے ہمیشہ عوامی پسند ناپسند پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سعید خان کے آئندہ کیریئر پر بھی عوامی پسندیدگی کا خوشگوار اثر پڑا۔ جس حیثیت سے ''چنی'' میں اس کی انٹری ہوئی تھی اسی حیثیت سے اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا۔ وہ خود بھی اس بات پر خوش تھا اور ایک دم کسی بڑے کردار کا متمنی نہیں تھا۔

''سعید خاناں! اگر تو ناشکرا بن کر رانا صاحب کو ٹکا سا جواب دے دیتا کہ میں محض ایک سین کا کردار نہیں کروں گا تو رانا صاحب کی صحت پر یا ان کی فلم پر کون سا اثر پڑ جاتا؟ تو نے امام صاحب کی نصیحت پر عمل کیا۔ صبر و شکر سے کام لیا تو دیکھ اللہ تعالیٰ نے اس کا کتنا خوب صورت انعام دیا ہے۔ فلم ہٹ ہو گئی اور میں بھی ہٹ ہو گیا۔ فلم انڈسٹری میں میری پہچان ہو گئی۔ اب فلم والے مجھے اپنی فلموں میں چھوٹے موٹے کردار دینے لگے ہیں۔''

پہلے کے مقابلے میں اب اس کی سوچ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جب اس کی پہلی فلم ''دشمن'' بری طرح ناکام ہو گئی تھی تو اس وقت اس نے اپنے آپ کو فلم کی ناکامی کا سبب سمجھا تھا۔ اگرچہ اس فلم میں بھی وہ ایک ایکسٹرا اداکار کے طور پر ہی پیش ہوا تھا مگر اس بار ''چنی'' کے ہٹ ہونے کو اس نے اپنا کارنامہ قرار نہیں دیا۔ بس اتنا ہی سمجھا کہ اس نے اپنے کام سے فلمساز و ہدایت کار سے لے کر فلم دیکھنے والوں تک کو مایوس نہیں کیا۔ جتنا میرا کام تھا اتنی ہی مجھے کامیابی حاصل ہوئی اور اس کی وجہ بھی شاید اوپر والے کی نظر عنایت ہے۔ میں نے ایک انٹری کی پیشکش کو ٹھکرا کر جو کفرانِ نعمت نہیں کیا، مولا کریم نے شاید اسی کا پھل دیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی ایک نامور شاعر ہی نہیں ایک معتبر سیاسی لیڈر بھی تھے۔ تحریک آزادی میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انگریزوں نے انہیں جنگِ آزادی میں ایک لیڈر کی حیثیت سے شریک ہونے کے جرم میں قید و بند کی سزا بھی دی۔ سی کلاس کے قیدی کی حیثیت سے ان سے جیل میں چکی بھی پسوائی۔ اس صورتِ حال کے باوجود جیل میں بھی ان کی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس واقعے کو انہوں نے اپنے ایک شعر کی صورت میں بھی بیان کیا ہے جو ایک طرح سے ان کے شعر و سخن سے بے حد لگاؤ کا آئینہ دار بھی ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی<br>
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

سعید خان نے فلموں میں اداکاری شروع کی تو اس کی بھی اس شعر سے ملتی جلتی کیفیت تھی۔ اسے اداکار بننے کا بہت شوق تھا مگر اس شوق کے چکر میں اس نے اپنی دال روٹی کے لیے کی جانے والی مشقت میں کوئی کمی آنے نہیں دی۔ اپنی دکان اور اس کے کام پر آنچ آنے نہیں دی۔ کہتے ہیں کہ دو کشتی میں سوار ہونا آسان کام نہیں ہوتا لیکن اس نے اس مشکل کام کو بھی اپنے حسنِ تدبیر سے برقرار رکھا۔ اپنے شوق کی تکمیل میں اگر وہ اپنی ساری توجہ، سارا وقت گزارتا تو اس کی اچھی خاصی چلتی ہوئی دکان بیٹھ جاتی، اس کا چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ ایکسٹرا اداکاروں کو ان دنوں ملتا ہی کیا تھا؟ بہت قلیل معاوضہ ملتا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ کسی نے دے دیا تو اس کا بڑا احسان، نہ دیا تو کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے اپنے اصل دھندے کو پہلے کی طرح مکمل توجہ کے ساتھ جاری و ساری رکھا۔

فلم والوں سے اس کی جان پہچان پرانی تھی۔ فلم والے اسے ایک اچھے اور کامیاب پینٹر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اس نے اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فلموں کے سیٹ ڈیکوریشن کے لیے تصویریں بنانے کا آرڈر بھی لینا شروع کر دیا۔ سینما ڈیکوریشن کے لیے وہ بینرز کا کام کرتا ہی رہا۔ سب اس کے کام سے مطمئن تھے۔ اس لیے سیٹ ڈیکوریشن کا کام بھی اسے ملنے لگا۔ ان لوگوں میں اس دور کے نامور فلمساز و ہدایت کار اشتفاق ملک بھی تھے۔ انہوں نے بھی سعید خان سے اپنی فلم ''گھر اواغ'' کے لیے تصویریں بنوائیں۔ اس نے بڑی محنت، بڑے لگن اور دلچسپی کے ساتھ کام کیا اور اشتفاق ملک کو بے حد متاثر کیا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اشتفاق ملک نے نوجوان آرٹسٹ سے اس کی بنائی ہوئی تصویروں کا بل مانگا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

"ملک صاحب! میں نے آپ کا کام پیسوں کے لیے نہیں کیا ہے۔"

اشفاق ملک نے اسے گھور کر دیکھا۔ "ارے بھئی! کام تو پیسوں ہی کے لیے کیا جاتا ہے۔" اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ "مگر تم کہہ رہے ہو تم نے پیسوں کے لیے یہ کام نہیں کیا ہے۔"

"جی ہاں! میں نے یہی کہا ہے اور بقائمی ہوش وحواس کہا ہے۔"

"اچھا..... تو پھر یہ بتا دو یہ کام کس لیے کیا ہے؟"

"مجھے پیسے نہیں، کام کے بدلے کام چاہیے۔ میں آپ کی فلم میں کام کرنا چاہتا ہوں، مجھے اپنی فلم میں اداکاری کا موقع دیجیے۔"

اس نے یہ بات اپنے ٹیڑھے میڑھے جسم کو جس طرح حرکت دے کر کہی اشفاق ملک اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اس کی باڈی لینگویج نے انہیں بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی متاثر ہوئے کہ اس لڑکے کو اداکاری کا شوق ہے جبھی وہ اپنی محنت کی مزدوری قربان کرنے پر آمادہ ہے۔ اس کی بات سن کر انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں اپنی فلم میں اداکاری کرنے کا موقع دیں گے لیکن......"

"لیکن کیا؟" ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے وہ قطع کلامی کے انداز میں بول پڑا۔

"لیکن اس صورت میں۔" ملک صاحب نے کہا۔ "جب تم اپنے بل کے پیسے ہم سے لوگے۔"

بڑے آدمی کا دل بھی بڑا ہوتا ہے۔ کردار بھی بلند ہوتا ہے۔ اشفاق ملک بڑے ہدایت کار ہی نہیں بڑے اور اعلیٰ کردار کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے نوجوان آرٹسٹ کو کس خوب صورتی سے اس کے کام کا معاوضہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اب سعید خان کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی ان کی اس محبت اور جذبے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "ملک صاحب! آپ واقعی بہت گریٹ ہیں۔ آپ نے تو مجھے اس طرح مجبور کر دیا۔ اپنی محبت کا گرویدہ بنا لیا کہ......" اس کی آواز اس کے جذبات میں لڑکھڑا کر رہ گئی۔

سعید خان جب بہت بڑا فنکار بن گیا تو اس نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ "اب آپ سے کیا پردہ۔ اشفاق صاحب کا شکریہ ادا کرتے وقت میں نے اپنی اداکاری کا بھی تھوڑا سا جوہر دکھایا تھا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ اداکار کی حیثیت سے کام مانگتے وقت تھوڑی سی اداکاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگلے پر یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس بندے میں کچھ گنس ہیں۔ کوئی خوبی ہے۔ ملک صاحب پر بھی میری اس اداکاری کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔"

اشفاق صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولے۔

"چلو پیسے جیب میں رکھو۔"

سعید خان نے ان کا حکم بجالاتے ہوئے پیسے جیب میں رکھے مگر اس طرح جیسے محض ان کا حکم ماننے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ ملک صاحب نے اس کی فرمانبرداری سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی! ہم اپنی اس فلم "گہرا داغ" میں کوئی موقع نکال لیں گے تمہارے لیے۔"

اور انہوں نے واقعی اس کے لیے اپنے اسکرپٹ رائٹر سے ایک مناسب کردار کا اضافہ کروا لیا جو بہت مختصر بھی نہیں تھا۔ اب تک وہ فلموں میں جو کام کرتا رہا تھا وہ ایک آدھ انٹری سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ ملک صاحب نے اس کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے اس کے موڈ مزاج کے مطابق ایک اچھا کردار لکھوایا جس میں اسے اداکاری کرنے کا بھی مناسب موقع ملا۔ اس نے اپنی دانست میں اس کردار کو نبھانے کے لیے اپنی بھرپور اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ شاٹ لینے سے پہلے جتنا اسے سمجھایا اور بتایا جاتا اس سے کچھ زیادہ ہی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے اندر ابتداء ہی سے فن کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ جس کا اظہار اس سے از خود ہوتا رہتا تھا۔ ملک صاحب کو اس کی یہ بات بھلی لگی کہ وہ اپنے کردار میں زیادہ سے زیادہ جان ڈالنے کے لیے اسکرپٹ کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر اسے اس بات پر روکتے ٹوکتے تو ملک صاحب منع کرتے۔

"ارے بھئی! یہ دیکھو کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ غلط تو نہیں کیا ہے؟ اگر اس نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے منظر میں جان ڈال دی ہے تو یہ اس کی خوبی ہے۔"

"گہرا داغ" بھی ملک صاحب کی دوسری فلموں کی طرح کامیاب ہوئی۔ تماشائیوں نے جہاں اسد جغتائی، نیلو، طالش اور اعجاز درانی کی اداکاری پسند کی اور فلم کی کامیابی میں اشفاق ملک کی بہترین ہدایت کاری کی تعریف کی وہاں نئے کامیڈین کو بھی سب نے پسند کیا۔ دل کھول کر سراہا۔ اخباروں کے تبصروں میں بھی اس نئے اداکار کا ذکر کیا گیا اور لکھا گیا کہ



اشفاق ملک کی نئی دریافت سے مستقبل میں اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ کچھ اخباروں اور تبصرہ نگاروں نے اس کی اوور ایکٹنگ کی طرف بھی اشارہ کیا مگر مجموعی طور پر عوام کی طرف سے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی۔ فلم وہی پسند کی جاتی ہے جس میں عوامی پسند کی چیزیں ہوں۔ اداکار وہی مقبول ہوتے ہیں جنہیں تماشائیوں کی پذیرائی حاصل ہو۔ یہ درست ہے کہ اس نئے کامیڈین نے کوئی اعلیٰ معیار کی کامیڈی پیش نہیں کی تھی۔ بس اس کی عجیب وغریب حرکتوں کی وجہ سے فلم بین خوب جی بھر کے ہنسے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی باڈی لینگویج نے فلم دیکھنے والوں کو کھل کر قہقہے لگانے پر مجبور کیا تھا۔ اس پر اس کے مکالموں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ اسکرپٹ رائٹر کے لکھے ہوئے مکالموں میں اس نے خود ساختہ ٹکڑوں کا تڑکا لگا کر انہیں دو آتشہ بنا دیا تھا وہ بھی فلم بینوں کو محظوظ کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوا تھا۔ ان تمام باتوں نے مل جل کر اس کے مختصر کردار کے باوجود اسے نمایاں کر دیا تھا۔

"گہرا داغ" کے ذریعے وہ فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی نگاہوں میں آ گیا تھا۔ اب اسے فلم سازوں سے خود فلم میں کام کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کرنی پڑتی تھی۔ فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اپنی فلموں میں خود اسے کاسٹ کرنا شروع کر دیا تھا مگر یہ چھوٹے اور ثانوی کردار ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ظریف، نذر اور آصف جاہ وغیرہ کی مقبولیت عروج پر تھی۔

سعید خان کو ان کے بغل بچے کے طور پر سپورٹنگ کامیڈین کی حیثیت سے کاسٹ کیا جانے لگا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا نذر، آصف جاہ اور اے شاد شکار پوری وغیرہ سے تو اچھی کامیڈی میں کر سکتا ہوں مگر ان کو بڑے بڑے کردار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں میں کامیڈین کی حیثیت سے کاسٹ کیا جاتا ہے اور ان سے بدرجہا بہتر کام کرنے والوں کو ان کا بغل بچہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ فلم نگری بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں تو چلتی کا نام گاڑی ہے۔ یہاں سب چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے بستے ہیں۔ اسے ایسی باتوں سے دکھ ہوتا تھا مگر چونکہ وہ ابتداء ہی سے صابر وشاکر طبیعت کا مالک تھا۔ تھوڑے پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔ اس بات کی تربیت کچھ تو اسے اپنے گھر سے حاصل ہوئی تھی اور بہت کچھ مسجد کے امام صاحب کی سرپرستی میں اس نے سیکھا تھا۔ وہ اس کا بہت ہی سخت اور کٹھن دور تھا جب وہ بے یار و مددگار مسجد میں سکونت پذیر تھا۔ جیب میں ایک پیسا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس اللہ کے گھر میں اللہ کے بھروسے پر پڑا رہتا تھا۔ مسجد کے امام صاحب اس کے دکھ اور اس کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا۔ انہوں نے نہ صرف اسے کبھی بھوکا سونے نہیں دیا بلکہ اچھی اچھی باتوں کی تعلیم بھی دی۔ وہ تو اس دور میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا جب کہ امام صاحب نے اسے اس بات کا حوصلہ دیا کہ وہ چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ یہ انہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آج وہ اس مقام پر تھا کہ پینٹنگ کی دکان سے اس کی آمدنی بہت ٹھیک ٹھاک ہو جاتی تھی جب کہ اسے اپنے شوق کی تکمیل کا بھی موقع مل رہا تھا۔ ان باتوں کو سوچ کر وہ اپنے آپ سے کہتا۔ "سعید خاناں! اگر مولا نے ایک انٹری کے کردار سے تجھے چھوٹے موٹے باضابطہ کرداروں تک پہنچایا ہے تو انشاء اللہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب تو مین کامیڈین کی حیثیت سے بھی فلموں میں کاسٹ کیا جائے گا۔ اس کے گھر میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ مجھے میری صلاحیتوں کا پھل ضرور ملے گا اور پھر مجھے ان مختصر کرداروں سے کون سا نقصان پہنچ رہا ہے؟ ان کی آمدنی سے میرے گھر کا چولہا تو نہیں جلتا کہ آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔"

اللہ صبر کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ چھوٹے اور مختصر کرداروں کے باوجود آہستہ آہستہ فلم انڈسٹری میں اس کے پیر جمتے گئے۔ فلم انڈسٹری کے لوگ اسے اچھی طرح جاننے پہچاننے لگے۔ اسے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے تو پہچانتے ہی تھے، اب کامیڈی آرٹسٹ کی حیثیت سے بھی اس کا شمار ہونے لگا۔ سپورٹنگ کامیڈین کی ضرورت پڑتی تو سعید خان کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی۔

ایک دن ظریف کا چہرہ ایک فلمی بینر بناتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ یہ شخص جتنی اچھی اداکاری کرتا ہے اتنا ہی اچھا اس کا نام بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں نام میں کیا رکھا ہے؟ مگر نام میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہوتا ہے۔ اب اس ظریف کو دیکھو۔ کیسا جچتا ہے اس پر جب کہ میرا نام سعید خان ہے۔ یہ بھی کوئی نام ہے؟ پینٹر کی حیثیت سے تو چل سکتا ہے لیکن فلمی اداکار کے طور پر یہ نام کسی طرح نہیں جچتا۔ میں جتنی اچھی اداکاری کرتا ہوں اسی کی مناسبت سے کوئی اچھا سا نام بھی ہونا چاہیے۔ کوئی ایسا نام جو سعید خان جیسے عام ناموں سے بالکل مختلف ہو جسے سنتے ہی طبیعت پھڑک اٹھے۔ تماشائی جس طرح میری اداکاری دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اسی طرح میرا نام سن کر بھی جھوم جائیں۔ ان کی طبیعت میں ترنگ آ جائے۔

اس روز اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ اداکار کی حیثیت سے سعید خان سے پیچھا چھڑائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اچھا اداکار بننے کے لیے ایک اچھا نام بھی ہونا چاہیے۔ بعد میں اس نے یہ سوچنا اور غور و فکر کرنا شروع کردیا کہ اس اچھے سے نام کے لیے کس سے مشورہ کروں؟ میرے جاننے والے لوگوں میں کون ایسا شخص ہے جو اس سلسلے میں میری مدد کرسکتا ہے؟ اسے اپنے ہمدردوں میں بہت سے لوگ یاد آئے مگر اس نے سوچا ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ میرے نام کے سلسلے میں سوچیں، غور و فکر کریں، دوسرے لوگ جن کے پاس کچھ وقت ہوسکتا ہے وہ میری اداکاری کی طرح اس مسئلے کو بھی مسخرہ پن سمجھ کر ٹال دیں گے یا کوئی اونگا بونگا سا نام بتا کر کہیں گے۔ "تم جیسی اداکاری کرتے ہو اس پر یہ نام خوب جچے گا۔"

کئی دنوں تک اس مسئلے پر سوچنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے اچھا مشورہ اگر مجھے کوئی دے سکتا ہے سب سے خوب صورت نام اگر میرے لیے کوئی تجویز کرسکتا ہے تو وہ شخص میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ جس بات کا ارادہ کر لیتا تھا اس سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ "بس میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنا فلمی نام میں خود تلاش کروں گا۔" اسے ایک بار پھر امام صاحب کی نصیحت یاد آئی۔ "بیٹا! ہمیشہ اپنی مدد آپ کیا کرو۔ تم سے اچھا تمہارا کام کوئی اور نہیں کرسکتا۔"

"کیوں نہ میں اس سلسلے میں لغت کا سہارا لوں؟"

اس کے بعد وہ فیروز سنز کی کتابوں کی دکان تک پہنچ گیا اور ان کے فیروز اللغات کے علاوہ کئی اور لغت بھی خرید کر گھر لے آیا اور فرصت کے اوقات میں ان کی ورق گردانی شروع کردی۔ ایک دن، دو دن، تین دن، کئی دن لگ گئے اس کوشش میں ایک سے ایک نام نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر کسی کو پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اچھے نام تو تھے مگر ان میں کوئی انوکھا پن کوئی چونکا دینے والی، طبیعت کو پھڑکانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ نیت درست ہو تو مشکل سے مشکل منزل بھی آسان ہوجاتی ہے۔ اس کی جستجو بھی نیک نیتی پر جاری تھی لہٰذا اس کی مسلسل کوشش اور کاوش کے نتیجے میں آخرکار اسے ایک ایسا نام نظر آیا کہ اس کی طبیعت پھڑک اٹھی۔ "ہاں یہی میرا نام ہونا چاہیے یہ نام اگر مجھے اچھا لگا ہے پسند آیا ہے تو دوسروں کو بھی اچھا لگے گا، پسند آئے گا۔" اور اگلے ہی روز... اس نے اسٹوڈیو پہنچ کر اعلان کردیا۔ "آج سے میرا فلمی نام 'رنگیلا' استعمال کیا جائے۔ اس نام سے مجھے مخاطب کیا جائے۔ یہی نام فلموں کے کریڈٹ میں لکھا جائے۔"

نگار خانے میں جو صحافی نظر آئے ان سے بھی اس نے کہا۔ "آپ لوگ بھی اب میرے ذکر پر میرا نام سعید خان استعمال نہ کریں۔ اب مجھے رنگیلا کے نام سے یاد کریں۔ اپنی خبروں اور فلمی تبصروں میں رنگیلا ہی لکھا کریں۔"

کئی اخباروں میں خبریں بھی چھپ گئیں۔ "سعید خان کامیڈین نے اپنا نام تبدیل کرلیا ہے۔ اس نے اپنا فلمی نام رنگیلا رکھ لیا ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ اب اسے اسی نام سے یاد کیا جائے۔"

جلد ہی یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ عام آدمیوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ اس کا اصلی نام کیا ہے۔ اس نام کی مقبولیت کے ساتھ اس کا یہ خیال اور پختہ ہوگیا کہ نام کا اثر بھی شخصیت پر پڑتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ کام کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اچھے کام کے بغیر کوئی مقبولیت حاصل نہیں کرتا۔ ایسے لوگ جو نام کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں ان کا نام ان کے اچھے کام کی طرح اچھا ہونا چاہیے۔ سوہنا اور پیارا ہونا چاہیے۔

ایک بار...... اس وقت جب وہ بڑا اداکار بن گیا تھا۔ ایک انٹرویو کے دوران اس سے پوچھا گیا۔ "کیا آپ نے دلیپ کمار (یوسف خان) کی پیروی کرتے ہوئے اپنا نام بدلا؟"

"جی نہیں۔" رنگیلا نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "ان کے نام بدلنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس لیے اس دور کے نامور اداکار اشوک کمار کے انداز کا نام دلیپ کمار رکھ لیا۔ الحمدللہ میرے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ بس مجھے ایک اداکار کی حیثیت سے اپنا نام سعید خان کچھ جچا نہیں تھا۔"

اس سے پوچھا گیا۔ "نام بدلنے کا مشورہ کس نے دیا تھا آپ کو؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نام بدلنے کا مشورہ مجھے سعید خان نے ہی دیا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہتا تھا۔ تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے دیوانے کا نام۔"

اس سے دوسرا سوال پوچھا گیا۔ "یوسف خان (دلیپ کمار) کی طرح سعید خان بھی پٹھان ہیں۔ پھر آپ کو سعید خان کہلوانے میں کیا قباحت تھی؟ کیا خرابی محسوس ہوئی؟ جب کہ ان کا کہنا ہے کہ پٹھان سپر سونک قسم کی قوم ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

رنگیلا نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ان



پٹھانوں کے علاوہ بھی بہت سے پٹھان ہیں۔ جن کے لکڑی کی ٹالیں ہیں۔ جو سڑکوں پر ریڑی میں چنے بھونتے ہیں۔ ٹیکسی، ویگن، ٹرک چلاتے ہیں۔ ڈرائیوری اور کنڈیکٹری کرتے ہیں۔ جوتے گانٹھتے ہیں اور ایسی ہی دیگر بہت سی محنت مزدوری کر کے بڑی مشکلوں سے پیٹ پالتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ان سے پتا نہیں چلتا کہ یہ قوم کتنی سپر سونک ہے۔ میرے لیے سعید خان ہونا کوئی فخر کی بات نہیں تھی۔ میرے تماشائی مجھے رنگیلا کے نام سے اور اس کے کام کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ یہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔"

رنگیلا بہت زیادہ لکھا پڑھا نہیں تھا لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھا تھا حاصل کیا تھا۔ ان کی ہر اچھی بات یاد رکھتا تھا۔ ان پر عمل کرتا تھا جب کہ اس کے اندر ابتداء ہی سے ایک فنکار موجود تھا جو وقت کی آنچ میں آہستہ آہستہ کندن بنتا رہا۔ یہ شعر اس پر مکمل طور پر صادق آتا تھا۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

وہ ایک دم بڑا اداکار نہیں بن گیا تھا، جس طرح اپنی پہلی فلم ہی سے کچھ لوگ کامیاب اداکار بن جاتے ہیں، شہرت اور مقبولیت کے عروج پر پہنچ جاتے ہیں، جیسا ندیم کے ساتھ، ریما کے ساتھ اور شان کے ساتھ ہوا۔ اس کی پہلی فلم "دشمن" نہ صرف بری طرح ناکام ہوگئی بلکہ اس نے اداکاری کو بھاری پتھر سمجھ کر اس سے توبہ کرلی تھی۔ پھر ایک لمبے عرصے کے بعد دوبارہ اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہوا۔ یوں کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ اس عروج کی منزل پر ایک ایک قدم چل کر پہنچا تھا۔

جب وہ باضابطہ کامیڈین کی حیثیت سے فلموں میں پیش کیا جانے لگا۔ وہ دور اس کے لیے بہت سخت بہت دشوار گزار تھا۔ ان دنوں منور ظریف، لہری، ننھا اور علی اعجاز جیسے ورسٹائل کامیڈینز کی موجودگی میں اس کے لیے اپنا تشخص برقرار رکھنا بہت بڑی بات تھی۔ یہ ایسے مزاحیہ فنکار تھے جن کی کامیڈی کا ایک معیار تھا۔ ایک وقار تھا جب کہ رنگیلا کی کامیڈی بالکل مختلف اور جداگانہ انداز کی تھی۔ اسکرین پر نمودار ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص خدوخال اور جسمانی جنبش (باڈی لینگویج) کے ذریعے فلم بینوں کے سنجیدہ اور اداس چہروں پر خوشیاں بکھیر دینے پر دسترس رکھتا تھا۔ یہی اس کے مزاح یا اداکاری کے اسلوب کی انفرادیت تھی۔ اسی بات نے اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا تھا۔ ہر قسم کے کامیڈینز کی موجودگی میں اپنا مقام بنا لیا تھا اور اپنے چاہنے والوں اور پرستاروں میں اضافہ کرتا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ناقدین اور مبصرین کا ایک طبقہ اس کی اداکاری کو بڑی سنجیدگی سے اوور ایکٹنگ قرار دیتا تھا۔ اسے گھٹیا مزاح قرار دیتا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں۔ "جسے پیا چاہے وہی سہاگن" تو کچھ ایسی ہی بات تھی کہ اس کی عوامی مقبولیت اور پسندیدگی نے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو مجبور کر رکھا تھا کہ اپنی فلموں کی کامیابی کے لیے رنگیلا ہی کو کاسٹ کریں۔ اپنی فلموں میں اس کی موجودگی کو وہ یونہی ضروری عنصر نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکرین پر اس کی انٹری کے ساتھ ہی تماشائیوں پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر وہ لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ بچے اور ناپختہ ذہن کے نوجوان ہی نہیں، پختہ عمر کے سنجیدہ افراد بھی اپنی بے ساختہ ہنسی کو روک نہیں سکتے تھے۔ تماشائیوں کا بہت بڑا طبقہ فلموں کی کاسٹ میں رنگیلا کا نام دیکھ کر ہی فلم دیکھنے کا ارادہ کر لیتا تھا۔

اپنی چالیس سالہ فنی زندگی میں اس نے سنجیدہ اداکاری بھی کی مگر اسے وہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو اس کے مخصوص مزاح کی وجہ سے اسے حاصل تھی۔ اس کی وہ اداکاری جس پر اوور ایکٹنگ کا لیبل لگا ہوا تھا وہی اس کی شناخت بنی رہی۔ اس کے چاہنے والوں اور پرستاروں نے اسے کامیڈین کی جگہ سیریس ہیرو کے روپ میں زیادہ پسند نہیں کیا۔

اپنی اس کامیابی کے بارے میں اس نے ہمیشہ یہی کہا۔ "یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا اگر رب العزت مجھ پر مہربان نہ ہوتا، مجھ کو اپنی نوازشوں سے نہیں نوازتا تو میں ہرگز اس مقام تک نہیں پہنچتا۔" وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے کہتا تھا۔ "میں کیا تھا مگر میرے اللہ نے مجھے کیا بنادیا۔"

جب اس سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ دور افق کی طرف دیکھتے ہوئے یادوں کی پگڈنڈیوں میں کھو جاتا۔ اس کی آواز یوں سنائی دیتی جیسے وہ کہیں بہت دور کھڑے ہو کر بول رہا ہو۔

"میں افغانستان کے ایک دور افتادہ چھوٹے سے علاقہ ننگرہار کے ایک انتہائی غریب اور پس ماندہ خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ میری پرورش سنگلاخ پہاڑوں میں ہوئی۔ جہاں فن اور فنکار کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ میرے والد ننگرہار کی ایک مسجد میں امام تھے۔ اس سے پہلے وہ فوج میں رہ چکے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے جوشیلے تھے۔ ان کے خون میں بڑی گرمی تھی۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی یہ گرمی اور سرگرمی

برقرار رہی۔ اپنے مزاج کی گرمی کی وجہ سے وہ ہر ایک سے ذرا ذرا سی بات پر الجھ پڑتے تھے۔ اگلا کمزور ہوتا تو بات آگے نہیں بڑھتی۔ سوا سیر ہوتا تو وہ بھی لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔ ان کی اس عادت اور رویے کی وجہ سے ہمارے دشمنوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ انہی دشمنوں کی وجہ سے میرا بڑا بھائی بھی قتل ہو گیا۔ اس قتل کے بعد دشمنی کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ بابا کے سر پر ہر وقت بیٹے کا انتقام لینے کا بھوت سوار رہنے لگا۔ ہمارے دشمن بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ ہر وقت اس بات کے لیے تیار رہتے تھے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کی گئی تو ہم اس کا بھرپور جواب دیں گے۔ ہماری زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم سب کی جانوں کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ یہ دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ قبائلی دستور کے مطابق یا تو ہم زندہ رہتے یا ہمارے دشمن۔

حالات جب انتہائی سنگین ہو گئے تو ماں اس بات پر بضد ہو گئی۔ ''ہمیں اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں بچانے کے لیے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیے۔''

مگر بابا اس بات کو بزدلی قرار دیتے تھے۔ ''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں سے کہیں بھاگ جائیں۔ ہمارے دشمن تو یہی کہیں گے۔ 'بزدل کہیں کے، ڈر کر بھاگ گئے۔' میں اپنا مذاق اڑانا نہیں چاہتا۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے بیٹے کا انتقام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ میں یہاں سے اس وقت تک کہیں نہیں جاؤں گا جب تک میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو جائے گی۔''

''ماں تو عورت تھی۔ بیوی تھی۔ شوہر بیویوں کی باتوں پر کب چلتے ہیں، کب ان کی بات مانتے ہیں جب کہ میرا بابا تو اڑیل ٹٹو تھا۔ انتہائی گرم مزاج شوہر۔ وہ بھلا بیوی کے مشورے پر کیسے عمل کرتا؟ ماں سے بہتر اس کو کون سمجھتا تھا مگر آخر وہ ماں تھی۔ اپنے ایک بیٹے کو ان کی ضد پر قربان کر چکی تھی اب اس میں اپنی اولادوں کی مزید قربانی دینے کی سکت نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ہر حال میں یہاں سے چلے جانے ہی کا ارادہ کر لیا مگر یہ کام اس کی مرضی اس کی رضا سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ بچوں کا باپ میری کسی صورت نہیں مانے گا لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ اگر میں خاندان کے بڑوں، بزرگوں سے ان پر دباؤ ڈلواؤں ان کو مجبور کرواؤں تو عین ممکن ہے وہ ان کی بات مان جائیں۔ اس دور میں بزرگوں کو آج کی طرح بے توقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹے اپنے بڑوں کا بہت عزت و احترام کرتے تھے۔ بچے ہی نہیں، پختہ عمر کے لوگ اور بوڑھے بھی اپنے سے بڑوں سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کرتے تھے یہی بات تھی کہ قبائلی نظام میں جرگے کا سسٹم تھا۔ جرگہ جو فیصلہ کر دیتا تھا اسے ماننا لازمی ہو جاتا تھا۔ ماں نے اس مسئلے پر جرگے سے مدد نہیں لی۔ اپنے خاندان کے بزرگوں سے مل کر ان سے درخواست کی۔ ''آپ لوگ اگر ان سے مل کر اس مسئلے پر بات کریں اور ان پر دباؤ ڈالیں کہ مزید خون خرابے سے بہتر ہے کہ اپنے بال بچوں کو لے کر اور کہیں چلے جاؤ۔''

''بیٹا! یہ بات تو تم بھی اسے سمجھا سکتی ہو۔ آخر تم اس کی بیوی ہو۔''

''بزرگو! شوہر بیویوں کی باتوں کو کب اہمیت دیتے ہیں؟ میں تو انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئی۔ انہیں کس کس طرح سمجھایا کہ تم میرے ایک بیٹے کو اپنی دشمنی کی بھینٹ چڑھا چکے۔ اب اپنے بچوں کی میں مزید قربانی نہیں دے سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں کی رہائش ہی ترک کر دو۔ نہ یہاں رہو گے نہ دشمنی کی آگ بھڑکے گی۔ مگر ان کے سر پر تو انتقام کا بھوت سوار ہے۔ کہتے ہیں بس اپنے بیٹے کے خون کا انتقام لیے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ ان کی ضد ہی کی وجہ سے تو آپ لوگوں سے درخواست کی ہے۔''

خاندان کے بزرگوں نے بابا کو بلا کر سمجھایا۔ ''آخر تم کب تک اپنے دشمنوں میں اضافہ کرتے رہو گے؟ بہتر یہی ہے کہ اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے کہیں چلے جاؤ۔''

چند لمحوں تک بابا سر جھکائے سوچتے رہے پھر نہایت احترام سے بولے۔ ''اگر یہ آپ لوگوں کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، میں کہیں چلا جاؤں گا مگر بس اتنی مہلت مجھے دے دیجیے کہ میں اپنے بیٹے کا انتقام لے لوں۔''

''ہم لوگ تو تمہیں بہت سوجھ بوجھ کا بندہ سمجھتے ہیں۔ پھر تم احمقوں جیسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمنوں کا ایک بندہ مار دو گے تو کیا وہ خاموش بیٹھے رہیں گے کیا وہ تمہارے دو بندے نہیں ماریں گے؟ اس طرح تو تم اپنے پورے خاندان کو اپنی دشمنی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔''

بابا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ بات غلط بھی نہیں۔ میں انتقام لوں گا تو دشمن بھی انتقام لیں گے اس طرح تو یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ دونوں طرف کے لوگ مرتے رہیں گے۔ انہیں سوچتا ہوا دیکھ کر ایک اور بزرگ بولے۔

''تم تو مسجد کے امام ہو۔ قرآن پاک کی آیتیں نماز میں پڑھتے ہو۔ لوگوں کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام پر چلنے کی



تلقین کرتے ہو۔'' اس کے بعد انہوں نے سورہ آلِ عمران کی ایک آیت پڑھی اور پھر اس کا ترجمہ کیا۔ ''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔''

بزرگوار کی زبانی کلام اللہ کی یہ بات بابا کے دل کو لگی۔ دوسرے بزرگ نے ان کی بات کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے کہا۔ ''ارشادِ نبویؐ بھی ہے۔ جس نے غصہ روک لیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنے عذاب روک لیتا ہے اور جو اپنی زبان کو قابو میں رکھتا ہے۔ اللہ اس کے عیوب کو چھپا لیتا ہے۔''

بابا کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بزرگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتیں اس انداز میں سمجھائی تھیں کہ وہ قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''اب بتاؤ کیا سوچا ہے؟ کیا ارادہ کیا ہے؟ اپنے انتقام کی آگ بجھاؤ گے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان پر عمل کرو گے؟'' یہ بات ایک تیسرے بزرگوار نے پوچھی۔

بابا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ بزرگوں کی طرف دیکھا اور نہایت احترام سے کہا۔ ''آپ لوگ جیسا کہیں گے جو حکم دیں گے ویسا ہی کروں گا۔''

''یہ ساری باتیں بہت بعد میں انہوں نے ماں کو بتائیں۔ ماں سے ہم بھائی بہنوں کو معلوم ہوئیں۔ ماں کہتی تھیں۔ ''تمہارے بابا کی باتیں سن کر میں مسکرا کر رہ گئی۔ ان کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے ہی تو بزرگوں کو تمہیں سمجھانے کو کہا تھا۔ میرے ہی ایما پر انہوں نے تمہیں قائل کیا تھا۔''

قصہ مختصر یہ کہ بزرگوں کی محفل سے اٹھ کر جب بابا گھر آئے تو ماں سے بولے۔ ''تم کہتی ہو نا کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔''

''ہاں۔''

تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری بات بھی مان لینی چاہیے۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کہ......''

ماں نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی! مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟'' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے تو صبر کر لیا تھا کہ تم اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے چکر میں میری اولادوں کے دشمن بن گئے ہو تو یہی سہی۔ شاید یہی میرا مقدر ہے کہ میں جیتے جی مر جاؤں۔''

''تمہیں اسی دکھ سے بچانے کے لیے تو میں نے اپنے دشمن کو معاف کر دیا ہے۔ اپنا غصہ تھوک دیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا بھی یہی فرمان ہے کہ دشمن کو معاف کر دو۔''

وہ آخر میری ماں تھیں۔ مستقبل کے ایک بڑے اداکار کی ماں۔ لہٰذا انہیں بھی تھوڑی سی اداکاری کرنی چاہیے تھی۔ بابا کو میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''تم کتنے اچھے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم نے میری بات مان لی ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟''

''نہیں......تم خواب نہیں دیکھ رہی ہو۔ جاگ رہی ہو۔ بس اب چلنے کی تیاری کرو مگر بڑی خاموشی کے ساتھ۔ کسی دن ہم چپکے سے یہاں سے چل دیں گے۔''

میری ماں بھی میری طرح بڑی انمول تھی۔ اس نے بابا کو اپنی کوششوں اور کاوشوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ہم جب بڑے ہوئے سمجھدار ہوئے تو پشاور میں اس نے یہ ساری باتیں یہ ساری داستان ہمیں سنائی۔ جب بھی ماضی کی بات نکلتی ماں خوب مزے لے لے کر یہ قصہ سناتی۔

''ہم ننگرہار سے پشاور کیسے پہنچے۔'' اپنی داستان سناتے ہوئے رنگیلا نے بتایا۔ ''یہ کوئی رنگین نہیں۔ بڑی سنگین کہانی ہے۔ بہت دکھ بھری کہانی ہے۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا۔ بہت چھوٹا مگر مجھے بھی اس سفر کی یاد آتی ہے تو خدا یاد آ جاتا ہے۔ بابا نے جیسا کہ ماں سے کہا تھا۔ ایک دن چپکے سے بال بچوں کو ساتھ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ بس اتنا ہی اپنے ساتھ سامان لیا جو ان کے قافلے کے لوگ اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ جان بچانے کے لیے اپنے آبائی وطن کو چھوڑنا، سنت نبویؐ بھی ہے۔ بابا نے بھی سنت نبویؐ کی ادائیگی ہی کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ہجرت کی تھی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان دنوں بابا ایک مسجد میں امامت کرتے تھے۔ ان کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ کوئی ملازمت نہیں تھی۔ آج کل بڑے شہروں کی مسجدوں میں جس طرح امام مسجد اور مؤذن تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ ہمارے پس ماندہ علاقے ننگرہار میں ایسا کوئی تنخواہ دار امام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے بابا کے وسائل ایسے نہیں تھے کہ وہ اس ہجرت کے لیے کسی سواری کا بندوبست کرتے انہوں نے ماں سے کہا۔

''ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہوگا۔''

ماں بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کے لیے آگ کے دریا میں بھی کودنے سے گریز نہیں کرتی۔ بولی۔ ''ہاں مجھے پتا ہے۔ ہم کسی گاڑی گھوڑے پر سفر نہیں کر سکتے۔ پیدل سفر کریں گے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کسی سواری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

''ایسی بات نہ سوچو۔ تم نے اس ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

بھی تمہارا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔"

"تم بڑی حوصلہ مند عورت ہو۔"

"تمہارے بچوں کی ماں ہوں اور ہر ماں کا حوصلہ اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ بلند رہتا ہے۔"

ذرا سوچیے...... گرم اور سنگلاخ علاقے میں پیدل سفر اور وہ بھی بچوں کے ساتھ۔ سب کے ہاتھ میں کوئی سامان۔ ہمارے لیے یہ آگ کا دریا ہی تھا جسے ہم نے تیر کر پار کیا۔ میں الفاظ میں اس سفر کی روداد بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے خود بھی اس کا تجربہ ہوا تھا مگر ماں جب یہ داستان سناتی تھی تو اس کی باتوں سے ہمیں زیادہ بہتر طور پر پتا چلتا تھا کہ یہ سفر کتنا تکلیف دہ کس قدر مشکل اور خطرناک تھا۔ کئی دنوں تک ہم مسلسل چلتے رہے۔ تھوڑی دیر رک کر آرام کرنے کے بعد نئے عزم سے سفر شروع کر دیتے۔ وہ جو ایک غزل کسی نے گائی ہے۔ "چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ۔" اس میں بیان کی گئی کیفیت کا اندازہ ہر کوئی اس طرح نہیں لگا سکتا جس طرح ہم لگا سکتے ہیں۔ ہم بچے تھوڑے سفر کے بعد ماں سے پوچھتے۔ "ماں! ہمیں اور کتنا چلنا پڑے گا؟ ہمارا سفر کب ختم ہوگا؟"

ماں بڑے پیار سے لیکن بڑے عزم کے ساتھ کہتی۔ "بس اب تھوڑا سا ہی سفر باقی رہ گیا ہے۔ ہم خاصی مسافت طے کر چکے ہیں۔ چلتے رہو۔ آہستہ آہستہ باقی سفر بھی کٹ جائے گا۔ ہماری منزل آ جائے گی۔"

آفرین ہے اس ماں پر جو خود بھی تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود تھک کر حوصلہ نہیں ہاری۔ بابا کے اندر تو ایک جنگجو سپاہی کا حوصلہ موجود تھا۔ اس لیے وہ اتنے شکستہ نہیں ہوئے تھے۔ جتنا ہم پر اس سفر کا اثر ہوا تھا۔ بہرحال ہم منزل تک پہنچنے کی اُمید میں گرتے پڑتے چلتے رہے۔ آگے بڑھتے رہے اور آخر۔ ہماری منزل آ گئی۔ ہم پہاڑوں ریگستانوں اور سنسان علاقوں کا سفر کر کے پشاور پہنچ گئے۔ ماں بتاتی ہے۔ "ہم بالکل بے سروسامانی کی حالت میں افغانستان سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل نئی جگہ تھی۔ یہاں کا ماحول نیا تھا۔ یہاں کے حالات مختلف تھے۔ کوئی اپنا کوئی عزیز و اقارب۔ کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ یہاں ہمیں بالکل نئے سرے سے زندگی شروع کرنی تھی۔ یہ بات ہمارے لیے یقیناً پریشان کن تھی۔ اس کے باوجود میں بہت مطمئن تھی۔ بہت خوش تھی کہ مولا کریم نے ہمارے دشمنوں کے نرغے سے ہمیں نکال دیا۔ ہمارے معصوم بچوں کو بے گناہ مارے جانے سے بچا لیا اور ایک محفوظ جگہ پہنچا دیا۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکر ادا کیا۔ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی دل ہی دل میں سجدہ ریز ہو گئی تھی۔ بعد میں جب سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا ملا تو ہر نماز کے بعد شکرانے کی دو نفل ضرور پڑھتی۔"

یہ تو ماں کے تاثرات تھے جو اس نے ہمارے بڑے ہونے پر سمجھدار ہونے کے بعد ہم کو بتائے تھے۔ اس ضمن میں میرا اپنا ذاتی تاثر بڑا عجیب و غریب تھا۔ میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ پشاور آنے کے بعد میں نے پہلی بار سڑکوں پر بسوں، ٹرکوں اور دیگر گاڑیوں کو بھاگتے دیکھا تو ڈر گیا اور سوچنے لگا۔ "یا الٰہی! یہ کیسی مخلوق ہے جو دھواں اڑاتے ہوئے بھاگتی پھرتی ہے۔"

پشاور کی دنیا میرے لیے ننگرہار سے بالکل مختلف تھی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ بالکل پس ماندہ علاقہ تھا۔ وہاں بھی کچھ گاڑی گھوڑے ہوں گے مگر میں نے ایسی کوئی چیز اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی تھی۔ ایک تو ہم لوگ ایک ایسے علاقے میں رہتے تھے جہاں ترقی کی کوئی روشنی نہیں پہنچی تھی۔ دوسرے میں بہت چھوٹا تھا۔ میری نگاہوں سے کبھی کوئی بس ٹرک یا ویگن وغیرہ نہیں گزری تھی۔ ایک دن میں نے اپنی عمر کے ایک لڑکے سے پوچھا۔ "یہ کیسا جانور ہے جو سڑکوں پر دھواں چھوڑتے ہوئے بھاگتا پھرتا ہے؟"

لڑکے نے سر سے پیر تک مجھے گھور کر دیکھا پھر بولا۔ "پینڈو! تو کہاں سے آیا ہے؟ یہ جانور نہیں گاڑیاں ہیں۔ پٹرول اور ڈیزل سے چلتی ہیں اور سواری کے کام آتی ہیں۔"

میری سمجھ میں بس یہی بات آئی۔ "تو کہاں سے آیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"میں ننگرہار سے آیا ہوں۔ ہمارے ہاں تو گھوڑے اور گدھے سواری کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔"

بعد میں اس لڑکے کی بات میری سمجھ میں آہستہ آہستہ آ گئی۔ اب میں گاؤں دیہات کا پینڈو نہیں تھا۔ پشاور کی ترقی کی روشنی نے آہستہ آہستہ میری سمجھ اور سوچ و فکر میں شدھ بدھ پیدا کر دی تھی۔ میرے ذہن کو بھی روشن کرنا شروع کر دیا تھا۔

پشاور میں کچھ دنوں تک رہنے کے بعد ہم لوگ کرم ایجنسی چلے گئے۔ شاید بابا کو وہاں اپنے بہتر مستقبل کی کوئی آس نظر آئی تھی۔ لہٰذا اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر وہاں منتقل ہو گئے۔ وہیں میں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مدرسے کی بھی اور اسکول کی بھی مگر وہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بابا ہم سب کو اپنے ساتھ لے کر پشاور واپس آ گئے۔ کیوں؟ اس واپسی کی کیا وجہ تھی؟ اپنی نوعمری کی وجہ سے مجھے یہ جاننے میں کوئی



دلچسپی نہیں تھی۔ اس بات کی مجھے کچھ خوشی ہی ہوئی تھی کیونکہ کرم ایجنسی سے زیادہ مجھے پشاور پسند تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ بابا کی واپسی کی کیا وجہ ہو سکتی تھی تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو اُمید لے کر وہ وہاں گئے تھے شاید وہ پوری نہیں ہو سکی ہوگی یا پھر اپنے اور بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے انہیں پشاور ہی مناسب محسوس ہوا ہوگا۔ یہاں واپس آ کر وہ کمبر مرچنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔

رنگیلا اپنے ماضی کی کہانی سناتے ہوئے کہتا تھا۔ "یہ مجھ پر میرے اللہ کا کرم نہیں تو اور کیا ہے کہ مجھ جیسا نہایت پس ماندہ علاقے کا پینڈو فن اور آرٹسٹ کی دنیا میں اس مقام کو پہنچ گیا۔"

اس کی یہ بات درست بھی کہ اللہ کی نظر کرم اس پر ہمیشہ رہی کیونکہ جب رب راضی ہوتا ہے تب ہی سب راضی ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی فرمانِ خداوندی ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ایکسٹرا کے طور پر اپنی اداکارانہ زندگی کا آغاز کیا اور کامیڈی کنگ بن گیا۔ فلموں کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ وہ جو اس نے کبھی خواب دیکھا تھا تمنا کی تھی کہ میں بھی کامیڈین کا کردار کروں۔ مجھے بھی کلیدی کرداروں میں شمار کیا جائے۔ فلموں کے اشتہاروں، سینما گھروں کے ہورڈنگز اور سڑکوں پر لگائے جانے والے بینرز میں نمایاں طور پر پیش کیا جائے۔ ایسا ہی ہونے لگا۔ فلموں کی پبلسٹی میں اس کا مکھڑا خصوصی طور پر پیش کیا جانے لگا۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا۔ یہاں تک پہنچنے کا اس کا سفر بہت صبر آزما تھا۔ فلم نگری کی کچھ اپنی روایت ہوتی ہیں۔ دستور ہوتے ہیں۔ اس سے وابستہ افراد کے رویے ہوتے ہیں۔ فلم والے عام طور پر دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا ترقی کرتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مگر سب لوگ ایسے نہیں ہوتے کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں جو کمزور لوگوں کو سہارا دے کر آگے بڑھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ رنگیلا کے ابتدائی دور میں بھی متعدد فلم والوں نے ایسا ہی کیا۔ جہاں تک جس سے ممکن ہوا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ فلم انڈسٹری میں اس کے آگے پیچھے کوئی ہمدرد، کوئی سپورٹر، کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ کوئی حمایت میں بولنے والا نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو اس کے ساتھ اپنا تمسخر اڑانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب رنگیلا انتہائی جدوجہد کے بعد فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ قدرت اس پر مہربان تھی اس لیے وہ نامہربان فلم والوں کے سلوک سے دل برداشتہ نہیں تھا۔ اپنے آپ کو نامہربانوں کی نامہربانی سے بچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرتا رہتا تھا۔ وہ بظاہر سیدھا سادا اور بے وقوف سا ایک پینڈو نظر آتا تھا لیکن حقیقتاً نہ وہ اتنا بھولا بھالا تھا نہ اتنا بدھو تھا جتنا لوگ اس کے بارے میں تصور کرتے تھے۔

اداکاری کی آمدنی پر اس کا انحصار نہیں تھا۔ روزی روٹی کے لیے اس کی پینٹنگ کی دکان چل رہی تھی۔ اس لیے اس کی صحت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا تھا۔ اسے جو کردار بھی ملتا اپنی دانست میں اسے وہ زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ پیدائشی جینئس تھا۔ اپنی ابتدا ہی سے بہت ذہین اور فطین تھا۔ اس کی یہی ذہانت تھی جس کے سہارے وہ معمولی اور عام سے کرداروں کو بھی اس انداز میں پیش کرتا تھا کہ وہ غیر معمولی حیثیت کے ہو جاتے تھے۔ انہیں دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اسی طرح وہ مشکل سے مشکل کام کو بھی ذرا سی جدوجہد اور محنت سے آسانی سے کر گزرتا تھا۔ وہ لوگ جو اسے محض پریشان کرنے کے لیے اسے نیچا دکھانے کے لیے اس کے خلاف کوئی درپردہ سازش کرتے تھے۔ کامیاب نہیں ہوتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ جن حالات کا مجھے سامنا ہے ان میں ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچنا میرے لیے دشوار سے دشوار تر ہوتا جائے گا۔ مجھے اگر یہاں رہنا ہے آگے بڑھنا ہے، ترقی کرنا ہے تو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ہوگا۔ فلم والے اگر اس وقت مجھے چھوٹا موٹا کردار دے رہے ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے کیونکہ مجھے فلم دیکھنے والے پسند کرنے لگے ہیں لیکن ان کے رحم و کرم پر میں وہ ترقی نہیں کر سکتا جو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت آگے بڑھنا ہے جب کہ فلم والے میری طبیعت کے مطابق مجھے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ اس کے لیے مجھے اپنی اور صرف اپنی کوشش کرنی پڑے گی، اسے امام مسجد کی بات یاد آ گئی۔

"تمہارے لیے تم سے بہتر کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جو خود اپنے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔"

یہ اور ایسی ہی باتیں وہ کچھ دنوں تک سوچتا رہا اور اس کا عزم و ارادہ پختہ ہوتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے خود ایک فلم بنانی چاہیے۔ ایک ایسی فلم جس میں وہ خود کو بھرپور طریقے پر پروجیکٹ کر سکے۔ اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکے۔

فلم بنانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس حقیقت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں بڑا

سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے۔ تجربے کی وسعت اور مزاج کی پختگی بھی ضروری ہوتی ہے چونکہ اب تک اس نے فلم انڈسٹری کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور فلم سازی کے معاملات پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے تمام نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے یہ مشکل اور بھاری ذمہ داری نبھانے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ ''چاہے کچھ بھی ہوجائے مجھے یہ کام کرنا ہے۔ مجھے ہر حال میں اپنی فلم بنانی ہوگی۔'' اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنے آپ سے کہا۔ ''اس پار یا اس پار۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ فلم ناکام ہوجائے گی۔ میری جمع پونجی ڈوب جائے گی اگر ایسا ہوا تو اسے بھی میں گھاٹے کا سودا نہیں سمجھوں گا۔ اس ناکامی سے بھی مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

اور پھر ایک دن اخباروں میں خبر چھپ گئی۔ ''نیا کامیڈین رنگیلا بھی فلم سازی کے میدان میں کود پڑا۔''

اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ حسب روایت کچھ فلم والوں کا ہاضمہ خراب ہوگیا اور ان سے پریشانی اور حیرانی کا مظاہرہ ہونے لگا اور تو وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے کہ یہ رنگیلا کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔ ہاں وہ جو کرسکتے تھے انہوں نے خوب جی بھر کر کیا۔ ''لو بھئی! اب فلم انڈسٹری کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اب رنگیلا جیسے بھی فلم بنائیں گے تو......''

''چیونٹی کے جب برے دن آتے ہیں تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔ اونچی اڑان اڑنے کی بے وقوفی میں یہ الو کی دم بھی اپنا خانہ خراب کرلے گا۔''

ایسے لوگ نگار خانے میں جہاں دو چار اکٹھے ہوتے، ایسی باتیں کرکے رنگیلا کا خوب جی بھر کر مذاق اڑاتے۔ ایسی باتیں اس لیے کی جاتی تھیں کہ اس کی بازگشت رنگیلا کے کانوں تک پہنچ جائے اور اسے دکھ پہنچے وہ گھبرا جائے پریشان ہوجائے اور یہ ارادہ بدل دے۔ شاید لاشعوری طور پر انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ جس طرح اپنی اوٹ پٹانگ کامیڈی کے باوجود عوامی مقبولیت حاصل کرتا جارہا ہے کہیں اپنی فلم بنا کر بھی اپنی کوشش میں وہ کامیاب نہ ہوجائے۔

حاسدوں اور بدخواہوں کی یہ باتیں ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں تھیں۔ نہ ہی انہوں نے اس مقصد سے کہی تھیں۔ رنگیلا تک یہ باتیں پہنچیں تو اسے واقعی دکھ ہوا مگر حسب عادت وہ مسکرا دیا اور اپنے آپ سے کہا۔ ''رنگیلا تو بھی کتنا بھولا ہے۔ ارے پگلے جس برتن میں جو ہوتا ہے وہی اس سے برآمد ہوتا ہے نا۔ اگر تو نے یہ سوچا تھا سمجھا تھا کہ کچھ لوگ تیری مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے تیری رہنمائی کے لیے اپنی خدمات پیش کریں گے تجھ سے آکر کہیں گے کہ رنگیلے گھبرانے کی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہم ہیں ناں جب بھی تجھے ہماری ضرورت ہو ہمیں آواز دینا۔ اگر تو نے ایسا سوچا تھا ایسا خیال کیا تھا تو یہ تیری بھول تھی۔ سراسر غلطی تھی۔ تیرے نامہربان ساتھیوں نے وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر دکھ کس بات کا؟ یہ لوگ تیرا مذاق شاید اس لیے اڑا رہے ہیں کہ تو اپنا ارادہ بدل دے۔ فلم بنانے کا خیال دل سے نکال دے۔''

''اچھا..... اگر ایسی بات ہے۔'' اس نے اپنی بات کا جواب اپنے آپ کو دیتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو میں فلم ضرور بناؤں گا۔ ہر حال میں اور ہر صورت میں بناؤں گا بلکہ جلنے والوں کو مزید جلانے کے لیے اس کی ہدایت کاری بھی خود ہی کروں گا۔''

اور پھر اخباروں میں یہ خبر بھی نمایاں طور پر شائع ہوگئی۔ ''رنگیلا اپنی ذاتی فلم خود ڈائریکٹ کرے گا۔''

جلنے والے اور جل بھن کر کباب ہوگئے۔ ان کی افواہوں میں اور تیزی آگئی۔ ان کے قہقہے اور بلند ہوگئے اور وہ شدومد کے ساتھ رنگیلا کا مذاق اڑانے لگے۔

''بھئی اس فلم کا جنازہ وی وی آئی پی انداز میں بڑی دھوم دھام سے نکلے گا۔''

اخبار والوں کے مزے آگئے۔ انہیں تو ایسی چٹ پٹی اور مرچ مصالحہ لگی خبروں کی تلاش رہتی ہے۔ مختلف حوالوں سے رنگیلا کے بارے میں آئے دن دلچسپ خبریں چھپنے لگیں۔ اس ضمن میں جس نے بھی جو بات جس انداز میں کی اخبار والوں نے مزے لے لے کر اسے اسی رنگ میں شائع کرنا شروع کردیا۔ رنگیلا کا جو مذاق نگار خانوں میں اڑایا جاتا اس کی بازگشت اسٹوڈیوز کی چار دیواری سے باہر بھی سنائی دینے لگی۔ ایسی باتوں سے رنگیلا کو دکھ تو پہنچنا ہی چاہیے تھا اگرچہ وہ اسے ہنس کر نظر انداز کرنے کا عادی تھا اور بدخواہوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنا کام کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے اپنا کام یعنی اپنی مجوزہ فلم کی تیاری کا کام کرنا شروع کیا تو پریشان ہوگیا۔ اسے قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فلم کے سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ کہانی اور اسکرپٹ کی تیاری کا تھا۔ اس ضمن میں اس نے جس فلمی مصنف سے رابطہ کیا جس کو اپنی فلم کی کہانی لکھنے اور اسکرپٹ تیار کرنے کو کہا اس نے اس طرح انکار کردیا جیسے اس نے اگر یہ کام کیا تو اس کا دین دھرم نشٹ ہوجائے گا۔ پہلے تو اسے حیرانی ہوئی کہ رائٹرز اس طرح کیوں انکار کررہے ہیں اس نے ایک دو سے کہا بھی۔ ''سر جی! میں آپ کو کوئی

مفت کام کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں آپ جو معاوضہ لیتے ہیں میں وہ پورا ادا کروں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے تم معاوضہ دو گے مجھے اس کا علم ہے مگر مجھے معاف کرو بھائی کسی اور سے یہ کام کروالو۔''

بعد میں اسے اس بات کا اندازہ ہوا کہ فلمی مصنفین کے انکار کی کیا وجہ ہے۔ انکار کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ وہ اس کا کام کر کے اپنی مٹی پلید نہیں کروانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فلم کا جو حشر ہوگا وہ تو بعد کی بات ہے ان کا نام اگر رنگیلا کی فلم کے ساتھ آئے گا تو وہ بھی رنگیلا کے ساتھ لوگوں کے مذاق کا نشانہ بن جائیں گے۔ جب اس پر ان باتوں کی آگاہی کا در کھلا تو وہ بڑی مشکلوں میں گرفتار ہو گیا اور سوچنے لگا۔ یار لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے میرے آگے بڑھنے کے راستے میں اس طرح کانٹے بچھا دیے ہیں کہ میرے لیے آگے قدم بڑھانا دشوار ہو گیا ہے۔ میرے خلاف فلم انڈسٹری میں ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ فلم والے مجھے چھوت کی بیماری سمجھ کر میرے قریب آنے سے گھبرانے لگے ہیں۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں اس ارادے سے باز آجاؤں؟ فلم بنانے کا خیال دل سے نکال دوں؟ یہ سوچ لوں کہ یہ مجھ جیسے بندے کا کام نہیں۔ جب سارے لوگ میرے خلاف ہیں تو میں کس کس کا مقابلہ کروں؟ طویل سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں نے ہمت ہار دی، فلم بنانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تو میرا مذاق اڑانے والوں کو ایک اور موقع مل جائے گا۔ اسے اس موقع پر یہ شعر یاد آگیا

بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

وہ پٹھان تو تھا ہی اس کی پٹھانی سرشت کام آگئی۔ ''جتنی بھی رکاوٹ میرے راستے میں کھڑی ہو جائے یہ فلم بنے گی اور انشاء اللہ ضرور بنے گی۔''

''مگر کیسے؟''

یہ سوال بھی بڑا اہم تھا۔ کہانی اور اسکرپٹ کے بغیر کیسے بنائی جائے گی؟

اس ''کیسے'' کا جواب اس کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے کہ جدوجہد کرنے والوں کو وہ کبھی مایوس نہیں کرتا۔

اس عزم اور ارادے کے ساتھ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور جن رائٹرز سے اب تک رابطہ نہیں کیا تھا ایک ایک کر کے ان سے بھی ملتا رہا اور اپنی فلم کے لیے کام کرنے کی درخواست کرتا رہا اور آخر کار بشیر نیاز کو اس کے حال پر ترس آگیا اور اس نے اس سے انکار نہیں کیا۔ ''ٹھیک ہے رنگیلے! میں تمہارا کام کروں گا۔''

بشیر نیاز بھی اللہ اس کی مغفرت کرے، سیلف میڈ انسان تھا۔ صحافت کے حوالے سے اپنی محنت، لگن اور جدوجہد کی وجہ سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر فلم رائٹرز کے مقابلے میں اس لحاظ سے بہتر سمجھا جاتا تھا کہ اسے کہانی کو بہتر ٹریٹ منٹ دینے کا ہنر آتا تھا۔ اپنے لکھے ہوئے اسکرین پلے کی مدد سے بھی وہ کہانی میں جان ڈال دیتا تھا جب کہ اس کے مکالمے بے حد جاندار ہوتے تھے۔ فلم کی کامیابی میں ان کا بھی حصہ ہوتا تھا۔

اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو شاید رنگیلا اپنی فلم کی کہانی اور اسکرپٹ کسی اور رائٹر سے لکھواتا جو یقیناً بشیر نیاز کے معیار کا نہ ہوتا جس معیار کا بشیر نیاز نے تحریر کیا تھا۔ بشیر نیاز کے لکھے ہوئے اسکرین پلے نے بھی ایک عام سی کہانی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

پہلا مرحلہ جو کہانی اور اسکرپٹ کا تھا۔ وہ تو خدا خدا کر کے ختم ہوا۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے رب ذوالجلال کا شکر ادا کیا کہ تو ہی بے سہاروں کا سہارا ہے اور مجھے بس تیرے ہی سہارے کی ضرورت ہے۔ اسکرپٹ کی تکمیل کے بعد فلم کو آگے بڑھانے میں جو مراحل سامنے آتے ہیں اس کے دوست نما دشمنوں نے ان میں بھی مقدور بھر رکاوٹیں کھڑی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر دھن کا پکا اور اپنے عزم و ارادہ پر چٹان کی طرح مضبوط رنگیلا، مخالفین کی کھڑی کی ہوئی ہر دیوار کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی فلم مکمل ہو گئی۔ اس نے دو رکعت شکرانے کی نماز پڑھی اور مولا کریم کا شکر ادا کیا اور کہا۔ ''کہنے والے نے غلط نہیں کہا ہے۔ ''ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے۔''

''تمام تر ناسا عد حالات کے باوجود میں تجھ سے مایوس نہیں ہوا۔ مجھے تیرا اور صرف تیرا ہی آسرا تھا۔ تیری شان کریمی کے صدقے کہ تو نے میرا مان رکھ لیا۔''

جاری ہے



# مئی کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے پانچویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

## ☆ فاطمہ بھٹو

ذوالفقار علی بھٹو فقط ایک شخص نہیں تھا، وہ تو ایک داستان تھا۔ اور جو اس سے جڑا وہ بھی داستان بن گیا۔ اس خاندان کے ہر فرد نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، مگر اس شہرت کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی جان سے گئے۔ ان کے دونوں بیٹے پُراسرار انداز میں قتل ہوئے۔ ان کی بیٹی اور پاکستان کی دو بار وزیراعظم بننے والی محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی شہید کر دیا گیا۔ ان کی بیگم نصرت بھٹو نے کتنی ہی اذیتیں اٹھائیں۔ ایک عرصے کوما میں رہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی موجودہ نسل میں یوں تو محترمہ کے بچوں (بلاول، بختاور اور آصفہ) کا زیادہ چرچا ہے مگر جس نے حقیقی معنوں میں خود کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منوایا، جس کی کتب دنیا بھر میں پڑھی گئیں اور جس کی ذہانت کو تسلیم کیا گیا، وہ ہے فاطمہ بھٹو۔ مرتضیٰ بھٹو کی صاحب زادی۔

مرتضیٰ بھٹو کی بھی عجیب کہانی تھی۔ جب باپ گرفتار ہوا تو اس نے اپنے بچوں کو پاکستان چھوڑنے کی ہدایت کر دی کہ کہیں وہ بھی زیرِ عتاب نہ آجائیں۔ مرتضیٰ بھٹو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ افغانستان چلے گئے۔ وہاں ''الذوالفقار'' نامی عسکری تنظیم کی بنیاد رکھی گئی۔ پاکستان مخالف سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ مرتضیٰ بھٹو دہشت گرد قرار پائے۔ ان ہی برسوں میں کراچی سے اڑان بھرنے والی پی آئی اے کی ایک فلائٹ اغوا ہوئی، اُن کے اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان کشیدگی بڑھنے کا سبب بھی یہی واقعہ تھا جس میں ایک فوجی اہلکار قتل ہو گیا تھا۔

کل تک جو اسٹیبلشمنٹ سے برسرپیکار تھے، وہی مرتضیٰ بھٹو اپنی بہن کے دور میں پاکستان لوٹتے ہیں اور اسی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔ الیکشن میں انہیں ناکامی ہوتی ہے مگر وہ حکومت کے لیے دردِ سر بنے رہتے ہیں۔ اور ایک روز اپنی ہی بہن کی حکومت میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔ فاطمہ بھٹو اسی مرتضیٰ بھٹو کی بیٹی ہے جس کا کیس آج بھی عوام کے لیے ایک معما ہے۔

فاطمہ بھٹو 29 مئی 1982 کو افغان دارالحکومت کابل میں اُس وقت پیدا ہوئیں، جب ان کے والد میر مرتضیٰ بھٹو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ دادا سابق وزیراعظم پاکستان۔ کل پھوپھی کو یہ منصب سنبھالنا تھا مگر فاطمہ کی پرورش جلاوطنی کے سائے میں ہوئی تھی۔ ان کی والدہ فوزیہ فصیح الدین بھٹو افغان وزارتِ خارجہ کے ایک اہلکار کی بیٹی تھیں۔ غنویٰ بھٹو، جو اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی (شہید

بھٹو) کی چیئرپرسن ہیں، ان کی سوتیلی ماں ہیں۔

فاطمہ نے ابتدائی تعلیم دمشق، شام میں حاصل کی۔ ذہین فطین طالبہ تھیں۔ 1993 میں غنوی بھٹو اور چھوٹے بھائی ذوالفقار بھٹو جونیئر کے ساتھ پاکستان آگئیں۔ باپ سیاست کے بکھیڑوں میں الجھا تھا، ان کا دھیان تعلیم کی جانب تھا۔ انہوں نے کراچی سے اولیول کیا۔ اسی عرصے میں باپ کی موت کا سانحہ برداشت کرنا پڑا۔ بمشکل یہ خاندان اس سانحے سے باہر نکلا۔ فاطمہ بیرون ملک چلی گئیں۔

2004 میں کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک سے امتیازی نمبروں کے ساتھ گریجویشن کیا۔ گریجویشن میں ان کا مضمون مشرق وسطیٰ میں بولی جانے والی زبانیں اور کلچر تھا۔ 2005 میں انہوں نے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز سے ''ساؤتھ ایشین گورنمنٹ اور سیاسیات'' میں ماسٹرز کیا۔

پاکستان لوٹنے کے بعد انہوں نے سیاست داں کی بجائے ایک قلم کار بننے کو ترجیح دی۔ انگریزی کو وسیلہ اظہار بنایا۔ شعر کہے، نثر بھی لکھی۔ پاکستان امریکا اور برطانیہ کے مختلف اخبارات میں ان کے کالم شائع ہونے لگے۔ لوگ حیران تھے کہ اتنی سی عمر میں ایسی پختگی، اتنی مہارت۔ ایسا ویژن۔ یہ خیال کیا جانے لگا کہ وہ جلد سیاست میں قدم رکھ دیں گی، مگر ایسا ہوا نہیں۔

1997 میں جب وہ پندرہ برس کی تھیں، ان کا پہلا شعری مجموعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا، عنوان تھا: Whispers of the Deserts یعنی صحرا کی سرگوشیاں۔ 2006 میں دوسری کتاب شائع ہوئی، جس کا موضوع 8 اکتوبر 2005 کو آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد میں آنے والا ہولناک زلزلہ تھا۔ تیسری کتاب Songs of Blood and Sword تھی۔ یہ متنازع بھی رہی اور مقبول بھی۔ دنیا بھر کے اخبارات نے ان پر تبصرے لکھے۔ جہاں ان کے طرز تحریر، انداز بیان اور جذبے کی تعریف ہوئی، وہیں ان کی اپنے رشتے داروں، بالخصوص محترمہ پر تنقید کو تھوڑا غیر متوازن ٹھہرایا گیا۔ انہوں نے انگریزی میں ایک ناول بھی لکھا ہے۔

قلم کار ہونے کے ساتھ وہ ایک سماجی کارکن بھی ہیں۔ فلاحی سرگرمیوں میں تواتر سے حصہ لیتی ہیں۔ ان کی توجہ کا محور جیل میں قید خواتین ہیں۔ وہ نہ صرف اس موضوع پر تفصیل سے لکھتی رہی ہیں بلکہ باقاعدگی کے ساتھ ویمنز جیل کا معائنہ بھی کرتی ہیں۔ انہیں کراچی میں کچی آبادیوں میں بسنے والے لوگوں کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ تجزیہ کاروں کا آج بھی یہی خیال ہے کہ انہیں سیاست میں آنا چاہیے۔ کچھ کے نزدیک اپنی ذہانت اور اپروچ میں وہی بھٹو خاندان کی اصل وارث ہیں۔

## ☆علی ظفر

وہ ایک ہمہ جہت فنکار ہیں۔ جتنے اچھے اداکار، اتنے ہی باکمال سنگر۔ مصور بھی عمدہ۔ وہ اوّلین ایکٹر ہیں، جس نے حقیقی معنوں میں خود کو بالی ووڈ میں منوایا ورنہ ان سے قبل جو اداکار ہندوستان گئے یا تو انہوں نے مختصر کردار کیے یا پھر ایسے رول جو ان کے شایان شان نہیں تھے۔ یہ علی ظفر ہی تھے جو پہلی بار ایک ہندوستانی فلم میں لیڈ رول میں نظر آئے۔

محنت کا پھل ملا، وہ فلم کامیاب رہی۔ آج علی ظفر بالی ووڈ کا حصہ بن چکے ہیں۔ سروے کے مطابق وہ پاک و ہند کی مقبول ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ پاکستان میں لکس جیسا اہم ایوارڈ اپنے نام کیا۔ ہندوستان میں فلم فیئر کے لیے نامزد ہوئے۔

علی ظفر نے پہلے پہل تو گلوکار کے طور پر شہرت حاصل کی۔ اُن کا گیت ''چھنو'' بہت مقبول ہوا مگر اس کامیابی کے پیچھے جدوجہد کی ایک طویل داستان تھی۔ ہم نے انہیں چھوٹے چھوٹے اشتہارات میں دیکھا، مزاحیہ ڈراموں میں انہوں نے مختصر کردار کیے۔ خود گانے سے قبل ابرارالحق کے ایک گیت میں ماڈلنگ کرتے نظر آئے۔ چھنو اس کے بعد ریلیز ہوا اور کامیاب ٹھہرا۔ ''حقہ پانی'' ان کا پہلا البم تھا۔ اس نے علی کو راتوں رات لوگوں کا من پسند آرٹسٹ بنا دیا۔ اس کی پانچ ملین کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کے گانے ایک عرصے تک



چارٹ میں نمبرون رہے۔ انہوں نے بہترین البم کے لیے لکس اسٹائل ایوارڈ حاصل کیا۔

آنے والے دنوں میں علی نے مزید میوزک ویڈیوز کیں۔ ٹی وی پر بھی نظر آئے مگر زندگی میں بڑی تبدیلی تب آئی جب وہ 2010 میں ہندوستانی فلم ''تیرے بن لادن'' میں جلوہ گر ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی پاکستانی اداکار بالی ووڈ میں لیڈ رول کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے فلم کے نام اور موضوع کو متنازعہ قرار دیتے ہوئے اسے پاکستان میں ریلیز نہیں کیا گیا۔ فلم میں ان کی اداکاری اور گائیکی دونوں کو سراہا گیا۔ اب وہ لو کا دی اینڈ میں ایک مختصر کردار میں نظر آئے۔ ''میرے برادر کی دلہن'' میں انہوں نے ایک بھرپور کردار کیا اور کترینا کیف کے سامنے خود کو منوایا۔ ناقدین نے ان کا کام سراہا۔ 2012 میں ''لندن، پیرس، نیویارک'' ریلیز ہوئی جسے پسند کیا گیا۔ 2013 میں ''چشم بددور'' سینما گھروں کی زینت بنی جو بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ انہیں ایشیا کا پرکشش ترین مرد قرار دیا گیا۔ اس اعزاز کے لیے انہوں نے ریتک روشن جیسے مقبول اداکاروں کو پچھاڑا تھا۔

علی نے 18 مئی 1980 کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ ان کے والدین تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اور پنجاب یونیورسٹی کا حصہ تھے۔ انھوں نے سی اے اے پبلک اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور نیشنل کالج آف آرٹس میں زیر تعلیم رہے۔ اس وقت ان کا اصل رجحان مصوری کی جانب تھا۔ انہوں نے اسکیچ آرٹسٹ کے طور پر کیریر شروع کیا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ کام کیا کرتے۔ وہیں ٹی وی کے لیے پیشکش ہوئی۔ چھوٹے موٹے کردار کیے۔ پھر گائیکی کی سمت آگئے۔ البم ''حقہ پانی'' کی بازگشت ہندوستان تک پہنچی۔ اس میں اُن کی پرکشش شخصیت کا بھی کردار رہا۔ 2006 میں ان کی البم ''مستی'' کا بھی بہت چرچا ہوا۔ اس کی ویڈیوز انٹرنیشنل مارکیٹ میں ریلیز ہوئیں۔ بالخصوص گیت ''سجنا'' بہت مقبول ہوا۔ ان کی ایک ویڈیو ''دیکھا'' اس وقت کی مہنگی ترین میوزک ویڈیو تھی۔ اس میں وہ ریما، میرا اور آمنہ حق سے رومانس کرتے نظر آئے۔ یہ گیت 2010 میں ریلیز ہونے والی ہالی ووڈ فلم Wall Street: Money Never Sleeps میں بھی برتا گیا۔

وہ نصرت فتح علی خان، عاطف اسلم اور اسٹرنگز کے بعد چوتھے پاکستانی گلوکار ہیں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس وقت تک یہ خبر ہندوستانی پروڈیوسروں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ یہ خوبرو گلوکار اداکاری کا ہنر بھی جانتا ہے۔ اسی زمانے میں ہندوستانی البم کیں۔ اسی شہرت کے ساتھ انہوں نے 2012 میں اپنا البم ''جھوم'' ریلیز کیا، جس نے توقع کے عین مطابق بے حد کامیابی حاصل کی۔

کوک اسٹوڈیو میں بھی متعدد بار انہوں نے اپنے فن کا جادو جگایا۔ چھ برس کے وقفے کے بعد 2015 میں وہ کوک اسٹوڈیو میں جلوہ گر ہوئے، تو ان کے گانے ''راک اسٹار'' نے کئی ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اسے یوٹیوب پر لاکھوں لوگوں نے دیکھا۔ پاک و ہند کے ممتاز فنکاروں نے اس کی تعریف کی۔ انہوں نے عائشہ فضل سے شادی کی جن سے ان کے دو بچے ہیں۔

آج علی ظفر آپ کو شہرت کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں، یوں لگتا ہے کہ انہوں نے دنیا فتح کر لی ہے۔ دولت کی دیوی بھی مہربان۔ لاکھوں چاہنے والے۔ مگر برائے مہربانی اس کامیابی کے پیچھے چھپی جدوجہد کو بھی یاد رکھیں۔ اس مڈل کلاس فیملی کو مت بھولیں، جہاں علی نے آنکھ کھولی۔ وہ دن بھی ذہن میں رکھیں، جب وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اسکیچ کیا کرتے تھے۔ 2000 میں پی ٹی وی سے نشر ہونے والے ڈرامے ''کانچ کے پر'' کو بھی مت بھولیں۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے علی نے طویل جدوجہد کی۔ اور یہ سفر ابھی تمام نہیں ہوا۔ انہیں مزید منازل طے کرنی ہیں اور آگے جانا ہے۔

## ☆رمزی یوسف

وہ خوابوں کی سرزمین پر تھا، وہ سرزمین جہاں سپنے سچ ہو جاتے ہیں، جہاں امکانات کے بادلوں سے سنہری دھوپ چھن کر آتی ہے، مگر اُسے حسین دھوپ کی خواہش نہیں تھی کیونکہ وہ جس نام کے ساتھ امریکا میں داخل ہوا تھا، وہ اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ اس نے اپنی شناخت چھپا لی تھی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ انگریزی، عربی، اردو، عبرانی اور بلوچی زبانوں پر اسے عبور تھا۔ تاریخ اور انگریزی کے مضمون پر
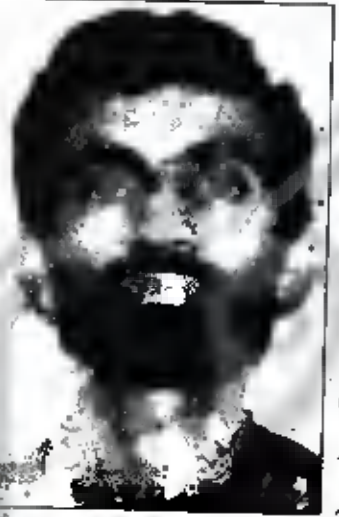
بڑی گرفت تھی۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا۔ دھان پان سا۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ یہ رمزی یوسف کا تذکرہ ہے۔ دہی رمزی یوسف جو اس وقت امریکا کی قید میں ہے۔ رمزی یوسف کے نام سے معروف اس شخص نے 20 مئی 1967 کو کویت میں مقیم ایک پاکستانی فلسطینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد محمد عبدالکریم کا تعلق پاکستان کے صوبے بلوچستان سے تھا۔ والدہ فلسطینی تھیں۔ عام خیال ہے کہ وہ القاعدہ کے سینئر رہنما اور 9/11 کے مرکزی ملزم خالد شیخ محمد کی بہن تھیں۔ کچھ ویب سائٹس پر خالد شیخ محمد کو رمزی کا چچا بھی لکھا گیا ہے۔ القاعدہ کے اس لیڈر کو کراچی سے گرفتار کیا گیا تھا اور یہ اس وقت گوانتاناموبے میں ہے۔

رمزی کے والد ایک انجینئر تھے، جو کویتی ہوائی کمپنی کے لیے کام کرتے تھے۔ کچھ برس بعد یہ خاندان پاکستان چلا آیا پھر اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھیج دیا گیا۔ وہ ویلز کی ایک درسگاہ میں الیکٹریکل انجینئرنگ کا طالب علم رہا۔ انگریزی بہتر بنانے کی غرض سے آکسفورڈ کالج کا بھی رخ کیا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ کچھ عرصے رمزی نے مصر میں بھی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ لوٹ آیا۔ شاید یہی وہ زمانہ ہے، جب وہ شدت پسندی کی جانب مائل ہوا۔ رپورٹس کے مطابق رمزی یوسف نے پشاور میں بم بنانے کی تربیت حاصل کی۔ اس زمانے میں افغانستان میں امریکی انخلا کے بعد وارلارڈز ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ 1992 میں وہ جعلی شناخت اور عراقی پاسپورٹ کے ساتھ امریکا پہنچ گیا۔ اس سفر میں احمد اعجاز نامی ایک شخص بھی ساتھ تھا۔ یہ شخص ایئرپورٹ پولیس کی توجہ منتشر کرنے کے لیے پلانٹ کیا گیا تھا۔ اس کے پاس مشکوک ویڈیوز اور پمفلٹ تھے جنھوں نے ایئرپورٹ حکام کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ رمزی کو بھی مشکوک اور نامکمل دستاویزات کی وجہ سے گرفتار کیا گیا مگر اصل توجہ احمد اعجاز پر رہی، وہ 72 گھنٹے کی کڑی تفتیش کے بعد حکام کو دھوکا دینے میں کامیاب رہا۔ اس نے خود کو پاکستانی ظاہر کیا اور پناہ کی درخواست کی۔ بالآخر اسے آزادی مل گیا۔ اب وہ آنکھوں میں غصہ لیے نیویارک کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اس غصے نے 26 فروری 1993 کو اپنا رنگ دکھایا۔ جب نیویارک لرز اٹھا۔ دہشت گرد حملے میں شہر کی شناخت تصور کیے جانے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹرز کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ ایک کار بم دھماکا تھا، جس میں 680 کلو وزنی مواد استعمال کیا گیا تھا۔ مقصد اس بلند منزلہ عمارت کو گرانا تھا جس میں اس وقت ہزاروں افراد موجود تھے۔ گو یہ بم اپنے مقاصد پورے نہ کرسکا مگر اس نے چھ افراد کی زندگیاں لے لیں۔ سیکڑوں اس واقعے میں زخمی ہوئے، جس میں اکثریت سویلین کی تھی۔ اس حملے کے بعد نیویارک ٹائمز کو رمزی کا ایک خط موصول ہوا جس میں اس نے دھماکے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے اسے امریکا کی اسرائیل کی حمایت کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اس کے مطالبات میں اسرائیل کی امداد بند کرنا اور مڈل ایسٹ سے دور رہنا تھا۔ اس خط میں خودکش حملہ آوروں کے دستے کا بھی تذکرہ تھا۔ واضح رہے کہ یہ نوّے کی دہائی کے اوائل کا تذکرہ ہے۔ پھر رمزی یوسف پاکستان میں روپوش ہوگیا۔ اس زمانے میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا جو ناکام گیا۔ عام خیال ہے کہ اس کا ذمے دار رمزی یوسف ہی تھا۔ آنے والے دنوں میں کئی خطرناک حملوں اور منصوبوں میں رمزی کا نام آیا جن میں پوپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ 7 فروری 1995 کو رمزی یوسف کو اسلام آباد سے گرفتار کرلیا گیا۔ اسے امریکا کے حوالے کردیا گیا جہاں اس پر طویل مقدمہ چلا اور اسے بیشتر الزامات میں قصوروار پایا گیا۔ اس نے مقدمے کے دوران کہا تھا۔ ''آپ مجھے دہشت گرد کہتے ہیں، ہاں میں دہشت گرد ہوں اور میں جب تک امریکا اور اسرائیل سے برسرپیکار ہوں، میں اس دہشت گردی کی حمایت کرتا رہوں گا، کیونکہ یہ دونوں ممالک دہشت گردوں سے بڑے دہشت گرد ہیں۔ انہوں نے دہشت گردی کو پیدا کیا۔ یہ جھوٹے، مکار اور مفاد پرست ہیں۔''

ایک کہانی کے مطابق جب یوسف کو گرفتار کرکے امریکا لایا گیا، تب ہیلی کاپٹر سے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا: ''آج نہیں تو کل، ہم تمھیں گرا ہی دیں گے۔'' عجیب اتفاق ہے، یہ سینٹرز آٹھ برس بعد زمین بوس ہوگئے۔

## ☆ مصباح الحق

لمبا قد۔ چہرہ خوبصورت سیدھے سجاؤ کا آدمی۔ اسے دیکھ کر کبھی کسی کو یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ عظمت کا تاج لے کر پیدا ہوا ہے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ اپنے کیریر کی اختتامی لکیر تک پہنچتے پہنچتے وہ انسان سے ایک سنہری داستان میں ڈھل جائے گا۔ کامیابیوں کی ایسی داستان رقم کرے گا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے۔ ایک انگریزی ویب سائٹ دنیائے کرکٹ کے عظیم کپتانوں کی فہرست بنائے گی تو اسے بھی



بڑے احترام سے فہرست میں جگہ دے گی۔ ایک بڑا انگریز اسپورٹس جرنلسٹ اسے عہد کا سب سے عزت دار کھلاڑی ٹھہرائے گا۔

یہ پاکستان کی ٹیسٹ کرکٹ کے کامیاب ترین کپتان مصباح الحق کا تذکرہ ہے جس نے بطور قائد غیروں کی زمین پر عظیم جنگیں لڑیں۔ اس قد آور قائد سے ایک عجیب معاملہ جڑا ہے۔ جتنی عزت اسے بیرون ملک دی گئی، جتنا احترام غیروں نے کیا، اپنوں نے اس کی اتنی ہی مٹی پلید کی۔ اس پر پھبتیاں کسیں۔ گالیاں دیں۔ الزامات لگائے۔ اسے ذلیل وخوار کرنے کے لیے سارا زور لگا لیا، مگر عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ایک تجزیہ کار کے مطابق مصباح ایک ایسی ٹیم کا سپہ سالار تھا جہاں بھیڑوں نے شیروں کی کھال پہن رکھی تھی۔ اسے منتشر فوج کے ساتھ مشکل ترین محاذوں پر لڑنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس نے ٹیسٹ کی تیز ترین سنچری بنائی، سال میں سب سے زیادہ رنز اسکور کرنے والا بلے باز رہا، اپنے ملک کو ایشیا کا فاتح بنوایا، ہندوستان کو ہندوستان میں شکست دی، جنوبی افریقا کو اس کی زمین پر ون ڈے سیریز ہرانے والا پہلا ایشیائی قائد ٹھہرا۔ ان حیران کن کامیابیوں کے باوجود بطور کپتان تین ہزار رنز بنانے والا یہ کھلاڑی، سری لنکا کے خلاف ایک تاریخ ساز فتح اپنے نام کرنے والا کپتان، انگلینڈ اور آسٹریلیا جیسی ٹیموں کے بخیے ادھیڑ دینے والا سورما... اپنے ملک میں مجرم قرار دیا گیا۔ البتہ مصباح نے مخالفت کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دیا۔ ایک تعلیم یافتہ شخص سے یہی امید کی جانی چاہیے۔

انہیں شریف النفس اور غیر متنازعہ کھلاڑی کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کبھی غصے میں اپنے مداح کی درگت نہیں بنائی۔ کبھی ڈوپ ٹیسٹ مثبت نہیں نکلا۔ کبھی صحافیوں سے جھگڑا نہیں ہوا۔ نہ تو کبھی گیند چبائی، نہ ہی کیسنو جا کر رنگ کیا۔ انہوں نے ہمیشہ اصولوں کی پاس داری کی۔

گو وہ ون ڈے میں کوئی سنچری نہیں بنا سکے مگر 42 کار آمد نصف سنچریاں بنائیں۔ ان کی اوسط 43.40 تھی، جو انتہائی متاثر کن ہے۔ یہ بیٹنگ اوسط پونٹنگ، لارا، انضمام، سارو گنگولی اور جے وردھنے جیسے کپتانوں سے زیادہ تھی۔ اس معاملے میں وہ میاں داد سے بھی آگے دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر بہترین اننگز میں وہ ناٹ آؤٹ رہے۔

مصباح الحق نے 28 مئی 1974 کو میانوالی میں آنکھ کھولی۔ یہ ایک مڈل کلاس گھرانا تھا، جو تعلیم کی اہمیت سے واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شوق کے زور میں بلا اٹھائے میدانوں کا رخ کرنے والے مصباح کبھی تعلیم سے غافل نہیں ہوئے۔ انہوں نے لاہور کی یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی سے ایم بی اے کیا۔ یہ تعلیم کیریر میں بہت کام آئی۔

8 مارچ 2001 کو انہوں نے نیوزی لینڈ کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ ون ڈے کیریر کا آغاز اگلے برس نیوزی لینڈ ہی کے خلاف کیا۔ کیریر کی ابتدا میں وہ ان اینڈ آؤٹ ہوتے رہے۔ ایک تو ان کی عمر زیادہ تھی۔ پھر اس وقت انضمام الحق، یوسف اور یونس جیسے کھلاڑی ٹیم میں موجود تھے۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ ان کے ٹیم سے باہر ہونے کا سبب انضمام کے مذہبی خیالات سے مطابقت نہ رکھنا بھی تھا۔ ٹیم میں آنے کے بعد بھی چند سانحات ہوئے مگر 2010 میں جب پاکستان نے انگلینڈ کا متنازعہ دورہ کیا، کپتان سمیت تین کھلاڑی زیر عتاب آئے، تب کپتانی کی ذمے داری ٹھنڈے مزاج کے حامل مصباح کو سونپی گئی۔

ون ڈے سے ریٹائرمنٹ کے وقت چالیس سالہ مصباح الحق اپنی ٹیم کی جانب سے ٹاپ اسکورر تھے۔ آخری ٹورنامنٹ میں چار نصف سنچریاں بنائیں۔ ورنہ کچھ کھلاڑی تو پانچ پانچ ورلڈ کپ کھیل کر بھی ایک نصف سنچری نہیں بنا سکے۔

لوگ ان پر سست بلے بازی کا الزام تو عائد کرتے مگر یہ بھول جاتے کہ کرکٹ ''ٹیم گیم'' ہے۔ یہ دیگر بیٹسمینوں کی بے پروائی سے گنوائی وکٹوں کا دباؤ ہوتا تھا، جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے انہیں اپنا انداز تبدیل کرنا پڑتا۔ جب ضرورت پڑتی، تیز رفتار اننگز بھی کھیلیں اور خوب کھیلیں۔ ٹیسٹ میں مصباح الحق نے 8 بار سو کا ہندسہ عبور کیا اور حیران کن طور پر ہر بار فتح نے پاکستان کے قدم چومے۔

ان پر ہونے والی تنقید کا ایک سبب ان کا سادہ مزاج اور کم گو ہونا بھی تھا۔ یہاں بگڑے ہوئے شہزادوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنا ہیرو بنایا جاتا ہے جو خود کو ڈسپلن سے بالاتر سمجھتے ہیں، ٹیم کے بجائے اپنے لیے کھیلتے ہیں۔ اگر مصباح الحق بھی ہمہ وقت اپنے کارناموں کا تذکرہ کرتے، اینگری ینگ مین





WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بن جاتے، ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتے، غیر ضروری بیانات دیتے تو ہماری قوم انہیں بھی اپنا ہیرو مان لیتی۔

ایک اسپورٹس تجزیہ کار کے مطابق اگر مصباح پاکستان کے بجائے آسٹریلوی تاریخ کے کامیاب ترین کپتان ہوتے، انہوں نے جنوبی افریقا کو اتنی فتوحات دلائی ہوتیں تو انہیں کاندھے پر بٹھایا جاتا، ان پر پھول نچھاور ہوتے، مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہیروز کی قدر نہیں کی جاتی۔

## ☆ حاکم علی زرداری

سندھ کے سینئر سیاست دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ سابق صدر پاکستان، آصف علی زرداری کے باپ اور دو بار پاکستان کی وزیر اعظم بننے والی محترمہ بینظیر بھٹو کے سسر تھے۔ سیاست ان کی گھٹی میں تھی۔ کئی نسلوں سے یہ خاندان سیاست میں تھا۔ ان کے دادا سجاول خان زرداری بھی برطانوی راج میں سیاست میں رہ چکے تھے۔

وہ 1930 میں سندھ کے ضلع نوابشاہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک متوسط زمین دار گھرانے سے تھا۔ عام خیال ہے کہ وہ ان اوّلین زمین داروں میں شامل تھے، جنہوں نے تقسیم کے بعد کراچی میں تعمیراتی شعبے میں سرمایہ کاری کی۔ انہوں نے کراچی کا مشہور بمبینو سنیما تعمیر کروایا۔

خاندانی روایت برقرار رکھتے ہوئے سیاست میں آئے۔ آغاز 60 کے عشرے میں ضلع کونسل نوابشاہ کے انتخابات سے کیا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں آئی تو وہ اس کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر 1970 کے عام انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت ہی میں پارٹی سے اختلاف کی وجہ سے وہ پی پی سے الگ ہوگئے۔ عام خیال ہے کہ بلوچستان میں فوجی آپریشن اس اختلاف کا سبب بنا۔ اختلاف اور مخالفت کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ اب وہ عوامی نیشنل پارٹی کا حصہ بن گئے۔ حاکم علی زرداری نے 1985 کے غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لیا لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔ ان کے خاندان نے بھی مارشل لا میں سختیاں جھیلیں۔ فوجی عدالت نے حاکم علی زرداری پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی تھی، حکومت نے ان کی آبائی زمین کو پانی کی فراہمی بند کرا دی جس سے اٹھارہ سو ایکڑ پر کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں۔

بعد میں حالات میں تبدیلی آئی۔ جب محترمہ سیاست میں آئیں تو وہ پارٹی کے قریب ہوگئے۔ دوبارہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ 88ء کے عام انتخابات کا انعقاد ہوا تو حاکم علی زرداری پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر دوسری بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بینظیر بھٹو نے انہیں اپنی پہلی حکومت میں قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا تھا۔

بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کی شادی ہوئی۔ جب وہ وزیر اعظم بنیں تو کرپشن کے کتنے ہی الزامات لگے۔ اس کے ذمّے دار جہاں ان کے شوہر آصف علی زرداری ٹھہرے، وہیں حاکم علی زرداری پر بھی انگلیاں اٹھیں۔ ان کے خلاف بھی کرپشن اور دیگر جرائم میں مقدمات درج کیے گئے۔

1990 کے انتخابات میں بھی حاکم زرداری نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیا، لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ 1993 کے انتخابات میں وہ تیسری بار رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے لیکن 1997 کے بعد سے انہوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔

1997 میں حیدرآباد میں اس وقت کے ڈپٹی سیکریٹری سائنس و ٹیکنالوجی عالم بلوچ کا قتل ہوا۔ اس کا مقدمہ آصف علی زرداری اور ان کے والد کے خلاف درج ہوا تھا۔ یہ مقدمہ ایک عرصے چلا۔ آخر انہیں بری کر دیا گیا۔ جنرل مشرف کے دور میں قومی مفاہمتی آرڈیننس کے تحت مقدمات کے خاتمے کا فائدہ حاکم زرداری کو بھی ہوا، تاہم آخر کے برسوں میں نیب کی اپیل پر لاہور ہائی کورٹ نے ان کے خلاف اراضی کی غلط الاٹمنٹ کا مقدمہ بحال کرنے کا حکم دیا تھا۔

بے نظیر بھٹو نے اپنی ایک کتاب میں ان مشکلات کا ذکر کیا، جن کا زرداری خاندان اور حاکم علی زرداری کو سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مطابق ان کے سسر پر سب سے کڑا وقت ان کی اور آصف علی زرداری کی منگنی کے بعد آیا۔ قومی بینکوں سے حاکم علی زرداری کے تعمیراتی منصوبوں کے لیے منظور شدہ



قرضوں کی ادائیگی روک دی گئی۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ غلطی کر رہے ہیں، پوری اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی آپ کے پیچھے پڑ جائے گی لیکن وہ (حاکم) کہتے تھے کہ مجھے پرواہ نہیں۔ میرے بیٹے کی خوشی مجھے زیادہ عزیز ہے۔

حاکم زرداری نے دو شادیاں کیں، دونوں بیویوں کا تعلق اپنے دور کے بڑے علمی اور ادبی گھرانوں سے تھا۔ پہلی شادی سندھ مدرستہ الاسلام کے بانی حسن علی آفندی کی نواسی سے ہوئی تھی، دوسری اہلیہ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کے علاوہ بی بی سی ہندوستانی سروس کے بانیوں میں شمار کیے جانے والے معروف شاعر، ادیب اور صداکار زیڈ اے بخاری کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آصف علی زرداری ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں فریال تالپور اور عذرا پیچوہو نے بھی سیاست میں حصہ لیا۔

ان کا اسلام آباد میں 24 مئی 2011 کو انتقال ہوا۔ آخری برسوں میں وہ بیماریوں میں گھرے رہے۔

## ☆ ضمیر جعفری

درد میں لذت بہت اشکوں میں رعنائی بہت
اے غم ہستی ہمیں دنیا پسند آئی بہت

تمغۂ قائداعظم اور تمغہ برائے حسن کارکردگی جیسے اعلیٰ ترین اعزازات سمیت متعدد ایوارڈز ان کے حصے میں آئے۔ عوام کی بھرپور محبت ملی۔ بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ پچاس کتب ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کا کلام نصاب کا حصہ بنا۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں ان کا

نام زیر بحث آیا۔ ان کی شخصیت اور فن پر عالمانہ تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ مزاحیہ شاعری ان کی اصل پہچان بنی۔ اس موضوع کے گرد گھومتی ان کی کتب مافی الضمیر، مسدس بدحالی، ولایتی زعفران کا بہت چرچا ہوا۔ کلیات کا عنوان نشاط تماشا تھا۔ وہ تخلیق فن کے لمحوں میں مزاح کو ایک ایسی ذہنی کیفیت سے تعبیر کیا کرتے تھے جو فکر و نظر کو اس انداز میں مہمیز کرے کہ پڑھنے والے پر شگفتگی، فرحت اور مسرت کے نئے در وا ہوجائیں۔

حضرت اقبال کا شاہیں تو ہم سے اڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

ان کا اصل نام ضمیر حسین شاہ تھا۔ انہوں نے یکم جنوری 1916 کو جہلم سے ملحقہ چک عبدالخالق کے ایک معزز خاندان میں آنکھ کھولی۔ ان کا خاندان علم و ادب کے حوالے سے مشہور تھا۔ شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم چک عبدالخالق سے حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کا رخ کیا۔ وہیں سے میٹرک کیا۔ ان کی بے ساختگی اور شگفتگی کا چرچا تھا۔ حاضر جوابی ان کا امتیازی وصف تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ادب کی سمت آگئے۔ اسکول کی بزم ادب کے فعال رکن تھے۔

گورنمنٹ ہائی اسکول، جہلم سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج کیمبل پور، اٹک سے انٹر کیا۔ اب لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کا حصہ بن گئے۔ گریجویشن کے بعد روزگار کی تلاش شروع ہوئی۔ آغاز کلرکی سے کیا۔ پھر صحافت کی سمت آگئے۔ روزنامہ احسان اور ہفت روزہ شیرازہ سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ ہفت روزہ سدا بہار، لاہور کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

اظہار پر قدغن انہیں گوارا نہیں تھی۔ آزادی اظہار کو کلیدی اہمیت دیتے۔ صحافت سے ان کا ساتھ کئی عشروں پر محیط رہا۔ بعد میں تواتر سے کالم لکھے جو مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ وہ اپنی تحریروں میں نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ زندگی کو زیر بحث لاتے۔ اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ دوسری عالمی جنگ جاری تھی۔ مقامی باشندے فوج میں بھرتی کیے جا رہے تھے۔ وہ بھی برطانوی فوج میں بھرتی ہوئے۔ تعیناتی جنوب مشرقی کمان میں بحیثیت کپتان ہوئی۔ شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ تھے۔ عالمی جنگ کے دوران انہیں کئی ممالک دیکھنے کا موقع ملا۔

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستانی فوج میں خدمات انجام دیں۔ 1949 میں اس سے الگ ہوکر صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ اسی سال راولپنڈی سے اپنا پرچہ "باد شمال" شروع کیا۔ ابتداً یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا، مگر پھر حالات بدلنے لگے۔ اسے بند کرنا پڑا۔ اب ان کی دلچسپی کا محور سیاست تھی۔ 1951 میں جہلم کے مضافات سے پنجاب اسمبلی کی نشست کے لیے الیکشن لڑا مگر سیاست میں کامیابی کے لیے جو گر درکار ہوتے ہیں، وہ انہیں کہاں آتے تھے۔

ناکامی مقدر بنی۔ 1952 میں پھر فوج کا حصہ بن گئے۔ ترقی کرکے میجر کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

حکومتِ پاکستان نے انہیں کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ مقرر کیا۔ انہوں نے اس عہدے پر پندرہ برس تک خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ پاکستان نیشنل سینٹر کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اور پھر وزارت بحالیات افغان مہاجرین میں مشیر مقرر رہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد میں اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے علمی و ادبی مجلے ''ادبیات'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس مجلّے کی معیار کو بہتر بنایا۔ اردو کو علاقائی زبانوں کے قریب لائے۔ پاکستانی ادیبوں کی فلاح کے منصوبے تجویز کیے۔ الغرض وہ ان کی زندگی کا یادگار دور تھا۔

ناقدین کے مطابق متنوع موضوعات اور شگفتہ پیرایہ اظہار ان کے اسلوب کے امتیازی اوصاف ہیں۔ اس قد آور تخلیق کار نے ہمیشہ فکر و خیال کے نئے پہلو پیش نظر رکھے۔ تجربات کو اہمیت دی۔ ان کی ظریفانہ شاعری دلوں کو تازگی اور مسرت کے احساس سے سرشار کرتی ہے۔ اُن کے ہاں ایک عالمانہ شان ہے۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے ارتعاشات کو فنی مہارت اور خلوص کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھالا۔

زندگی ہے مختلف جذبوں کی ہمواری کا نام
آدمی ہے شلجم و گاجر کی ترکاری کا نام

اس عظیم شاعر کا 16 مئی 1999 کو 83 سال کی عمر میں اسلام آباد میں انتقال ہوا۔

## ☆ رنگیلا

وہ ایک عہد تھا۔ سامنے اس کے کوئی نہ ٹھہر پاتا۔ وہ جہاں سے گزرا، وہ راہ گزر اس سے منسوب ہوئی۔ وہ مزاح کا بے تاج بادشاہ تھا۔ جوں ہی منظر میں داخل ہوتا، مسرت کا شعلہ سا لپکتا۔ پلوں میں محفل کو زعفران زار بنا دیتا۔ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے بغیر پاکستانی فلم انڈسٹری کا تصور نامکمل ہے۔

یہ ممتاز مزاحیہ اداکار رنگیلا کا تذکرہ ہے۔ وہ یکم جنوری 1937 کو افغانستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد سعید خان تھا۔ اوائل میں انہیں کسرت میں دلچسپی تھی۔ باڈی بلڈر بننا چاہتے تھے۔ یہ ایک مشکل میدان تھا۔ صلاحیتوں کا بھی فقدان تھا۔ پھر سب کے ساتھ پیٹ لگا ہے۔ جب پیٹ خالی ہو تب شوق ترجیح نہیں رہتا۔ انہوں نے بھی چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کئی برس تک فلموں کے بورڈ پینٹ کیے۔ ان کے اندر ایک اداکار چھپا تھا سو اسٹیج کا رخ کیا۔ وہاں خود کو دریافت کرنے کا موقع ملا۔

فلمی کیریر کا آغاز انہوں نے ایم جے رانا کی 1958 میں ریلیز ہونے والی فلم ''جٹی'' سے کیا جس میں انہوں نے مزاحیہ کردار کیا۔ کردار مختصر تھا، مگر اس نے توجہ حاصل کی۔ کچھ قلم کاروں کے مطابق انہوں نے اردو فلم ''داتا'' سے اپنا سفر شروع کیا تھا مگر وہ لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کرسکی۔

ابتدا میں انہیں منور ظریف اور آصف جاہ جیسے باکمال فنکاروں کے سامنے کوئی خاص پزیرائی نہیں ملی۔ انہوں نے ایک عرصے جدوجہد کی۔ 63ء میں ریلیز ہونے والی ''چوڑیاں'' اور ''موج میلہ'' تک انہوں نے چھوٹے موٹے کردار کیے۔ فلم ''گہرا داغ'' میں حقیقی معنوں میں ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ اگلے برس فلم ''ہتھ جوڑی'' میں وہ اور منور ظریف شگوفے چھوڑتے نظر آئے۔ فلم بہت پسند کی گئی۔ اگلے برس ''جی دار'' میں بھی رنگیلا اور منور ظریف نے خوب چٹکلے سنائے۔ کہتے ہیں، یہ پلاٹینم جوبلی کرنے والی پہلی فلم تھی۔ 67ء میں ریلیز ہونے والی ''یار مار'' ایک کامیاب فلم تھی۔ ان کا ایک مکالمہ ''اس دنیا نے غرق ہو جانا ہے لشکری'' بہت مقبول ہوا۔ 1969 میں ریلیز ہونے والی فلم ''دیا اور طوفان'' سے انہوں نے مزاحیہ اداکاری کے ساتھ خود کو بطور رائٹر، سنگر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی منوایا۔ یہ فلم ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی۔ ''ہیر رانجھا'' اور ''ماں پتر'' میں ان کے کردار نے فلم بینوں کو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ رنگیلا پروڈکشن کے بینر تلے انہوں نے متعدد کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان کی مشہور فلموں میں رنگیلا، دل اور دنیا، کبڑا عاشق، عورت راج، پردے میں رہنے دو، ایماندار، بے ایمان، انسان اور گدھا اور دو رنگیلے نمایاں رہیں۔ انسان اور گدھا کو کچھ لوگ ماسٹر پیس ٹھہراتے ہیں۔

پہلے وہ ایک عام کامیڈین تھے، پھر نمایاں مزاحیہ اداکار بنے، پھر ہیرو کے طور پر کردار نبھایا۔ یہ کامیابی اُس محنت کا نتیجہ تھی، جس سے انہوں نے کبھی جی نہیں چرایا۔ رنگیلا نے فلموں کے عام کامیڈین سے ہیرو شپ تک کا سفر خداداد صلاحیتوں کے بل پر طے کیا۔ اسکرین پر رنگیلا کی آمد فلم بینوں میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ اپنے دور کی تمام ہیروئنوں کے مقابل مرکزی کردار ادا کیے۔ بہترین اداکاری اور دیگر شعبوں میں شاندار کارکردگی پر 9 مرتبہ نگار ایوارڈ بھی اپنے نام کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اداکاری ہو گلوکاری یا ہدایت کاری رنگیلا نے ہر شعبے میں خود کو منوایا۔

فلم انڈسٹری میں شہرت کی عمر مختصر ہے۔ وہ بھی زوال کا شکار ہوئے۔ ایک ایسا زمانہ آیا، جب ننھا اور علی اعجاز ہیرو ہوتے اور وہ انہیں تھرڈ لیڈ میں نظر آتے۔ فلموں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے عام طور پر ان کے کردار کی خوب درگت بنتی، طرح طرح کی پھبتیاں کسی جاتیں، مذاق اڑایا جاتا۔ مگر انہوں نے کبھی اس کا برا نہیں منایا۔ وہ جانتے تھے کہ یہی سین کا تقاضا ہے۔

جگر اور گردے کے عارضوں کے باعث وہ انڈسٹری سے دور ہوگئے۔ 24 مئی 2005 کو لاکھوں انسانوں میں خوشیاں بانٹنے والے اس فنکار کا انتقال ہوا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پاکستانی فلمی تاریخ پر ان کا رنگ سب سے چوکھا تھا۔

## ☆ مصطفیٰ قریشی

مادری زبان سندھی، مگر شہرت اُنھیں پنجابی فلموں نے بخشی۔ وہ بھی بڑے دل والے ہیں۔ جتنی شہرت اُنھیں اس زبان نے دی، اتنی ہی محبت انہیں بھی پنجابی سے ہے۔ فلموں میں کام کرنے کے لیے پنجابی سیکھی تھی۔ پھر اس سے عشق ہوگیا۔ اکثر کہتے ہیں، پنجابی فلموں میں زبان ایک کردار کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا بڑا جاندار استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ مصطفیٰ قریشی کا تذکرہ ہے۔ پاکستانی انڈسٹری میں جن فنکاروں نے ولن کے کردار سے انصاف کیا، مصطفیٰ قریشی ان میں سرفہرست ہیں۔ ویسے پنجابی زبان کے علاوہ ان کی شہرت کا ایک حصہ دار اور تھا۔ یہ تھے ممتاز اداکار سلطان راہی، جنہوں نے سیکڑوں سپرہٹ فلمیں کیں۔ اپنا لوہا منوایا۔ مصطفیٰ قریشی اور ان کی جوڑی بہت مشہور تھی۔ ایک ہیرو ہوتا، دوسرا ولن۔ ایک طویل عرصے تک انہوں نے انڈسٹری پر راج کیا۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے اپنے دوست کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا: ''سلطان راہی کے دنیا سے جانے کے بعد ہماری جوڑی ٹوٹ گئی۔ مرحوم حقیقی زندگی میں واقعی ایک کھرا اور بہترین انسان تھا اور اس کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔''

مصطفیٰ قریشی 11 مئی 1937 کو حیدرآباد، سندھ میں پیدا ہوئے۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق شروع سے تھا۔ ذہین اور خوبرو نوجوان تھے۔ محنت سے کبھی جی نہیں چرایا۔ کیریر کا آغاز محمد علی اور وحید مراد کے ساتھ اردو فلموں سے کیا تھا۔ 1967 میں ریلیز ہونے والی ''لاکھوں میں ایک'' ان کی پہلی فلم تھی۔

اگلے برس ''دل دیا، درد لیا'' ریلیز ہوئی۔ پہلی نمایاں فلم ''عندلیب'' تھی، جو 1969 میں ریلیز ہوئی۔ وحید مراد اور شبنم نے فلم میں مرکزی کردار نبھائے۔ اردو فلم انڈسٹری میں خود کو منوانا ذرا دشوار تھا۔ اسی زمانے میں پنجابی فلم کی پیشکش ہوئی۔ پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا۔ ایک سبب تو یہی کہ وہ پنجابی پر عبور نہیں رکھتے تھے۔ پھر اس انڈسٹری کا مزاج الگ تھا۔ ادھر سلطان راہی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ پھر سوچا، اردو فلموں پر بھی تو وحید مراد اور محمد علی چھائے ہوئے ہیں، کیوں نہ ایک کوشش کی جائے۔

مصطفیٰ قریشی کی پہلی پنجابی فلم ہدایت کار الطاف حسین کی ''خون دے پیاسے'' تھی۔ اس میں ان کا رول پسند کیا گیا۔ انہیں یہ تجربہ اچھا لگا۔ پنجابی میں ان کی ڈائیلاگ ڈلیوری کو حیران کن پزیرائی ملی۔ یہی انداز ان کا ٹریڈ مارک بن گیا۔ 1979 میں ریلیز ہونے والی فلم ''مولا جٹ'' میں ان کے ڈائیلاگ بہت مقبول ہوئے۔ ''نواں آیا ایں سوہنیا'' آج بھی بچے بچے کی زبان پر ہے۔ نوری نت کا کردار بہت مقبول ہوا۔ آنے والے برسوں میں وہ اور سلطان راہی بہت سی فلموں میں اپنے مولا جٹ کے کرداروں کا اعادہ کرتے نظر آئے۔ بے شک یہ مثبت چلن نہیں تھا، مگر عوام نے اسے بہت پسند کیا۔ ان کی بیگم روبینہ قریشی بھی شوبز انڈسٹری سے وابستہ ہیں اور گلوکارہ کے طور اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ یہ افسوسناک امر ہے کہ انہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے وہ پزیرائی نہیں ملی، جس کے وہ حق دار تھے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

اب انہیں نہ تو کسی ایوارڈ کی ضرورت ہے، نہ ہی خواہش۔ اپنی بیگم سے بھی کہہ دیا کہ اگر ان کی موت کے بعد کوئی حکومتی تمغہ دیا جائے تو اسے وصول نہ کریں۔

وہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی ریلیز کے خلاف ہیں۔ انہوں نے متعدد بار کہا کہ پاکستانی فنکاروں کو بھارتی فلموں کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے، بھارتی حکومت سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھنی چاہیے۔ انہوں نے مزید ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی ریلیز پر پابندی عائد کی جائے۔ بھارتی وزیراعظم مودی کے بھی وہ سخت ناقد ہیں۔

مصطفیٰ قریشی آج بھی فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ 2014 میں فلم ''سلطنت'' میں نظر آئے۔ رواں برس ان کی فلم Two+Two ریلیز ہوگی۔ ان کے بیٹے عامر قریشی نے بھی فلم انڈسٹری میں قدم رکھ دیا ہے۔ ''بلائنڈ لو'' ان کی پہلی فلم ہوگی۔

## ☆ خان عبدالجبار خان

خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کے تذکرے کے بنا جدید پشتون سیاست کا تذکرہ ادھورا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی پشتون سیاست پر ان کا خاندان چھایا رہا۔ پہلے ان کے بیٹے ولی خان، پھر ان کی بہو بیگم نسیم ولی اور اب پوتے اسفندریار ولی۔ البتہ ان کے خاندان میں ایک نام ایسا بھی ہے، جو ان کی سیاست میں آمد سے قبل بھی معروف تھا۔ اور یہ نام خان عبدالجبار خان کا تھا، جو ان کے بڑے بھائی تھے۔ عبدالجبار خان، غفار خان سے آٹھ برس بڑے تھے۔ انہیں احتراماً ڈاکٹر خان صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ 1882 میں اتمان زئی، چارسدہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہرام خان مقامی زمیں دار تھے۔ ایڈورڈ مشن ہائی اسکول، پشاور سے انہوں نے میٹرک کیا۔ بمبئی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ سینٹ تھامس اسپتال لندن سے اپنی تربیت مکمل کی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران انہوں نے فرانس میں خدمات انجام دیں۔ جنگ کے بعد وہ انڈین میڈیکل سروس کا حصہ بن گئے۔ ان کی تعیناتی مردان میں ہوئی۔ 1921 میں اصولوں کی بنیاد پر انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ انگریز سرکار انہیں وزیرستان میں تعینات کرنا چاہتی تھی جہاں پشتونوں کے خلاف آپریشن شروع ہونے والا تھا اور وہ اس کے خلاف تھے۔

جب آزادی ہند کی تحریک شروع ہوئی، ان کا شمار اپنے علاقے کی نمایاں شخصیات میں ہوتا تھا۔ ان کے بھائی بھی سرگرم ہو چکے تھے۔ فکری طور پر یہ گھرانا ترقی پسند فکر کا حامل تھا اور کانگریس کی جانب رجحان رکھتا تھا۔ 1930 میں ان کے سیاسی سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ 1935 میں وہ قانون ساز اسمبلی میں شمال مغربی سرحدی علاقے کے نمائندے کے طور پر منتخب ہوئے۔ 1937 میں صوبائی الیکشن ہوئے۔ وسائل محدود تھے، اس کے باوجود انہوں نے واضح کامیابی حاصل کی اور سرحد میں پہلی کانگریس

سرکار قائم کی۔ سرحد کی صوبائی اسمبلی میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تو سبب ڈاکٹر خان صاحب ہی تھے۔

قیام پاکستان کے وقت وہ چیف منسٹر تھے۔ ان کے نظریات نئی حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ ان کی مقبولیت کو خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ ہزارہ میں نظر بند رکھا گیا۔ عبدالقیوم خان کے دور میں وہ پابند سلاسل رہے۔ ان کے بھائی بھی زیر عتاب آئے۔ بعد میں سردار بہادر خان کی کوششوں سے ان کی رہائی ممکن ہوئی۔ وقت کے ساتھ ان کے نظریات اور طرز سیاست میں تبدیلی آئی۔ 1954 میں محمد علی بوگرہ کی کیبنٹ میں وہ وزیر اطلاعات رہے۔ اپنے اس فیصلے کی وجہ سے ان کی سیاسی راہیں اپنے بھائی سے الگ ہوگئیں۔ ون یونٹ کا زمانہ شروع ہوا۔ 1955 میں انہوں نے مغربی پاکستان کے پہلے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ مارچ 1957 میں جب صوبائی اسمبلی میں بجٹ رد کر دیا، انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ حکمران جماعت مسلم لیگ میں پیدا ہونے والے اختلافات کی وجہ سے وہ اس سے الگ ہوگئے اور ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی۔

سیاست میں ان کا اثر ورسوخ سرحد کے علاقے میں بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ 9 مئی 1958 کو صبح ساڑھے آٹھ بجے... عطا محمد نامی ایک شخص نے لاہور میں انہیں قتل کر دیا۔ اس وقت وہ اپنے بیٹے کے گھر



کے باغ میں بیٹھے ایک فوجی افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ اس صبح 1959 الیکشن سے متعلق چند اہم امور زیر بحث آنے والے تھے۔ قاتل کا تعلق میانوالی سے تھا اور وہ ایک پٹواری تھا، جسے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا اور اس کا حکم براہ راست علامہ مشرقی نے دیا تھا۔

ڈاکٹر خان صاحب کو چارسدہ میں دفنایا گیا۔ اس وقت کے صدر پاکستان نے انہیں عظیم پشتو رہنما اور ایک مہذب انسان قرار دیا، جس نے آزادی کے لیے طویل جدوجہد کی، جسے بھلانا سہل نہیں۔

## ☆ عمر اکمل

اس 25 سالہ کھلاڑی کو موجودہ پاکستانی ٹیم کے متنازع ترین کھلاڑیوں میں شمار کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ انتہائی باصلاحیت، مگر انتہائی لاابالی۔ اچھا بلے باز، خراب فیصلہ ساز۔ ملک پر خاندان کو ترجیح دینے کا الزام بھی اس پر عاید کیا جاتا ہے۔ مشکوک سرگرمیوں کی جانب بھی کچھ حلقوں نے اشارہ کیا۔ کئی تنازعات میں اس نوجوان نے خود کو پھنسایا۔

محمد برادرز کا ایک زمانے میں چرچا تھا۔ اس خاندان کا جو فرد ٹیم کا حصہ بنا، اس نے صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ خود کو منوایا۔ اکمل برادرز کا معاملہ برعکس تھا۔ ہاں، انہوں نے بھی پاکستانی ٹیم میں جگہ بنائی۔ ایک وقت ایسا تھا، جب تینوں بھائی مختلف فارمیٹ کی ٹیم کا حصہ تھے، کھلاڑی تو ٹھیک ٹھاک ہیں مگر محمد برادرز سے کہاں موازنہ۔ صلاحیتوں کے بھرپور اظہار میں ناکام رہے۔

اس وقت ہمارا موضوع ہیں عمر اکمل۔ اکمل برادرز میں تیسرے بھائی۔ وہ 26 مئی 1990 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ کرکٹ خون میں تھی۔ دونوں بڑے بھائی اس ماحول سے آشنا تھے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ عمر نے ان ہی کے نقش پا کا تعاقب کیا۔ وکٹ پر رک کر بھی کھیلتے اور جب ضرورت ہوتی تو ہارڈ ہٹنگ کرتے۔ 2008 کے انڈر 19 ورلڈ کپ میں ان کی کارکردگی متاثر کن رہی، جس نے انہیں سوئی سدرن گیس ٹیم کا حصہ بنا دیا اور انہیں قائداعظم ٹرافی میں جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ چوتھے ہی فرسٹ کلاس میچ میں 248 رنز کی تباہ کن اننگز کھیلی۔ کچھ روز بعد 186 رنز کی متاثر کن اننگز داغ دی۔ 2009 میں پاکستان اے ٹیم نے آسٹریلیا کا دورہ کیا تو عمر کو اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ قومی ٹیم کے لیے راہ ہموار ہونے لگی۔ گو کچھ حلقوں کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ قبل از وقت ہے مگر پاکستانی ٹیم کی کمزور بیٹنگ نے ان کی مشکل آسان کر دی۔

انہوں نے 23 نومبر 2009 کو نیوزی لینڈ کے خلاف اپنے ٹیسٹ کیریر کا آغاز کیا۔ پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں 129 رنز کی تیز رفتار اننگز کھیل کر سب کو چونکا دیا۔ یہ بے حد اہم اننگز تھی۔ یاد رہے کہ انہوں نے جب سری لنکا کے خلاف ون ڈے ڈیبیو کیا، تب وہاں بھی سنچری جڑی تھی۔ ان اننگز کے بعد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے، مگر کچھ ہی روز میں ان کی طبیعت کا لاابالی پن ظاہر ہونے لگا۔ جس زمانے میں وہ ٹیم کا حصہ بنے، ان کے بھائی کامران اکمل ٹیم کا مستقل جزو تھے، تاہم ان کی وکٹ کیپنگ کی صلاحیتوں پر ہمیشہ انگلیاں اٹھائی گئیں۔ عمر بھی کیپنگ کر سکتے تھے، سو انہیں دستانے سونپ کر کامران کو باہر بٹھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پر ایک روز یہ خبر اخبارات کی زینت بنی کہ عمر اکمل مصر ہیں کہ ان کے بھائی کو بھی ٹیم میں شامل کیا جائے، ورنہ وہ نہیں کھیلیں گے۔ کچھ رپورٹس کے مطابق اسی چکر میں انہوں نے خود کو انجرڈ بھی ظاہر کیا۔ یہ تاثر دیا کہ وہ انجری کی وجہ سے بیٹنگ تک محدود ہیں، وکٹ کیپنگ نہیں کر سکتے۔ آنے والے برسوں میں اس طرح کے چند اور واقعات ہوئے، جہاں عمر ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتے نظر آئے۔

عمر 16 ٹیسٹ میچز میں 35.82 کی اوسط سے 1,003 رنز بنا چکے ہیں، جن میں ایک سنچری اور چھ نصف سنچریاں شامل ہیں۔ 111 ون ڈے میچز میں انہوں نے 34.67 کی اوسط سے 2,913 رنز بنائے، جن میں دو سنچریاں اور 20 نصف سنچریاں شامل۔ انہیں ٹی 20 اسپیشلسٹ کہا جاتا ہے، مگر وہ 63 میچز میں 26.86 کی اوسط سے فقط 1,343 رنز ہی اسکور کر سکے۔ ہاں وہ باصلاحیت اور نڈر ہیں، مختصر فارمیٹ میں خاصی امیدیں ان سے وابستہ کی جاتی ہیں، مگر وہ امیدیں بہت کم پوری ہوئیں۔ اس وقت وہ کیریر کے مشکل موڑ پر ہیں۔ ایشیا کپ اور ورلڈ کپ ہارنے

والی ٹیم کے جن کھلاڑیوں کی کارکردگی پر سب سے زیادہ اعتراضات اٹھائے جارہے ہیں، عمراکمل ان میں نمایاں۔

## ☆ ہارون

90 کی دہائی میں پاکستانی پاپ میوزک اپنے اوج پر تھا۔ جنید جمشید، سجاد علی اور اسٹرنگز خود کو منوا چکے تھے۔ نئے گلوکار، نئے بینڈز آرہے تھے۔ ایک جانب عجم شیراز کا چرچا تھا، دوسری طرف شہزاد رائے کا۔ اس زمانے میں جس بینڈ نے سب سے زیادہ متوجہ کیا، وہ تھا ''آواز''۔ گو یہ بینڈ بعد میں ٹوٹ گیا مگر جب تک یہ رہا، اس نے دلوں پر راج کیا۔

''آواز'' دو فنکاروں فاخر اور ہارون کی مشترکہ کاوش تھا اور آج ہمارا موضوع آخرالذکر ہے۔ یعنی ہارون۔

ہارون راشد کو آج فقط ایک گلوکار نہیں، بلکہ ایک کامیاب پروڈیوسر اور سماجی کارکن کے طور پر بھی شناخت کیا جاتا ہے۔ ان کے البمز کی دنیا بھر میں لاکھوں کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کئی اہم مقامات پر پرفارم کیا۔ دنیائے موسیقی میں خود کو منوانے کے بعد انہوں نے ایک ایسا کام کیا، جس نے نہ صرف پاکستانی شائقین کو گرویدہ بنالیا، بلکہ شوبز انڈسٹری میں نئے رجحانات بھی متعارف کروائے۔ یہ تھا ان کا اینیمیٹڈ ٹی وی شو ''برقعہ اونجر'' (Burka Avenger)، جس نے نہ صرف ریکارڈ کامیابی حاصل کی، بلکہ سماجی برائیوں کی اس سادگی سے نشان دہی کی کہ سب کے منہ سے بےساختہ واہ نکلا۔

وہ 11 مئی 1976 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ذہین بچے تھے۔ اوائل عمری میں موسیقی کی جانب مائل ہوئے۔ گھر والوں نے روک ٹوک نہیں کی۔ ساتھ تعلیم بھی چلتی رہی۔ تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک جانا ہوا۔ انہوں نے جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے 90 کی دہائی کے اوائل میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجویشن کیا۔ لوٹ کر انہوں نے بینڈ بنانے کا سوچا۔ اس منصوبے میں ان کے دوست فاخر بھی شامل تھے۔

16 برس کی عمر میں ہارون نے ایک گیت ''جان من کہنا کیا ہوا'' کمپوز کیا تھا۔ پہلے یہی گیت مکمل کیا گیا۔ اس کی ویڈیو بنائی اور ایم ٹی وی ایشیا کو بھیج دی۔ یہ پہلا پاکستانی گانا تھا، جو اس چینل نے نشر کیا۔ یہ امر پاکستانی میوزک انڈسٹری میں ان کے لیے لانچنگ پیڈ ثابت ہوا۔

1992 میں ان کا پہلا البم ''جان من'' ریلیز ہوا، جس کے گیت تو انائی سے پر تھے، کانوں کو بھلے لگتے تھے۔ البم سپرہٹ ثابت ہوا۔ پھر ان کا بلاک بسٹر گانا ''وطن کہانی'' آیا، جس نے پوری انڈسٹری میں سنسنی پھیلادی۔ اس کی ویڈیو چارٹس پر نمبر ون رہی۔ اس کی وجہ سے ان کی البم کی فروخت راتوں رات آسمان پر پہنچ گئی۔ بعد میں بھی انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ گیت دیا۔ 1995 میں البم 'جادو کا چراغ' ریلیز ہوا۔ اس وقت ''آواز'' اپنی شہرت کے اوج پر تھا۔ اس کی ویڈیو بہت پسند کی گئی۔ ''میں نہ مانوں ہار سجنا'' آج بھی سماعتوں میں رس گھول رہا ہے۔

ان کے گیت مسٹر فراڈیے نے تو جیسے تہلکہ مچادیا۔ وہ ہر دل کی آواز بن گیا۔ کرپشن کو آج سے پہلے شاید ہی کسی نے اس خوبی سے منظر کیا ہو۔ اس کی ویڈیو کا چرچا بین الاقوامی چینلز تک بھی پہنچا۔ 1997 میں ریلیز ہونے والی ویڈیو 'اے جواں' نے بھی ملک بھر کے نوجوانوں کو توانائی سے بھر دیا۔ ہارون ایک بار پھر ''وطن کہانی'' والی شہرت کی سطح تک پہنچ گئے تھے۔ الغرض ''آواز'' نے ایک کے بعد ایک ہٹ گیت دیے۔ یوں لگتا تھا، یہ بینڈ ایک عرصے تک انڈسٹری پر راج کرے گا، مگر اندر حالات بگڑ رہے تھے۔ فاخر اور ہارون میں فاصلے بڑھ رہے تھے۔

نیا ہزاریہ ''آواز'' کے لیے بدقسمت ثابت ہوا۔ بینڈ ٹوٹ گیا۔ فاخر نے الزام عاید کیا کہ ''آواز'' ان کی اور ہارون کی مشترکہ کاوش تھی، مگر کریڈٹ ہمیشہ ہارون کو دیا جاتا۔ ہارون نے ''ہارون کی آواز'' کے نام سے البم بنایا، جو 2000 میں ریلیز ہوا۔ دوسری طرف فاخر کا البم بھی تیار تھا۔ البم پسند کیا گیا، مگر اس میں ''آواز'' والا جادو نہیں تھا۔ ہارون نے امریکا اور برطانیہ کے کامیاب دورے کیے۔ ان کی مزید ویڈیوز آئیں، جنھیں پسند کیا گیا۔ انہیں بی بی سی کی جانب سے ایوارڈ بھی ملا، مگر صاف محسوس ہوتا تھا کہ آواز کے سُر کہیں کھو گئے ہیں۔ 2002 میں ان کی ویڈیو ''محبوبہ'' آئی، جو یوں بھی خاصی مشہور ہوئی کہ وہ اس وقت کی مہنگی ترین کاوش تھی۔



2007 میں ان کا البم ''ہارون کا نشہ'' ریلیز ہوا۔ اس عرصے میں انہوں نے پروڈکشن کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ تجربات اور جدت طرازی ان کے کام آئے۔ ساتھ انہوں نے سماجی اور سیاسی ایشوز کو ہلکے پھلکے انداز میں موضوع بنایا اور خوب داد بٹوری۔ انہیں ڈنمارک کی جانب سے قیام امن کی کوششوں کے اعتراف میں سول ایوارڈ بھی ملا۔

ہارون نے فنکاروں کی فلاح و بہبود کو بھی پیش نظر رکھا۔ ''آل میوزک پرفارمنس پاکستان سوسائٹی'' کے بانی رکن ہیں۔ وہ کاپی رائٹ کے قانون کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے بھی خاصا کام کررہے ہیں۔

''برقعہ اونجر'' ان کی کامیاب ترین کاوش ٹھہری۔ یہ پاکستان کی پہلی 3D اینیمیٹڈ ٹی وی سیریز تھی، جس کی بازگشت بین الاقوامی دنیا تک بھی پہنچی۔ دنیا کے کئی ممالک میں اسے ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 2013 میں ٹائم میگزین نے اسے سال کے متاثر ترین کرداروں میں سے ایک قرار دیا، جو بہت بڑی کامیابی تھی۔

## ☆ رانی

کہتے ہیں، ناکامی ہی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ بات رانی پر صادق آتی ہے۔ اس خوبرو اداکارہ کو ابتدا میں بدترین ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کتنی ہی فلمیں ناکام ہوئیں۔ انہیں منحوس تصور کیا جاتا تھا۔ پروڈیوسر ان کے ساتھ فلمیں کرنے سے کترانے لگے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا، فلم انڈسٹری چھوڑ دو، یہاں تمھاری دال نہیں گلنے والی۔ مگر اس باصلاحیت اور بلند حوصلہ اداکارہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اور پھر وہ وقت آیا، جب وہ سچ مچ کی رانی بن گئیں۔ ان کے نام پر فلم بکا کرتی۔ پروڈیوسر ان کے گھر کے باہر لائن لگائے کھڑے تھے۔ کل تک ان کے نام پر طنز کرنے والے کہنے لگے: ''بھئی جیسا نام، ویسا مقام، رانی!''

اداکارہ رانی 8 دسمبر 1946 کو لاہور میں محمد شفیع اور اقبال بیگم کے گھر پیدا ہوئیں۔ رانی کا اصل نام ناصرہ تھا۔ ہدایتکار انور کمال پاشا نے ناصرہ کو رانی کے نام سے 1962 میں اپنی فلم ''محبوب'' میں متعارف کرایا۔ ابتدا میں کئی ناکامیاں ملیں مگر جب وحید مراد کا ساتھ ملا تو قسمت چمکی۔ 1967 میں ہدایتکار حسن طارق کی فلم ''دیور بھابی'' ریلیز ہوئی جو بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ رانی کے اچھے دن شروع ہوگئے تھے۔ اس فلم کا گیت ''اے رات بتا کیا'' بہت مقبول ہوا۔ اگلے سال ان کی ایک اور سپرہٹ فلم ''بہن بھائی'' ریلیز ہوئی، جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ اس کے گیت ''ہیلو ہیلو مسٹر عبدالغنی'' نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ آج بھی اس کے بول اور بےساختگی ناظرین کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ رانی کو رقص پر بڑی گرفت تھی۔ ''تھا یقین کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی'' جیسے گیت کو لازوال بنانے میں ان کے رقص کا بھی کلیدی کردار تھا۔

1970 میں ''انجمن'' ریلیز ہوئی، تو اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت ہوگئی کہ رانی ایک سپر اسٹار ہے۔ اس فلم کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ فلم کے گیتوں نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ ''اظہار بھی مشکل ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے'' اور ''آپ دل کی انجمن'' جیسے گیت آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ ساتھ ہی رانی کی شبیہہ ابھرتی ہے۔ ان کی فلم ''تہذیب'' بھی بہت پسند کی گئی۔ ''امراؤ جان ادا'' میں وہ اپنے فن کے اوج پر نظر آئیں۔ اس کے گیت کراچی سے خیبر تک شائقین کے دلوں میں گھر کر گئے۔ فلم کا گیت ''جو بچا تھا لوٹانے کے لیے آئے ہیں'' امر ہوگیا، تو میڈم نور جہاں کے ساتھ اس میں کچھ کمال رانی کا بھی تھا۔

اس کے بعد انہوں نے ''ایک گناہ اور سہی''، ''بہارو پھول برساؤ''، ''ناگ منی'' جیسی فلمیں کیں، جنہوں نے ان کا قد مزید بلند کیا۔ ان کی پنجابی فلموں نے بھی خوب دھوم مچائی، جن میں ''چن مکھناں'' سب سے نمایاں تھی۔ وہ اسکرین پر ایک سپر اسٹار تھیں۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھیں۔ فلم بین ان کی ایک جھلک دیکھنے کو گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہتے، مگر ان کی ازدواجی زندگی اتنی خوشگوار نہیں تھی۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ سکون کی تلاش نے انہیں بےکل رکھا۔ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔

27 مئی 1993 کو فقط 46 برس کی عمر میں اس حسین اداکارہ کا انتقال ہوا۔

# المناک

کاشف زبیر

ہوائی حادثے ہر روز ہوتے ہیں۔ سینکڑوں جانیں تلف ہوتی ہیں لیکن اس حادثے نے تاریخ کا ایک نیا باب رقم کیا۔ اذیت کوشی اور ہلاکت خیزی کی ایک ایسی داستان جس کا تذکرہ عرصے تک اخبارات کے صفحے پر جاری رہے۔

میگی بیتھ اور میں یعنی الیگزنڈر کارک ریکسن میں آرنٹ کے گھر پہنچنے والے تھے۔ میں نے گاکونا سے روانہ ہونے سے پہلے اسے کال کر دی تھی۔ یہ اکتوبر کا مہینا تھا اور 1977ء کا سال تھا۔ یہ سال ریکارڈ گرمی والا تھا۔ الاسکا میں اس سے پہلے اتنی گرمی سو سال پہلے پڑی تھی۔ عام طور سے اکتوبر تک الاسکا میں سب پیک ہو جاتا ہے۔ سیاح واپس جا چکے ہوتے ہیں اور ان سے متعلق تمام کاروبار اگلے سال مئی تک کے لیے بند یا محدود کیے جا چکے ہوتے ہیں۔ مگر اس سال یہاں سرما کا آغاز نہیں ہوا۔ شمال سے چلنے والی ہوائیں معمول کی خنکی لیے ہوئے تھیں اور ابھی ان میں کاٹ نہیں آئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر شکاری اور سیاح ابھی تک الاسکا کے جنگلوں میں براجمان تھے۔ تین دن پہلے مجھے آرنٹ کی کال آئی اور اس نے پوچھا۔ ''شمال کی طرف ایک پرواز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

آرنٹ ولیم شوقیہ ہواباز تھا اور میں اس کے چھوٹے سیسنا طیارے میں متعدد بار اس کے ساتھ پرواز کر چکا تھا۔ اس کی بیوی ایمی بھی اچھی ہواباز تھی۔ آرنٹ آرم ڈیلر تھا اور وہ یہاں آنے والے شکاریوں کو ہتھیار اور گولیاں فروخت کرتا تھا اس کا بزنس بہت اچھا چل رہا تھا۔ میں گیم آفیسر تھا کلاؤنے نیشنل پارک اور گیم ریزرو میں میری ڈیوٹی تھی۔ ہفتے میں پانچ دن میں وہاں رہتا تھا اور پھر دو دن کے لیے گاکونا آ جاتا تھا جہاں میرا گھر تھا۔ ہمارے دو بیٹے تھے جو اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بڑا شیرڈ نائن گریڈ میں تھا اور ایک مہینے پہلے اس کی چودھویں سالگرہ منائی گئی تھی اس سے دو سال چھوٹا ڈیوڈ ساتویں گریڈ میں تھا۔ میگی نرس تھی اور مقامی اسپتال میں کام کرتی تھی۔ میں نے آرنٹ کی پیشکش اس کے سامنے رکھی۔ میگی کافی تیار کر رہی تھی اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔

''مسئلہ تو کوئی نہیں ہے لیکن کیا یہ کچھ لیٹ نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ شمال میں موسم خراب ہو سکتا ہے۔''

''آرنٹ نے کہا ہے کہ اس نے موسم کی رپورٹ لی ہے آنے والے ایک ہفتے میں موسم صاف رہے گا۔''

''بچے اسکول جا رہے ہیں۔'' میگی نے دوسرا بہانہ کیا۔

''کم آن وہ اب بڑے ہو گئے ہیں اور اپنی دیکھ بھال کر سکتے ہیں اور صرف دو دن کی تو بات ہے تیسرے دن ہم واپس آ جائیں گے۔''

میگی کسی قدر رضامند ہو گئی۔ میں نے فوری آرنٹ کو کال کی۔ ''میگی تقریباً مان گئی ہے، اُمید ہے کہ ہم تمہارے ساتھ اس ٹرپ پر ہوں گے۔''

میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ بچوں کو بتایا اور انہیں خبردار کیا کہ ہماری غیر موجودگی میں کسی غیر ذمے دارانہ حرکت سے گریز کریں گے۔ میگی نے حسبِ معمول اپنی میڈیکل کٹ ساتھ لی تھی۔ اس کا کہنا تھا جیسے ایک ڈاکٹر



ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے اسی طرح ایک نرس بھی ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتی ہے۔ میں نے اگلی شام روانہ ہونے سے پہلے آرنٹ کو کال کر کے اپنے آنے کا بتایا تو اس نے اطلاع دی۔ ''اس بار ہمارے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔''

یہ مہمان سام اور لوزیانہ تھے۔ دونوں میاں بیوی تھے اور انہوں نے حال ہی میں شادی کی تھی۔ سام کولوراڈو میں میڈیکل کا طالب علم تھا۔ لوزیانہ اسی یونیورسٹی میں پیتھالوجسٹ بن رہی تھی۔ دونوں بائیس کے آس پاس اور دلکش تھے۔ گزشتہ سال آرنٹ اور ایمی کولوراڈو گئے تھے تو وہاں سام سے ملاقات اور پھر دوستی ہو گئی۔ انہوں نے ان دونوں کو الاسکا آنے اور اپنے ساتھ ایئر ٹرپ پر جانے کی دعوت دی۔ سام اور لوزیانہ جسے پیار سے لز کہتے تھے۔ خاص اسی مقصد کے تحت یہاں آئے تھے۔ اتفاق سے آرنٹ کا سیسنا طیارہ چھ سیٹوں والا تھا۔ جب میں اور میگی آرنٹ کے گھر پہنچے تو وہ دونوں آ چکے تھے۔ آرنٹ نے اپنے گھر کے عقبی صحن میں باربی کیو کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ہم نے وہیں کھانا کھایا اور گیارہ بجے سب سونے کے لیے اٹھ گئے کیونکہ ہمیں صبح نو بجے روانہ ہونا تھا۔ تقریباً نو سو کلومیٹرز کا یہ سفر تین گھنٹے میں طے ہوتا۔ ہمیں بحیرہ بیوفورٹ کے کنارے واقع آرکٹک نیشنل پارک کے آخری سرے پر واقع عارضی آبادی کاک ٹووک میں اترنا تھا۔ یہ شمال کی طرف آخری آبادی تھی۔ یہاں صرف سرکاری حکام اور تحقیق کے لیے آنے والے سائنس داں اور ماہرین رہتے تھے۔ مگر وہ بھی اکتوبر کی آمد کے ساتھ ہی کاک ٹووک سے رخصت ہو جاتے تھے۔ نومبر کے آغاز میں باقی ماندہ افراد بھی چلے جاتے تھے اور آنے والے چھ مہینے کے لیے یہ جگہ مکمل ویران رہتی تھی۔ دو گھنٹے قیام کے بعد ہمیں دو بجے واپسی کے لیے پرواز کرنی تھی تاکہ روشنی میں ہی واپس ریکسن پہنچ جائیں۔ اگرچہ آرنٹ کا طیارہ تاریکی میں بھی پرواز کر سکتا تھا مگر اس صورت میں اسے گراؤنڈ ٹریفک کنٹرولر کی مدد لازمی درکار ہوتی اور پھر وہ کسی باقاعدہ ایئرپورٹ پر ہی اتر سکتا تھا جہاں رن وے لائٹس ہوتیں۔ اس لیے تاریکی سے پہلے واپسی پروگرام کا لازمی حصہ تھی۔

صبح سات بجے اٹھے اور آٹھ بجے تک ہم ناشتا کر کے تیار ہو گئے۔ آرنٹ نے گزشتہ روز ہی اپنا طیارہ چیک کر کے تیار کر لیا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے ایئر کلب پہنچے۔ آرنٹ نے پرواز کے لیے ضروری لوازمات پورے کیے۔ متعلقہ حکام کو پرواز کی سمت، منزل اور واپسی کا وقت بتایا تاکہ ایمرجنسی کی صورت میں حکام ہماری فوری مدد کر سکیں۔ ویسے تو طیارے میں ریڈیو بھی تھا اس سے مدد کا پیغام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ رابطے کے لیے ایک الگ سے ریڈیو تھا جو امدادی پیک میں تھا۔ ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر آ گئے۔ آرنٹ اور ایمی پائلٹ والے حصے میں تھے۔ پیچھے دو دو نشستیں آمنے سامنے تھیں۔ میں اور میگی پائلٹس سیٹوں کے پشت والی سیٹ پر

بیٹھے جب کہ ہمارے سامنے کیبن کے آخری حصے میں سام اور لز تھے۔

یہ ان کے لیے چھوٹے طیارے میں پرواز کا پہلا موقع تھا اس لیے وہ کچھ فکر مند تھے۔آرنٹ نے انجن اسٹارٹ کیا تو میگی نے سب کو چیونگم پیش کی تاکہ کان ٹیک آف کے دوران میں ہونے والے شور اور دباؤ سے محفوظ رہیں۔اس کے باوجود ٹیک آف کا مرحلہ سام اور لز پر بھاری گزرا تھا۔لز نے ابکائی لی اور منہ قے والی تھیلی سے لگا دیا۔ طیارہ تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا اور اس نے لیول فلائٹ شروع کی تو دباؤ کم ہو گیا اور لز کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ منٹ کے کچھ ٹکڑے کھانے کے بعد اس کی حالت اتنی بہتر ہوئی کہ اس نے اپنا کیمرا سنبھالا اور طیارے کے آس پاس اڑتے بادلوں اور دور نظر آنے والے پہاڑوں کی تصویریں لینے لگی۔

سب اپنے اپنے مشاغل میں لگ گئے تھے۔سام نے واک مین لگا لیا اور گانے سننے لگا۔میگی نے پشت سے سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔میں نے ایک رسالہ سنبھالا اور اسے دیکھنے لگا۔آرنٹ اور ایکی باری باری طیارے کو پائلٹ کر رہے تھے۔جیسے جیسے ہم شمال کی طرف جا رہے تھے زمین سفید اور سبزہ کم ہوتا جا رہا تھا۔سبزہ تو یہاں بہت تھا لیکن خزاں اور سردی کی وجہ سے مرجھا گیا تھا۔بلند جگہوں پر برف گری تھی اور بعض اونچے مقامات پر تو مستقل برف جمی رہتی تھی۔اس بلندی پر درجہ حرارت منفی میں تھا مگر کیبن کا درجہ حرارت خوشگوار تھا۔آرنٹ وقفے وقفے سے ایئر ٹریفک کنٹرولر سے موسم کا احوال لے رہا تھا۔تقریباً دو گھنٹے بعد جب ہم اپنی منزل سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر رہ گئے تھے تو آرنٹ کو پہلی تشویشناک خبر ملی۔ایئر ٹریفک کنٹرولر نے بتایا کہ بحیرہ بیوفورٹ کے اوپر بادلوں کا ایک حلقہ بن رہا ہے اور امکان ہے کہ چند گھنٹوں بعد وہ طوفان کا روپ اختیار کر لے گا۔مگر اسے کاک ٹووک تک پہنچنے میں شام کے چار بج سکتے ہیں اس سے پہلے وہاں طوفان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

آرنٹ نے رپورٹ ہمیں دی اور مشورہ لیا۔

''اب کیا کرنا چاہیے۔سفر جاری رکھنا چاہیے یا پھر واپسی کی راہ پکڑنی چاہیے؟''

یہ سن کر ہم مایوس ہوئے تھے کیونکہ سب ہی کاک ٹووک تک جانے کی خواہش رکھتے تھے۔میں اور میگی جانے کے حق میں تھے۔ایکی کا خیال تھا کہ خطرہ مول لینے کی بجائے واپسی کی راہ اختیار کی جائے۔لز بھی اس کی حامی تھی البتہ سام ہمارا حامی تھا۔کسی قدر بحث کے بعد میں نے تجویز دی۔ہمیں کاک ٹووک تک جانا چاہیے مگر وہاں قیام صرف ایک گھنٹے ہوگا۔ایک بجے ہم واپسی کے لیے پرواز کریں گے تو موسم یقیناً خاصا بہتر ہوگا۔طوفان چار بجے تک آسکتا ہے۔اس پر آرنٹ بھی ہمارا طرف دار ہو گیا اور دو کے مقابلوں میں چار ووٹ سے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ طیارے میں پرواز کے لیے خاصا ایندھن موجود تھا اور ایندھن کے کچھ اضافی ڈرم عقب میں رکھے تھے۔یہ ایندھن ہم کاک ٹووک میں طیارے کے ٹینک میں ڈال سکتے تھے۔ آرنٹ نے بتایا تھا کہ واپسی کا سفر تیزی سے ہوگا کیونکہ ایندھن کم ہونے سے طیارے کا وزن کم ہو جائے گا اور اسے تین کے بجائے ساڑھے تین سو کلو میٹرز فی گھنٹے کی رفتار حاصل ہو جائے گی۔

اب ہم برف کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے اور نیچے تا حد نگاہ سفید برف کی چادر تھی۔اس نے یہاں موجود جنگلوں کو بھی سفید کر دیا تھا۔یہ بہت خوب صورت منظر تھا اور لز اپنی مخالفت اور خوف بھول کر نیچے کی تصویریں لینے لگی۔کاک ٹووک کے نزدیک پہنچ کر آرنٹ نے وہاں ایئر اسٹرپ سے رابطہ کیا۔اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی اور رن وے کی نشان دہی کرنے کو کہا۔یہ معمول کی کارروائی تھی کیونکہ آرنٹ متعدد بار یہاں آچکا تھا۔اسے سب علم تھا مگر اصول اور قواعد کی پیروی لازمی تھی۔جب ہم رن وے تک پہنچے تو اس کے دونوں طرف سرخ رنگ کی کونز رکھ دی گئی تھیں۔رات میں ان کونز کے اندر روشنی ہوتی تھی جو رن وے کی نشان دہی کرتی تھی۔دن میں ان کا سرخ رنگ ہی کافی ہوتا تھا۔آرنٹ طیارہ رن وے کی سیدھ میں لایا اور آرام سے اسے نیچے اتار لیا۔ہمیں معمولی سا جھٹکا بھی نہیں لگا تھا۔طیارہ ٹیکسی کرتا ہوا اسٹرپ کے آخر میں چھوٹی سی عمارت کے سامنے رکا۔

''شاندار لینڈنگ۔'' میں نے داد دی تو آرنٹ مسکراتا ہوا نیچے اتر گیا۔یہاں کل دو افراد کا عملہ تھا۔ایک اٹینڈینٹ اور دوسرا اس کا نائب۔نائب نوجوان آدمی تھا۔ اس نے آرنٹ سے کسی خدمت کا پوچھا اور آرنٹ سے اس نے اسے عقبی حصے میں موجود ایندھن کے ڈرم طیارے کے ٹینک میں ڈالنے کو کہا۔اٹینڈینٹ نے ہمیں کافی کی دعوت دی مگر ہمارے پاس وقت کم تھا۔ہمیں ایک گھنٹے میں بحیرہ بیو



فورٹ کی برف سے ڈھکی سطح تک ہو کر واپس آنا تھا۔ہم نے اسکیز والے جوتے نکال کر پہن لیے اور بھاری کوٹ تو طیارے سے اترنے سے پہلے ہی پہن لیا تھا۔یہاں بلا کی سردی تھی اور درجہ حرارت منفی تین تھا۔اٹینڈینٹ نے ہمیں خبردار کیا کہ وہ تین بجے رن وے بند کر کے چلا جائے گا۔ آرنٹ نے اسے تسلی دی کہ ہم اس سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔طوفان کی اطلاع ان لوگوں کو بھی تھی اور اٹینڈینٹ نے ہمیں خبردار کیا۔

''یہاں کے طوفان بہت عجیب ہوتے ہیں اکثر اوقات ان کے بارے میں پیش گوئی غلط ثابت ہوتی ہے۔ ریڈار ان کی درست شدت نہیں بتا پاتا ہے۔''

رن وے پر برف کی پتلی سی پرت تھی مگر اس کے آس پاس برف بہت موٹی اور سخت ہو رہی تھی اس پر اس کی اسکیٹنگ کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ہم سب ہی اس کے ماہر تھے۔ذرا دیر بعد ہم بحیرہ بیوفورٹ کی طرف جا رہے تھے جو تقریباً ایک کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔اس کا جم جانے والا ساحل کسی قدر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ہمیں اس پر چڑھنے کے لیے زور لگانا پڑا تھا۔لز نے میگی سے برفانی ریچھوں کا پوچھا۔اس نے بتایا کہ وہ یہاں نہیں ہوتے ہیں۔وہ کینیڈا اور یورپ آرکٹک علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ایک زمانے میں الاسکا میں بھی ہوتے تھے مگر جب الاسکا روس کے پاس تھا تو روسیوں نے کھال کے لیے یہاں کے برفانی ریچھوں کو ختم کر دیا۔امریکیوں نے بھی انہیں یہاں دوبارہ بسانے کی کوشش نہیں کی۔اس لیے یہاں برفانی ریچھ نہیں پائے جاتے ہیں۔البتہ الاسکا میں سرخ ریچھ پائے جاتے ہیں جو خطرناکی میں سفید ریچھ سے بڑھ کر ہیں۔

''کیا وہ یہاں بھی ہوتے ہیں؟'' لز نے سہم کر پوچھا۔

''نہیں وہ پیچھے جنگلوں میں ہوتے ہیں اور اب تک تو وہ سرمائی خواب لینے اپنی کمیں گاہوں میں جا چکے ہوں گے۔'' آرنٹ نے کہا۔ہم اب سمندر کے اوپر تھے اور ہمارے قدموں تلے کئی فٹ موٹی برف کی تہ تھی۔جس کے نیچے سمندر تھا۔گرما میں چند مہینے کے لیے برف کی یہ تہ پگھل جاتی تھی اور سمندر سامنے آجاتا مگر اس کے بعد برف دوبارہ اپنا تسلط قائم کر لیتی تھی۔

ہم سمندر پر اسکی کر رہے تھے۔لز تصویریں لے رہی تھی۔میں اور میگی اسکی کرتے ذرا آگے نکل گئے۔ساحل

☆ نہار منہ عجوہ کھجور کے سات دانے جگر کی بیماری سے محفوظ رکھتے ہیں۔

☆ انجیر بہترین غذا اور دوا ہے مگر مقدار کا ضرور خیال رکھا جائے۔

☆ کلونجی موت کے سوا ہر بیماری کا علاج ہے۔سات دانے کلونجی نہار منہ لینے کی عادت بنالیں۔

سے دور برف کی تہ زیادہ موٹی نہیں تھی اور نیچے موجود سیاہ سمندر محسوس ہو رہا تھا۔میگی کو ڈر لگا۔

''یہاں سے چلو کہیں پرت ٹوٹ نہ جائے۔''

''یہ کئی فٹ موٹی ہے۔'' میں نے کہا۔''کاش کہ طوفان کا خطرہ نہ ہوتا تو ہم زیادہ دیر یہاں رکتے۔''

میگی کی بھی یہی خواہش تھی مگر ہمیں جلد واپس جانا تھا۔اس لیے وقت دیکھتے ہوئے ہم نے واپسی کی راہ لی اور جب ان لوگوں کے پاس پہنچے تو وہ سب فرش پر بیٹھی لز کے گرد جمع تھے۔وہ اپنا اسکی والا جوتا اتارنے کی کوشش کر رہی تھی اور کراہ رہی تھی۔میں نے پوچھا۔''کیا ہوا؟''

''اس کا پاؤں مڑ گیا ہے۔'' سام نے تشویش سے کہا۔''موچ آئی ہے لز کو شدید تکلیف ہو رہی ہے۔''

یقیناً اندر سوجن آگئی تھی اور جوتا پھنس رہا تھا۔میگی نے کہا۔''یہاں مت اتارو۔''

''تب کیا کریں؟'' سام نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

''لز کو واپس لے جانا ہوگا۔'' یہاں پاؤں کو سردی لگے گی تو تکلیف بڑھ جائے گی۔''

''مگر واپس کیسے لے جائیں؟'' یہ سوال ایکی نے کیا۔

''رن وے بلڈنگ میں سلیج والا اسٹیچر ہوگا۔وہ لے آتے ہیں اس پر لز آرام سے جا سکے گی۔''

''مگر وقت کم ہے۔'' آرنٹ نے گھڑی دیکھی۔ ''ہمیں یہاں آئے پچاس منٹ ہو چکے ہیں۔''

''مجبوری ہے۔'' میں نے کہا اور ایکی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ہم ہر ممکن تیزی سے رن وے بلڈنگ تک آئے۔ وہاں اسٹیچر تو نہیں تھا۔خوش قسمتی سے ایک چھوٹی سلیج مل گئی۔ہم اسے لے کر واپس آئے اور لز کو اس پر بٹھا کر اسے رن وے کی عمارت میں لے آئے۔یہاں میگی نے اس کا جوتا اتار کر دیکھا۔ٹخنہ سوج گیا تھا۔وہاں گرم پانی دستیاب تھا۔میگی نے اس سے سکائی کی اور پھر ایک دوا لیپ کر کے

گرم پٹی باندھ کر اس پر موزہ چڑھا دیا۔ باقی علاج اب ریکسن پہنچ کر ہی کیا جاتا۔ اس چکر میں ہمیں دو گھنٹے ہو چکے تھے اور جب آرنٹ نے طیارے کا انجن اسٹارٹ کیا تو آسمان سرمئی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اٹینڈ بنٹ نے ٹھیک کہا تھا کہ یہاں طوفان عجیب ہوتے ہیں اور ان کی درست پیش گوئی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ طیارہ بلند ہوا تو چند لمحے کے لیے تیز ہوا نے اسے ڈگمگا دیا تھا اور ہم سب اپنی سیٹوں پر ہل کر رہ گئے تھے۔

"میرے خدا۔" لز نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

"فکر مت کرو۔" ایمی نے مڑ کر کہا۔ "ہوا تیز ہو تو ٹیک آف کرتے ہوئے طیارہ ہل جاتا ہے۔ یہ چھوٹا طیارہ ہے کل وزن صرف اٹھارہ سو کلو گرام ہے۔"

چند منٹ بعد ہم تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے اور طیارہ اب ہمواری سے پرواز کر رہا تھا۔ واپسی کا سفر دو گھنٹے اور چالیس منٹ کا تھا۔ آرکٹک نیشنل پارک کے وسط میں پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس سے بچنے کے لیے آرنٹ طیارے کو پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر لے آیا تھا۔ یہاں بادل تھے اور موسم بہت سرد تھا۔ باہر کا درجہ حرارت بتانے والا تھرمامیٹر منفی نو درجے ظاہر کر رہا تھا۔ اچانک ہی سیسنا کا انجن کھانسنے لگا۔ اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ آرنٹ نے پریشان ہو کر چند بٹن دبائے تو آواز پھر سے ہموار ہو گئی۔ ایمی نے کہا۔ "شاید انجن کو ایندھن کی فراہمی میں ایئر آ گئی تھی۔"

"شاید ایندھن ڈالنے کے دوران میں کچھ ہوا بھی شامل ہو گئی ہو۔" آرنٹ نے کہا۔ اس کا لہجہ مطمئن تھا مگر اسی لمحے انجن پھر کھانسا اور اچانک بند ہو گیا۔ انجن کی آواز بند ہوئی تو ایسی خاموشی چھا گئی جس میں ہمیں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دینے لگی۔ سام نے کہا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"

آرنٹ انجن کا اسٹارٹر بٹن بار بار دبا رہا تھا۔ ایمی مڑ کر بولی۔ "اپنے اوسان بحال رکھو۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

اگر ہم جب سے آرنٹ کے ساتھ آ جا رہے تھے پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ لز کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ "میرے خدا اگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا تو؟"

"اچھی اُمید رکھو۔" میں نے نرمی سے کہا اور سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔ مجھے دیکھ کر باقی سب بھی سیٹ بیلٹ باندھنے لگے۔ میگی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ یخ ہو رہا تھا۔ آرنٹ پاگلوں کی طرح اسٹارٹر بٹن دبا رہا تھا مگر انجن میں جنبش بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس موقع پر ایمی نے ہوش سے کام لیا۔ اس نے کہا۔ "گلائیڈ کرو اور مے ڈے کا پیغام بھیجو۔"

آرنٹ نے ریڈیو پر کہا۔ "مے ڈے...... مے ڈے، میرے طیارے کا انجن بند ہو گیا ہے اور کام نہیں کر رہا۔" مگر دوسری طرف سے جواب نہیں ملا۔ آرنٹ مسلسل مے ڈے کا پیغام بھیج رہا تھا اور دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ایمی ریڈیو چیک کر رہی تھی اس نے کہا۔ "یہ کام نہیں کر رہا ہے دیکھو اس کا سرخ بلب روشن نہیں ہے۔"

آرنٹ نے چند بٹن اور دبائے تو انکشاف ہوا کہ طیارے کا برقی نظام کام نہیں کر رہا۔ شاید اسی وجہ سے انجن بند ہوا تھا کیونکہ فیول انجکشن سسٹم بجلی سے کام کرتا تھا۔ طیارے میں ایک متبادل پاور سپلائی سسٹم بھی تھا۔ آرنٹ نے اسے آن کرنا چاہا تو اس نے بھی کام نہیں کیا۔ ایک ایک کر کے اس کی ساری تدبیریں ناکام جا رہی تھیں اور ہم اپنی سیٹوں پر خوف زدہ سے آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ آرنٹ طیارے کو گلائیڈ کرنے والی پوزیشن میں لے آیا تھا۔ مگر یہ زیادہ دیر گلائیڈ نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی ہم پہاڑی علاقے میں تھے یہاں زمین زیادہ دور نہیں تھی۔ مگر بادلوں اور دھند کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک اور خطرناک صورت حال تھی۔ نیچے اترتے ہوئے طیارہ کسی پہاڑی سے ٹکرا جاتا تو آن واحد میں سب مارے جاتے۔ میگی نے آرنٹ سے پوچھا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"کریش لینڈنگ۔" اس نے طیارے کی فلائنگ اسٹک کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "سب اس کے لیے تیار ہو جائیں۔ اپنا سر آگے کی طرف جھکا لیں اور دونوں ہاتھ سر کے گرد لپیٹ لیں۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ آلٹی میٹر چار ہزار سات سو پچاس فٹ کی بلندی بتا رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس میں پچاس فٹ کی کمی ہوئی۔ میں نے حساب لگایا کہ طیارہ ہر چھ سیکنڈ میں پچاس فٹ نیچے جا رہا ہے اور اس کے نیچے جانے کی رفتار تقریباً آٹھ فٹ فی سیکنڈ ہے۔ یہ رفتار خاصی زیادہ تھی خاص طور سے پونے دو ٹن وزنی طیارے کے لیے جس میں خاصا ایندھن بھی بھرا ہوا تھا۔ میں نے آرنٹ سے کہا۔ "کیا اس کا ایندھن گرایا جا سکتا ہے؟"

''ہاں لیکن اگر انجن اسٹارٹ ہوگیا تو ہم ایندھن کے بغیر کیا کریں گے؟''

''اس رفتار سے یہ ایندھن کے ساتھ گرا تو اس میں آگ لگ سکتی ہے اور ہم جل کر مارے جائیں گے۔''

ایمی مسلسل اسٹارٹر بٹن دبا رہی تھی حالانکہ اب انجن اسٹارٹ ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی۔ آرنٹ نے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ جیسے ہی طیارہ ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آیا اس نے ایندھن کے ٹینک کو کھولنے والا بٹن دبا دیا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ طیارے کے نیچے ایندھن پھوار کی طرح گر رہا تھا۔ مگر ٹینک میں خاصا ایندھن تھا اور اسے خالی ہونے میں وقت درکار تھا۔ ایندھن بتانے والے میٹر کی سوئی سست روی سے نیچے جا رہی تھی۔ آرنٹ طیارے کو قابو کر کے اسے زیادہ دیر ہوا میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ وہ دیر سے اور سست رفتاری سے زمین سے ٹکرائے۔ میٹر بتا رہا تھا کہ اب بھی طیارے میں کوئی سو گیلن ایندھن تھا اور یہ بھی بہت زیادہ تھا۔ یہ فی سیکنڈ ایک گیلن کی رفتار سے گر رہا تھا اور یہاں طیارہ اب چھ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے نیچے جا رہا تھا۔ اچانک طیارہ بادلوں سے نکل آیا۔ نیچے تہہ در تہہ ڈھلانی جنگل تھا جو دھند میں لپٹا ہوا کسی عفریت کی طرح ہمیں نگلنے کے لیے بے قرار تھا۔ زمین چند سو فٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ایمی نے آرنٹ سے کہا۔ ''وہ ڈھلان دیکھو۔''

میں نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر سیٹ بیلٹ کی وجہ سے دیکھ نہیں سکا تھا۔ میگی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سام نے بھی لز کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں وہ زیر لب کچھ کہہ رہا تھا۔ میری یادداشت میں یہ آخری جھلک تھی۔ اس کے فوراً بعد ایمی کے چلاّنے کی آواز آئی۔ ایک وحشت ناک رگڑ کی آواز اور زلزلے نے طیارے کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ تاریکی چھا گئی۔ مجھے لگا میں تاریک سمندر میں ڈوب رہا ہوں اور ڈوبتا جا رہا ہوں۔ تاریکی نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا تھا اور میں اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پھر مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ ''الیک...... الیک......''

میں چونک کر ہوش میں آیا تو میرے سر اور شانے میں شدت کی تکلیف ہو رہی تھی۔ مجھے پکارنے والی میگی تھی۔ وہ مجھے ہلا رہی تھی اور روتے ہوئے پکار رہی تھی۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے سیٹ پر سیدھا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر نہ ہو سکا کیونکہ سیٹ ہی ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ یہاں اندھیرا سا تھا اور صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''تم ٹھیک ہو؟'' میں نے میگی سے پوچھا۔

''ہاں، میرے پیروں میں چوٹ آئی ہے لیکن میں ٹھیک ہوں۔''

''باقی لوگ؟'' میں نے سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ جام ہوگئی تھی۔ بہ مشکل میں اسے کھولنے میں کامیاب ہوا۔

''مجھے نہیں معلوم، مجھے کھولو۔'' میگی نے جواب دیا۔ میں نے ٹٹول کر اس کی سیٹ بیلٹ بھی کھولی۔ اس دوران میں میرے بائیں شانے کا درد بے پناہ شدت اختیار کر گیا تھا اور عملاً یہ ہاتھ ناکارہ ہو رہا تھا۔ میں کراہا تو میگی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''میرا بایاں شانہ۔''

اس نے ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ''کالر بون فریکچر ہے۔''

آرنٹ کا طیارہ اندر سے خوب صورت اور پُرآسائش تھا مگر اس وقت یہ کباڑ کا ڈھیر بن گیا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازے کا ہینڈل کہاں ہے۔ پائلٹ والے حصے میں شاخیں بھر گئی تھیں۔ آرنٹ اور ایمی ان میں چھپے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے سوا کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہونے لگیں اور تب میں نے لز اور سام کو دیکھا۔ دونوں اپنی نشستوں پر بے حرکت پڑے تھے۔ میں نے میگی سے کہا۔ ''انہیں دیکھو، میں باہر نکلنے کا راستہ بناتا ہوں۔''

میگی سامان ہٹاتی ان کے پاس جانے لگی اور میں طیارے کی باڈی ٹٹول کر اس میں دروازہ تلاش کرنے لگا۔ مگر حادثے نے طیارے کی صورت بگاڑ کر رکھ دی تھی اور اس کی باڈی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم زندہ کیسے بچے تھے؟ بالآخر کھڑکی کی مدد سے میں نے دروازہ تلاش کر لیا اور زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی مگر ٹیڑھی ہو جانے والی باڈی میں دروازہ پھنس گیا تھا۔ میں نے پیچھے ہو کر اسے لات ماری۔ لات کی ضرب نے شانے کی تکلیف میں اضافہ کر دیا تھا۔ مگر میں نے برداشت کرتے ہوئے پھر لات ماری اور تیسری لات میں دروازہ ٹوٹ کر باہر جا گرا۔ اس دوران میں میگی سام اور لز کو دیکھ رہی تھی اس نے سسکی لی۔ ''میرے خدا یہ زندہ نہیں ہے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا وہ سام کے پاس کھڑی تھی۔ ذرا روشنی ہوئی تو مجھے سام کی گردن پر ایک بڑا گھاؤ دکھائی دیا جس سے خون نکل کر نہ صرف اسے بلکہ سیٹ کو بھی تر کر گیا تھا۔ کسی چیز نے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ میں نے لز کا پوچھا تو میگی نے کہا۔ ''یہ زندہ ہے۔''

میں باہر نکلا تو میں نے خود کو تنگ سی جگہ پایا۔ ذرا دیر میں سمجھ میں آیا کہ طیارہ کسی نالے میں گرا تھا۔ اس کے دونوں پر اور دم کا حصہ غائب تھا۔ صرف کیبن والا حصہ بچا تھا۔ ونڈ شیلڈ سمیت تمام شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ باہر سے طیارے کی حالت زیادہ خراب تھی۔ ہر چیز ٹوٹ گئی تھی لیکن شکر ہے کہ آگ نہیں لگی تھی ورنہ کوئی بھی نہ بچتا۔ فضائی حادثوں میں سب سے زیادہ اموات جلنے سے ہوتی ہیں۔ میں گھوم کر پائلٹ والے حصے میں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ طیارہ نالے میں ہی اترا تھا اور گھسٹتا ہوا نیچے آیا تھا۔ راستے میں آنے والی جھاڑیاں ونڈ شیلڈ توڑ کر اندر گھس گئی تھیں اور کاک پٹ عملاً ان سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی وجہ سے اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آرنٹ والی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ یہ بھی جام ہو رہا تھا۔ اس کی ٹوٹی کھڑکی سے اندر گھس جانے والی جھاڑیاں اور شاخیں باہر نکل رہی تھیں۔ میں انہیں نکالتے ہوئے آرنٹ کو آواز دے رہا تھا۔ جواب میں اس کی کراہ سنائی دی تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔

''آرنٹ تم ٹھیک ہو؟'' میں نے جھاڑیاں نکالنے کی رفتار تیز کی۔ میگی بھی نکل کر آ گئی تھی۔ اس کی حالت معمولی زخموں کے سوا ٹھیک تھی۔ آرنٹ زخموں سے چور اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور ایمی کو آوازیں دینے لگا۔ میگی اس کی طرف سے جھاڑیاں نکال رہی تھی۔ ایمی اپنی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ آرنٹ کھڑکی کے راستے باہر آیا۔ میں نے اب تک اسے سام کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے خود پوچھا۔ ''سام اور لز کیسے ہیں؟''

''لز زندہ ہے مگر سام......'' میں نے افسوس سے سر ہلایا تو آرنٹ پچھلے حصے کی طرف جھپٹا تھا۔ سام کی موت نے اسے شدید دھچکا دیا تھا۔ وہ رونے لگا۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ ''یہ وقت افسوس کا نہیں ہے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ اب تک گمشدگی کی اطلاع حکام تک پہنچ گئی ہوگی؟''

''نہیں۔'' آرنٹ نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی ساڑھے تین ہوئے ہیں۔ ساڑھے چار سے پہلے کسی کو احساس نہیں ہوگا۔ اگر میں مے ڈے کا پیغام بھیجنے میں کامیاب ہوتا تو اب تک ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوتی۔''

طیارہ پرواز کے پندرہ منٹ بعد حادثے کا شکار ہوا تھا۔ گویا ہم سوا گھنٹے تک بے ہوش رہے تھے۔ آرنٹ کی اطلاع حوصلہ شکن تھی۔ ساڑھے چار بجے کے بعد طیارے کی گمشدگی کا احساس ہوتا تب بھی امدادی حکام اس کا قطعی تعین نہیں کر سکتے تھے کہ طیارہ کہاں غائب ہوا ہے۔ طیارہ پورے نو سو کلو میٹرز کے روٹ میں کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا اور اسی لحاظ سے اس کی تلاش شروع کی جاتی۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگتا اور پانچ بجے تک غروب ہو جاتا اس کے بعد تلاش کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا ہمیں کل صبح سے پہلے کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں رکھنی تھی۔ اگر موسم ایسا ہی رہتا اور اس میں مزید خرابی کا امکان تھا تو ہماری تلاش کا امکان مزید محدود ہو جاتا۔ میرے ذہن میں بحیرہ بیوفورٹ سے اٹھنے والا طوفان تھا جو چار بجے تک کاک ٹودک تک پہنچ جاتا اور ہم اس جگہ سے سو کلومیٹرز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ طوفان زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں یہاں آ سکتا تھا اور ہمیں اس سے پہلے ایسی پناہ گاہ تلاش کر لینی تھی جہاں ہم مدد آنے تک زندہ رہ سکیں۔ اسی لیے میں نے آرنٹ کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس سے پہلے کہ طوفان یہاں آئے ہمیں کوئی مناسب جگہ تلاش کر لینی چاہیے۔''

اس دوران میں ایمی بھی ہوش میں آ گئی تھی۔ اس کی پسلیوں پر ضرب لگی تھی اور دایاں گھٹنا بھی زخمی تھا مگر وہ حرکت کر سکتی تھی۔ اب وہ دونوں مل کر لز کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہاں سردی شدت کی تھی اور کہرہ درختوں اور زمین پر جم رہا تھا۔ درجہ حرارت یقیناً منفی میں تھا۔ شروع میں تو احساس نہیں ہوا تھا مگر اب سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ سب نے اپنے گرم لباس تلاش کرنا شروع کیے۔ سامان الٹ پلٹ گیا تھا اس لیے ہمارے کپڑے بھی خاصی مشکل سے ملے۔ میرے اور میگی کے پاس موٹے اونی اوور کوٹ تھے۔ ان کے ساتھ روسی ساختہ فر والی گرم ٹوپیاں تھیں۔ اتفاق سے یہ ساری چیزیں مل گئیں۔ آرنٹ نے اپنی گرم روئی کی جیکٹ اتاری نہیں تھی۔ البتہ ایمی کا

کوٹ نہیں مل رہا تھا۔ طیارے کا بہت سا سامان باہر گرا تھا۔ ہم اس میں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ اچانک طیارے کی طرف سے لز کے رونے اور چلّانے کی آواز آنے لگی۔ وہ سام کو پکارتے ہوئے میگی اور ایمی سے لڑ رہی تھی کہ سام ان کی وجہ سے موت کا شکار ہوا تھا۔ انہوں نے بہ مشکل اسے چپ کرایا۔

یہاں نالے میں اتنا پتا نہیں چل رہا تھا مگر اوپر درختوں کے سرے ہلنا شروع ہو گئے تھے اور ان پر جما کہرا نیچے گر رہا تھا۔ یہ طوفان کی آمد کی اطلاع تھی۔ ایک جگہ مجھے میگی کی میڈیکل کٹ نظر آئی اور یہ کام کی چیز تھی۔ گرنے سے اسے نقصان نہیں ہوا تھا۔ نالا دو پہاڑیوں کے درمیان میں تھا اور طیارہ اس کے اوپری حصے میں گرا تھا۔ دائیں بائیں اگی جھاڑیوں نے اس کے پروں سے ٹکرا کر طیارے کی رفتار ختم کر دی تھی۔ ورنہ وہ کسی ہموار جگہ گرا ہوتا تو نہ جانے کتنی دور تک رگڑتا ہوا جاتا۔ مگر یہاں اسے تیس پینتیس گز سے زیادہ آگے جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ہماری بچت ہوئی تھی۔ ہم واپس آئے تو لز خود پر قابو پا چکی تھی۔ سام کی لاش کینوس شیٹ سے ڈھک دی تھی۔ لز کا کوٹ بھی مل گیا تھا مگر میگی عام شرٹ میں تھی۔ صرف اس کی پتلون گرم تھی۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر آرنٹ نے اپنی جیکٹ اتار کر زبردستی اسے پہنا دی۔

ہمارے پاس پانی کا ایک کین تھا جس میں دو گیلن پانی تھا۔ کافی کا تھرماس اندر سے ٹوٹ گیا تھا مگر اس میں کافی موجود تھی۔ تھرماس دھات کا تھا۔ کھانے کی باسکٹ ٹوٹ گئی تھی اور اس میں موجود سینڈوچز بکھر گئے تھے بہ مشکل ہمارے ہاتھ چند سینڈوچز آئے تھے۔ کچھ چاکلیٹ تھی۔ ایمی کی پسلیوں میں فریکچر تھا۔ میگی نے ہم دونوں کو طبی امداد دی۔ اس نے میری کالر بون سیٹ کر کے میرا ہاتھ ایک پٹی سے لٹکا دیا جو گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ کو سینے سے اس طرح باندھ دیا کہ وہ حرکت نہ کرے۔ ہمیں پین کلر اور اینٹی بایوٹک دیئے تھے۔ آرنٹ امدادی پیک تلاش کر رہا تھا یہ طیارے کے عقبی حصے میں تھا مگر یہ حصہ ہی ٹوٹ گیا تھا اور امدادی پیک یقیناً باہر کہیں گرا تھا۔ آرنٹ نے کہا۔ ”میں اسے تلاش کرتا ہوں اگر اس میں موجود ریڈیو سلامت ہوا تو ہم فوری مدد حاصل کر سکیں گے۔“

آرنٹ کی بات سن کر ہم سب پُر امید ہو گئے تھے۔ میں پہلی بار لز کے پاس آیا۔ وہ بھی زخمی تھی اس کے ہاتھوں، چہرے اور پیٹ پر زخم آئے تھے مگر اپنے شوہر کے غم میں وہ اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ میرے شانے سے لگ کر سسک کر رونے لگی۔ میگی اس کے زخم صاف کر رہی تھی۔ ایمی کو ایک چھوٹا کمبل مل گیا تھا اس نے وہ اوڑھ کر آرنٹ کی جیکٹ اسے واپس کر دی تھی۔ مجھے ٹارچوں کا ایک پیک ملا تھا۔ اس میں ایک بڑی طاقتور ٹارچ اور ایک ایمرجنسی لائٹ تھی اور خوش قسمتی سے دونوں کام کر رہی تھیں۔ ایمی نے بتایا کہ سام کی نشست کے نیچے ایک بڑی شیٹ تھی جو واٹر پروف بھی تھی۔ مگر اسے نکالنے کے لیے سام کو نشست سے ہٹانا لازمی تھا۔ آرنٹ ناکام واپس آیا تو میں نے اس کی مدد سے سام کی لاش آگے کاک پٹ کی نشست پر ڈال دی۔ اس کے بعد شیٹ نکالی یہ کوئی پندرہ فٹ طویل اور دس فٹ چوڑی شیٹ تھی۔ اس کے کنارے پر دھاتی رنگ لگے تھے جن سے رسی باندھی جا سکتی تھی اور رسی کا بنڈل بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے کہا۔

”اسے طیارے پر باندھ کر ہم آنے والے طوفان سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن طیارہ ڈھلان پر ہے اگر طوفان میں شدت ہوئی تو وہ اسے نیچے گرا سکتا ہے۔“ آرنٹ نے خدشہ ظاہر کیا۔ ہم نے باہر آ کر ڈھلان کا معائنہ کیا۔ یہاں زاویہ بیس ڈگری کا بن رہا تھا عام حالات میں یہ خطرناک نہیں تھا لیکن اگر ہوائیں بہت تیز ہو جاتیں تو طیارے کو نیچے گرا سکتی تھیں۔ آرنٹ نے میگی اور لز کے ساتھ مل کر اس کا سدباب شروع کر دیا۔ وہ پتھر اور لکڑی لا کر طیارے کے اگلے حصے کے آگے جمانے لگے۔ ان چیزوں کی یہاں کمی نہیں تھی۔ میں اپنے طور پر ان کی پوری مدد کر رہا تھا۔ یہ کام کر کے طیارے پر واٹر پروف شیٹ پھیلا کر اس کے سوراخ والے حصے ڈھانپنے لگے۔ اس کے دھاتی رنگز سے رسیاں باندھ کر ہم آس پاس جھاڑیوں اور درختوں کے تنوں سے باندھنے لگے۔ یوں طیارے کے گرنے کا خطرہ بھی کم سے کم ہو جاتا۔ جب تک ہم نے یہ کام نمٹایا تاریکی چھا چکی تھی اور ہواؤں میں شدت آ گئی تھی۔

اندر سے سارا ملبا صاف کر دیا تھا۔ بچ جانے والی رسی طیارے کے کیبن سے باندھ دی گئی تھی۔ طیارے کا فرش دھات کا تھا اس لیے ہم اس پر آگ جلا سکتے تھے مگر یہاں خشک لکڑی نہیں تھی اور گیلی لکڑی جلاتے تو اندر دھواں بھر جاتا اس لیے طیارے کے ملبے اور سامان میں سے وہ چیزیں



نکال لیں جو آگ پکڑ سکتی ہیں اور انہیں فرش پر جمع کر کے آگ دکھا دی۔ کچھ دیر بعد چھوٹا سا الاؤ روشن ہوا تھا تو اس کی گرمائش سے ہم سب کی جان میں جان آئی تھی۔ مصروفیت کی وجہ سے ہمیں شاید اب بھی سردی کی شدت کا درست اندازہ نہیں ہوا تھا۔ انسٹرومنٹ پینل پر لگا ہوا تھرمامیٹر ناکارہ ہو گیا تھا۔ مگر درجہ حرارت یقیناً صفر سے خاصا نیچے جا چکا تھا۔ ہم گرم کپڑوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ ایمی نے لرزتے لہجے میں کہا۔ ”ابھی طوفان نہیں آیا ہے تو یہ حال ہے طوفان کے دوران کیا حال ہوگا۔“

سردی کی شدت کم کرنے کے لیے کافی کو تھرماس سمیت آگ پر گرم کیا اور پھر کپڑے سے چھان کر سب نے باری باری تھرماس کے ڈھکن میں گرم کافی لی۔ اس سے ہمیں بہت سہارا ملا تھا۔ آگ کو مسلسل جلائے رکھنے کے لیے ہم اس میں چیزیں ڈال رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ جلانے کے قابل چیزیں ناکافی تھیں اور ہمیں جلد لکڑی کی ضرورت پڑے گی میں نے آرنٹ سے کہا۔ ”ہمیں لکڑی کی ضرورت ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ہم چل کر کچھ لکڑی لاتے ہیں۔“

”اکیلے نہیں میں چلوں گی۔“ میگی نے میرے بازو کی وجہ سے کہا۔ ”یہ تمہاری صحیح مدد نہیں کر سکے گا۔“

آرنٹ اور میگی باہر چلے گئے۔ ایمی نے کہا۔ ”یہاں لکڑی بہت نم ہے جلنے سے پہلے یہ بہت دھواں دے گی۔“

”تم فکر مت کرو مجھے آگ پر لکڑی خشک کرنی آتی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر میں میگی اور آرنٹ خاصی لکڑی لے آئے۔ ایک ڈھیر ڈال کر وہ اور لکڑی لینے چلے گئے تھے۔ کیونکہ پچھلے حصے میں زیادہ جگہ نہیں تھی اس لیے لائی جانے والی لکڑی کاک پٹ والے حصے میں رکھ دی۔ میں نے اس میں سے کچھ ٹکڑے لیے اور انہیں آگ پر سینکنے کے انداز میں خشک کرنے لگا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ مگر اس وقت یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور دوسرے میں اس طرح سے آگ بھی تاپ رہا تھا۔ دیکھا دیکھی ایمی اور لز میری مدد کرنے لگے۔ جتنی زیادہ خشک لکڑی ہمارے پاس موجود ہوتی۔ سردی سے اتنا ہی بچاؤ ہوتا۔ لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے بھی کر رہے تھے تاکہ اس کی نمی زیادہ تیزی سے زیادہ خشک ہو جائے۔ خشک ہونے والی لکڑی الاؤ کے پاس رکھ رہے تھے۔

ایک گھنٹے میں میگی اور آرنٹ خاصی لکڑی لے آئے۔ اس سے کاک پٹ والا حصہ پوری طرح بھر گیا تھا۔ یہ اس لحاظ سے بھی اچھا ہوا کہ اس طرف ونڈشیلڈ ٹوٹ جانے سے بہت بڑا سوراخ تھا جسے واٹر پروف شیٹ سے پوری طرح ڈھکا نہیں جا سکتا تھا اور رہ جانے والے سوراخ سے یخ ہوا اندر آ رہی تھی۔ مگر اب لکڑی نے اسے پوری طرح بند کر دیا تھا۔ خشک اشیا اور لکڑی کے باوجود کچھ نہ کچھ دھواں ہو رہا تھا۔ اسے باہر نکالنے کے لیے آرنٹ نے کیبن کی چھت میں موجود چھوٹا سا سوراخ کھول دیا تھا۔ اس سے دھواں باہر جانے لگا اور اندر اس کا اثر کم رہ گیا تھا۔ سردی کے مسئلے سے نمٹنے کے بعد ہم نے بچ جانے والے سینڈوچز سے پیٹ کی آگ سرد کی۔ یہ معمولی سی خوراک تھی مگر اس وقت ہمارے لیے بڑا سہارا تھی۔ چاکلیٹ کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اسے برے وقت کے لیے رکھ دیا جائے جب کھانے کو سینڈوچز بھی نہ رہیں۔

چار سیٹوں کے درمیان معمولی سی جگہ تھی مگر کاک پٹ کے عقب کو لگنے والی نشستیں نکالی جا سکتی تھیں اور ہم نے کوشش کر کے انہیں نکال دیا تھا اور ان کا ریگزین اور گدیلی سیٹیں اتار کر فرش پر بچھالی تھیں۔ اس سے خاصی جگہ ہو گئی تھی اور ہم سب آرام سے بیٹھے تھے۔ کھل کر لیٹنے کی یہاں گنجائش نہیں تھی۔ طیارے کے ملبے سے نکلنے والی تمام قابلِ آتش اشیا ہم دو گھنٹے میں جلا چکے تھے اور اب لکڑی سے الاؤ روشن تھا۔ اس لیے لکڑی خشک کرنے کا کام بھی مسلسل جاری تھا۔ اس مسلسل مشق کا صلہ ہمیں گرمائش کی صورت میں مل رہا تھا اور ہم دھوئیں سے بچے ہوئے تھے۔ میں نے اور آرنٹ نے خواتین سے کہا کہ وہ سو جائیں ہم دونوں جاگتے رہیں گے۔ چار گھنٹے بعد ہم انہیں اٹھا دیں گے اور خود آرام کریں گے۔ وہ تینوں سونے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں اور آرنٹ لکڑی خشک کرنے کے ساتھ ساتھ اس امکان پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اگر ہم خود کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی کا کیا امکان تھا۔ آرنٹ کے پاس ایک نقشہ محفوظ تھا۔ اس نے اندازے سے ایک جگہ انگلی رکھی۔

”ہم یہاں ہیں؟“

میں نے نقشے پر غور کیا۔ ”یہاں سے نزدیک ترین آبادی آرکٹک ولیج ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تقریباً ساٹھ کلومیٹرز دور ہے اور

ہمیں وہاں مدد مل سکتی ہے لیکن ہم جس قسم کے علاقے میں ہیں یہاں ساٹھ کلومیٹرز بنا کسی سڑک یا راستے کے تین گنا کر لو۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اوپر سے موسم جان لیوا حد تک سرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس موسم میں ان پہاڑوں پر سفر کرنا بہت ہی دشوار کام تھا۔ ہمارے پاس نہ تو خوراک تھی اور نہ ضروری سامان۔ ایسے میں ساٹھ کلومیٹرز کا سفر بھی ناممکن حد تک مشکل ہوتا۔ لز کے پاؤں میں موچ تھی۔ ایمی اور میں فریکچرز کا شکار تھے۔ صرف آرنٹ اور میگی کسی ایسے زخم سے محفوظ تھے جو ان کو معذور کر دیتا۔ دیکھا جائے تو میں، ایمی اور لز اس سفر کے لیے فٹ نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ ''ہم سب کے لیے سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر تم اور میگی جا سکتے ہو۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' میگی نے چونک کر کہا۔ وہ ہماری گفتگو سن رہی تھی۔

''میں اکیلا جا سکتا ہوں مگر میں ایمی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

ایمی سو چکی تھی اس لیے اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے آرنٹ سے کہا۔ ''اس موضوع پر صبح گفتگو کی جائے گی۔ ابھی ہمارے پاس خاصا وقت ہے یہ طوفان آسانی سے ٹلتا نظر نہیں آ رہا ہے۔''

طوفان کے ابتدائی آثار پانچ بجے نمودار ہوئے تھے اور سات بجے یہ اپنی شدت کے ساتھ آن پہنچا تھا۔ باہر ہوا خوفناک آوازوں میں چنگھاڑ رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کو جھنجوڑ رہی تھی۔ پتھر گر رہے تھے اور شاخیں ٹوٹ رہی تھیں۔ ان سب کی ملی جلی آوازیں جیسے قیامت کا تاثر دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی سہم گئے تھے۔ واٹر پروف شیٹ جہاں سے ذرا ڈھیلی تھی وہاں سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ آرنٹ وقفے وقفے سے اٹھ کر دیکھتا تھا کہ کہیں رسی تو نہیں نکل گئی یا شیٹ کہیں سے پھٹ تو نہیں رہی ہے۔ اگر شیٹ کہیں سے پھٹ جاتی تو تیز ہوا لمحوں میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی اور اس کے بعد ہم طوفان کی شدت کے سامنے رہ جاتے۔ یہ شیٹ اس وقت ہماری ڈھال تھی۔ اس لیے ہمیں اس کی بہت فکر تھی۔ وقت رفتہ رفتہ گزر رہا تھا۔ شور میں شاید ہی کسی کو نیند آئی سوائے ایمی کے۔ پین کلر نے اس پر اثر کیا تھا اور وہ سو گئی تھی۔ لز غنودگی میں جاتی اور پھر سسکیاں لیتی ہوئی چونک جاتی۔ میگی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی وہ اسے بانہوں میں لے لیتی۔

گیارہ بجے لکڑی خشک کرنے اور الاؤ کو روشن رکھنے کا کام عورتوں نے سنبھال لیا۔ میں اور آرنٹ آرام کرنے لگے۔ میں اس سیٹ سے پشت لگائے بیٹھا تھا جس پر سام کی لاش تھی۔ مجھے اس کا افسوس ہو رہا تھا اس کی عمر مرنے والی نہیں تھی۔ ابھی وہ پڑھ رہا تھا اور لز سے اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے شاید سو گیا تھا پھر میری آنکھ تیز آوازوں سے کھلی۔ آوازیں ایمی نکال رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں تکلیف تھی اور وہ جھک کر ابکائی جیسی آوازیں نکال رہی تھی لیکن اس کے پیٹ میں کچھ ہوتا تو نکلتا۔ میگی اور آرنٹ بار بار اس سے پوچھ رہے تھے کہ اسے کیا ہوا ہے۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے صرف ابکائیاں لے رہی تھی۔ میگی نے زور لگا کر اسے پیچھے کیا اور اس کا کمبل ہٹا کر پیٹ سے شرٹ اوپر کی تو پسلیوں سے ذرا نیچے ایک بڑا سا نیلگوں ابھار نظر آیا۔ ایمی نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں...... بہت درد ہو رہا ہے۔''

میں نے میگی کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید چوٹ سے پتے پر ورم آیا ہے۔''

میگی ایک کپڑا لے کر اسے آگ پر گرم کر کے ایمی کے پیٹ کی سنکائی کرنے لگی۔ سنکائی سے اسے فرق پڑا تھا اور درد کی شدت کے ساتھ ساتھ ورم میں بھی کمی آئی تھی۔ پھر میگی نے اسے چند اینٹی بایوٹک دیں۔ وہ کھا کر نڈھال انداز میں نیم دراز ہو گئی۔ آرنٹ نے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا تھا اور اس کے بال سہلا رہا تھا۔ ایمی کی تکلیف نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ ہم اس ویرانے میں بے یار و مددگار اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میگی نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ ''اگر یہ پتے کا درد ہے تو اسے پھر اٹھے گا۔ شاید کریش کے دوران اس کے پیٹ پر کچھ لگا جس نے پتے کو نقصان پہنچایا ہے۔''

''یہ خطرناک تو نہیں ہے؟''

''ہو بھی سکتا ہے، پتا پھٹ جائے تو آدمی اندرونی زہر پھیلنے سے مر جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں واحد حل پتا نکال دینا ہوتا ہے۔''

میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ ''یہاں سرجری ہو سکتی ہے؟''

میگی نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اول تو یہاں کچھ نہیں ہے دوسرے میں سرجن نہیں ہوں اس کا آپریشن تو



عام ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا۔''

''یعنی ایمی کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے؟''

''بالکل اور اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''مگر اس موسم میں ہم یہاں سے بھی باہر نہیں جا سکتے۔''

وہ درست کہہ رہی تھی موسم بہت بڑی رکاوٹ بن گیا۔ اس موسم میں نہ تو ہم تک مدد آ سکتی تھی اور نہ ہم کہیں مدد لینے جا سکتے تھے۔ سوائے صبر سے بہتر وقت کے انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات آرنٹ اور ایمی بھی سمجھ رہے تھے۔ میگی کا خدشہ درست ثابت ہوا چند گھنٹے بعد ایمی کو دوبارہ درد اٹھا تھا اور اس کا پیٹ ابھر آیا۔ میگی نے پھر سنکائی کی تو اس سے معمولی سا فرق پڑا تھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ مگر باہر مکمل تاریکی تھی اور طوفان اسی شدت سے جاری تھا۔ ہواؤں کے شور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہم لکڑی مسلسل جلا رہے تھے اور جلانے کے قابل لکڑی کم رہ گئی تھی۔ آرنٹ نے کہا کہ ذرا روشنی ہو جائے تو وہ باہر جا کر مزید لکڑی لے آئے گا۔ میگی ہر چار گھنٹے بعد ایمی کو اینٹی بایوٹک ڈوز دے رہی تھی۔ کافی اب اسے ہی دی جا رہی تھی۔ گرم کافی سے اسے سہارا ہوتا تھا۔

دس بجے کے قریب جب باہر کسی قدر روشنی ہو چکی تھی تو آرنٹ لکڑی لینے گیا۔ میگی اس کے ساتھ جانے کو تیار تھی مگر اس نے منع کر دیا اور ایمی کی دیکھ بھال کرنے کو کہا۔ وہ ایک طرف سے رسی کھول کر اور شیٹ ہٹا کر باہر گیا اور رسی مجھے پکڑا گیا کہ میں شیٹ کو ہٹنے سے روکوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس موسم میں باہر جانا اور لکڑی جمع کر کے لانا ہرگز آسان نہیں تھا۔ چھرے جیسے باریک برف کے ذرے اڑ رہے تھے اور باہر آنکھ کھلی رکھنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ آرنٹ ہم سب کے لیے یہ مشکل اٹھا رہا تھا۔ اس نے کئی چکر لگائے اور اچھی خاصی لکڑی جمع کر کے لے آیا اور جب خود آیا تو سر سے پاؤں تک برف میں اٹا ہوا تھا۔ اندر آنے سے پہلے اس نے خود کو جھاڑا اس کے باوجود خاصی برف تھی۔ سردی سے ایسا برا حال تھا کہ وہ آ کر الاؤ پر تقریباً گر گیا تھا۔ خاصی دیر تک آگ تاپنے کے بعد اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''میرے خدا باہر کیسی جان لیوا سردی ہے مجھے لگ رہا تھا کہ رگوں میں میرا خون منجمد ہو گیا ہے۔ بس ایک اچھی بات تھی کہ طوفان نے درختوں سے بے شمار شاخیں توڑ دی ہیں اور وہ نالے میں آ کر گری ہیں میں وہی جمع کر کے لا رہا تھا۔''

''یہ تو اچھی اطلاع ہے اگر شاخیں نزدیک ہیں تو میں بھی جمع کر کے لا سکتا ہوں۔''

''نہیں اس کام میں دونوں ہاتھ استعمال کرتا ہوں گے۔'' آرنٹ نے انکار کیا۔ ''تمہارے لیے مشکل ہوگا اور چوٹ لگ گئی تو تم زیادہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ فی الحال ہم مزید کسی مشکل کو دعوت نہیں دے سکتے۔''

میگی نے کہا۔ ''یہ لکڑی بھی کافی ہے۔ اب ہم ذرا احتیاط سے جلائیں گے تو بارہ گھنٹے جل جائے گی۔''

میں حسب معمول لکڑی خشک کر رہا تھا اور اسے جلنے کے قابل بنا رہا تھا۔ لز نے اپنے غم پر قابو پا لیا تھا اور خاموش تھی۔ دن میں ایمی کی تکلیف کم ہوئی تھی مگر شام تک یہ پھر بڑھنے لگی۔ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ آرنٹ اسے حوصلہ دے رہا تھا اور میگی بھی لگی ہوئی تھی مگر اس کی تکلیف میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ پیٹ کا ورم کبھی بڑھ جاتا اور کبھی کم ہو جاتا تھا۔ وہ شکایت کر رہی تھی کہ اسے لگ رہا ہے کوئی چھری سے اندر سے اس کا پیٹ کاٹ رہا ہے۔ جب تکلیف میں شدت آتی تو وہ یوں سانس لیتی کہ اس کا پورا جسم ہلنے لگتا تھا۔ میگی نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''اب اینٹی بایوٹک بھی اثر نہیں کر رہی ہے۔''

''پین کلرز؟''

''وہ پہلے ہی بے اثر تھیں کیونکہ یہ نارمل پین کلر ہیں اس قسم کے درد کے لیے دوسری پین کلرز درکار ہوتی ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اینٹی بایوٹک کام نہیں کر رہی ہیں اس کا مطلب ہے کہ اب سرجری ہی واحد حل رہ گیا ہے۔''

میں نے مایوسی سے باہر جاری طوفان کو دیکھا۔ ''اس کے ہوتے ہوئے ایسی کوئی امید نہیں ہے۔''

آرنٹ ہماری گفتگو سن رہا تھا اس نے کہا۔ ''میں جا سکتا ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے اختلاف کیا۔ ''تم باہر جا کر دیکھ چکے ہو کہ حالات کیا ہیں اور ایسے میں باہر زیادہ رہنا ممکن نہیں ہے۔''

''میں کوشش کر سکتا ہوں۔'' آرنٹ نے اصرار کیا۔

''اس طوفان میں راستہ بھٹک جانے کا بہت زیادہ امکان ہے۔'' میگی نے نقطہ اٹھایا۔ ''ہمارے پاس سمت بتانے والے آلات نہیں ہیں اور آسمان بھی صاف نہیں ہے

اس لیے تم کیسے پتا چلاؤ گے کہ تم درست سمت میں جا رہے ہو۔“

”تم نہیں جاؤ گے۔“ ایمی نے آرنٹ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہمیں اسی جگہ مدد کا انتظار کرنا چاہیے۔“

”تمہیں ڈاکٹر اور علاج کی ضرورت ہے۔“ آرنٹ نے بھرّائے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں یوں بیمار اور بے بس نہیں دیکھ سکتا۔“

”اگر تمہیں جانا ہی ہے تو تمہیں طوفان رکنے یا اس کی شدت کم ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں اس طرح کے طوفان دو سے تین دن جاری رہتے ہیں اور ابھی تو سرما کا آغاز ہے، اُمید ہے کہ طوفان زیادہ دیر جاری نہیں رہے گا۔“

”ہاں یہ جلدی گزر جائے گا۔“ ایمی نے سر ہلایا۔ ”شاید رات بارہ بجے کے بعد اس کی شدت کم ہو جائے تو پھر تم صبح جاسکو گے۔“

اب ہم میں سے کسی کا مدد کے لیے جانا لازمی ہو گیا تھا کیونکہ اس طوفان میں ہماری مدد یا تلاش کے لیے امداد آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میگی نے سامان کی تلاش کے دوران ایک پیکٹ فلیئرز کا برآمد کیا تھا۔ یہ آتش بازی کی طرح اوپر جا کر پھٹتا تھا اس کے ساتھ اس کا پستول بھی جس میں ڈال کر اسے چلایا جاتا تھا۔ مگر یہ اسی صورت میں کارآمد ہوتا جب کوئی امدادی پارٹی نزدیک آجاتی۔ حادثے کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور ہم نے بارہ گھنٹے پہلے آخری سینڈوچ بھی کھا لیا تھا۔ چاکلیٹ کانی کی طرح صرف ایمی کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ ویسے بھی یہ بہت کم تھی۔ اب ہم بھوک بھی محسوس کر رہے تھے اگرچہ یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی مگر اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کل تک سردی کی طرح بھوک بھی ایک مسئلہ بن جائے گی۔ سردی کا تو ہمارے پاس علاج تھا مگر بھوک کا کوئی علاج نہیں تھا۔

ایمی کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ رات بارہ بجے کے بعد طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی۔ ہواؤں کی رفتار کم ہو گئی تھی اور ان کی چنگھاڑ بھی اب پہلے جیسی خوفناک نہیں رہی تھی۔ البتہ اس طوفان نے ہر طرف برف کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ تین بجے تک نالے میں ہوا کا دباؤ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ برف باری بھی رک گئی تھی۔ البتہ آسمان پر بادل تھے اور موسم صاف نہیں ہوا تھا۔ لکڑی ختم ہونے والی تھی اس لیے میں اور آرنٹ باہر گئے۔ ہوائیں رکنے سے درجۂ حرارت میں بھی خاصا فرق آیا تھا اور اب یہ پہلے کی طرح کاٹ دار نہیں رہا تھا۔ ہم برف کرید کر لکڑی تلاش کر رہے تھے۔ باہر آرنٹ کو مجھ سے بات کرنے کا موقع ملا اور اس نے کہا۔ ”ایلگ مجھے جانا ہوگا۔ ایمی کی حالت ٹھیک نہیں ہے اسے علاج کی ضرورت ہے ورنہ وہ...... مر جائے گی۔“

یہ خدشہ میرے ذہن میں بھی تھا۔ ”مگر تم جاؤ گے کیسے برف نے رہے سہے نشان بھی مٹا دیئے ہوں گے۔ تم راستہ بھٹک گئے تو خود بھی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”میں خطرہ مول لوں گا۔ ایمی کی خاطر۔“ آرنٹ نے ایک عزم سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ خاموشی سے چلا جاؤں ورنہ ایمی مجھے جانے نہیں دے گی۔“

”خاموشی سے کیسے؟“

”ہم لکڑی لینے کے بہانے نکلیں گے اور میں چلا جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے بعد سب تمہیں دیکھنا ہو گا۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”دوست تم مجھ پر بہت بڑا بوجھ ڈال رہے ہو۔“

اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”ایلگ تم کو یہ بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ میں یہاں بیٹھ کر ایمی کو لمحہ بہ لمحہ مرتے نہیں دیکھ سکتا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تم کب روانہ ہو گے؟“

”جیسے ہی ذرا روشنی ہوگی۔“

آرنٹ کی روانگی کی خاطر ہم نے کم لکڑی چنی تھی اور جلد طیارے میں واپس آگئے۔ میگی نے لکڑی دیکھ کر کہا۔ ”یہ کم ہے جلد ختم ہو جائے گی۔“

”تاریکی میں اتنی ہی ملی ہے۔ ذرا روشنی ہو جائے تو پھر جاتے ہیں۔“ میں نے کہا تو میگی نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا۔ صبح سات بجے روشنی ہونے لگی تھی۔ آسمان پر بادل تھے مگر اب اتنے گہرے نہیں تھے۔ سردی کی وجہ سے ہوا بھی صاف تھی یعنی دھند نہیں تھی۔ آرنٹ نے مجھے اشارہ کیا پھر اس نے ایمی کے ماتھے پر پیار کیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

”لکڑی چننے۔“ آرنٹ نے کہا۔ ”تم حوصلہ رکھنا میں جلد واپس آؤں گا۔“



ایمی سمجھ رہی تھی کہ وہ ابھی کی بات کر رہا ہے مگر میں آرنٹ کے الفاظ کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ ہم باہر آئے اور لکڑیاں جمع کرنی شروع کیں۔ اس کے بنڈل بنا کر ہم طیارے کے اندر پہنچانے لگے۔ نالے میں بیچ بیچ درختوں سے ٹوٹی لکڑی کا اتنا بڑا ڈھیر تھا جس سے شاید ہفتوں آگ جلائی جاسکتی تھی۔ جب خاصی لکڑی پہنچا دی گئی تو آرنٹ نے مجھے اشارہ کیا اور ہم نالے سے نیچے اترنے لگے۔ یہاں خاصا ملبا تھا اور زمین ہموار نہیں تھی اس لیے آرنٹ نے نالے سے نکل کر سفر کرنے کا فیصلہ کیا اس نے اسی جگہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”اب تم واپس جاؤ لیکن میرے بارے میں فوری مت بتانا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ نالے کی دیوار پر چڑھنے لگے۔ ڈھلان کے اوپری حصے میں جا کر اس نے ہاتھ ہلایا اور دوسری طرف اترنے لگا۔ کچھ دیر اس کا سر نظر آتا رہا پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں واپس پلٹا اور طیارے کے نزدیک آیا مگر میری اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ باہر سردی اب بھی اچھی خاصی تھی اور اس میں چلنا پھرنا تو ممکن تھا لیکن ساکت کھڑے رہنے سے جسم کا درجۂ حرارت ضائع ہونے لگتا تھا۔ چند منٹ بعد میں اندر آیا تو ایمی نے فوراً سوال کیا۔

”آرنٹ کہاں ہے؟“

”وہ آس پاس کا جائزہ لے رہا ہے ممکن ہے ہمیں کوئی نشان نظر آجائے اور ہم وہاں تک جا کر مدد حاصل کر سکیں۔“

”کیسے نشانات؟“ میگی نے پوچھا۔

”یہاں جگہ جگہ ٹاورز بنائے گئے ہیں جہاں راستہ بھٹک جانے والوں اور حادثے کا شکار افراد کے لیے مدد کی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ بلندی کی وجہ سے یہ ٹاورز دور سے نظر آتے ہیں۔ ان میں مواصلاتی سسٹم بھی ہوتا ہے جس سے مدد طلب کی جاسکتی ہے۔“ میں نے تفصیل سے بتایا۔ ”یہ ٹاورز خاص طور سے سڑکوں اور آبادیوں سے دور جگہوں پر بنائے گئے ہیں۔“

ایمی پر امید ہو گئی۔ ”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

مگر میگی مشکوک تھی وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ میں کب جھوٹ بول رہا ہوتا ہوں اور کب سچ کہہ رہا ہوتا ہوں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔ میگی مجبوراً چپ ہو گئی۔ ایمی بار بار غنودگی میں چلی جاتی تھی اور پھر تکلیف اسے چونکا دیتی تھی۔ آرنٹ کو گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا کہ اس نے پوچھا۔ ”وہ اب تک کیوں نہیں آیا ہے؟“

میرے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ میں سچ بول دوں۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ایمی اصل میں وہ مدد لینے گیا ہے۔“

”مدد لینے گیا ہے مگر کہاں؟“ وہ تکلیف کے باوجود اٹھ بیٹھی۔

”آرکنگ ولیج۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ یہاں سے ساٹھ کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔“

ایمی نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”اور تم نے اسے جانے دیا جب کہ تم جانتے ہو کہ موسم کیسا ہے اور یہ علاقہ کتنا دشوار گزار ہے؟“

”میں نے اسے روکنے کی اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کی مگر وہ نہیں مانا۔“

”تب تمہیں چاہیے تھا مجھے بتاتے۔“ ایمی برہمی سے بولی۔ ”اگر اسے کچھ ہوا تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

میں نے ندامت سے کہا۔ ”ایمی اس نے تمہارا واسطہ دیا تھا وہ تمہاری خاطر گیا ہے۔ تمہیں طبی مدد کی ضرورت ہے وہ اس لیے گیا ہے۔“

ایمی رونے لگی تھی اور میگی مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھتی ہوئی اسے چپ کرانے لگی۔ ”پلیز ایمی مت رو تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ چپ ہو جاؤ مجھے یقین ہے آرنٹ کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ جلد مدد کے ساتھ آئے گا۔“

باہر روشنی تیز ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ شاید کچھ دیر میں بادل چھٹ جائیں۔ میں نے سوچا کہ بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ میں کھانے کو کچھ تلاش کروں کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بھوک ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ سچ مچ ایک طرف سے بادل چھٹ رہے تھے اور سورج کی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں نالے سے باہر جاسکوں میں نے بائیں طرف کی ڈھلان کا انتخاب کیا اور ایک مناسب جگہ سے اوپر چڑھ گیا۔ ایک ہاتھ سے یہ دشوار کام میں نے کیسے کیا یہ میں ہی جانتا تھا۔ اوپر چڑھ کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا مگر وہاں سوائے درختوں اور برف کے کچھ نہیں تھا۔ پھلوں یا کھانے کے قابل کسی نباتی شے کا ملنا بہت مشکل تھا کیونکہ اس کا سیزن گزر چکا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ شاید طوفان میں مارے جانے

والے کسی جانور یا پرندے کی لاش مل جائے اور ہم اس کے گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکیں۔

میں درختوں کے درمیان چل رہا تھا۔ میں نے ایک شاخ اٹھالی تھی اور برف کے ڈھیر پر جہاں شبہ ہوتا اس شاخ سے کرید کر دیکھتا تھا کہ برف تلے کیا ہے۔ ایک جگہ چند درختوں کے درمیان جھاڑی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس گیا اور شاخ سے جھاڑی ہلا کر دیکھ رہا تھا کہ اس میں سے جنگلی مرغی نکل کر چلاتی ہوئی بھاگی۔ شکر ہے مرغا نہیں تھا ورنہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا۔ مگر مرغے کی موجودگی بالکل ممکن تھی۔ مرغی جس طرح بلند آواز سے چلا رہی تھی۔ وہ شاید مرغے کو پیغام دے رہی تھی۔ میں جلدی سے جھاڑی میں گھسا۔ میری توقع کے عین مطابق گھاس اور پروں سے بنے گھونسلے میں چار عدد انڈے تھے میں نے انہیں اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ہر ممکن تیزی سے واپس نالے کی طرف آیا۔ جب تک میں نالے میں اترا مرغا یا مرغی نظر نہیں آئے تھے۔ یہ معجزہ ہی تھا جو مجھے اس موسم میں مرغی کے چند انڈے مل گئے تھے۔ میں طیارے میں گھسا تو ایمی پُرسکون تھی۔ میں نے مسرور لہجے میں کہا۔

”میں انڈے لایا ہوں۔“

”یہاں کوئی گروسری اسٹور بھی ہے۔“ میگی نے طنزیہ لہجے میں کہا مگر جب میں نے کوٹ سے انڈے نکال کر دکھائے تو انہیں بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اتفاق سے یہ چار انڈے تھے اور ہم بھی چار تھے۔ میں نے کافی کے خالی ہو جانے والے تھرماس میں برف بھری اور اسے الاؤ پر رکھ دیا۔ جب پانی ابلنے لگا تو اس میں ایک انڈا ڈال دیا۔ دس منٹ میں وہ فل بوائل ہو گیا۔ اسے نکال کر چھلکا اتارا اور پھر چاقو سے اس کے ٹکڑے کر کے سب نے چوتھائی انڈا کھایا تھا۔ خاصی دیر بعد ہماری پیٹ میں جانے والی یہ اوّلین خوراک تھی۔ اس گرم دیسی انڈے کی لذت اور ذائقہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ مجھے انڈے پسند نہیں ہیں مگر اس وقت وہ مجھے دنیا کی لذیذ ترین خوراک لگا تھا۔ باقی انڈے میگی نے سنبھال کر رکھ دیئے اور طے کیا کہ ہر چھ گھنٹے بعد ایک انڈا ابال کر کھایا جائے گا۔ ایمی کی بڑھی کم ہوئی تھی اس نے مجھ سے معذرت کی کہ اس نے مجھ پر غصہ کیا حالانکہ یہ آرنٹ کا فیصلہ تھا۔

”مجھے معلوم ہے وہ کتنا ضدی آدمی ہے اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔“ کہتے ہوئے ایمی کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ آگئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے تھے وہ میری خاطر گیا ہے۔“

”آرنٹ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ میگی نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“

میگی نے کچھ دیر بعد مجھ سے باہر چلنے کو کہا۔ اس نے رفع حاجت کا کہا تھا مگر اصل میں وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ باہر آکر اس نے تشویش سے کہا۔ ”ایمی کی حالت خراب ہو رہی ہے اس کا ورم نیلگوں سے اب چمکیلا سیاہ ہو رہا ہے اور یہ خطرناک علامت ہے۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے کہ وہ اس حالت میں کتنی دیر رہ سکتی ہے؟“

”اگر پتا نہ پھٹا تو وہ تکلیف برداشت کرتی رہے گی لیکن پتا پھٹ گیا تو اس کے پاس مشکل سے دو گھنٹے ہوں گے۔“

”ہم کچھ نہیں کر سکتے؟“

”جتنا بس میں تھا کر دیا۔ اب یہ آرنٹ پر ہے کہ وہ کتنی جلدی جا کر مدد لے آتا ہے۔“

میں نے اس علاقے میں جو ذرا سفر کر کے دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب تک آرنٹ پہاڑی علاقے میں رہے گا اس کے لیے سفر کرنا بہت مشکل ہوگا اور اس کی رفتار دو کلومیٹرز فی گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوگی اس کا مطلب تھا کہ اسے آرکٹک ویلج تک پہنچنے میں چوبیس گھنٹے لگ سکتے تھے۔ سفر کا آخری بیس کلومیٹرز کا حصہ آسان اور ہموار جنگلات پر مشتمل ہوتا۔ مگر جنگل میں سفر کرنا بہرحال آسان نہیں ہوتا۔ منزل تک پہنچنے کے لیے آرنٹ کو بہت زیادہ محنت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ اس کے باوجود یہاں امداد آنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ موسم صاف ہو رہا تھا اور اگر اسی طرح رہتا تو فضائی مدد بہت آسانی سے آجاتی۔ مگر موسم خراب ہو جاتا تو پھر مدد آنے میں دیر ہو سکتی تھی۔ میگی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ایمی کے لیے فکر مند ہے۔ وہ نرسنگ کے دوران میں اس قسم کے بے شمار کیس دیکھ چکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ کس حالت میں مریض کے پاس کتنا وقت ہوتا ہے۔

شام سے پہلے میں اور میگی دوبارہ باہر گئے اور ہم نے لکڑی جمع کر کے طیارے میں پہنچائی۔ اس دوران میں شمال کی طرف سے تیز اور خنک ہوا چلنے لگی تھی اس سے سردی کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ ہم گرم لباس میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ لکڑی جمع کر کے ہم نے کھانے کے لیے مزید کوئی چیز تلاش کرنا چاہی مگر وہاں اب کچھ نہیں تھا۔ میں ہمت کر کے مرغی والی جھاڑی تک گیا تو وہ بھی غائب تھی شاید انڈوں سے محرومی کے بعد مرغی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اب تک ہم دو انڈے ابال کر کھا چکے تھے اور دو ہی باقی تھے۔ ایمی کی حالت ہر گزرتے گھنٹے خراب ہو رہی تھی اس کی آنکھوں کے گرد حلقے آگئے تھے اور ہونٹوں کی رنگت عنابی ہو گئی تھی۔ وہ ذرا سی حرکت کرتی تو تکلیف سے تڑپ جاتی تھی اس لیے بالکل ساکت لیٹی تھی اور بولنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔ جب میگی نے تیسرا انڈا ابالا تو اس کا حصہ بہ مشکل اسے کھلایا تھا کیونکہ وہ منہ بھی مشکل سے کھول رہی تھی۔ آرنٹ کو گئے ہوئے چودہ گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور مجھے امید تھی کہ اس نے سفر کا مشکل حصہ طے کر لیا ہوگا۔

تیسرا انڈا ہم نے دس بجے کھایا تھا اور آخری انڈا صبح کے لیے رکھ دیا گیا۔ لز زیادہ تر آرام کر رہی تھی صرف ایک بار وہ میگی کا سہارا لے کر باہر گئی تھی۔ ایمی شروع میں چند بار باہر گئی تھی مگر جب اسے تکلیف شروع ہوئی تو وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ اب تو اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ رات کے لیے ہم نے طے کیا کہ باری باری میں، میگی اور لز جاگ کر آگ کو روشن رکھیں گے اور ایمی کا خیال رکھیں گے۔ گیارہ سے دو بجے تک میں جاگتا رہا پھر میگی کو اٹھا دیا۔ وہ پانچ بجے تک جاگی اور اس نے لز کو اٹھا دیا۔ آٹھ بجے لز نے مجھے جگایا۔ باہر روشنی ہو رہی تھی اور سب ہی جاگ گئے تھے۔ میگی نے آخری انڈا بھی ابال لیا تھا۔ ہم نے اس سے ناشتا کیا ایمی کی آنکھیں بالکل ہی اندر دھنس گئی تھیں اور وہ صورت سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ پورے جسم میں صرف اس کی آنکھیں ہی جنبش کر رہی تھیں اور باقی وہ گول مول سی ہو کر بالکل ساکت تھی۔ اس نے انڈا کھانے سے انکار کر دیا تھا اور میگی کو پیٹ کا معائنہ کرنے سے بھی روک دیا تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے مجھے صرف تکلیف ہوتی ہے۔“

میگی نے اس کی بات مان لی۔ معاملہ شروع سے ہمارے بس میں نہیں تھا اور ہم اس کے لیے اب سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آرنٹ کو گئے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور اگر وہ آرکٹک ویلج تک پہنچ گیا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس بجے تک مدد آجانی چاہیے تھی۔ ہوا اگرچہ تیز تھی مگر موسم ہیلی کاپٹر ریسکیو کے لیے صاف تھا۔ میں نے فلیئر گن نکالی۔ اس میں ایک درجن کارتوس تھے۔ میں نے سوچا کہ ضروری نہیں ہے کہ ہیلی کاپٹر کی آمد پر اسے استعمال کیا جائے۔ ممکن ہے آس پاس کچھ لوگ ہوں جو ہماری مدد کر سکتے ہوں مگر وہ ہم سے بے خبر ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے چند فلیئر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے میگی اور لز کو بتایا تو انہوں نے میرے خیال کی تائید کی۔ باہر نکل کر میں نے ایک نالے کے اوپری حصے میں جا کر ایک فلیئر فائر کیا۔ وہ خاصی بلندی پر جا کر آواز کے ساتھ پھٹا اور آسمان پر رنگین روشن لکیریں پھیل گئیں۔

میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا اور جب کوئی ردعمل نہیں ہوا تو میں واپس طیارے میں آگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہر آدھے گھنٹے بعد ایک فلیئر فائر کروں گا۔ آدھے گھنٹے بعد میں دوبارہ طیارے سے نکلا اور نالے کی بلندی پر گیا۔ ایک فلیئر اور فائر کیا اور حسب سابق چند منٹ کے انتظار کے بعد مایوس واپس آگیا۔ میگی نے بتایا کہ لکڑی بہت کم رہ گئی تھی۔ میں میگی کے ساتھ لکڑی جمع کرنے لگا۔ اس دوران میں ہم آنے والے وقت پر بات کر رہے تھے کہ اگر آرنٹ اپنی منزل پر نہ پہنچ سکا، وہ راستہ بھٹک گیا یا کسی حادثے کا شکار ہو گیا تو ہم پھر کیا کریں گے؟ کیا اپنے طور پر جدوجہد کریں یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مدد کا انتظار کریں۔ میگی نے کہا۔ ”اگر میں

آج بھی بھوکی رہی تو شاید کل تک مجھ میں کچھ کرنے کی ہمت باقی نہیں رہے گی۔''

''یہی حالت میری بھی ہے لیکن اصل مسئلہ ایمی کا ہے اسے فوری علاج کی ضرورت ہے اگر آرنٹ اپنی منزل پر نہیں پہنچا تو ایمی کا بچنا ممکن نہیں ہے۔''

بے پناہ سردی نے ہماری جسمانی توانائی زیادہ تیزی سے استعمال کی تھی اور اسی لیے بھوک زیادہ لگ رہی تھی۔ ہم ابھی سے کمزور ہونے لگے تھے۔ میگی ٹھیک کہہ رہی تھی کہ جلد ہمیں خوراک نہ ملی تو ہم کسی کام کے قابل نہیں رہیں گے۔ خاص طور سے لکڑی جمع کرنے کے اور آگ کے بغیر یہاں چند گھنٹے رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم لکڑی جمع کر کے واپس آئے تو ایمی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اس نے میگی سے کہا۔ ''میرے پیٹ میں کچھ ہوا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اندر تیزاب بھر گیا ہے۔''

میگی نے اس کے پیٹ سے کپڑا ہٹایا تو اس کے ساتھ میں بھی چونک گیا کیونکہ اس کے مخصوص جگہ ورم غائب تھا مگر اس کا پیٹ بڑھ رہا تھا۔ اس میں نیلاہٹ آ گئی تھی اور جلد چمک رہی تھی۔ میگی مضطرب ہو گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ مسئلہ خراب ہو رہا ہے۔ ایمی ہمیں غور سے دیکھ رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا کچھ غلط ہو رہا ہے؟''

''نہیں۔'' میگی نے مشکل سے مسکرا کر کہا۔ ''سب ٹھیک ہے تم فکر مت کرو۔''

ایمی گہرے سانس لے رہی تھی۔ ''نہیں مجھے لگ رہا ہے میں بچ نہیں سکوں گی۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آرنٹ آرکٹک ولیج پہنچ گیا ہے اور جلد مدد آنے والی ہے۔''

''مدد نہیں آئے گی۔'' ایمی نے سرگوشی میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے میری وجہ سے تم لوگ بھی خطرے میں پڑ گئے۔''

میں اور میگی اسے تسلی دینے اور زندگی کا یقین دلانے لگے۔ پھر میگی کا صبر جواب دے گیا اور وہ روتے ہوئے طیارے سے باہر چلی گئی۔ ایمی نے میرا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''جب تم آرنٹ سے ملو تو اس سے کہنا کہ میں آخری لمحات میں اسے ہی یاد کر رہی تھی اور میں اس سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی۔''

''پلیز.....'' میں خود پر قابو پانے لگا مگر میری نظر دھندلا رہی تھی۔

''نہیں میری بات سنو، آرنٹ سے کہنا کہ میری زندگی کے سب سے حسین سال وہی ہیں جو میں نے اس کے ساتھ گزارے۔ میں بہت خوش رہی اور میں نے اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن اگر کبھی میری وجہ سے اسے کوئی کمی ہوئی ہو یا اس کا دل دکھا ہو تو وہ مجھے معاف کر دے۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''میرے بعد جان اور لارا کا بہت خیال رکھے۔ اب اسے ان کی ماں بھی بننا ہوگا۔''

''ایمی تم آرام کرو بولو مت۔''

''کچھ دیر بعد آرام کر لوں گی۔ ابھی مجھے بولنے دو۔''

شاید وہ تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لیے بول رہی تھی۔ اس بار میں نے اسے بولنے سے نہیں روکا۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں کی یادیں دوہرا رہی تھی پھر اس نے بتایا کہ اس کی آرنٹ سے کیسے ملاقات ہوئی اور کیسے وہ محبت میں گرفتار ہوئے۔ شادی کے بعد ان میں پہلا جھگڑا کب ہوا اور ایمی پورے دو دن ایک موٹیل میں چھپی رہی اور آرنٹ اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتا رہا۔ جب ملے تو انہوں نے عہد کیا کہ اب وہ کبھی نہیں لڑیں گے۔ میگی آ گئی تھی اور وہ بھی ایمی کی باتیں سن رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایمی کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی اور وہ اچانک خاموش ہوئی تو میگی نے آگے بڑھ کر اسے چیک کیا۔ اس کی نبض اور پھر پپوٹے اٹھا کر پتلیاں چیک کیں۔ اس نے تشویش سے کہا۔ ''یہ بے ہوش ہو گئی ہے، نبض کی رفتار ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں باہر دیکھتا ہوں شاید مدد آ جائے۔''

''یہاں کوئی مدد نہیں آئے گی۔'' لز نے تلخی سے کہا۔

''خدا کے لیے حوصلہ رکھو۔''

''کہاں سے لاؤں حوصلہ؟'' وہ رونے لگی۔ ''سام مر گیا، ایمی بھی مر جائے گی اور اس کے بعد ہم بھی مدد کے انتظار میں ایک ایک کر کے مر جائیں گے۔''

مجھ میں ایمی کو مرتے دیکھنے اور لز کی مایوسی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لیے باہر آ گیا اور ایک درخت کے تنے سے سر ٹکا کر رونے لگا۔ شمال کی طرف سے چلنے والی سرد ہوا کی شدت میں کمی آئی تھی اور ایک بار پھر موسم دھندلا اور ابر آلود ہو رہا تھا۔ میں نے تشویش سے آسمان کو دیکھا اگر بادل چھا جاتے یا دھند آ جاتی تو ہماری تلاش پھر سے مشکل ہو جاتی۔ جس کے بارے میں امکان تھا کہ وہ اب تک ٹھیک سے شروع نہیں ہوئی ہے۔ اگر آرنٹ آرکٹک ولیج تک نہیں بھی پہنچا تھا تب بھی طیارے کی گمشدگی کے بعد اس کی تلاش لازمی شروع ہو چکی ہوگی۔ البتہ تلاش کرنے والے اس سے بے خبر ہوں گے کہ ہم کہاں ہیں؟ مجھے خیال آیا کہ اگر آرنٹ ناکام رہا تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم لامحدود مدت تک یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے ایک فلیئر فائر کیا اور پھر دس دس منٹ کے وقفے سے فلیئر فائر کرنے لگا۔ میں نے مجموعی طور پر آٹھواں فلیئر فائر کیا تھا کہ اندر سے میگی نکلی اور میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ وہ آ کر میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی تھی۔ میں بھی رو رہا تھا۔ اندر سے لز کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر میں نے اندر آ کر ایمی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ مگر اس کا جسم پھول رہا تھا۔ میں نے اسے پلاسٹک شیٹ سے ڈھک دیا اور کہا۔

''ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

''کہاں اور کیسے؟'' میگی نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا مگر ہم یہاں بیٹھ کر موت کا انتظار نہیں کر سکتے۔''

''میں نہیں چل سکتی۔'' لز بولی۔ ''میرے پیر کی موچ ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔''

میگی نے پٹی کھول کر اس کے پاؤں کا معائنہ کیا اور میں سامان جمع کرنے لگا جس کی ہمیں راستے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ ساری چیزیں میں نے دو عدد بیگوں میں جمع کر لیں۔ واٹر پروف شیٹ اور رسیاں بھی ساتھ لے لیں ان کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی خاص طور سے بارش اور برف باری کے دوران۔ پانی لے جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ ہمارے پاس سوائے تھرماس کے اور کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔ میں نے اسی میں پانی بھر لیا۔ لز مسلسل کہہ رہی تھی کہ وہ نہیں چل سکتی ہے اور ہم اسے یہاں چھوڑ جائیں مگر میں اور میگی اسے یہاں چھوڑ کر جانے کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھے۔ جب اس نے زیادہ ہی اصرار کیا تو میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے تب ہم بھی نہیں جاتے ہیں۔''

''نہیں میرا مطلب ہے تم مجھے چھوڑ کر جاؤ اور مدد لانے کی کوشش کرو۔'' لز نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں نہیں روک رہی۔''

''لز ہم تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' میگی نے نرمی سے کہا۔ ''اگر تم نے ہمت نہ کی تو ہم سب یہیں رہ کر اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔''

لز ہچکچائی۔ ''میں تم لوگوں پر بوجھ بن جاؤں گی۔''

''نہیں ہم تمہارے لیے بندوبست کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم تمہاری لیے اسٹک بنا دیں گے جس سے تم سہارا لے کر چل سکو۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو میں تیار ہوں۔'' لز نے کہا۔

میں نے ایک درخت سے دوشاخہ شاخ توڑی اور اسے صاف کر کے اور کپڑا باندھ کر اسے بے ساکھی بنا دیا۔ لز اسے اپنی بغل میں دبا کر اس کے سہارے چل سکتی تھی۔ تین بجے ہم طیارے سے نکلے۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر ہم تین یا چار گھنٹے سفر کریں تو اس دوران میں کوئی سات سے دس کلومیٹرز جا سکتے تھے اس کے بعد ہم رات میں رک کر آرام کرتے اور کل صبح پھر اپنے سفر کا آغاز کرتے۔ سام اور ایمی کی لاشیں ہم نے اچھی طرح لپیٹ دی تھیں مگر جنگلی جانوروں سے ان کو بچانے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لز رو رہی تھی اور ہم بہت بوجھل دل کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس نیشنل پارک کے وسط میں پہاڑیوں کے ساتھ ایک وائلڈ لائف ری فیوج سینٹر بھی تھا مگر وہ اکتوبر کے آغاز میں بند ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم جنوب مشرق کی سمت جائیں تو اس سینٹر تک پہنچ سکتے تھے اور وہاں موجود ریڈیو سے مدد طلب کر سکتے تھے۔ جب کہ آرکٹک ولیج جانے کے لیے ہمیں ٹھیک جنوب کی سمت جانا ہوتا۔ میں نے میگی اور لز سے مشورہ کیا۔ لز نے کہا۔

''دونوں میں سے جو جگہ نزدیک ہو ہمیں وہاں جانا چاہیے۔''

''ری فیوج سینٹر تیس کلومیٹرز کے فاصلے پر اور آرکٹک ولیج اس سے دوگنے فاصلے پر ہے۔''

''میں بھی ری فیوج سینٹر کی طرف جانے کے حق میں ہوں۔'' میگی نے کہا۔

پہلی سڑک ہمیں کوئی بیس کلومیٹرز کے بعد ملتی۔ سب سے پہلے ہمیں اس سڑک تک پہنچنا تھا کیونکہ یہی ہمیں ری فیوج سینٹر تک لے جاتی اور درمیان میں آنے والے دریاؤں اور ندیوں سے ہم اسی سڑک کے پلوں سے گزر سکتے تھے۔ مگر یہ بیس کلومیٹرز کا سفر آسان نہیں تھا۔ اگر ہم مسلسل سفر کرتے تو شاید کل شام سڑک تک پہنچنے میں کامیاب رہتے۔ میں نے پشت پر بیگ لاد رکھا تھا اور اسے دائیں شانے پر رکھا تھا۔ مسلسل ہاتھ بندھے رہنے سے ٹوٹی

ہڈی کی تکلیف بہت کم رہ گئی تھی مگر میں اب بھی اس ہاتھ کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اور نہ بائیں شانے پر بوجھ ڈال سکتا تھا۔ میگی نے پشت سے بیگ اور سوکھی لکڑیوں کا ایک بنڈل باندھا ہوا تھا۔ یہ راستے میں جلانے کے کام آتا۔ وہ لز کو بھی سہارا دے رہی تھی۔ بعض مقام ایسے آتے تھے جہاں سے وہ بغیر سہارے کے نہیں گزر سکتی تھی۔

بھوک کی حالت اور درماندہ جسم کے ساتھ ہم نے آنے والے چار گھنٹے کیسے سفر کیا یہ بیان سے باہر ہے۔ لز کے لیے خاص طور سے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس قدر دشوار راستوں پر فٹ انسانوں کے لیے چلنا بھی آسان نہیں تھا اور وہ ایک پیر کے سہارے سفر کر رہی تھی اور اس نے بلاشبہ بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ راستے میں روتی رہی اور نہ جانے کس کس کو برا بھلا کہتی رہی مگر اس نے ہمیں رکنے کے لیے نہیں کہا۔ پانچ بجے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سورج کے غروب ہونے سے پہلے میں نے ایک پہاڑی چوٹی کو مرکز نگاہ بنا لیا اور اندھیرا ہونے کے بعد اس کی چوٹی پر جمی سفید برف کو دیکھتے ہوئے سفر جاری رکھا۔ تارچ آرنٹ ساتھ لے گیا تھا اور ہمارے پاس ایمرجنسی لائٹ تھی۔ جب تاریکی شدید ہوگئی تو میں نے اسے جلا لیا۔ باقی دو گھنٹے کا سفر ہم نے اس کی روشنی میں کیا۔

درختوں اور ایک چٹان سی ڈھکی جگہ تلے ہم نے پڑاؤ ڈالا اور سب سے پہلے الاؤ جلایا۔ کچھ دیر آرام کر کے ہم لکڑیاں جمع کرنے لگے تاکہ الاؤ ساری رات جلتا رہے۔ یہاں زمین پر لکڑی نہیں تھی اس لیے ہم درختوں سے شاخیں توڑتے رہے۔ بہر حال یہاں دھوئیں سے مسئلہ نہیں ہوتا اس لیے گیلی لکڑی بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔ میگی جو شاخیں توڑ رہی تھی اچانک اس نے کوئی چیز منہ میں ڈالی اور اسے چبا کر کھانے لگی میں تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”درخت کی گوند۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مزے کی ہے۔“

”یہ مضر نہ ہو۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں اس درخت کی گوند مضر نہیں ہوتی ہے میں نے بچپن میں بہت کھائی ہے۔“

میں ایک جلتی شاخ اٹھا لایا اور ہم اس کی روشنی میں تنوں پر چپکی گوند تلاش کر کے توڑتے رہے۔ ذرا سی دیر میں ہمارے پاس اس کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ یہ شیشے کی طرح سخت تھی مگر منہ میں لینے پر جب اسے نمی ملتی تو یہ نرم پڑنے لگتی اور آخر میں گھل جاتی تھی۔ اس کے چند ٹکڑے کھا کر میں نے محسوس کیا کہ میری بھوک کا مداوا ہو رہا تھا۔ ہم نے لز کو دیا تو وہ بے تابی سے کھانے لگی۔ الاؤ میں لکڑیوں کا ڈھیر ڈالا تو ذرا سی دیر میں وہ پوری طرح بھڑک اٹھا تھا اور اس کی گرمائش نے ہمیں بہت سکون دیا تھا۔ گوند نے صرف ہمارا پیٹ نہیں بھرا تھا بلکہ میں خود کو جسمانی طور پر بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ میگی نے انکشاف کیا کہ گوند صرف خوراک نہیں بلکہ دوا بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ واٹر پروف شیٹ زمین پر بچھا کر ہم نے اس طرح لے لی کہ وہ کمبل بھی بن گئی تھی۔ اس کے تلے ہم سردی اور اوپر سے گرنے والی اوس سے خاصی حد تک محفوظ تھے۔

رات بھر ہم باری باری جاگتے رہے اور پہرہ دینے کے ساتھ الاؤ کو روشن بھی رکھا تھا۔ صبح ہم نے پھر گوند کھائی اور مزید گوند توڑ کر راستے کے لیے ذخیرہ کر لی تھی۔ لز نے بتایا کہ اس کی تکلیف اور پاؤں کی سوجن میں خاصی کمی آئی تھی اور وہ اب چلنے کے قابل تھی۔ مگر اس جسمانی بہتری کے باوجود آنے والا سفر ہمارے لیے ہرگز آسان نہیں تھا۔ آگے الاؤ جلانے کے لیے کچھ خشک لکڑیاں بھی ساتھ لی تھیں۔ اس دن ہمیں کئی ندی نالوں سے واسطہ پڑا۔ اگرچہ موسم سرد ہونے کے بعد ان میں پانی کم رہ گیا تھا مگر جو بھی تھا وہ بے پناہ سرد تھا اور اس سے بچ کر گزرنے میں ہمیں بہت مشکل پیش آئی تھی۔ کیونکہ اس بار سارا دن ہی سفر کرنا تھا اور ہم صبح سات بجے چل پڑے تھے۔ اس لیے طے کیا کہ ہم دو گھنٹے سفر کریں گے اور اس کے بعد آدھے گھنٹے کا آرام ہوگا۔

شام تک ہماری حالت خستہ ہو چکی تھی اور اب تک سڑک کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ سورج کی مدد سے میں سمت کا تعین کرتا رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہم درست سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ اب ڈھلانیں پھیل رہی تھیں اور پہاڑیوں کی اونچائی کم اور ان کی دوری بڑھ رہی تھی۔ یہاں برف کم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم میدان کے نزدیک آ رہے تھے۔ اس کے باوجود پانچ بجے تاریکی چھا گئی اور ہم سڑک تک نہیں پہنچے تھے۔ ہم وقفے کے بعد آدھے گھنٹے سے چل رہے تھے۔ میگی اور لز سے مشورہ کر کے میں نے مزید ڈیڑھ گھنٹے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ایمرجنسی لائٹ کے سیل کمزور پڑ رہے تھے اس لیے روشنی کی خاطر ہم نے مشعلیں جلا لیں۔ ان سے روشنی بھی ہوتی اور یہ دور سے ہماری نشان دہی بھی کرتیں۔ ان کی روشنی میں ہم خود کو آگے دھکیل رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ جاؤں مگر میں کیسے لیٹتا ان دونوں عورتوں کی ذمے داری بھی مجھ پر تھی۔ میگی آگے تھی اسی نے سب سے پہلے سڑک دیکھی اور چلائی۔

”سڑک...... وہ رہی۔“

ایک چھوٹی سی ڈھلان کے پار سڑک کی سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ ہم پُرجوش ہو گئے اور اپنی حالت کی پروا کیے بغیر تیزی سے ڈھلان سے اترنے لگے۔ پونے سات بجے کے قریب ہم سڑک پر تھے اور میں نے وہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ چند گز کے فاصلے چند تنوں کے درمیان ہم نے ڈیرہ جمایا۔ الاؤ روشن کیا اور پھر ہمت کر کے لکڑیاں جمع کیں۔ لز کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ الاؤ روشن ہوتے ہی لیٹ کر سو گئی تھی۔ میں اور میگی بھی سونا چاہتے تھے مگر سب کا سونا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے پہلے میگی کو سونے کو کہا اور خود جاگتا رہا۔ نیند پلکوں پر براجمان ہوئی تھی اور میری آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ نیند سے بچنے کے لیے میں الاؤ کے پاس آ بیٹھا۔ بارہ بجے جب میری ہمت جواب دے گئی تو میں نے لز کو اٹھایا اور خود سو گیا پھر میری آنکھ روشنی کے ساتھ کھلی تھی۔ میگی اور لز دونوں جاگ رہی تھیں اور آپس میں بات کر رہی تھیں۔ میگی نے تھرماس کا ڈھکن میری طرف بڑھایا۔

”مقامی کافی۔“

میں نے لے کر سپ لیا تو ذائقہ اچھا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

میگی مسکرائی۔ ”گوند کو پانی میں ڈال کر ابالا تو کافی بن گئی۔“

اس ناشتے سے تازہ دم ہو کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ سڑک کی وجہ سے ہمیں ایسی آسانی ہوئی تھی کہ بیان سے باہر تھی۔ اس پر چلنا ہمیں مسئلہ ہی نہیں لگ رہا تھا حالانکہ اب بھی چھ سے سات کلومیٹرز کا فاصلہ باقی تھا۔ مدد کی اُمید نظر آنے لگی تو ہمارے موڈ خوشگوار ہو گئے تھے اور ہم اب ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ مگر جب پیچھے رہ جانے والوں کا خیال آتا تو ہم دکھی بھی ہو جاتے تھے۔ ہموار اور صاف سڑک پر ہم دو گھنٹے چلے ہوں گے کہ ایک بورڈ پر ری فیوجی سینٹر کے بارے میں نشان دہی نظر آئی۔ یہ سڑک آگے جا کر دو شاخہ ہو جاتی تھی اور ہمیں بائیں طرف جانا تھا۔ کچھ آگے گئے تو ایک بڑے دریا پر پل آ گیا۔ اس دریا میں اتنا پانی تھا کہ ہم اسے کسی صورت عبور نہیں کر سکتے تھے۔ ری فیوجی سینٹر کی طرف جانے والی سڑک آئی اور سینٹر اب ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ مڑتے ہی ہمیں اس کا واچ ٹاور دکھائی دیا اور کچھ دیر بعد عمارات بھی نظر آنے لگیں۔

ہم ہانپتے کانپتے سینٹر میں داخل ہوئے تو توقع کے عین مطابق وہاں کوئی فرد نہیں تھا۔ مگر کسی مصیبت زدہ فرد یا پارٹی کے لیے انتظام تھا۔ ایک بورڈ پر ایسے افراد کے لیے ہدایات تھیں کہ وہ کس طرح سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔ ہم اس کیبن میں آئے جس میں مدد کا سامان تھا۔ اس میں پیک خوراک، گرم لباس، دوائیں اور مدد طلب کرنے کے لیے ریڈیو تھا۔ میں نے سب سے پہلے ریڈیو سے رابطہ کیا اور دوسری طرف موجود آپریٹر کو اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ آدھے گھنٹے میں ہم تک مدد پہنچ جائے گی۔ جب تک ہیلی کاپٹر آتا ہم نے وہاں موجود خوراک سے استفادہ کیا۔ گرم کافی اور چاکلیٹ پی۔ ہیلی کاپٹر کی آواز پر ہم باہر آئے۔ یہ بڑا ریسکیو ہیلی کاپٹر تھا۔ امدادی کارکنوں نے پہلے ہمارا معائنہ کیا۔

سب سے پہلے انہوں نے مجھے اور لز کو آرکٹک ویلیج چھوڑا جہاں چھوٹا سا میڈیکل یونٹ تھا اور وہاں ہمیں طبی امداد دی گئی۔ وہاں ہمیں پتا چلا کہ آرنٹ یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ میگی طیارے کی نشان دہی کے لیے ہیلی کاپٹر ٹیم کے ساتھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آرنٹ کی تلاش کا کام شروع ہو گیا۔ سام اور ایمی کی لاشیں اسی دن آرکٹک ویلیج لائی گئی تھیں اور اگلے دن ہمیں ان کے ساتھ ہی ریکسن روانہ کیا گیا۔ مزید ایک دن بعد آرنٹ ایک کھائی سے ملا۔ وہ کھائی میں گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا تھا اور سردی سے اس کی حالت خراب تھی مگر اس کی جان بچ گئی تھی۔

دو دن بعد لز سام کی لاش لے کر واپس کولوراڈو چلی گئی اور اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ریکسن میں ہم ایمی کی تدفین میں شریک ہوئے تھے۔ میں نے آرنٹ سے معافی مانگتے ہوئے اسے ایمی کا آخری پیغام پہنچایا۔ اس نے کہا۔ ”دوست تمہارا کوئی قصور نہیں ہے تم نے اور میگی نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لی تھی مگر ہم ایمی کو بچا نہیں سکے۔“

اس کے بعد ہم کبھی ایئر ٹرپ پر نہیں گئے۔ آرنٹ نے فلائنگ چھوڑ دی تھی۔ چند سال بعد میں اور میگی الاسکا سے جارجیا شفٹ ہو گئے کیونکہ ہمارے بچے اب یونیورسٹی میں آ گئے تھے اور ہم ان سے دور نہیں رہ سکتے تھے اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ چلے آئے۔

# سراب

راوی : شہباز ملک

قسط : 109

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے مجھے گھیرلیا۔ میں نے کرنل زرد بکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرد بکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرد بکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنی کی تھی۔ وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیرلیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی" شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب میں نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹافون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا" کنور ہوشیار" سادی کو لے کر جیمبر..." مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں۔ شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا۔ فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا۔ فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیرلیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گرا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے لگ کر کہا" پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے ادشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم آگے چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیرلیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے



گرفتار کرکے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچادیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسرنو تیاری کرانا شروع کردی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہوگیا اور اس نے زیرلب کہا" اعلانِ جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کردیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنے کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں رودبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحے کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اساروں نے گھیرلیا اور میں رودبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسارا اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آگئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سو مرد چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑلیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا مجبور تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقے زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کردیا۔ پھر مجھے رودبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آگئے۔ سامیرا نے زیبک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور رودبیر کو اٹھالے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کررہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کردیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہوگیا۔ آرگون کی فوج نے آکر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگادی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہوجاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہوگیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کررہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کردیا۔ جتنے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کردیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرادیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہوگئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آگیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بجھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کردی۔ گویا مصنوعی رن دے بنا دیا تھا تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کرکے ہارن کو بھگادیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے رودبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جارہا تھا۔ حالات سنگین ہوگئے تھے کیونکہ ایرٹ رودبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آرہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں رودبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور رودبیر کو تلاش بھی کرلیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہوگیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کررہا تھا کہ شامین اندر آگیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آگئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو ماررہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شامین نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کردیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شامین مرچکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مارکر باہر آجائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہورہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آچکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوالیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کردوں گا لیکن عین وقت پر ڈیلی نمودار ہوگئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔

## اب آگے پڑھیں

باہر سے بہہ کر آتے روغن کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں یہ روغن کے پیپے کس کام کے لیے لایا تھا اور یہ کس کام میں آنے والا ہے۔ بہتے ہوئے روغن کی مقدار بتا رہی تھی کہ کئی ایک ڈرم الٹائے گئے ہیں۔ ہر ڈرم میں تقریباً پچاس کلو روغن ہوگا جب کہ بہتے ہوئے روغن کی مقدار دو ڈھائی سو کلو ہوگی جو میں نے شاہی ارکان کو دھمکانے، موت کا خوف دلانے کے لیے منگوایا تھا۔ گویا دوسروں کو موت دینے کا جو سامان اکٹھا کیا تھا وہ ہماری

موت کا سبب بننے والا تھا۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا لیکن میں مجبور ہوگیا تھا۔ اگر ذرا سی بھی حرکت کرتا تو میرے ساتھ دوسرے بھی لپیٹ میں آجاتے۔ مجھے اپنی موت کا خوف کبھی نہیں رہا ہے۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے لیکن دوسروں کو خاص کر اپنے ساتھیوں کو میں مرتا ہوا کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے میں مسلسل غور کررہا تھا کہ کس طرح اور کون سی چال چلوں کہ اس پر قابو پاسکوں۔ اس لیے کہ زیبی کے بارے میں علم تھا وہ اذیت کوش بندی ہے۔ اذیت دے کر

لطف اٹھاتی ہے۔ایسے ذہنی بیماروں کی دنیا میں کمی نہیں۔ان لوگوں کو یہ بیماری کچھ زیادہ ہی لگتی ہے جو دبے کچلے ذہن کے ہوتے ہیں۔زینی زندگی بھر ٹھوکروں میں رہی۔ڈیوڈ شا کی ناجائز اولاد ہونے کی سزا پاتی رہی، یہی وجہ تھی کہ وہ اذیت پسند بن گئی۔

میں نے اسے کئی بار ٹھکرایا تھا اس کی پیش رفت کو تحقیر کے ساتھ رد کیا تھا۔اس کا بھی غبار اس کے دل میں ہوگا اسی لیے مجھے بھی زندہ جلانے پر تلی ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔باہر سے بہہ کر آنے والا روغن آہستہ آہستہ کمرے میں پھیل رہا تھا۔جیسے ہی وہ مشعل گراتی پورا کمرا جہنم بن جاتا۔آتش فشاں کا دہانہ بن جاتا'بس کچھ ہی دیر کی بات تھی۔میری طرح دوسرے لوگ بھی دم بخود تھے۔کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے روکا جائے۔نیچے سے دوڑ کر اوپر چوبارے میں جانا ممکن نہیں تھا۔مجھ سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ اندر آنے کے بعد میں نے پستول جو باسو سے چھینا تھا وہ ہولسٹر نہ ہونے کی وجہ سے پہلے کمر میں ٹھونسا تھا پھر روغن کا چوبی ڈرم اٹھانے کے لیے اسے کمر سے نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ اگر میں اس کی طرف بڑھتا تو اسے اٹھا بھی نہ پاتا کہ زینی اوپر سے مشعل روغن پر پھینک دیتی۔اسے کیسے روکوں میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ زینی کی آواز گونجی:

''شہباز، اپنے ہاتھ اٹھا کر باہر کی طرف بڑھو... میں نہیں چاہتی کہ اس عمارت میں تمہارا تکہ بنے۔اتنے بہادر آدمی کے جلتے ہوئے جسم کو میں دیکھ نہیں سکتی۔''ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک معجزہ سا ہوا۔

اس چوبارے کے بالکل سامنے دوسری طرف کی دیوار میں بھی ایک چوبارا بنا ہوا تھا۔عام طور پر مغل طرز تعمیر میں بھی ایسا ہی دیکھا ہے کہ آمنے سامنے کی دیواروں میں ایک جیسی نقاشی ہوتی ہے جسے ''جواب'' کہا جاتا ہے۔جیسا میں نے لکھنؤ کی عمارتوں میں دیکھا تھا۔لکھنؤ کا رومی دروازہ اور اس کے سامنے بالکل ویسا ہی ایک نمائشی دروازہ بنا ہوا تھا۔لاہور و ملتان کے کئی نمائشی دروازے یہاں' اس وادی میں بھی ویسا ہی تعمیراتی انداز تھا کہ چوبارے کے سامنے چوبارہ اور مصر کے اہرام جیسا معبد۔پتا نہیں یہ مماثلت کیسے بنی یا اتفاق ہے کہ اس چوبارے کے سامنے چوبارہ تھا۔اس چوبارے کا دروازہ کھلا اور کوئی چوبارے میں آیا۔ابھی ادھر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔خود میری نظر بھی نہیں پڑی تھی۔

میری نظر تب ادھر گئی جب اس چوبارے سے ایک تیر سنسناتا ہوا چلا اور زینی کے گلے میں ترازو ہو گیا۔اس کی کربناک چیخ پوری عمارت میں گونج کر رہ گئی تھی۔اس کا جسم لہراتا ہوا اونچائی سے فرش پر گرا تھا۔مشعل اس کے ہاتھوں میں تھی جو اس کے جسم تلے آکر بجھ گئی تھی ورنہ آگ کا پھیلنا ضروری تھا۔

زینی کو تیر لگتے ہی باہر سے کسی نے فائر کیا مگر گولی اندر نہیں آئی تھی۔شاید باہر کسی اور طرف چلائی گئی تھی پھر برسٹ چلا تھا۔ایسا لگا تھا جیسے دو قسم کے ہتھیار چنگھاڑے تھے۔برسٹ کی بھیانک آواز کے ساتھ ہال میں جمع افراد بھی چیخے تھے'کئی ایک کی چیخ گونجی تھی، یہ خوف کی چیخ تھی۔شاید اندر جمع افراد ڈر گئے تھے۔میں نے بلند آواز میں کہا''سب فرش پر لیٹ جائیں۔فوراً۔''

میری آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سب کے سب زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔باہر سے گولیاں برسنے کی آواز آرہی تھی'پھر کسی سب مشین گن کی آواز گونجی۔گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ کسی کی چیخ ابھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

جب کافی دیر تک فائرنگ بند رہی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا۔باہر کا جائزہ لینے پر غور ہی کر رہا تھا کہ سب مشین گن کے ساتھ سفیر داخل ہوا۔اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔''شہباز صاحب!سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں سب خیریت ہے۔باہر کتنے آدمی ہیں۔ان کا کیا بنا؟''

''باہر ایک ہی آدمی تھا جو دروازے سے لگا کھڑا تھا۔''

''لیکن زینی نے تو کہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے عمارت کو گھیر رکھا ہے۔''

''ہاہاہا۔''سفیر نے قہقہہ لگایا''اس کے اندر خون کس کا ہے۔تم نے ہی بتایا نا کہ وہ ڈیوڈ شا کی بیٹی ہے تو اس میں اس کی خصلت ہونا ضروری ہے۔جھوٹ'مکر'فریب اس کی سرشت میں شامل ہے۔اس کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا۔اسے اس نے باہر کھڑا کر دیا تھا۔ویسے بات غلط بھی نہیں تھی۔اس کے پاس آٹو میٹک گن تھی۔وہ اکیلے ہی پورے مجمع کو روک سکتا تھا۔میں اسے نشانے پر لے ہی رہا تھا کہ یہ تمہارا عاشق۔''اس نے چوبارے پر کھڑے ایرٹ کی طرف اشارہ کیا''یہ کسی چھپکلی کی طرح بغیر ایک لمحہ ضائع



کیے دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔''اس نے زینی پر تیر چلایا اور میں نے باہر کھڑے شخص کو نشانہ بنایا۔

میں نے ہاتھ ہلا کر ایرٹ کو شاباشی دی۔پھر سفیر سے پوچھا''تم تو قلعہ کی طرف جا رہے تھے لوٹ کیوں آئے؟''

''ابھی میں آدھے ہی راستے میں تھا کہ ایک واقعہ ہوگیا۔''

''کون سا؟''

''ہم شہر سے باہر آچکے تھے۔باغوں کے اس سلسلہ میں داخل ہو چکے تھے جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔ابھی پہلا باغ ہی پار کیا تھا کہ ایک سیٹی سی بجی۔میں رک گیا۔ایسی تیز سیٹی تھی کہ کافی دور تک سنائی دی ہوگی۔''

''یہاں میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکیہ یا ہرکارے جب پیغام لے کر جاتے ہیں تو دوڑتے ہوئے تیز سیٹی بجاتے ہیں تاکہ جنگلی جانور دور بھاگ جائیں۔یہ ان کی پہچان ہوتی ہے۔''

''یہی بات ایرٹ نے بھی کہی تھی۔اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا کہ اس وقت جنگ کا ماحول ہے اور باغوں کی دوسری طرف سامیرا کی فوج ہے۔ادھر سے کوئی خبر رساں ادھر آنے سے رہا۔ضرور یہ شہنشاہ معظم کا پیامبر ہے۔''

یہ سن کر میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ہرکارا سیٹی بجاتا ہوا نزدیک آگیا۔جیسے ہی وہ ہمارے قریب سے گزرا میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی اور اسے زمین پر پٹک دیا۔اس نے گرتے ہی آواز لگائی کہ میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا۔آپ نے مجھے پہچانا نہیں لیکن میں آپ کو پہچانتا ہوں۔''سفیر بولتے بولتے رکا پھر سانس لے کر بولا''اس نے کیا کہا تھا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اس لیے میں نے ایرٹ سے ترجمہ کے لیے کہا تو اس نے جملہ بتایا۔میں نے کہا'تم نے مجھے کیسے پہچانا تو وہ بولا کہ آپ جب فوج کا معائنہ کرنے آئے تھے تو میں پہلی قطار میں تھا۔اسی لیے مجھے راجا صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''بات کو مختصر کرو۔''میں نے سفیر سے کہا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں۔تم ہی بار بار ٹوک دیتے ہو۔''

''تو پھر جلدی بولو نا۔''

''اس نے مجھے ایک خط دیا کہ یہ آپ کے لیے ہے۔کئی دوسروں کے بھی خطوط ہیں، میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر انہیں دینے جا رہا ہوں کیونکہ میرا اصل کام ہی یہی ہے۔لیکن کچھ عرصہ سے قلعہ اور آرگون کے درمیان قاصد کو بھی آنے جانے سے منع کر دیا گیا تھا۔اگر میں پکڑا گیا تو گلا کاٹ دیا جائے گا۔''

میں نے خط کھول کر پڑھا۔اس میں لکھا تھا کہ بہت جلد سامیرا اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوگی۔ریناٹ کے پاس بہت تھوڑے سے فوجی ہیں، وہ انہیں روندتی ہوئی شہر میں داخل ہو جائے گی۔تمہیں ریناٹ کی فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے لیکن ہوشیاری سے اس لیے کہ ڈیوڈ شا بھی ہے جو وہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟''میں نے سفیر سے پوچھا۔

''میں یہی خبر تمہیں دینے آیا تھا کہ یہاں یہ نئی کہانی دیکھی اور میدان میں کود پڑا۔''

''چلو یہ بھی بہتر ہوا۔اگر تم نہ آتے تو شاید میں اتنی جلدی زینی سے نمٹ نہ پاتا۔''

''اب تم ان لوگوں کو سنبھالو میں اپنے کام کو نمٹانے چلا۔''کہہ کر وہ مڑ گیا۔

سفیر نے جو اطلاع دی تھی وہ بہت اہم تھی۔یعنی کہ اصل کھیل شروع ہوا چاہتا ہے۔ریناٹ کو اس تہہ خانے سے نکالنا اب ضروری ہو گیا ہے۔اسے نکالے بغیر کوئی چارہ نہیں اس لیے کہ سامیرا آگے بڑھ رہی ہے تو ریناٹ کی فوج اسے روکے گی اور خون خرابہ ہوگا۔اس خون خرابے سے لوگوں کو بچانا ضروری ہے۔اور اس کے لیے ریناٹ کو سامنے لانا ہی ہوگا۔پھر سب سے بڑا خطرہ ڈیوڈ شا تھا، اسے بھی قابو کرنا ہے۔اتنے سارے کام کیسے نمٹاؤں میں یہی کچھ سوچتا ہوا اس محافظ کی طرف بڑھا جس نے تہہ خانے کا مقام بتایا تھا۔

''رودنانا تم ادھر آؤ۔''میں نے رودنانا کو اشارہ کیا۔وہ آگے بڑھ آیا تب میں نے اس سے کہا''تم اسی جگہ کھڑے رہنا میں دروازہ کھولنے کی ترکیب ڈھونڈتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ اس دروازے کو کھولنے کا کوئی نہ کوئی کل یا آلہ باہر بھی ہوگا۔''رودنانا بولا۔

''تو ڈھونڈو نا۔''

''میری ڈیوٹی دروازے تک محدود تھی۔اندر آنے کا حکم نہ تھا ورنہ میں ضرور ڈھونڈ لیتا۔''

''کوئی بات نہیں۔اب میں تلاش کرتا ہوں۔شاید کوئی ایسا بٹن یا زنجیر یا دستہ مل جائے جس کے ذریعہ دروازہ

کھولا جاسکتا ہو۔‘‘ کہہ کر میں دیوار کی طرف بڑھ گیا۔عام طور پر خفیہ راستے کی زنجیر یا بٹن دیوار میں ہی لگایا جاتا ہے۔یہ سوچ کر میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔میری تقلید میں کئی اور لوگ بھی دیوار پر ہاتھ پھیر کر ایسا کچھ تلاش کرنے لگے جسے دبا کر یا کھینچ کر دروازہ کھولا جاسکتا تھا۔تقریباً دو گھنٹے گزر گئے مگر ایسا کچھ نہیں ملا۔میں نا اُمید ہو گیا تھا کہ ایک جگہ دیوار کچھ ابھری ہوئی محسوس ہوئی۔اس پر رنگ و روغن اس طرح کیا گیا تھا کہ وہ ایک نظر میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔میں نے اس ابھرے ہوئے حصے کو دبایا تو یکا یک ایک سرسراہٹ سی ہوئی۔ساتھ ہی ساتھ بہت ساری آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ’’کھل گیا۔‘‘

میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔فرش میں چار بائی چار فٹ کا ایک دروازہ سا کھل گیا تھا اور سب اس میں جھانک رہے تھے۔میں تیزی سے ادھر بڑھا اور اونچی آواز میں تاکید کی، ’’سامنے سے ہٹ جاؤ...... اندر سے کوئی بھی تیر اندازی کرسکتا ہے۔‘‘

تمام لوگ دور ہٹ گئے۔وہاں موجود ایسے لوگ جن کے پاس اسلحہ تھا وہ سب اسلحہ سونت کر مستعد ہو گئے۔میں نے نہایت احتیاط سے اندر جھانکا۔اندر بالکل سناٹا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے نیچے کوئی ہے ہی نہیں۔میں نے زینی والی گن کو اٹھا لیا اور روناٹا سے کہا۔ ’’میں نیچے اتر رہا ہوں‘ تم گنتی گنتے رہو۔جب پانچ سو تک گن لو تو احتیاط سے نیچے اتر جانا۔تمہارے بعد کوئی دوسرا پانچ سو تک گنے اور پھر وہ اترے اسی طرح وقفہ دے دے کر نیچے اترتا جائے۔‘‘

’’اس کا فائدہ، ایک ساتھ اترتے تو دشمن کو قابو کرنے میں آسانی ہوتی۔‘‘ روبیر بولی۔

’’میں اکیلا سو پر بھاری ہوں، پیچھے آنے والا مجھے مدد دے گا اگر ضرورت پڑی تو......‘‘ اتنا کہہ کر میں نے اللہ کا نام لیا اور نیچے اتر گیا۔

میں نے روناٹا کو تو منع کر دیا تھا مگر اس کو منع نہیں کرسکا تھا جو میرے لیے پیرِ تسمہ پا سے کم نہیں۔چند سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ عقب میں آہٹ محسوس ہوئی‘ میں نے مڑ کر دیکھا۔وہ روبیر تھی جو چلی آرہی تھی۔

اس کی اس حرکت نے مجھے غصہ دلا دیا تھا لیکن یہ وقت چیخنے چلانے‘ غصے کے اظہار کا نہ تھا۔میں خاموش رہ گیا۔اپنی پوری توجہ نیچے کی جانب مبذول رکھی۔نیچے خاموشی کا راج تھا۔مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت میں بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہوں یعنی خطرے کے منہ پر بڑا جمان ہوں۔اس لیے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے کوئی حملہ آور نمودار ہوسکتا تھا یا ایک ساتھ بہت سارے لوگ مقابلے کے لیے للکار سکتے تھے۔انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا بالآخر بالکل نیچے اتر گیا۔مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ بتانے والوں نے بتایا تھا کہ ریناٹ کے ساتھ بیس بائیس افراد نیچے اترے تھے۔مگر اس وقت ایک بھی فرد نظر نہیں آرہا تھا۔وہ سب کدھر گئے؟ میں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر جائزہ لیا تبھی میری نظر دور ایک گلیارے پر پڑی۔

سنتے ہیں کہ ہماری دنیا میں‘ بادشاہ محلوں کے نیچے خفیہ سرنگ بنواتے تھے۔لگتا ہے کہ یہ تہہ خانہ بھی کسی سرنگ سے منسلک ہے اور وہ تمام لوگ اس سرنگ سے فرار ہو گئے ہیں۔میں یہی سوچتا ہوا گلیارے کی جانب آگے بڑھ رہا تھا۔

اگر ریناٹ اپنے حواریوں کے ساتھ فرار ہو گیا ہے تو بات مزید الجھ جائے گی اس لیے کہ وہ باہر پہنچ کر شہریوں سے مدد لے گا۔ابھی تو مٹھی بھر لوگ اس کے ساتھ ہیں پھر تو ایک عالم اس کے ساتھ ہوگا۔

اسی فکر میں ڈوبا میں آگے بڑھ رہا تھا۔میرے پیچھے روبیر تھی۔وہ نہایت احتیاط سے پیر دبا دبا کر آگے بڑھ رہی تھی۔اس کی جانب میری توجہ بالکل نہیں تھی۔میری تمام حسیں بیدار تھیں اور میں گویا پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔

گلیارا شیطان کی آنت ثابت ہو رہا تھا۔پتا نہیں کتنا طویل تھا۔پھر بھی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔تبھی میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی کے قدموں کی دھمک گونجی ہو۔بند جگہ پر ہلکی سی آواز بھی گونجدار ہو جاتی ہے نا۔میں نے ہاتھ پیچھے کر کے روبیر کو رکنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں کچھ اور آگے بڑھا۔آگے گلیارا مڑ رہا تھا۔اب میں اور زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا۔موڑ پر پہنچ کر رکا اور جھانک کر دیکھا۔گلیارا آگے تک جاتا تھا مگر سامنے ہی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔میں نے روبیر کو دوبارہ رکنے کا اشارہ کیا۔وہ تھم گئی۔میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔آواز پھر سنائی دی جیسے کوئی چل رہا ہو۔وہ آواز اسی دروازے کی طرف سے آرہی تھی۔میں اور آگے بڑھا۔اس دروازے پر پہنچا۔اندر دیکھنے کے لیے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔دروازہ بہت تھوڑا سا کھل گیا۔میں نے اندر دیکھنے کی کوشش کی اور



چونک گیا۔اس لیے کہ اندر ایک جم غفیر نظر آیا تھا۔فرش پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور ایک شخص ٹہل رہا تھا۔وہ شناسا چہرہ تھا۔یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے موت دینے کے فیصلے کی تائید کی تھی اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ مجھے ہارن کے آگے ڈال دیا جائے۔اسے دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی روانی بڑھ گئی تھی۔مگر میری نظریں ہنوز متلاشی تھیں۔میں ریناٹ کو تلاش کر رہا تھا مگر وہ اس بھیڑ میں نظر نہیں آرہا تھا۔سانپ کو چھوڑ کر لکیر پیٹنا لاحاصل بات تھی اس لیے میں نے آگے بڑھ جانا مناسب سمجھا۔اگلے کمرے میں جھانکا۔وہاں بھی اسی طرح لوگ بھرے ہوئے تھے۔ان میں بھی ریناٹ نظر نہیں آیا تو میں نے اس کے بعد والے کمرے میں دیکھا۔اس کمرے میں لوگ کم تھے۔مجھے شبہ ہوا کہ اسی کمرے میں ریناٹ بھی ہوگا۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایک ساتھ اتنے لوگوں سے نمٹا کیسے جائے۔کھلی جگہ میں جنگ کرنا آسان ہے لیکن ایک بند کمرے میں اتنے سارے لوگوں سے نمٹنا آسان نہیں۔پھر کمرے بھی تین تھے اور تینوں میں کل کتنے لوگ ہیں اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔میں نے مزید کمروں کی تلاشی کے لیے سوچا اور آگے بڑھ گیا۔اس کے بعد بھی کئی کمرے تھے لیکن وہ سب خالی تھے۔میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔کافی آگے جانے کے بعد ایک دروازہ نظر آیا۔میں اس کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔اس لیے کہ مجھے دیکھنا تھا کہ وہ دروازہ کھلتا کہاں ہے۔اس دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ مقفل نظر آیا۔اسے کھولوں کیسے۔اس لیے کہ کسی بھی وقت کوئی بھی کمرے کا دروازہ کھل سکتا تھا۔اگر ایک بھی شخص باہر آتا تو مصیبت کھڑی ہو جاتی۔وہ آواز دے کر دوسروں کو ہوشیار کر دیتا اور مجبوری میں مجھے گولیوں کا استعمال کرنا پڑتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔

میری نظریں دروازے کے آس پاس کی دیواروں کو ٹٹول رہی تھیں۔اس لیے کہ مجھے اندازہ تھا کہ اس بند دروازے کو کھولنے کے لیے بھی کسی خفیہ کنڈے یا بٹن کا استعمال ہوتا ہوگا۔میں دیوار پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ اگر کوئی ابھرا ہوا پتھر ہوگا جسے دبا کر دروازہ کھولا جاتا ہوگا تو وہ محسوس ہو جائے۔کافی دیر تک میں وقت برباد کرتا رہا۔لیکن مایوسی تھی کہ جکڑے جا رہی تھی۔میں نا امید ہو چکا تھا کہ مجھے ایک پتلی سی ڈنڈی نظر آئی۔وہ ڈنڈی ٹھیک اس جگہ لگی ہوئی تھی جہاں دیوار مل رہی تھی۔یعنی داہنے کونے میں۔اس کارنر پر وہ اس طرح چپکی ہوئی تھی جیسے وہ شو پیس ہو۔خوبصورتی کے لیے لگائی گئی ہو۔ایک نظر میں وہ معیوب نظر نہیں آئی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے وہاں اس کی موجودگی کچھ عجیب سی لگی۔صرف اس لیے کہ سجاوٹ کا سامان ایسی جگہ رکھا جاتا ہے جہاں لوگوں کی نظر پڑے مگر وہ کونے میں رکھی تھی۔میں نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ ہاتھ میں بہ آسانی نکل آئی جیسے وہاں سے اسے نکالا جاتا ہے اور پھر وہیں رکھ دیا جاتا ہے۔میں نے اسے بغور دیکھا۔وہ چار فٹ کی ڈنڈی ہوگی جس کا ایک سرا دوشاخہ تھا۔اس دوشاخہ کو ٹٹول کر دیکھا مگر اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس پر شبہ ہوتا۔میں اسے اس کی جگہ پر رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے اس کونے کی چھت میں ایک کنڈا سا نظر آیا بالکل ویسا ہی جیسا ایک کنڈا مجھے کچھ دیر قبل معبد کی سیڑھیوں پر نظر آیا تھا۔مگر یہ کنڈا چھت پر تھا اور وہاں تک ہاتھ پہنچ نہیں پاتا۔تبھی ایک خیال کے تحت میں نے اس ڈنڈی کو اونچا کر کے اس کنڈے میں اٹکانے کی کوشش کی۔وہ ڈنڈی اس کنڈی تک پہنچ رہی تھی۔میں نے ایک کوشش کی۔تجربہ کامیاب رہا اور ڈنڈی کے دوشاخہ سے کنڈی پر دباؤ ڈالتے ہی دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔میں نے چھڑی کے ساتھ ادھر دوڑ لگا دی۔دروازے سے باہر جھانکا۔ایک ہی نظر میں وہ مقام پہچان میں آگیا۔وہ دروازہ محل کے عقب میں کھل رہا تھا جدھر جھاڑیاں سی اگی ہوئی تھیں۔میں نے واپس آکر اسی کنڈے پر ڈنڈی سے دوبارہ دباؤ ڈالا تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ایک معرکہ سر ہو گیا تھا۔میں نے روبیر کو واپسی کا اشارہ دیا اور خود بھی تیز قدموں سے واپس چل پڑا۔

اتنی تیزی سے واپس ہو رہا تھا کہ روبیر بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔شاید اس نے سمجھا تھا کہ دشمن نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ہم دونوں آگے پیچھے سیڑھیوں تک آئے اور پھر اسی تیزی سے باہر نکلے۔

روناٹا بس اترنے ہی والا تھا۔اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا تھا۔ہمیں باہر آتا دیکھ وہ جلدی سے مڑ گیا تھا۔اوپر پہنچتے ہی میں نے کہا‘‘ دوستو ہم نے ایک بڑی کامیابی حاصل کرلی ہے۔بس کچھ دیر کی بات ہے۔ریناٹ ہمارے قبضہ میں ہوگا۔‘‘

روناٹا نے میرے کہے ہوئے الفاظ کا ترجمہ کیا

’’ہمیں یقین تھا۔ہمیں یقین تھا تم کامیاب ہو گے

گے۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''مجھے ابھی مکمل کامیابی نہیں ملی ہے۔ جلد پوری کامیابی ملے گی۔'' میں نے کہا'' تم سب فتح حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ آخری معرکہ ہوگا۔ ظلم کی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ اب یہاں امن کا راج ہوگا۔''

روناٹا نے ترجمہ کیا تھا کہ'' ہم تیار ہیں ... ہم تیار ہیں۔'' کا ایک شور سا اٹھا۔ اتنی دیر میں ریناٹ سے نمٹنے کا پلان میرے دماغ میں بن گیا تھا۔ میں نے اپنے پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان سے کہا کہ کچھ لوگ یہاں ٹھہریں باقی میرے ساتھ عقبی میدان میں آئیں۔ وہ سب تو گویا حکم کے منتظر تھے۔ سب کے سب میرے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ میں نے عقبی میدان کو دکھاتے ہوئے کہا'' تمام تیر انداز دائرہ بنا کر محل کے عقبی حصے کو گھیر لیں۔ اس دیوار میں ایک در ہے۔ جب وہ کھلے اور اندر سے کوئی نکلے اور آپ کو حکم ملے تو آپ بلاتکلف ان پر تیروں کی بارش کر دیں۔''

ان سب نے ترکش سے ایک ایک تیر نکال کر کمان پر چڑھا لیے اور میرے حکم کے مطابق میدان میں پھیل گئے۔ ایک دو نے وہاں موجود پیڑوں پر مورچہ بنالیا۔ اب وہاں وہ لوگ رہ گئے جو تیر انداز نہیں تھے۔ گرز بردار تھے۔ وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے کہ میں ان کے لیے کون سا حکم جاری کرتا ہوں۔ میں نے روناٹا سے کہا'' اور تم ان کی سربراہی کرو گے۔ یہ سب تمہاری نگرانی میں حملہ کریں گے۔ تم ان کے سربراہ ہو۔ کمانڈر ہو۔'' پھر میں نے ان میں سے دس بارہ افراد کو اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا اور واپس پہلی والی سمت میں چل پڑا۔ محل کے مرکزی دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا'' آپ سب یہاں سے تہہ خانے کے دروازے تک مورچہ بنالیں۔ اندر سے جو بھی نکلے اس پر حملہ کر دیں۔'' لیکن حکم کے بغیر نہیں پھر میں نے روبیر سے کہا'' تم میرے ساتھ آؤ۔''

روبیر میرے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی تہہ خانے کے دروازے تک آئی۔ میرے ساتھ مجبوری یہ تھی کہ میں ان کی زبان سمجھ تو لیتا تھا مگر بولنے پر قادر نہیں تھا اس لیے ایک ترجمان کو ساتھ رکھتا تھا۔ روبیر کو بھی یہاں تک ترجمانی کے لیے لایا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا'' ہم نے دوبارہ اندر نہیں اتریں گے۔ صرف تیسری سیڑھی تک رہیں گے۔ یہاں سے تمہیں چیخ کر کہنا ہے کہ ہم محل کو آگ لگا رہے ہیں۔ اگر کسی کو نکلنا ہے تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر باہر آجائے۔''

''جی اچھا۔'' روبیر بولی۔

''یہ جو روغن کے پیپے ہم اٹھا لائے تھے یہ اب کام آئیں گے۔ انہی میں آگ لگا کر ہم نیچے پھینکیں گے۔'' میں نے روغن سے لبالب بھرے لکڑی کے ڈرموں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''لیکن جب آگ بھڑکے گی تو پورا محل لپیٹ میں آجائے گا۔ پھر ہم باہر کیسے نکلیں گے؟'' روبیر نے سوال کیا۔

''بے فکر رہو۔ ایسا موقع نہیں آئے گا۔'' کہہ کر باہر کھڑے دو آدمیوں کو قریب آنے کا اشارہ دیا۔ جب وہ قریب آگئے تو میں نے روبیر سے کہا کہ وہ اسے کہے کہ پیپے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ روبیر نے میرے الفاظ کا ترجمہ کیا۔ حکم سنتے ہی وہ دونوں پیپے کی طرف دوڑ گئے اور ایک کے بعد ایک پیپے لا کر تہہ خانے کے دروازے پر رکھنے لگے۔ تقریباً چھ پیپے لائے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

قدرت کا نظام کچھ ایسا حیرت انگیز اور عظیم حکمتوں پر مبنی ہے کہ آدمی کا ذہن اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہاں ایک اتفاق دوسرے اتفاق کا اور ایک واقعہ دوسرے واقعے کا سبب بنتا ہے اس طرح واقعات و اتفاقات کا ایک تسلسل زندگی کا تانا بانا بنتا اور آدمی حالات کے تار عنکبوت میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت ایسا ہی کچھ ہوا۔

میں ان پیپوں کو اندر دھکیل کر آگ لگانے ہی والا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ یکایک دروازہ کھلا تھا اس لیے میں آڑ نہ لے سکا۔ وہ بھی تیزی سے باہر آیا تھا اس لیے واپس نہ مڑ سکا اور ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پتھر کے بت بن گئے تھے۔ بس ایک ٹک ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی کو میں نے ہی توڑا'' تم سب اس چوہے دان میں پھنس چکے ہو۔ یہ روغن کے پیپے دیکھ رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ آگ لگانے کے کام آتا ہے۔'' میں خاموش ہوا تھا کہ روبیر نے ترجمہ کر دیا۔

''تو کیا تم آگ لگاؤ گے؟'' اس نے غرا کر پوچھا'' آگ لگا کر زندہ بھاگ سکو گے؟ پورے آرگون میں ہمارے لوگ ہیں وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے؟''

''اتنی خوش فہمی ٹھیک نہیں۔ آرگون پر ہمارا قبضہ ہے... سامیرا اپنی فوج کے ساتھ بڑھتی آرہی ہے۔ شاید شام



تک وہ تخت پر بیٹھی نظر آئے گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا ایسی بات ہے۔ اگر تم سچے ہو تو ثبوت بھی دو۔''

''اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ ہم یہاں نظر آرہے ہیں۔''

''ہمارے وہ دوست جو اوپر سے آئے ہیں۔ ان کے پاس دہاڑنے والے ہتھیار ہیں۔ وہ ایک لمحے میں تم سب کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔''

''اچھی خبر سنائی ہے۔ تمہارے وہ دوست یعنی ڈیوڈشا کے ساتھی... ان کے لیے میں کافی ہوں۔ ڈیوڈ کے دو اہم ساتھیوں کو میں نے موت کی نیند سلا دی ہے۔ یقین کرو، اگر ڈیوڈ بھاگ نہ جاتا تو اب تک مارا جاتا۔ میرے آدمی اسے آرگون کے کونے کونے میں تلاش کر رہے ہیں۔''

''اس کے ساتھ ایک ایسا آدمی بھی ہے جو دیو جتنی طاقت رکھتا ہے۔ ایک ہاتھ سے چار آدمیوں کا گلا دبا سکتا ہے۔ اس کے رہتے کوئی بھی ڈیوڈشا پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''

''اسے بھی میں نے زخمی کر دیا ہے... تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میری مدد کے لیے پوری ٹیم اوپر سے آگئی ہے۔ اور ہمارے پاس آگ برسانے والے دھماکا پیدا کرنے والے ہتھیار بھی ہیں۔ تم سب اسی صورت بچ سکتے ہو کہ شکست تسلیم کر لو۔'' کہتے ہی میں نے اپنے کندھے سے لٹکی رائفل اتار کر دکھائی۔'' یہی نہیں اب میں تہہ خانے میں جلنے والے روغن گرانے والا ہوں۔ آگ پورے تہہ خانے میں پھیل جائے گی اور سب جل کر خاک ہو جائیں گے۔''

اس وقت اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اگر تیر اندازوں کا نرغہ نہ ہوتا تو وہ کوئی نہ کوئی چال ضرور چلتا مگر وہ بے بس تھا اس لیے غصے کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ترپ کا پتا پھینکا'' اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو واپس نیچے جاؤ اور اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کھلنے والے دروازے سے ایک ایک کر کے باہر نکلیں۔ میں خون خرابہ نہیں چاہتا۔ وقت کم ہے۔ آگ لگانے سے پہلے وہ باہر نکل جائیں۔''

اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے روبیر کی طرف مڑ کر کہا'' جلدی... جتنی جلدی ممکن ہو یہاں رہ گئے تمام تیر انداز کو لے کر محل کے عقب میں چلی جاؤ۔ میں بھی آرہا ہوں۔''

حکم ملتے ہی اس نے تیر اندازوں کو ساتھ لیا اور ادھر دوڑ گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے ایک پیپا سیڑھیوں پر انڈیلا۔ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں۔ فوراً آگ پکڑ لیتیں اسی لیے میں نے بہت تھوڑا روغن گرایا اور جلتی ہوئی مشعل اندر پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کے اوپر وہیں ایستادہ سنگی مجسمہ کو کھینچ کر دروازے پر رکھا اور بھاگتا ہوا پیچھے پہنچا۔ باقی رہ گئے لوگ بھی میری تقلید میں دوڑ پڑے۔

محل کے عقبی حصے میں پہنچا تو دروازہ کھل رہا تھا۔ میں نے روبیر کو بولنے کا اشارہ دیا۔ اس نے چیخ کر کہا'' ایک ایک کر کے سر پر ہاتھ رکھے باہر آئیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کسی نے شرارت کی تو انجام موت ہوگا۔''

یہ تمام لوگ وہ تھے جن کی زندگی عیش و عشرت میں گزر رہی تھی۔ انہیں جنگ و جدل سے کیا لینا دینا۔ انہیں اپنی جان زیادہ عزیز تھی اسی لیے ایک آواز پر سب نے سر پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور ایک ایک کر کے باہر آنے لگے تھے۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا۔ دنیا میں بہت سی باتیں بار بار دہرائی جاتی ہیں اور جو ماضی میں تھا وہی آج ہے۔ سورج ہر صبح ایک افق سے نکلتا اور ہر شام دوسرے افق میں ڈوب جاتا ہے۔ چاند کے طلوع و غروب کے اوقات اور ستاروں کی گردشیں مقرر ہیں۔ ہوائیں اپنے طے شدہ راستوں پر دھرتی کے آخری کناروں تک چکر کاٹتی ہیں، زمین کی گردش کے ساتھ ساتھ رتیں بدلتی ہیں۔ موسم تبدیل ہوتے ہیں۔ 365 دنوں کے چکر میں کبھی سردی کبھی بہار کبھی خزاں کبھی بادلوں کے جھکڑ اور کبھی جلتے سورج کے نیچے دھرتی کا سفر جاری رہتا ہے اور دھرتی کے اس سفر میں ہم کائنات کے طبعی عوامل کو ایک یکسانی کے ساتھ رنگ بدلتے اور ایک پڑاؤ سے بار بار گزرتے دیکھتے ہیں۔ ایک ہی عمل یا ایک ہی واقعہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ماضی کا واقعہ دہرایا جا رہا ہے۔ سامیرا نے بتایا تھا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو زبردستی محل سے نکالا گیا تھا۔ آج اسے نکالنے والے یا ان کے ساتھی مجبور ہو کر باہر نکل رہے تھے۔

میں نے روبیر سے کہا کہ وہ ان لوگوں سے کہے کہ سب ایک طرف جا کر بیٹھ جائیں۔ اس نے میرے الفاظ کو مقامی زبان میں ادا کیا۔ باہر آنے والے ایک گھنے پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھنے لگے۔ تقریباً ایک سو ساٹھ افراد باہر آئے تھے مگر ان میں ریناٹ نہیں تھا۔ جب تمام لوگ باہر آگئے تو میں

نے رودبیر سے کہا کہ وہ ان سے پوچھے کہ روناٹ کہاں ہے۔اس کے قریبی لوگ کہاں ہیں؟

رودبیر کے سوال پر ایک آدمی نے کہا کہ وہ تو کب کا محل سے جاچکا ہے۔

''کہاں؟ کدھر گیا ہے؟'' رودبیر نے پوچھا۔

''اپنے آدمیوں کے ساتھ وہ شہر کی طرف گیا ہے۔''

یہ خبر دہلا دینے والی تھی۔ریناٹ کا یوں فرار ہو جانا اچھا نہیں تھا۔میں نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ ان تمام لوگوں کو وہاں لے جائے جہاں پہلے سے کچھ قیدی موجود ہیں۔انہیں بھی قیدی سمجھا جائے پھر کچھ لوگوں کو اندر بھیجا کہ وہ جا کر سیڑھیوں پر لگی آگ کو بجھانے کی کوشش کریں اگر نہیں بجھے تو یوں ہی چھوڑ دیں۔محل جلتا ہے تو جلنے دیں۔

حکم دے کر میں شہر کی طرف چل پڑا۔میرے ساتھ رودبیر اور راٹون کے علاوہ کچھ اور جانباز بھی تھے۔میں نے ٹھان لیا تھا کہ ہر حال میں ریناٹ کو گرفتار کرنا ہے۔تا کہ اس کا فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔راٹون اور رودبیر ساتھ چل رہے تھے۔وہ دونوں بحث کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔راٹون کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامیرا اتنی جلدی قلعہ سے یہاں پہنچ جائے گی۔وہ کہہ رہا تھا ''اتنی طویل مسافت اس قدر پوشیدہ طور پر طے کرنا آسان نہیں ہے۔کوئی فوج نہیں کر سکتی۔سامیرا بھی نہیں۔''

''کیوں نہیں کر سکتی؟'' رودبیر کا سوال تھا۔

راٹون نے اپنا خیال پیش کیا ''اتنی رازداری سے قلعہ سے آرگون پہنچنا۔درمیانی چوکیوں کو اس طرح فتح کرنا کہ کسی ایک نفس کو بھی علم نہ ہو پائے بعید از قیاس ہے۔''

''آپ کے یقین نہ کرنے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا'' رودبیر نے جواب دیا ''ہو سکتا ہے سامیرا نے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا ہو جو متروک ہے۔جنگل سے ہو کر گزرتا ہو۔''

''مگر وہ راستہ کتنا دشوار اور خطرناک ہے۔'' راٹون نے کہا ''اسے عبور کرنے کی ہمت کون کر سکتا ہے۔''

''اسے عام لوگ دشوار سمجھ کر ترک کر سکتے ہیں۔'' رودبیر بولی۔''مگر سامیرا ناقابلِ تسخیر ہے۔کسی سے خوفزدہ ہونے والی نہیں اسی لیے تو وہ اتنے عرصے سے ریناٹ کے مقابل کھڑی ہے۔اس کے حوصلہ کو دیکھ کر ہی برف والے نے اس کی مدد کے لیے اس بہادر آدمی کو ہمارے پاس بھیجا۔'' رودبیر کا اشارہ میری طرف تھا۔میں خاموش سا ایک جانب بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''سب سے اہم بات یہ کہ....'' رودبیر نے مجھ پر نظر ڈال کر کہا ''جو سر سے کفن باندھ لے اس کے لیے راہ کی دشواری یا خطرہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔سامیرا نے سر سے کفن باندھ لیا ہے۔''

''مگر وہ اکیلی نہیں ہوگی۔اس کے ساتھ پورا لشکر ہوگا۔مال و اسباب ہوگا۔جنگی سامان ہوگا اور جنگل میں اسمار بھی ہیں ہارن بھی ہیں۔پھر کانٹے برسانے والے پرندے بھی۔ان سے مقابلہ کرتے ہوئے بڑھنا ہے جو شاہی فوج سے زیادہ خطرناک ہیں۔وہ کیسے نمٹ پائے گی؟''

کہیں ایسا نہ ہو کہ راٹون اپنی تاویلات سے رودبیر کو قائل کر لے اور پھر دوسرے بھی بزدلی کی راہ پر چل پڑیں۔اس وقت ہمیں بہادروں کی ضرورت ہے۔ایک ایک سپاہی اہم ہے۔یہ جنگ اس وادی کی قسمت کا فیصلہ کرے گی اس لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔میرے دل نے سرگوشی کی ''اسے روکنا ہوگا۔ان کی باتوں میں دخل دینا ہوگا۔''

''کیا تمہیں یقین آتا ہے کہ دوسری دنیا سے کوئی آرگان آ سکتا ہے؟ لیکن میں آ گیا۔نہ صرف خود آیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔اس وقت قلعہ میں میرے دس سے زیادہ دوست موجود ہیں جو سامیرا کے ساتھ آ رہے ہیں۔ان کے پاس دہاڑنے والے ہتھیار بھی ہیں جو آگ والے تیر برساتے ہیں۔''

''آپ کو برف والے نے بھیجا ہے تبھی آپ آئے ہیں۔''

''برف والے کی منشا ہے کہ میں سامیرا کی مدد کروں اسی لیے اس نے میرے ساتھیوں کو بھی بھیج دیا۔جب برف والا یہی چاہتا ہے تو سامیرا کی فتح یقینی ہے۔کوئی بھی پریشانی اب اسے روک نہیں پائے گی۔''

''اگر برف والا یہی چاہتا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے اپنے گال پر خود ہی تھپڑ مار کر کہا۔یہ دراصل یہاں کا طریقۂ کار ہے کہ جب کوئی گناہ سے تائب ہوتا ہے تو وہ اپنے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے۔برف والے کی منشا کے خلاف اس نے سامیرا کو کچھ کہا تھا یہ اس کے خیال میں گناہ کی بات تھی۔

میں اس کے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا مگر یہ مسکراہٹ فوراً ہی حیرت میں بدل گئی کیوں کہ ایک آواز ابھری اور پورے آرگون پر چھا گئی تھی۔یہ آواز تھی اس نقارے کی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا اور میرے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ یہ طبل جنگ ہے۔لیکن اس بار آواز میں ہلکا سا فرق تھا۔میں نے رودبیر کی طرف دیکھا۔گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔رودبیر میری بات فوراً سمجھ گئی۔اس نے سرگوشی جیسے انداز میں بتایا ''یہ ...یہ شاہی اعلان ہے۔لگتا ہے کہ ریناٹ اپنے کسی پڑاؤ میں پہنچ گیا ہے جہاں سے یہ اعلان ہو رہا ہے؟''

''اعلان میں کیا کہا جا رہا ہے۔اس کا کوئی مطلب تو ہوگا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''تمام سپاہیوں کو حاضر ہونے کا اعلان ہے۔جنگ کے لیے پیش قدمی ہوگی۔''

''مگر ریناٹ کے سارے سپاہ تو میدانِ جنگ میں ہے؟''

''ہو سکتا ہے اس نے کچھ فوج یہاں آرگون میں بھی رکھی ہو، وہ انہیں ہی بلا رہا ہے؟''

''اگر یہ بات ہے تو معاملہ پریشان کن ہے۔میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی ساری فوج میدانِ جنگ میں جا چکی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ وہ جنگ کسی اور طرح سے لڑنا چاہتا ہے۔''

''مجھے خود حیرت ہے کہ ایسا کیسے ہوا؟ ہمارے یہاں جنگ کا ایک اصول ہے۔اس اصول کے تحت جنگ کے لیے خصوصی فوج ہوتی ہے اور وہی میدانِ جنگ میں جاتی ہے۔دوسری فوج صرف شہر کے نظم و نسق سنبھالتی ہے۔یہاں جو فوج تھی وہ لڑنے والی نہیں صرف امن و امان برقرار رکھنے والی تھی۔لگتا ہے ریناٹ نے دھوکا کیا ہے اور اپنی پوری فوج سامیرا کے مقابلے میں نہیں بھیجی ہے اور اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔''

''جس کے ساتھ ڈیوڈ شا جیسے لوگ ہوں وہ عیاری سے کام لینا ضروری سمجھتا ہے۔مجھے لگ رہا ہے کہ ڈیوڈ شا نے یہ عقل دی ہوگی اور اب وہ اسی کے پاس بیٹھا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو یہ بہت برا ہوگا۔تمہارے دشمن کے پاس دہاڑنے والے ہتھیار ہیں جو آگ والے تیر پھینکتا ہے۔وہ سامیرا کی فوج کو بہت جلد روک لے گا۔اسے تباہ کر دے گا۔لگتا ہے ہم ہمیشہ محکوم ہی رہیں گے۔ظلم و جور سہنا ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔'' رودبیر کے لہجے میں درد اتر آیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورت بھی کیا چیز ہے۔جب محبت پر اتر آئے تو سب کچھ بھول جاتی ہے اور جب دھوکا کھا لے تو عقل کے گھوڑے پر سوار ہو جاتی ہے۔یہی وہ رودبیر تھی جو میری موت کی خواہاں تھی۔سامیرا سے غداری کر رہی تھی۔مجھے اسی نے رسوا کیا اور صرف اپنی محبت کو پا لینے کے لیے اس نے سب سے دشمنی مول لی۔پھر جب شامین نے اسے دھوکا دیا تو اب اسے وطن پرستی یاد آ رہی ہے۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' رودبیر نے ٹوکا تو میں خیالوں کے بھنور سے باہر آ گیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''میں ڈیوڈ شا کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں کہ اس سے کیسے نمٹا جائے؟''

''تمہارے ساتھ برف والے کی مدد ہے۔اس نے ہی ڈیوڈ شا سے نمٹنے کے لیے تمہارے ساتھیوں کو بھی بھیجا ہے تو وہی تمہیں فتح بھی دلائے گا کیونکہ وہ عظیم ہے۔ہمارا محافظ ہے۔''

ساتھیوں کے لفظ نے مجھے سفیر کی یاد دلا دی۔نامعلوم اس پر کیا گزری وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔وہ یہاں کی زبان سے بھی ناواقف ہے۔جنگل میں موجود درندوں سے بھی آگاہ نہیں۔اگر اسمار یا ہارن سے مڈبھیڑ ہوگئی تو وہ کیسے نمٹے گا۔اس کے پاس ہتھیار تو ہے لیکن گولیاں صحیح مقدار میں ہیں بھی یا نہیں۔ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ نقارے کی گونج میں ایک واضح فرق آ گیا۔ایسا فرق کہ میں چونک گیا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔''رودبیر، اب کون سا پیغام دیا جا رہا ہے؟''

''نقارے پر جو پیغام دیا جاتا ہے یہ ایک الگ علم ہے۔اس بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں لیکن جہاں تک میں سمجھ رہی ہوں وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پہنچ گئے ہیں لیکن ابھی اور پہنچنا باقی ہیں۔جو پہنچے نہیں ہیں اب وہ سیدھے میدانِ جنگ میں پہنچیں۔جنگ کی ابتدا اب ہوا چاہتی ہے۔''

رودبیر کی بات نے مجھے مزید دہلا دیا۔اس کا مطلب یہی تھا کہ ریناٹ اب میدانِ جنگ کا رخ کرنے والا ہے۔یقیناً اس کے ساتھ ڈیوڈ شا ہے جو اسے اکسا رہا ہے۔جب کہ سفیر نے یہی بتایا تھا کہ سامیرا ابھی قلعہ سے نکل پڑی ہے اور آرگون کی طرف بڑھ رہی ہے۔یقیناً اس کے ساتھ راجا صاحب اور میرے تمام دوست بھی ہوں گے۔ڈیوڈ شا کے پاس اگر آتشی اسلحہ ہے تو ان کے پاس بھی ہوگا۔یہ اور بات ہے کہ ڈیوڈ شا کے پاس جدید ترین اسلحہ ہے۔مقابلہ ٹکر کا ہے لیکن میں ان سے دور ہوں۔ان کی مدد

کس طرح کروں؟

''کیوں نہ ہم ریناٹ کی جمع ہونے والی فوج پر حملہ کر دیں اس طرح یہ لوگ یہیں الجھ جائیں گے۔'' روبیر نے ایک عقل کی بات سمجھائی تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے دماغ کی کھڑکی کھل گئی۔

یہ خیال برا نہیں تھا۔ میں نے روبیر سے کہا ''تمہیں اندازہ ہے کہ یہ نقارہ کہاں بج رہا ہے۔ ہمیں تیزی سے وہاں پہنچنا ہے۔''

''میں آرگون بہت کم آئی ہوں۔ یہاں کی گلیاں سڑکیں میرے لیے اجنبی ہیں۔'' روبیر نے جواب دیا۔

''لیکن میں یہاں کی ایک ایک گلی ایک ایک علاقہ جانتا پہچانتا ہوں۔'' رائون نے کہا۔

''تو بتاؤ یہ کہاں سے آواز آرہی ہے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''یہ آواز... سورج والی سمت میں ایک بڑا میدان ہے، مجھے لگ رہا ہے یہ آواز وہیں سے آرہی ہے۔''

''وہ میدان یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''اگر ہم تیز تیز چلیں تو زیادہ دور نہیں ہے۔ آواز بھی صاف ہے۔ یہ نزدیک ہونے کا اشارہ ہے۔''

''چلو دیکھ لیتے ہیں تمہارا اندازہ کتنا صحیح ہے؟'' میں نے مسکرا کر کہا ابھی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی سا کوندا اور میں نے پاس کے ایک پیڑ کا جائزہ لیا۔ وہ پیڑ خاصا بلند تھا۔ یوں بھی یہاں کے پیڑ بلندی میں ہمارے یہاں کے پیڑوں سے کافی اونچے ہوتے ہیں۔ وہ پیڑ بھی کافی اونچا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی پھر کہا ''اگر اس پیڑ پر چڑھ کر دیکھا جائے تو اصل مقام کا تعین بہ آسانی ہو جائے گا'' پھر میں نے ان میں سے ایک مضبوط جسامت والے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا تم اس پیڑ پر چڑھ سکتے ہو؟''

ابھی میں نے صرف پوچھا تھا لیکن وہ جیسے پہلے سے ہی تیار تھا۔ شاید اس لیے کہ میں نے اسے اہمیت دی تھی۔ وہ دوڑ کر بندر جیسی پھرتی سے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ میں نے اس کی تیزی پر داد دی۔ وہ کافی اوپر پہنچ چکا تھا۔ وہ آواز کی سمت دیکھ ہی رہا تھا کہ عقب سے کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ تعداد میں سات تھے اور ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ کسی نے گرز اٹھا رکھی تھی۔ کوئی ترکش و تیر کمان کے ساتھ تھا تو کسی کے پاس گوپھن جیسا ہتھیار تھا۔ دیکھنے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سب سپاہی ہیں۔ وہ یکا یک سامنے آئے تھے اس لیے ہم اپنے آپ کو کسی آڑ میں بھی نہیں کر سکے تھے۔ ہم ان کی نظروں میں آچکے تھے۔ میں نے رائون سے کہا ''روبیر کو اشارہ دے کر دوسروں کو بھی ہوشیار کر دو۔''

تقریباً سب ہی اس نئی افتاد پر گھبرا اٹھے تھے۔

''میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب تک میں نہ کہوں کوئی دخل نہ دے کیونکہ میں ابھی شور شرابہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ڈنکے کی آواز پر اِدھر اُدھر چھپے تمام سپاہی نکلے چلے آرہے ہوں گے۔ اس طرح ایک ایک دستے کو روکنا وقت برباد کرنا ہے۔''

''ہم لوگ ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ جسے شطرنج کہتے ہیں۔ اس کھیل میں ہم بھی کبھی پیادے کو اہمیت دے کر شاہ مرا لیا کرتے ہیں۔''

''میں ابھی نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ ذرا سوچو.. ان لوگوں نے بھی سن لیا ہوگا کہ ریناٹ شکست تسلیم کر کے تہہ خانے میں چھپ گیا تھا پھر بھی یہ اس کی آواز پر دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے ایسا کیا ہوا کہ یہ لوگ پھر سے جانثاری پر تیار ہو گئے ہیں۔''

''بات تو صحیح ہے۔'' رائون نے کہا۔ ''مگر ہمیں جیسا حکم دیا جا رہا ہے ہمیں وہی کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ برف والے کا نمایندہ ہے۔'' اس نے ایک نزدیکی درخت کی جانب دوڑ لگا دی اور کسی بندر کی سی پھرتی سے وہ اس پر چڑھ گیا۔ باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی اور اِدھر اُدھر خود کو چھپانے کی سعی کرنے لگے۔ اتنی دیر میں سپاہی قریب آچکے تھے۔ میری منشا نہ تھی کہ میں ان سے جھگڑتا اس لیے میں نے اپنے کندھے سے لٹکی گن کو گرا دیا جیسے ہی گن گری میں نے اسے پیروں سے جھاڑیوں کے اندر دھکیل دیا تاکہ وہ اسے دیکھ نہ سکیں۔ شاید انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ میں نے کوئی چیز نیچے گرائی ہے یا پھر انہوں نے دیکھا ہو تو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ اب وہ بہت قریب آچکے تھے۔ ان کے جسم پر زرہ بکتر بھی تھی۔ اس سے پہلے میں نے جتنے بھی سپاہی دیکھے تھے سب کے سب وردی میں نظر آئے تھے یہ پہلا دستہ نظر آیا تھا جو زرہ بکتر میں ملبوس تھا۔ یقیناً یہ اہم دستہ تھا۔ مجھے بیچ راستے میں کھڑا دیکھ اس نے پوچھا ''تو کون ہے اور ہمارے راستے میں کیوں کھڑا ہے۔ کیا تجھے اپنی جان کا خوف نہیں



ہے۔ کیوں گھر سے باہر نکلا۔''

میں نے اس کی بات سمجھ تو لی تھی مگر بول نہیں سکا تھا۔ جواب میں کیا کہتا یہ الفاظ میرے پاس نہیں تھے اور نہ میں کسی مترجم سے اپنے جواب کا ترجمہ کرا سکتا تھا۔ اس لیے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔ میرے جواب نے اسے تیخ پا کر دیا۔ اس نے کمر سے لٹکے سنگی خنجر کو نکالا اور اسے میری طرف بڑھا کر پوچھا ''جواب دے تو کون ہے؟ کیا تو ان لوگوں کا ساتھی ہے جو اوپر سے آئے ہیں۔ جو معبد میں مہمان ہیں؟''

میں نے نفی میں دوبارہ سر ہلا دیا۔ اس بار اس نے خنجر اونچا کیا اور مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے اسے ہلایا مگر میں نے پیچھے ہٹ کر خود کو بچا لیا۔ میری اس جسارت پر وہ تلملا گیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے خنجر چلا دیا۔ اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو اپنے سر سے محروم ہو چکا ہوتا۔ وہ جھنجلا کر آگے بڑھا۔ باقی سب اپنی جگہ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ چیختا ہوا خنجر سیدھا کر کے چڑھ دوڑا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ بلند ہو۔ میں نے اس آزمودہ داؤ کو آزمایا جسے میں نے اس چائنیز سے سیکھا تھا جو دیکھنے میں کمزور سا تھا لیکن ٹریک خوب جانتا تھا۔ وہی چائنیز جس کے لخت جگر کو بیٹو دل دے بیٹھا تھا۔ میں نے سپاہی کے بلند ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی کہنی سے قریب دو انگلیوں سے چوٹ ماری۔ یہ داؤ جتنا مشکل ہے اتنا ہی کارگر بھی۔ اگر انگلیوں میں جان ہو تو انگلیاں مقابل کے گوشت میں دھنس جاتی ہیں، وہی ہوا۔ وہ ڈکرا اٹھا۔ اس کی چیخ خاصی بلند تھی۔ یقیناً انگلی صحیح نشانے پر لگی تھی۔ کہنی کے قریب والی رگ پر ضرب پڑی تھی۔ اس کا ہاتھ مفلوج ہو گیا ہوگا۔ خنجر بھی چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

اپنے ساتھی کی چیخ سن کر باقیوں کو بھی ہوش آگیا۔ وہ سب ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ ایک ایک کر کے آتے تو بات دیگر تھی لیکن اتنے سارے سپاہی ایک ساتھ آگے بڑھے تھے۔ میں کوئی فولاد کا بنا ہوا تو تھا نہیں۔ کسی کا بھی خنجر میرے جسم میں دھنس سکتا تھا۔ میں نے ان کے حلقہ سے نکلنے کے لیے خود کو زمین پر گرایا اور پھسلتا ہوا دور نکل گیا۔ وہ سب ادھر ہی مڑ گئے۔ اگر میں اس جگہ رکتا تو ایک نہ ایک زخم میرے جسم پر ضرور بن جاتا لیکن میں رکا نہیں پھسلتا چلا گیا۔ کہنیوں کو زمین پر اڑا کر جسم کو آگے دھکیلنا اتنا آسان بھی نہیں۔ مگر پہلے کی مشق کام آئی اور میں ان سے کافی دور ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ پھرتی سے زمین بھی... چھوڑ دی تھی۔ اب میں اٹھ گیا تھا کہ ان میں سے ایک نے منہ سے زوردار آواز نکالی اور میری جانب دوڑا۔ اس کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسا کراٹے میں رائج ہے کہ دشمن پر دہشت طاری کرنے کے لیے زوردار آواز نکالو۔ اس کے چیخنے پر میں نے اپنے جسم کو پیروں کے دونوں پنجوں پر اونچا کیا اور جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے داہنی جانب چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنے زور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ میں نے کھڑے کھڑے لات گھما دی۔ جوتے کا نوکیلا سرا اس کی ریڑھ کی ہڈی سے ٹکرایا اور وہ بھد سے زمین پر گر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ جس جگہ چوٹ لگی ہے وہ اسے اٹھنے نہیں دے گی۔ نچلا حصہ کچھ دیر کے لیے مفلوج ہو چکا ہوگا۔ اس لیے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر باقی سپاہیوں کو دیکھا۔ اگر بر وقت میں اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو گرز کا بھرپور وار میرے جسم پر پڑتا۔ جنگ میں اتفاقات ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنی جگہ سے ہٹنا میرے کام آگیا تھا۔ اب میں جس جگہ تھا وہاں سے میں نے ایک لمبی چھلانگ ماری اور ان سب کے عقب میں چلا گیا۔ ان کے سروں پر سے گزرتے ہوئے میں مکا رسید کرنا نہیں بھولا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اس طرح کا وار کروں گا۔ جس کی گردن سے مکا ٹکرایا تھا وہ بھی زمین پر گر گیا۔ ایک قلیل وقت میں میں نے دو بندوں کو فارغ کر دیا تھا۔ باقی رہ جانے والے اپنی اپنی جگہ رک کر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ میں نے للکار کر پھر اچھال بھری۔ یہ طریقہ جنگ ان کے لیے بالکل نیا تھا شاید اسی لیے وہ محو حیرت تھے مگر یہ کراٹے کا پسندیدہ انداز سمجھا جاتا ہے جس کی پریکٹس مجھے بہت اچھی طرح تھی۔ وہ سب عام انداز سے لڑنے والے میرے سامنے کہاں ٹکتے ایک کے بعد ایک چار افراد گر چکے تھے۔ میں نے تاک تاک کر نازک حصوں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ یہ سب کس قسم کے خاص دستے سے تعلق رکھتے تھے جو صحیح انداز سے لڑنا بھی نہیں جانتے۔ اور یہی میری بھول تھی۔ ذرا سی غفلت کا انہوں نے فائدہ اٹھا لیا۔ گوپھن جیسا ہتھیار تھامے ہوئے شخص نے رسی میں بندھے دھات کے وزنی گولے کو گھما کر مجھے مارا۔ وہ گولا پوری قوت سے میری پیٹھ سے ٹکرایا تھا۔ مجھے اپنی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں زمین پر گرا تھا کہ ایک دوسرا سپاہی خنجر لہراتے ہوئے میری طرف لپکا۔ اس نے وار

کرنے کے لیے خنجر بلند کیا تھا کہ خود چھنک کر گر پڑا۔ پیڑ پر چڑھے بندے نے وہیں سے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ عین اس پر گرا تھا۔ اس لیے اتنا تو درکنار وہ چیخ بھی نہ سکا تھا۔ کودنے والے پر بقیہ سپاہی لپکے تھے کہ ادھر اُدھر چھپے میرے ساتھی میدان میں آگئے۔ اب واقعی یہ چھوٹا سا میدان، میدان جنگ بن گیا۔ مگر جو میری چوٹ سے گرے تھے وہ ہنوز بے ہوش تھے۔ اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس جانب دوڑ لگا دی جہاں جھاڑیوں میں اپنی وہ والی گن پھینکی تھی جو میں نے زیتی سے حاصل کی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے بھی اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ اور زوردار مقابلہ جاری تھا کہ میں نے گن تلاش کر لی اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور وہ سب ہی نہیں خود میرے ساتھی بھی چیخ مار کر گر گئے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا "روبیر انہیں بتاؤ کہ اگر انہوں نے ہاتھ نہیں روکے تو اس ہتھیار کے جلتے تیر ان کے جسموں کو چھلنی کر دیں گے۔"

روبیر نے زمین سے اٹھتے ہوئے میرے الفاظ کا ترجمہ کیا۔ ان سپاہیوں نے اشارے سے بتایا کہ وہ میری بات مانیں گے۔ تب میں نے کہا "سب اپنے ہتھیار پھینک کر اپنے ہاتھوں کو سروں پر رکھ لیں۔"

روبیر نے فوراً ہی میرے جملے کا ترجمہ کیا جسے سنتے ہی انہوں نے عمل کیا۔ میں نے سب کو ایک قطار میں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور پھر روبیر کی مدد سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ میں نے پہلا سوال کیا کہ وہ کیوں پہلے نہیں گئے اور اب کیوں جا رہے ہیں تو ان میں سے ایک بولا "اعلان جنگ سے قبل ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم ایک مخصوص بڑے سے گھر میں چھپ کر رہیں گے اور جب نقارے کی مدد سے پیغام دیا جائے گا تبھی باہر نکلیں گے۔ ہمیں سامیرا کی فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہوگا۔"

"مجھے اس کی بات میں وزن لگ رہا ہے۔" پیڑ پر چڑھنے والے ایمارک نے کہا "پیڑ سے کافی دور تک نظر آتا ہے۔ سورج والی سمت میں کچھ سپاہی ضرور ہیں اور ادھر سے ہی نقارہ بجنے کی آواز آ رہی ہے لیکن اصل فوج اس جگہ سے بہت دور الٹے ہاتھ پر جمع ہے۔ اسی سمت میں کافی دور سامیرا کی فوج صف بستہ ہے۔"

"وہاں پہنچ کر تم لوگ کیا کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کافی دور سے گھوم کر سامیرا کی فوج کے عقب میں پہنچتے اور حملہ کر کے افراتفری مچا دیتے۔ ہمارا دستہ یہ سوچ کر جنگ میں حصہ لیتا کہ اسے زندہ بچ کر نہیں آنا ہے۔ شہنشاہ پر قربان ہو جانا ہے۔" اسی قیدی نے جواب دیا۔

جس نے بھی یہ دستہ تشکیل دیا ہے وہ کافی سوجھ بوجھ والا لگا اس لیے کہ اگر یہ حملہ ہو جاتا تو سامیرا کی فوج کو سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔ خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہی کرتا ہے۔ میں نے مارنٹ کو ان قیدیوں کو لے جانے کا حکم دیا۔ مارنٹ سے کہا تھا کہ انہیں بھی اسی جگہ رکھا جائے جہاں دیگر قیدی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے فوراً دھماکا کرنے والے اسلحہ سے ختم کر دینا۔" مارنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنی داہنی آنکھ دبا دی تھی۔ اگر اسے پہلے سے اس اشارے کا پتا نہ ہوتا تو شاید وہ سمجھ نہ پاتا لیکن معبد میں ہنستے ہوئے میں نے اس اشارے کا ذکر کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ فوراً سمجھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

"جی ہاں' آپ نے جس طرح مجھے سکھایا ہے میں اسی طرح اسے استعمال کر کے ان سب کو موت دے دوں گا۔" پھر ان قیدیوں کی طرف مڑ کر بولا "چلو... اب وہی تم سب کی منزل ہے۔"

قیدی کینچوے جیسے بن گئے تھے۔ بغیر چوں چرا کیے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں واپس جاتے ہوئے میں دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مستعد تھے۔ میرے اشارے کے منتظر تھے۔ میں نے انہیں نظروں ہی نظروں میں تولا۔ مارنٹ دلیر تھا' پھرتیلا تھا اس کے جانے سے ہمارا ایک اہم سورما کم ہو گیا تھا لیکن مجھے باقی کے لوگوں پر بھی بھروسا تھا۔ وہ بھی وقت پڑنے پر بے جگری سے لڑتے۔ مجھے خوشی تھی کہ جب بھی اور جہاں بھی مجھے دوست ملے بہادر ملے۔ ایسے بہادروں کا ساتھ ہو تو دل سے خوف کم ہو جاتا ہے۔ میں نے ان بہادروں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب چل پڑے۔ ایمارک ہمارا رہنما تھا۔ اس کی رہنمائی میں ہم اسی جانب بڑھ رہے تھے جدھر سے نقارے کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ سب سے آگے وہ تھا' اس کے پیچھے روبیر اور پھر میں اور میرے پیچھے باقی سب۔ ہم احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ پگڈنڈی نما سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے پیڑ تھے۔ میری نظریں درختوں کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ اس لیے کہ میں نے بندر نما



مخلوق کی تباہی' خون آشامی دیکھی تھی۔ کہیں کوئی جھنڈ ادھر بھی نہ ٹپک پڑے اسی خیال سے میں ان درختوں کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے قدم سے قدم ملا کر روبیر چل رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ بولی۔ "یہ کیا بات ہوئی... خواہ مخواہ یہ لوگ کود گئے۔ انہیں اتنی آسانی سے پکڑ میں آنا تھا تو سامنے آئے کیوں؟"

"یہ نہ کہو... بہت بڑا کام ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیسا کام؟"

"ان کی وجہ سے ایک اہم بات معلوم ہو گئی۔ ریناٹ کس طرح حملہ کرنے والا ہے یہ قبل از وقت پتا چل گیا۔ سمجھ لو آدھی جنگ ہم نے جیت لی یعنی اب اس کی یہ والی فوج جسے اس نے اس کام کے لیے محفوظ رکھا تھا اسے میں تباہ کروں گا۔"

"واہ.. اس بارے میں تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ واقعی یہ ایک اہم کام ہو گیا۔" روبیر بولی۔

"اب خاموشی سے آگے بڑھنا ہے۔" کہہ کر میں نے رفتار تیز کر دی۔ میں جلد سے جلد ریزرو سپاہیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ کیونکہ قرین قیاس تھا کہ ریناٹ بھی وہیں ہو گا۔ وہاں جتنے بھی سپاہی کیوں نہ ہوں سب کو گرفتار کرنا ہے۔ خون خرابے سے اجتناب کرتے ہوئے سامیرا کی راہ صاف رکھنا ہے اور اگر یہ کام جلدی ہو گیا تو سامیرا کی فوج میں شامل ہو جانا ہے تاکہ اسے تقویت ملے۔ ویسے اس کے ساتھ میری پوری ٹیم ہے جو پوری ایک فوج پر بھاری ہے لیکن ادھر بھی تو ڈیوڈ شا جیسا عیار و مکار ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ اس والے دستے میں ہے یا فوج کے ساتھ ہے یہ خبر بھی نہیں مل رہی تھی۔ ڈیوڈ کے ساتھ باسو بھی ہوگا۔ سب سے زیادہ خطرہ اسی سے تھا کیونکہ عام لوگ اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھے۔ وہ قوت کا پہاڑ ہے۔ اسے زیر کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ وہ میرے چنگل میں پھنس گیا تھا اور اس کا ستارہ بلند تھا کہ وہ میری جکڑ سے فرار بھی ہو گیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہوشیار ہوگا۔ اب کسی طور وہ مجھ پر رحم نہیں کھائے گا۔ اپنے آپ میں وہ عجوبہ ہے۔ ویسے یہ دنیا ہی عجائبات سے بھری ہے۔ اس عجیب دنیا میں ہر بات ایک نئی بات ہے۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے یہاں کے عجائبات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر واپس جا سکا تو جسے بھی یہاں کے بارے میں بتاؤں گا وہ اسے جھوٹ سمجھے گا۔ بارن جیسا قوی اور اسمار جیسا پھرتیلا خون آشام درندہ۔ دیکھنے میں مور سے بھی زیادہ خوبصورت پرندہ جس کی ہلاکت خیزی ایسی کہ دنیا دنگ رہ جائے جس کے پروں سے زہریلی سوئی جھڑے اور بھی بہت کچھ جو عجائبات میں ہی شمار ہو سکتا ہے۔ میں انہی سب باتوں پر غور کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ اگر یہاں سے بحفاظت اپنی دنیا میں پہنچ گیا تو پھر سے وہی شب و روز ہوں گے۔ لیکن نہیں' وہاں اب بھی مرشد علی کا قضیہ باقی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو دربدری میری زندگی میں در آئی۔ پتا نہیں مرشد کون سی سازش تیار کر رہا ہوگا۔ کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے مجھے چین نہیں مل سکتا۔ اسی کی وجہ سے تو میری زندگی اس ڈھب پر آئی۔

خیالوں میں ڈوبا میں بڑھا جا رہا تھا کہ ایمارک نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اس کے روکنے سے میں ماضی کے گرداب سے نکل کر حال میں لوٹ آیا۔

"اب ہمیں احتیاط کرنا ضروری ہے کیونکہ نقارے کی آواز بند ہو گئی ہے۔"

## آسیہ اندرابی

1963ء سری نگر میں پیدا ہوئیں، ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے سری نگر کے ایک کالج سے بائیو کیمسٹری میں گریجویشن کی۔ ازاں بعد قرآن حکیم کا ترجمے کے ساتھ مطالعہ کیا اور عربی زبان کو سمجھنے کے لیے عربی آنرز کرنے اور خود کو خواتین کی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ وہ پردے کے استعمال کو کسی بھی کام کو سرانجام دینے کے لیے حائل نہیں سمجھتیں۔ 1981ء میں انہوں نے دختران فاطمہ کے نام ایک نکاتی ایجنڈا تشکیل دیا یعنی پردہ خواتین کی حفاظت کے لیے ہے جسے اللہ بھی چاہتا ہے۔ جون 2002ء کو ان کی تنظیم کو پوٹا کے قانون کے تحت دہشت گرد قرار دیا۔ 1987ء میں انہوں نے اپنی تنظیم کو دختران ملت کا نام دیا۔ 1989ء میں ان کی تحریک نے جڑ پکڑ لی آزادی کشمیر کے سلسلے میں وہ سری نگر کی گلیوں اور محلوں میں پھیل گئی۔ 1991ء میں انہوں نے ہڑتالوں کی کال دی۔ انہوں نے ایک عرصہ جیل میں گزارا۔

مرسلہ: اکبر ذیشان۔ میرپور (آزاد کشمیر)

میں نے غور کیا تو واقعی نقارہ نہیں بج رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جو یہاں کے جنگل کا حصہ ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے موت نے پر پھیلا دیئے ہوں۔ سناٹے کی چادر پھیل گئی ہے۔ میں نے ایمارک سے کہا ”پیڑ پر چڑھ کر دیکھو، اب وہ لوگ کتنی دور ہیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ زیادہ دور نہیں ہیں۔ غور سے سنیں لوگوں کی باتوں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا ہے۔“

میں نے کان لگا کر سنا مگر میں ان کی طرح خوش سماعت تو تھا نہیں کہ ہلکی سی آواز بھی سن لیتا۔ یہاں کے تقریباً تمام لوگوں کی حس سماعت بہت تیز دیکھی ہے۔ وہ ہلکی سی سرسراہٹ بھی سن لیتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی تو ہماری آواز سن سکتے ہیں اس لیے واقعی ہمیں احتیاط کرنا ہوگی۔ میں نے ایمارک کو دوبارہ اشارہ کیا کہ وہ پیڑ پر چڑھے۔ ایمارک پیڑ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ اس لیے کہ اس پیڑ کا جائزہ لینے کے لیے جیسے ہی میں نے اوپر دیکھا تھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ شاخوں کے درمیان وہی خوش رنگ پرندہ بیٹھا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اڑ سکتا تھا اور وہ اڑتے ہوئے ہی اپنے پروں کو پھیلاتا ہے جس سے زہریلی سوئیوں جیسے کانٹے برستے ہیں۔ یہ ایک ایسا خطرہ تھا جس سے بچنا بہت ضروری تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس سے پہلے جتنی بار بھی میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔ پہلی بار اسے کھلے میں بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ گو کہ وہ اس طرح سکڑا سمٹا بیٹھا تھا جیسے خوفزدہ ہو۔ مگر یہ پرندہ خطرہ محسوس کر کے ہی تو پروں سے نکلنے والی سوئیوں کی بارش کرتا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ میں اسی پر غور کرنے لگا۔ ایمارک نے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔ اس پرندے کو دیکھتے ہی اس پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھ کر باقی لوگوں نے بھی اوپر کی طرف دیکھا۔ جس جس نے اوپر دیکھا تھا وہ سب اسی کیفیت میں آ گئے تھے۔ اس خوف کے عالم میں آگے بڑھنا خطرناک تھا اس لیے میں نے واپسی کا اشارہ دیا اور خود بھی مڑ گیا۔ میری تقلید میں سب مڑ گئے اور آہستہ روی سے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ ان سب کے قدم اتنے آہستہ اٹھ رہے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چل رہے ہیں۔ تقریباً سب کی نظریں اوپر کی طرف تھیں۔ ہر ایک کو یہی خطرہ تھا کہ وہ پرندہ اڑنا نہ شروع کر دے۔ مگر وہ اپنا سر پنجوں میں ڈالے بیٹھا رہا۔ کافی پیچھے ہٹنے کے بعد میرے ذہن میں ایک خیال نے جنم لیا اور میں رک گیا۔ مجھے رکتا دیکھ کر باقی سب بھی رک گئے۔

”مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس پرندے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ میں نے سب پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

”کیوں... ایسا کیوں لگ رہا ہے؟“ ردبیر پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”کچھ دیر قبل یہاں نقارہ بج رہا تھا۔ نقارے کی تیز آواز سے جنگل کا ہر چرند پرند خوفزدہ ہوا ہوگا۔ ہے نا؟“

”بالکل۔“

”اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ کہیں سے آ رہا ہوگا۔ اس نے نقارے کی گونجدار آواز سنی تو خوفزدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا ثبوت اس کے بیٹھنے کا انداز بھی ہے۔“

”بات تو سو فیصد صحیح ہے۔“ ردبیر چہکی۔ پرندے کو دیکھ کر اس پر بھی مردنی چھا گئی تھی مگر میرے ایک جملے نے اس میں زندگی کی رمق دوڑا دی تھی۔ وہ گویا پھر سے جی اٹھی تھی۔

”تو ساتھیو! آپ سب آرام سے بیٹھیں۔ اب کچھ ہی دیر میں یہ اپنے گھر کی جانب کوچ کر جائے گا۔ جس طرح ہم نقارے کی آواز نہ آنے پر محتاط ہو گئے تھے اسی طرح یہ بھی اب اڑنے کے لیے پر تول رہا ہوگا۔ بس کچھ دیر کی بات ہے۔“ ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس پرندے نے اڑان بھری اور نیچی پرواز کرتا ہوا مغربی سمت میں چلا گیا۔

”آپ کا ہر اندازہ صحیح نکلتا ہے؟“ ردبیر نے خوش ہوتے ہوئے کہا ”آپ جیسا بہادر، زیرک اور میٹھی باتیں کرنے والا شخص میں نے پہلے نہیں دیکھا۔“

ردبیر پر میری تعریف کرنے کا گویا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ میری جانب ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ کوئی اور ہوتا تو شہید ہو چکا ہوتا۔ مگر اس کی قاتل نگاہوں کا اثر مجھ پر ذرا بھی نہیں پڑا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا ”اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“

اس حکم پر ردبیر کا منہ بن گیا۔ یہ عورتیں بھی نا دنیا کے کسی خطے کی ہوں مزاجاً سب ایک ہوتی ہیں۔ اپنی تعریف کرانا خصوصی طور پر پسند ہوتا ہے اور جب ان کی کسی بات کو نظر انداز کر دو تو منہ بنا لینا بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ گو کہ کئی بار میں نے اسے سمجھایا بھی کہ وہ میری طرف توجہ نہ دے کر



ایرٹ پر توجہ دے کیونکہ ایرٹ اس کی چاہت میں پاگل ہے لیکن وہ تو گویا اس کے لیے پتھر کی بن جاتی تھی۔

میں کن انکھیوں سے اس کا ہی جائزہ لے رہا تھا کہ ایمارک بولا ”آپ نے کہا تھا کہ پیڑ پر چڑھ کر میں اس مقام کا جائزہ لوں جہاں نقارہ بج رہا ہے۔“

”ارے ہاں... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کسی اونچے پیڑ پر چڑھ کر ایک نظر دیکھ لو۔ وہاں اب کیا ہو رہا ہے اور کتنے لوگ ہیں۔“ یہ کام ضروری بھی تھا کیونکہ اس طرح ان سے نمٹنے کی پلاننگ عمدہ طریقہ سے کی جا سکتی تھی۔ اندھے کنواں میں تو چھلانگ لگانا نہیں تھا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا ایمارک کی دی گئی معلومات کی روشنی میں ہی کرنا تھا۔ میری نظریں ایمارک کے ساتھ ساتھ پیڑ کی بلندی کی طرف جا رہی تھیں۔ ایمارک نہایت پھرتی سے پیڑ کی بلندی کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کافی اوپر پہنچ گیا۔ اس کا رخ اسی طرف تھا جدھر سے نقارے کی گونج سنائی دی تھی۔ ابھی وہ ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور وہ پیڑ کی بلندی سے نیچے گرنے لگا۔ ہم سب گھبرا اٹھے۔ شاید اس کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا یا پھر پیڑ پر بیٹھے کسی موذی کیڑے نے اسے کاٹا تھا جس کی وجہ سے اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ اوپر سے نیچے گر پڑا۔

ہم سے صرف دس ہاتھ کی دوری پر وہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے گرد خون کا ایک تالاب سا بنتا جا رہا تھا۔ سب کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کی نظروں میں رحم اور خوف کا ملا جلا تاثر تھا مگر میری نظریں اس پر نہیں اس کے گلے میں اٹکے ہوئے تیر پر مرکوز تھیں۔ یقیناً اسے دور سے کسی تیر انداز نے دیکھ لیا تھا اور تیر چلا دیا تھا۔

اس حادثے پر میں بھی رنجیدہ تھا مگر یہ وقت غم منانے کا نہیں تھا۔ دشمن نے جب تیر چلایا تھا تو وہ اپنے شکار کو دیکھنے بھی آتا ہوگا۔ اس خیال کے تحت میں نے حکم دیا ”جلدی... جتنی جلدی ہو سکے سب اس راستے کو بھول کر جنگل میں داخل ہو جاؤ۔ اندر پہنچ کر باقی باتیں کر لینا۔“

”مگر ایمارک کی لاش؟“ ردبیر نے آبدیدہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ وقت لاش پر غور کرنے کا نہیں ہے۔ خود کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس نے ایک نیک مقصد کے تحت جان دی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنا اب ہماری ذمے داری ہے۔“ کہتے ہوئے میں جنگل میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ سب ہی آ گئے تھے۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس جگہ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ کافی اندر آنے کے بعد میں نے سب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ سب رنج و غم سے چور تھے۔ حکم ملتے ہی بیٹھ گئے۔ میں نے مڑ کر اس طرف دیکھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ اس طرف خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب تک لاش دیکھنے کے لیے کوئی آیا نہیں ہے۔ اگر آتا تو پیروں کی چاپ یا باتیں کرنے کی آواز ضرور سنائی دے جاتی مگر ادھر گہری خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جو اس جنگل کا خاصہ ہے۔

”اب ہمیں مزید ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ دشمن ہوشیار ہو چکا ہے۔ وہ ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا کیونکہ ہمارے قدموں کے نشان وہاں موجود ہوں گے۔ اسے دیکھ کر وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ایمارک اکیلا نہیں تھا۔ اس لیے اب وہ ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے تنبیہ کی۔ انہوں نے سر ہلا کر تائید کی۔

”مگر ہمیں رکنا نہیں ہے۔ ہم جس مقصد سے اس طرف آئے ہیں اسے پورا کرنا ہی ہوگا۔“ میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

”ہمیں آپ ہر معرکہ میں ساتھ پائیں گے۔“ ایک نوجوان نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا تو میرا حوصلہ سوا ہو گیا۔ مجھے ایسے ہی ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے ہر مقام پر ایسے ہی دوست ملتے ہیں۔

”آپ لوگ کچھ دیر آرام کر لیں پھر ہم دوبارہ اپنا سفر شروع کریں گے۔ اس بار ہم زیادہ لمبا چکر کاٹ کر ان کے عقب میں جائیں گے اور اپنے ساتھی کی موت کا بدلہ لیں گے۔ اس لیے کہ ہم اس بے قصور ایمارک کا خون کسی بھی طرح معاف نہیں کر سکتے۔ زندگی اور موت ساتھ چلتی ہے۔ ہر ایک کو مرنا ہے لیکن بے قصور کی موت کا بدلہ لینا بھی فرض ہے۔“ کہہ کر میں نے سب کے چہرے کا معائنہ کیا۔ آہستہ آہستہ سب کے چہروں پر اطمینان چھا رہا تھا۔ میرا وعدہ ان کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھی کو لوٹا تو نہیں سکتا مگر اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر ایک کو موت آنی ہے مگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو مرنے والے کا غم کم محسوس ہوتا ہے اور غصہ زیادہ اثر دکھاتا ہے۔ ان سب پر بھی غصے کا اثر تھا جو میرے وعدہ کی وجہ سے کم ہو گیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں

دشمنوں سے انتقام ضرور لوں گا۔اسی لیے وہ سب آرام سے بیٹھ گئے۔روبیر نے پیڑ سے ٹیک لگا لی تھی۔ایک تو جنگل کا گھنا پن اوپر سے شام اترنے لگی تھی۔اندھیرے کا گہرا پن پوری طرح سے سیاہ چادر پھیلا چکا تھا۔لیکن ہم مشعل بھی جلا نہیں سکتے تھے اس لیے کہ روشنی دشمنوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔میں نے ان لوگوں سے کہا''تم سب آرام کرو۔میں آس پاس کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

ان میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔خود روبیر بھی تھکن کی وجہ سے وہیں لیٹ گئی تھی۔میں نے اپنے قدم اس جانب بڑھا دیے جدھر سے ہم آئے تھے۔

اس وقت تو وہاں سے چلے آئے تھے مگر اب ضمیر چین لینے نہیں دے رہا تھا۔میں تو دشمن کی لاش کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا مگر حالات کی وجہ سے اپنے دوست کی لاش کو بے یار و مددگار چھوڑ آیا تھا اور اب یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی۔اسی لیے میں دبے پاؤں ادھر ہی بڑھنے لگا تھا۔یہ کوئی پگڈنڈی یا راستہ تو تھا نہیں۔گھنی جھاڑیوں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔جھاڑیوں میں کسی بھی قسم کا جانور دبکا ہو سکتا تھا جو خوفزدہ ہو کر حملہ کر سکتا تھا پھر بھی میں بلا خطر آگے بڑھتا رہا۔خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے جسم میں جلن محسوس ہونے لگی تھی پھر بھی میں رکا نہیں۔آہستہ آہستہ اس جگہ پہنچ ہی گیا جہاں ایمارک کی لاش پڑی تھی۔میں نے احتیاط کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی بھی نظر نہیں آیا۔لاش اسی طرح پیڑ کے نیچے پڑی تھی۔یہ حیرت کی بات تھی کہ نشانہ بنانے والا دیکھنے کیوں نہیں آیا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جس نے اسے نشانہ بنایا ہے وہ خود بھی سمجھ نہ پایا ہو کہ اس کا نشانہ کس پر تھا۔ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دور سے اسے صحیح نظر نہیں آیا کہ پیڑ پر کون ہے۔اس نے ایمارک کو خون آشام بندر نما مخلوق سمجھ کر نشانہ لگایا ہو؟ بات کچھ بھی ہو مجھے تو لاش چاہیے تھی۔میں آگے بڑھا مگر فوراً ہی رک گیا۔ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ دشمن چالاکی سے کام لے رہا ہو اور اس نے پیروں کے نشانوں سے اندازہ لگا لیا کہ پیڑ کے نیچے کئی آدمی تھے۔باقی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔دشمن انتظار میں ہو کہ جیسے ہی لاش کے پاس کوئی آئے اسے گرفتار کر لیا جائے۔اور وقت بھی کم تھا۔خطرہ بھی موجود تھا۔اس لیے میں نے خود کو زمین پر گرا لیا اور کرولنگ کرتے ہوئے ادھر بڑھنے لگا۔دھیرے دھیرے میں لاش کے قریب پہنچ گیا۔میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ذرا سی آہٹ پر میں مقابلے پر اتر آتا۔ابھی تک میں نے گن استعمال نہیں کی تھی۔صرف اس ڈر سے کہ دھماکے کی آواز دور تک سنائی دے گی اور ریناٹ کے سپاہی ہوشیار ہو جائیں گے۔گن کے ساتھ کرولنگ کرنا آسان نہیں پھر بھی میں کرولنگ کرتا رہا تھا۔اب میں نے رسک لینے کا سوچا اور گن کو جسے کندھے سے باندھ رکھا تھا اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔

اب تک میں لیٹا ہوا تھا۔میری نگاہیں چاروں جانب کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔مگر اب تک کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ہر طرف خاموشی تھی۔کچھ کچھ مطمئن ہونے لگا تھا۔اس لیے اٹھ کر بیٹھا پھر کھڑا ہو گیا۔پھر بھی کہیں سے کوئی کھٹکا کوئی چاپ سنائی نہ دی تو میں نے گن کو دوبارہ کندھے پر لٹکا لیا اور پھر جھک کر لاش کو اٹھا لیا۔

لاش کو کندھے پر لاد کر میں نے دوڑ لگا دی۔جھاڑیوں کو پھلانگتا۔روندتا ہوا میں اس جانب دوڑ رہا تھا جدھر باقی ساتھیوں کو چھوڑ آیا تھا۔کچھ آگے جانے کے بعد میں نے رفتار سست کر لی اس لیے کہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔جھاڑیوں کی ہلچل سے میرے ساتھی مجھے دشمن سمجھ کر تیر چلا سکتے تھے۔

کافی دور آنے کے بعد احساس ہوا کہ میں بھٹک گیا ہوں اس لیے کہ اتنی دیر میں مجھے ان لوگوں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔مگر اب تک وہ سب نظر نہیں آئے تھے۔میں رک گیا۔کھڑے ہو کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ان سب کو میں نے کہاں چھوڑا تھا۔اس اندھیرے میں پتا ہی نہیں لگ رہا تھا۔انہیں آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ایک عجیب سی لاچاری نے گھیر لیا تھا۔کندھے پر گن تھی اور دونوں ہاتھوں میں ایمارک کی لاش۔اب میں کدھر جاؤں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پتے کھڑکھڑائے اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔مجھے ایسا لگا جیسے دور کہیں کسی نے سیٹی بجائی ہو۔میں نے یہاں ابھی تک کسی کو منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔پہلی بار سن رہا تھا۔اس لیے چونکنا ضروری تھا۔ میں پوری طرح ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔تاکہ اگر پھر وہ آواز گونجے تو بہ آسانی سن سکوں۔ آواز دوبارہ سنائی دی۔مگر یہ آواز سیٹی کی نہیں تھی،کچھ مختلف تھی اور بہت ہلکی تھی پھر بھی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔پیروں کے نیچے آنے والے پتے ہلکی آواز میں احتجاج کر رہے تھے۔میں نے لاش کو زمین پر رکھ دیا اور گن کو کندھے سے اتار لیا۔میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ داہنی جانب کی جھاڑیاں



ہلیں اور کوئی بگولے کی طرح اندھیرے سے نکلا اور بھوت کی طرح لپٹ گیا۔اس کی جکڑ اتنی سخت تھی کہ میں ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔میری گن بھی گر گئی تھی۔میں اس کی جکڑ سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا اور وہ مجھے پچھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔دونوں طرف سے زور آزمائی ہو رہی تھی۔میں نے اب پاؤں کو استعمال کرنے کا سوچا اور اس کے پیروں میں اپنے پیر پھنسانا ہی چاہا تھا کہ اس نے منمناتے ہوئے سرگوشی کی''پتا نہیں یہ جنگلی کیا کھاتے ہیں۔''

اس آواز نے میرے اندر ایک نئی توانائی بھر دی اور میں نے شوخ لہجے میں کہا''وہی جو سادی کھلائے کھا لیتا ہوں۔''

میری آواز سنتے ہی وہ اور زور سے چمٹ گیا۔بلکہ مجھے چوم بھی لیا۔ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان بھی چل پڑی ''ظالم ایسی بھی کیا بے رخی۔میری آمد کا سن کر بھی ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔''

''پہلے مجھے چھوڑ تبھی تو جواب دوں گا۔''میں نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے جکڑ ڈھیلی کرتے ہوئے گلا کیا''تو نے بہت ستا رکھا ہے۔واپس جائے گا تو دیکھنا سادی کیسا ستاتی ہے؟''

''ابھی تمہاری سن رہا ہوں تب اس کی بھی سن لوں گا۔''میں نے خود کو آزاد کراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتائیں کہ ہم سے دوری کی وجہ کیا تھی۔سفیر سے آپ کی خیریت کی اطلاع ملتے ہی میں بے چین ہو اٹھا تھا۔''

''اگر میں تجھ سے ملنے چلا جاتا تو یہاں معاملہ مزید الجھ جاتا۔یہ سب باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔اس وقت تو اطلاعاً عرض ہے کہ یہاں ایک لاش بھی ہے جو میری مدد کرتے ہوئے مارا گیا۔''

''اوہ...کہاں ہے لاش۔''

''لاش حضور کے قدموں میں پڑی کہہ رہی ہے'چلنے والے ذرا دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔'' میں نے ماحول کو ہلکا رکھنے کی کوشش کی۔

''ابھی دیکھتا ہوں۔''کہہ کر اس نے جیب سے پینسل ٹارچ نکالی اور اس سے زمین کا جائزہ لینے کے لیے روشنی ڈالی۔سامنے ہی ایمارک کی لاش رکھی تھی،اسے دیکھ کر اس نے سوال کیا''لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ اس کا کریا کیا ہے؟''

''دنیا میں تین طریقے سے مردوں کے آخری رسومات ہوتے ہیں۔ہندو جلایا کرتے ہیں۔پارسی چیل کوؤں کو کھلا دیتے ہیں اور مسلمان و عیسائی اور یہودی دفناتے ہیں۔ان کے مذہب میں پتا نہیں کیا کرتے ہیں...لیکن اس وقت یہ میرے مددگار کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے میں تو اسے دفناؤں گا۔''

''تو پھر بسم اللہ۔''کہہ کر اس نے کمر سے ایک خنجر نکالا اور اسے لہرا کر کہا''اس کی مدد سے ابتدا کرتے ہیں۔''

''ارے ارے...کیا اسے پارچوں میں تبدیل کرو گے؟''میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہ میرا خنجر ہے....اس سے میں دنیا کا ہر کام کرتا ہوں.... یہ دیکھیں۔''کہہ کر اس نے زمین کھودنا شروع کر دی۔میں نے بھی ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔زمین نرم تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خاصہ بڑا گڈھا کھود لیا۔

جب گڈھا اتنا بڑا ہو گیا کہ اس میں ایمارک کی لاش کو لٹایا جا سکے تو ہم نے اسے لٹا کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔اس کام سے فرصت پا کر میں نے پوچھا''اب بتاؤ تم اکیلے کیا کر رہے ہو۔باقی سب کہاں ہیں؟''

''میں مقابل فوج کا جائزہ لینے نکلا تھا کہ نقارے کی آواز سنی۔حیرت ہوئی کہ نقارہ فوجی پڑاؤ سے دور بج رہا ہے۔یہ کون لوگ ہیں یہی دیکھنے چلا آیا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔''

''میرے ساتھ بھی کچھ لوگ ہیں۔میں ان کو ایک جگہ بٹھا آیا ہوں۔تم اپنے پڑاؤ کی جانب جاؤ اور میں ان کی طرف جا رہا ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔صحیح سے باتیں بھی نہیں کر سکا ہوں۔دل ابھی بھرا بھی نہیں ہے کہ آپ جانے کی ضد کرنے لگے۔''

''عقل جب بٹ رہی تھی تو تم کہاں تھے؟ ہم یہاں پکنک پر نہیں آئے ہیں۔جتنی جلد ممکن ہو گا ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔اور اپنی دنیا میں پہنچ کر جتنا مرضی باتیں کر لینا۔اب جاؤ اور باقی سب سے کہنا کہ وہ تیاری کر لیں۔آج ہی ان پر ہم بھرپور حملہ کریں گے۔''

''بڑی جلدی میں ہیں۔کیا کسی کی یاد ستانے لگی ہے۔''اس نے ہنس کر کہا۔

''تم تو ابھی آئے ہو۔میں کب سے اس وادی میں

پھنسا ہوا ہوں، مجھے کیا اپنوں کی یاد نہیں آئے گی؟ میرا بس چلے تو میں ابھی اور اسی وقت اس وادی سے نکل جاؤں لیکن یہاں سے نکلنے کا نہ تو راستہ معلوم ہے اور نہ کوئی طریقہ۔ یہ برف والا بھی نہ جانے کیا چیز ہے کہ دور بیٹھا ہوا بھی ہمیں پیغام دیتا رہتا ہے۔ ہم اسی کی مدد سے یہاں سے نکل سکتے ہیں اور وہی کوئی راستہ نکالے گا۔''

''برف والے کا کہا تو مجھے یاد آیا... راجا عمر دراز بھی کسی برف والے کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ بس نام ہی نام سنا ہے۔''

''وہ ایک ایسی پُراسرار ہستی ہے کہ میں اس پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی الجھتا جاتا ہوں۔ پتا نہیں کیا چیز ہے۔ خیر یہ بتاؤ تم لوگ آئے کیسے؟''

''مت پوچھیں۔ زندگی کا ہر لمحہ آخری لگ رہا تھا۔ صرف آپ کی محبت تھی کہ ہم برفزاروں میں چلتے رہے... جب چلے تھے تو ہمارے ساتھ بیس افراد تھے لیکن جب ایک غار میں پہنچے تو صرف وہی لوگ بچے جو اسلام آباد سے چلے تھے۔ باقی سب یعنی تمام پورٹرز برف میں دفن ہو گئے۔''

''اس سرد جہنم کو پار کرنا آسان نہیں ہے۔ میں خود بھی کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں۔''

''اور ایک راجا عمر دراز ہیں جو بیماری کی حالت میں بھی اس مشقت کو جھیلتے رہے۔''

''راجا صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''مت پوچھیں... وادی میں آنے کے ساتھ پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔ سامیرا نے پتا نہیں کون کون سی جڑی بوٹی استعمال کرائی ہے کہ ان کے چہرے پر چھائی مردنی اب نظر ہی نہیں آتی۔ اس لڑکی میں کمال کا طبیب چھپا ہے۔''

''ادے احمق... وہ لڑکی نہیں ہے۔ راجا عمر دراز سے بھی عمر میں بڑی ہوگی۔''

''لیکن وہ تو ایسے اٹھلاتی ہے جیسے الہڑ مٹھیار ہے۔''

''عشق نام ہے دماغی خلل کا۔ وہ محترمہ راجا صاحب کے عشق میں پور پور ڈوبی ہوئی ہیں۔ راجا صاحب بھی انہی کی محبت میں کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے ہیں۔''

''محبت ان کی، ہم لوگوں کے دماغ میں خلل کیوں پیدا کیا گیا۔'' اس نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔

''تمہارے دماغ کے خلل کا سبب میں ہوں۔ تم سب میری محبت میں چلے آئے۔ یہی تو ہوتا ہے۔ انسان کے دل میں محبت کے سوتے نہ پھوٹیں تو زندگی بے رنگ ہو جائے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے تمام دوست مخلص ہیں جبھی تو سب اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔''

''بس بس زیادہ مکھن پالش نہیں۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اب یہ بتا دیں کہ رابطے کا ذریعہ کیا ہوگا؟''

''میں نے ڈیوڈ شا کو دیکھا ہے کہ وہ تمام ضروری آلات لے کر آیا ہے۔ کیا تم لوگ بھی ایسا کچھ لے کر آئے ہو جس سے رابطہ کیا جا سکے؟''

''موبائل فون سب کے پاس ہے لیکن وہ یہاں آ کر بیکار ہو گیا ہے۔ موبائل کی وجہ سے کسی کو کوئی اور چیز ساتھ لینے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس کی وجہ سے اب ہم سب پریشان ہیں۔''

''سفیر بتا رہا تھا کہ راجا صاحب کے پاس سیٹ لائٹ فون ہے جس کا بوسٹر وہ اوپر لگا آئے ہیں۔''

''ہاں ایسا ایک فون ہے تو لیکن وہ بھی بیمار چل رہا ہے۔ کبھی کام کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ شاید بوسٹر میں کوئی خرابی آ گئی ہے۔''

''پھر رابطے کا ذریعہ کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا خیال ہے صدیوں پہلے کے انسان جو طریقہ استعمال کرتے تھے وہی بہتر رہے گا۔ یعنی ایسا کچھ جس سے پیغام رسانی ہو سکے... ہم ایک دوسرے کے ساتھ اشاروں کے ذریعہ رابطہ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اب جاؤ... مگر یہ بات یاد رکھنا۔ میں اسی جنگل میں ہوں۔''

''یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آپ اسی جنگل میں تشریف رکھتے ہیں۔''

''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اندھا دھند حملہ نہ کرنا ہمارے ساتھی بھی تمہارے مقابلے پر آ سکتے ہیں۔''

''جی، میں سب کو ہوشیار کر دوں گا۔''

''تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ حملے کا طریقہ کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہمارے پاس آتشی اسلحہ ہے۔ ہم ایک ہی بار میں پوری فوج کو پیچھے دھکیل دیں گے۔''

''یہ مت بھولو کہ ان کے ساتھ ڈیوڈ شا ہے اور اس کے پاس انتہائی جدید اسلحہ ہے۔''

''میرا نام وسیم ہے... یہ مت بھولیں میں نے اسلحے کی اسمگلنگ بھی کی ہے۔ دیکھتے رہیں۔ ڈیوڈ شا کے اسلحے میں استعمال کر رہا ہوں گا ہاہاہا۔''



''اچھا اچھا تمہیں مار خان، اب جاؤ مجھے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر اس نقارہ والے دستے کو منتشر کرنا ہے۔'' کہہ کر میں مڑ گیا۔ وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے مڑ کر ادھر دیکھا جہاں ایمارک کو دفن کیا تھا۔ موت بھی کتنی ظالم ہے کہ ایک پل میں جدائی ڈال دیتی ہے۔ زمین انسان کو نگل جاتی ہے مگر خود قائم رہتی ہے۔ کوئی امیر یا غریب، نیک و بد، حاکم ہو یا محکوم پادری، پنڈت، مولوی، زانی، شرابی، چور، ڈاکو۔ ایک حادثہ سب پر گزرتا ہے۔ موت کا حادثہ، اور یہ حادثہ ایسا ہے جو محبت اور عداوت کے رشتے کاٹ دیتا ہے۔ جب تک آدمی جیتا ہے دھرتی کا پھل اور اناج کھاتا ہے اور جب مرتا ہے، دھرتی اسے کھا جاتی ہے۔ جس طرح زمین اور موسم اپنی طے شدہ منزلوں سے گزرتے ہیں اسی طرح زندگی اور موت کے واقعات بھی ایک ہی مقررہ دائرے میں رونما ہوتے ہیں۔ ایمارک کچھ دیر پہلے تک ہمارے درمیان قہقہے بکھیر رہا تھا مگر اب موت کی گود میں سو گیا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد احساس ہوا کہ میں واقعی راستہ بھٹک گیا ہوں۔ اس اندھیرے جنگل میں میں ان لوگوں کو کیسے تلاش کروں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر زور سے پکارتا ہوں تو دشمن ہوشیار ہو جائیں گے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ وسیم کو زبردستی کیوں واپس بھیج دیا۔ اسے خدا نے میری مدد کے لیے بھیجا ہوگا اور میں نے اپنی نادانی میں سنہری موقع گنوا دیا۔ وہ رہتا تو تلاش میں مدد ہی کرتا اب کیا کروں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ جس جگہ سے میں جنگل میں داخل ہوا تھا وہاں سرخ پھولوں سے لدے پیڑوں کی بہتات تھی۔ میں نے اندھیرے میں آس پاس کے درختوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر تمام پیڑ ہیولوں جیسے لگے۔ جب جنگل میں داخل ہو رہا تھا تب کچھ روشنی تھی اسی لیے پھول نظر آ گئے تھے مگر اب کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن معاوف ہو گیا تھا۔ میں نے اندازے سے اس رخ پر چلنا شروع کیا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ یہ کوشش بارآور ہوئی اور کچھ ہی دیر میں میں جنگل سے باہر نکل آیا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ ہم جس جگہ سے جنگل میں داخل ہوئے تھے وہ جگہ دور نہیں تھی۔ اس کی پہچان یہ تھی کہ وہاں خون جمع ہوا تھا۔ جنگل سے باہر بھی اندھیرا تھا لیکن اتنا گہرا نہیں اس لیے خون کا بڑا سا سیاہ دھبا نظر آ گیا تھا۔ میں اسی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنا رخ ادھر موڑا جدھر سے جنگل میں داخل ہوا تھا پھر میں اندر بڑھتا چلا گیا۔ میں بالکل سیدھ میں چل رہا تھا اس لیے کہ ہم سب سیدھ میں ہی دوڑے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے دبی دبی آواز میں پکارا۔ ''روبیر... روبیر۔'' لیکن کوئی جواب نہیں آیا تب میں مزید آگے بڑھا اور پھر آواز لگائی۔ اس بار میری آواز خالی نہیں گئی۔ روبیر نے جواب دیا تھا۔ وہ جواب میں مجھے پکاری تھی۔ میں اس آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ اب مجھے وہ بڑی بڑی جھاڑیاں نظر آ گئی تھیں جنہیں پھلانگ کر ہم اس کھلے قطعہ پر پہنچے تھا جہاں وہ سب آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ میں اس جھاڑی کو ہٹا کر دوسری طرف پہنچا ہی تھا کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شاید گوپھن سے وار کیا گیا تھا۔ کسی رسی میں بندھا دھات سے بنا گولا پوری شدت سے میرے کندھے پر لگا تھا۔ مارنے والے نے سر کا نشانہ لیا ہوگا مگر وار اچٹ گیا تھا اور گولا میرے کندھے سے ٹکرایا تھا۔ یہ ایسی چوٹ تھی کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ضرب کھاتے ہی زمین پر گرتا اور بے ہوش ہو جاتا۔ میں گرا ضرور تھا لیکن بے ہوش نہیں ہوا تھا اور گرتے ہی قلابازی کھا کر دور چلا گیا تھا۔ حملہ کرنے والے نے دوبارہ حملہ کیا مگر اس بار میں ہوشیار تھا، اس کا وار بچ گیا۔ اندھیرا پوری طرح پھیلا ہوا تھا۔ حملہ کرنے والا مجھے سایہ جیسا دکھ رہا تھا۔ اتنی دیر میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں ایک دو نہیں آٹھ دس مسلح افراد کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے تمام ساتھیوں کو قیدی بنا رکھا ہے۔

''کون ہو تم لوگ۔'' میں نے پوچھا پھر احساس ہوا کہ وہ میری بات کب سمجھ پایا ہوگا اس لیے میں نے جلدی سے روبیر سے کہا کہ وہ ترجمہ کر دے۔ اس نے ترجمہ کر دیا۔

ان سپاہیوں میں سے ایک نے کہا ''ہم شاہ معظم کے جانثار سپاہی ہیں۔ صرف خاص موقع کے لیے ہم باہر آتے ہیں۔''

''تو سن لو سامیرا آندھی طوفان کی طرح بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ دھماکا کرنے والے ہتھیار بھی ہیں اور برف والا بھی۔ ابھی بھی وقت ہے۔ ریناٹ کا ساتھ چھوڑ کر سامیرا کے ساتھ ہو جاؤ ورنہ برف والا نابود کر دے گا اور تمہاری آنے والی نسلیں بھی سزا پاتی رہیں گی۔'' میں نے کڑے لہجے میں کہا۔

روبیر نے ترجمہ کیا تھا کہ وہ غرا کر بولا۔ ''ہم شاہ معظم کے وفادار ہیں۔ ان کا ساتھ دینے کی قسم کھائی ہے۔''

میں سمجھ چکا تھا کہ یہ لوگ برطانوی ناٹوں یا لکھنو کے بانکوں جیسی قسم کے لوگ ہیں جو صرف مرنا اور مارنا جانتے ہیں۔شاید ان کو اس لیے رکھا گیا ہے کہ جنگ کے وقت جدھر کا دستہ کمزور پڑ رہا ہو یہ لوگ اس طرف پہنچ کر انہیں کور دیں۔ان کی طرف سے لڑیں، اس وقت تک لڑیں جب تک ان کے جسم میں جان ہے۔ یہ بالکل سوکھی لکڑی جیسے ہیں۔جو ٹرخ تو سکتی ہے لیکن لچک نہیں دکھائے گی۔اس کا بس ایک ہی علاج تھا کہ اسے سزا دی جائے۔میں نے لیٹے لیٹے اپنے کندھے سے لٹکی گن کو ٹٹولا۔گن موجود تھی۔ایک ہاتھ لمبی یہ آٹومیٹک گن ہلکی بھی تھی اور پیٹے کی وجہ سے اب تک پیرہن کی طرح سے ساتھ نبھا رہی تھی۔میں نے لیٹے لیٹے غیر محسوس طریقہ سے اسے آگے کیا اور پھر سیفٹی کیچ ہٹایا۔کٹ کی آواز ہوئی لیکن اس کے لیے یہ غیر مانوس آواز تھی اس لیے وہ سمجھ نہ پایا اور میں نے ٹریگر دبا دیا۔اگر چاہتا تو اس کے سر کی طرف نال کا رخ کر سکتا تھا لیکن میں نے ہوا میں فائر کیا تھا۔فائر کا دھماکا اسے گھبرا دینے کے لیے کافی تھا۔وہ اچھل پڑا تھا وہ کھڑے کھڑے گرا تھا۔میرے لیے اتنا موقع کافی تھا۔میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف گن تان کر بولا۔''تمام لوگ ہتھیار پھینک کر کھڑے ہو جائیں ورنہ یہ دھماکا کرنے والا ہتھیار اس پر آگ والے تیر پھینکے گا۔''

وہ شخص جو اتنی دیر سے بڑی بڑی ہانک رہا تھا ایک فائر ہوتے ہی ایسے چپ ہو گیا جیسے اس کی نانی مر گئی ہو۔زمین پر پڑا اپٹر پٹر دیکھے جا رہا تھا۔اس کی بولتی بند ہو گئی تھی۔میں نے اس کے چہرے پر چھائے خوف کے لرزتے سائے کو دیکھ کر لطف لیتے ہوئے ڈانٹ کر کہا''چلو سب ہتھیار پھینک کر کھڑے ہو جاؤ۔''

روبیر نے میرے الفاظ کا ترجمہ کیا۔اپنے افسر کی حالت دیکھ کر باقی ساتھی بھی ڈر گئے تھے۔اور وہ سب ہتھیار پھینک کر کھڑے ہو گئے۔اتنا بڑا مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہو گیا تھا۔اگر یہی واقعہ ہماری دنیا کا ہوتا تو شاید اتنی جلدی لوگ ہتھیار نہ ڈالتے لیکن یہ لوگ کہنے کو سپاہ گری بھی کرتے ہیں لیکن جنگ و جدل سے کوسوں دور ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امن پسندی ان کی سرشت میں داخل ہے۔ایک دھمکی میں پسپا ہو جاتے ہیں۔ان کی فطرت ہمارے حق میں تھی اس لیے میں نے ان کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دیا اور سب کے ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر ایک بندے کی نگرانی میں انہیں وہیں بھیج دیا جہاں اور بھی قیدی رکھے ہوئے تھے۔

ان سب کے جانے کے بعد میں نے بقیہ لوگوں سے کہا''وقت بہت برباد ہو گیا۔سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی جنگ شروع ہو جائے گی اس لیے ہمیں رات میں ہی اس دستے کو منتشر کر دینا ہے۔''

''ہم تیار ہیں۔ہم تیار ہیں۔''سب نے ایک ساتھ آواز لگائی۔

''او میرے بھائی اتنی زور سے چیخو گے تو وہ لوگ خود وہاں سے دوڑ کر آ جائیں گے۔''میں نے کہا تو سب کے سر جھک گئے۔

''سنو اب تمہیں کرنا کیا ہے۔''میں نے کہہ کر روبیر کی طرف دیکھا۔وہ میرے قریب کھسک آئی۔میں نے اس سے کہا کہ وہ سب کو لے کر دائرے میں آگے بڑھے۔میں پہلے جاتا ہوں۔

روبیر نے بولنے کی بجائے سر ہلا دیا پھر وہ ساتھیوں سے گفتگو کرنے لگی۔اس کی آواز نیچی تھی۔میں نے گن کو ہاتھوں میں تھاما اور آگے بڑھنے لگا۔میں اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔میرا خیال تھا کہ جلد سے جلد حملہ کرنے سے ہمیں کامیابی ملے گی۔اسی خیال کے تحت میں آگے بڑھ رہا تھا۔پیچھے آنے والے احتیاط سے کام نہیں لے رہے تھے۔وہ جھاڑیوں کو روندتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔جھاڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز رات کی خاموشی میں دور تک سنائی دے رہی تھی۔اس آواز سے دشمن متوجہ ہو سکتے تھے اس لیے میں نے روبیر سے کہا کہ وہ انہیں سمجھائے کہ احتیاط سے آگے بڑھیں۔پیروں کے نیچے آ کر چرمرانے والے سوکھے پتوں کی بھی آواز سنائی نہ دے۔

وہ سب میرے حکم پر آمنا صدقنا سر جھکا دیتے تھے۔

اب وہ ایک ایک قدم نہایت احتیاط سے اٹھا رہے تھے۔وہ میدان جس میں شاہی فوج کے اس دستے نے پڑاؤ لگا رکھا تھا وہ سامنے ہی لگ رہا مگر اب احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کافی دور ہے۔اس لیے کہ اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی وہ اتنی ہی دور نظر آ رہا تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگل گھنا تھا اور ہمیں ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا تھا۔پھر جگہ جگہ کھائی بھی آ جاتی تھی جو شاید بارش کے پانی کی وجہ سے بن گئی تھی لیکن یہ یہاں کے لیے موسم گرما تھا اس لیے پانی سوکھ چکا تھا اور وہ بڑے بڑے کنواں جیسی کھائی ہماری رفتار کو سست کر رہی تھی۔ہمارا حوصلہ ہمارے ساتھ تھا



اس لیے ہم بڑھتے چلے جا رہے تھے۔اب رات بھی آخری سرحد پر تھی۔ختم ہونے کے لیے تیزی سے صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بالآخر ہم نے جنگلی علاقے کو پار کر لیا۔اب ہم میدانی علاقے میں آ گئے تھے اور وہاں سے پڑاؤ بہت نزدیک نظر آنے لگا تھا۔اس منظر نے ہمارے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ بھر دیا۔ہم نے رفتار مزید تیز کر دی اور آہستہ آہستہ ہم پڑاؤ سے قریب ہوتے چلے گئے۔

وہ ایک بڑا سا میدان تھا،اس میدان میں دور دور تک بہت سارے خیمے لگے ہوئے تھے۔پڑاؤ کے درمیان ایک بڑا سا الاؤ روشن تھا۔وہ الاؤ یہاں سے صاف دکھائی دے رہا تھا جس کے نزدیک کئی ایک بندے بیٹھے تھے۔الاؤ سے لپلپاتی ہوئی آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔جس کی کانپتی ہوئی روشنی میں منظر کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔اس زرد روشنی میں خیموں کی پہرے داری کے لیے ٹہلتے ہوئے سپاہی خاصے خوفناک لگ رہے تھے۔اس لیے کہ ان کے ہاتھوں میں ان کے قد سے زیادہ لمبے نیزے تھے۔الاؤ کی کانپتی ہوئی روشنی میں ان کے سائے دور تک پھیل رہے تھے۔چار سے پانچ سپاہیوں کا ایک جتھا ٹہلتا ہوا میدان کے آخری حد تک جاتا پھر لوٹ کر الاؤ کے پاس رک جاتا۔الاؤ کے گرد بیٹھے سپاہی ان کو اپنی جگہ دے دیتے اور ان کے نیزے لے کر ٹہلنے لگتے۔میں نے غور کیا'سپاہی ایک بار میں تین چکر لگاتے پھر بیٹھ جاتے اور ان کی جگہ نئے سپاہی لے لیتے خیموں میں کون لوگ ہیں اس کا اندازہ لگ نہیں پایا تھا کیونکہ ابھی تک کسی بھی خیمے کا پردہ اٹھا نہیں تھا۔جو بھی تھے سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔میں نے گنا کل سترہ خیمے تھے۔یقیناً ایک خیمے میں چار سے چھ سپاہی یا افسران ہوں گے ،اس طرح ان میں ساٹھ سپاہیوں کی موجودگی یقینی تھی۔اتنے سپاہیوں کو تو میں اکیلے سنبھال سکتا تھا۔پھر بھی میں نے روبیر سے کہا''سب مستعد رہیں اور پھیل جائیں۔جیسے ہی میں آواز دوں ہر جانب سے تیر برسنا چاہیے تاکہ وہ سب گھبرا اٹھیں۔''

روبیر نے انہیں سمجھایا تو وہ سب تیر کو کمان پر چڑھا کر مستعد ہو گئے۔میں نے ان پر نظر ڈالی اور پڑاؤ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ابھی کچھ ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ میرا پیر ایک گڑھے میں جا پڑا۔اس گڑھے میں سوکھے پتے بھرے ہوئے تھے جو میرے وزن سے چرمرا اٹھے۔آواز خاصی بلند تھی،شاید یہ خاموش فضا کی کارستانی تھی کہ ہلکی سی آواز شور جیسی بلند ہوئی تھی۔یہ آواز پہرے داروں کی سماعت سے ٹکرائی تو کسی ایک نے للکارا''کون ہے؟''

الاؤ کی زرد روشنی دور تک پھیل رہی تھی اس لیے میرا چھپے رہنا ناممکن سی بات تھی۔پھر بھی میں نے خود کو زمین پر گرا لیا تاکہ دور سے دیکھنے والا صحیح اندازہ نہ لگا پائے کہ یہ کوئی انسان ہے یا جانور۔آواز دینے والا پہرے دار بھی مغالطے میں آ گیا اور وہ حقیقت جاننے کے لیے قریب آنے لگا۔میں نے وہاں رکنا بے وقوفی سمجھی اور سینے کے بل پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔وہ جتنا آگے بڑھ رہا تھا میں اتنا ہی پیچھے ہٹ رہا تھا۔ہمارے درمیان فاصلے کم نہیں ہو پائے تھے کیونکہ وہ بھی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔اس نے نیزے کو بلند کر رکھا تھا جیسے وہ وار کرنا چاہتا ہے۔میں بھی کمال ہوشیاری سے رینگتے ہوئے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔وہ ایک ایک قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔مجھے حیرت تھی کہ وہ اتنا آگے بڑھ آیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے نوٹس تک نہیں لیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔انہوں نے اس سپاہی کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔شاید انہوں نے یہی سمجھا ہو کہ ادھر کوئی جانور ہے جسے بھگانے کے لیے ان کا سپاہی آگے بڑھ رہا ہے۔سامیرا کے فوجی یہاں تک آ جائیں گے اس بارے میں تو انہوں نے سوچا بھی نہ ہو گا۔ان کے وہم و گمان سے پرے کی بات ہے۔اگر یہی سپاہی ہماری دنیا کے ہوتے تو باقی کے سپاہی بھی آگے آ چکے ہوتے۔مجھے گھیر چکے ہوتے مگر وہ سب اپنی جگہ کھڑے رہے اور میں پیچھے ہٹتا رہا۔

اب میں اتنی دور آ چکا تھا کہ اسے قابو کرنے کی سعی کر سکتا تھا۔جیسے ہی اس نے درمیان کی جھاڑی پھلانگی میں جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔وہ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔اس نے نیزہ اونچا کر کے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔اس کے وہم و گمان بھی نہ ہو گا کہ میں اس پر اڑتا ہوا جا پڑوں گا۔وہ چاروں شانے چت گرا تھا کہ میں نے اس کے سینہ پر سواری گانٹھ لی اور گلا دبانے لگا۔ہلکا سا ہی دباؤ ڈالا تھا کہ سنگی خنجر تانے روبیر آڑ سے نکل آئی۔اس نے وار کرنا ہی چاہا تھا کہ میں نے منع کیا''نہیں اسے مارنا نہیں ہے۔اس سے پوچھو کہ وہاں کتنے آدمی ہیں۔''

روبیر نے سوال کیا تو میں نے گلے پر دباؤ کم کر

دیا۔ مگر وہ بولا نہیں۔ تب روبیر نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔ دوسری بار پوچھنے پر اس نے خود سوال کر دیا ”تم لوگ کون ہو؟ یہ آدمی تو باہر سے آیا لگتا ہے۔ لعنت ہے ان لوگوں پر جو باہر سے آدمی بلا رہے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میں نے سمجھ لیا کہ وہ شاہی دستے کا سپاہی ضرور ہے لیکن وطن پرست ہے اس لیے میں نے کہا ”دوست تم نے صحیح کہا۔ ایراٹ نے باہر سے گندے لوگوں کو بلا کر بہت بڑا جرم کیا ہے اسی لیے برف والے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو باہر سے بلا لیا تاکہ میں ان برے لوگوں پر قابو حاصل کر کے اپنی دنیا میں واپس لے جاؤں۔“

”کیا تم واقعی برف والے کے بلاوے پر آئے ہو؟“

”ہاں میں برف والے کے بلانے پر آیا ہوں اور مجھے خون خرابہ پسند نہیں اس لیے تمہیں آزاد کر رہا ہوں لیکن تم شور نہیں مچاؤ گے اور نہ بھاگنے کی کوشش کرو گے ورنہ یہ لڑکی تمہیں ہلاک کر دے گی۔“

روبیر کی زبانی میرا پیغام سنتے ہی اس نے کہا ”نہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ تو میں بھاگوں گا اور نہ ہی شور کروں گا۔ تم نے برف والے کا نام لیا ہے تو ثبوت پیش کرو کہ تم اس کے مہمان ہو۔“

میں نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ کھڑا ہو کر اپنے گلے کو سہلا رہا تھا کہ میں نے اس کے نیزہ کو اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا ”یہ لو تمہارا ہتھیار، اس لیے کہ میرے لیے یہ ایک معمولی کھلونا ہے۔ کیونکہ میرے ساتھ یہ ہے۔“ کہہ کر میں نے گن کو اپنے جسم سے بندھے پٹے سے نکال کر اسے دکھایا۔ ”یہ دھما کا بھی کرتا ہے اور آگ والے تیر بھی برساتا ہے۔“

گن دیکھ کر اس پر رعشہ سا چھا گیا۔ اس نے التجایہ انداز میں کہا کہ اسے سامنے سے ہٹا لیں۔ مجھے اس ہتھیار سے خوف آتا ہے۔ اس جیسے ہتھیار نے مجھ سے میرے چار بھائیوں کو چھینا ہے۔

مجھے یہ آدمی بہت کام کا لگنے لگا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا انہیں ان لوگوں نے قتل کیا جو ریناٹ کے ساتھ ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس نے روبیر کی زبان سے میرے الفاظ سنتے ہی کہا ”جی ہاں، میرے بھائیوں کا بس اتنا قصور تھا کہ وہ باہر سے آنے والوں کا حکم نہیں مان رہے تھے۔“

”وہ سب برے لوگ ہیں اور انہیں ریناٹ نے بلایا ہے۔ ایک ایسا شخص جو وطن دشمن ہو اپنے ہی عوام پر ظلم ڈھا رہا ہو تم ایسے شخص کے لیے لڑنے آئے ہو؟“ میں نے اس کی غیرت کو للکارا۔

”میں پہلے دل سے شہنشاہ معظم کے ساتھ تھا لیکن جب اس نے باہر والوں کو بلا لیا تو میرا دل اس کی طرف سے میلا ہو گیا۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ سامیرا کی فوج میں چلے جاؤ۔ وہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔“

”میں خود بھی یہی کرنے والا ہوں۔ جیسے ہی جنگ شروع ہو گی میں بھاگ کر ان کے ساتھ مل جاؤں گا۔“

”تو پھر دیر کیسی تم ابھی ان کے پاس چلے جاؤ۔ میں اپنا ایک آدمی ساتھ کر دوں گا جو تمہیں سامیرا سے ملاقات کرا دے گا۔“

”میں تیار ہوں اس لیے کہ میں نے آتے وقت اپنے گھر والوں کو آرگون کے ایک دور دراز علاقے میں چلے جانے کو کہہ دیا تھا۔ میرے گھر والے اپنے آبائی علاقے میں رہیں گے تو ریناٹ ان سے بدلا نہیں لے سکے گا۔“

”تو پھر ہاتھ ملاؤ۔ تم ابھی سے سامیرا کی فوج کے سپاہی ہو۔ اب ہم تمہارے پڑاؤ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ تم ساتھ دینے پر تیار ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔“

”بالکل تیار ہوں۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

اتفاقات ہی عروج ہیں ..... یہ بھی اتفاق تھا کہ دشمن کی صف کا ایک سپاہی ہمیں مل گیا۔ اب ہمیں اس پڑاؤ میں موجود افسران کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہو گی کیونکہ فتح تو ہمیں ملنے ہی والی ہے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ روبیر بولی ”کیا میں ساتھیوں کو بلا لوں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ اب ہم پوری طاقت سے اس دستے پر حملہ کریں گے اور کسی کو فرار بھی نہیں ہونے دیں گے۔ حملے کا طریقہ کار وہی ہو گا جو میں نے پہلے بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔

روبیر نے آواز دی تو ادھر ادھر دبکے ہوئے تمام ساتھی باہر آ گئے۔ ان سب نے رونکا نامی اس شخص کو گلے سے لگایا پھر ہم سب اسی طرح نصف دائرہ کی صورت میں آگے بڑھنے لگے۔ اب ہم پھر سے اسی مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے میں نے پسپائی اختیار کی تھی۔ میں نے پڑاؤ پر نظر ڈالی۔ ان کا ایک سپاہی گم ہو گیا تھا۔ وہاں موجود پہرے داروں نے اسے جنگل میں داخل ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا پھر بھی وہاں کوئی ہلچل یا پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تمام پہرے دار اسی طرح اپنی اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے، میں نے مڑ کر روبیر سے کہا کہ ”وہ سب کو ہوشیار کر دے جیسے ہی میں کہوں گا وہ سب تیر چلانا شروع کر دیں گے۔“

”جی بہتر ہے۔“ کہہ کر اس نے ساتھیوں تک میرا حکم پہنچایا اور سب آہستہ آہستہ پڑاؤ سے قریب ہونے لگے۔ ہم اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ نیزہ پھینکتے تو کوئی نہ کوئی سپاہی زد میں ضرور آ جاتا۔ میں نے اپنے قریب کھڑے رونکا سے پوچھا۔ ”اس دستے میں کوئی اور بھی ایسا ہے جس کے خیالات تمہارے جیسے ہیں۔“

”ایک دو ہیں لیکن ان کو ابھی میں بلا نہیں سکتا کیوں کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کی ڈیوٹی صبح کی ہے۔“

”اگر چاہو تو پڑاؤ میں جا کر انہیں بیدار کر کے اپنے ساتھ باہر لے آؤ اس لیے کہ جب ہم حملہ کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ ان سے بات کرنے کا موقع نہ ملے۔“

”نہیں اب میرا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں کافی دیر سے باہر رہا ہوں۔ افسران تک یہ بات پہنچا دی گئی ہو گی۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا اور کچھ مزید آگے بڑھا تبھی ایک پہرے دار نے للکارا ”کون ہے؟ کیا رونکا ہو گیا؟“

میں جواب میں کیا کہتا اس لیے خاموش رہ گیا۔ مجھے دیکھ لیا گیا ہے، اس کا مجھے احساس ہو چکا تھا۔ اسی وقت مجھے للکارنے والے نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا اور پھر ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ ایسا لگ رہا تھا کئی افراد مل کر سب کو ہوشیار کر رہے ہوں۔ کچھ ہی دیر میں پورے پڑاؤ میں ہلچل سی مچ گئی۔ سپاہی ادھر سے ادھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ پھر ادھر سے کسی نے تیر چلایا تھا جو بالکل میرے قریب سے گزر گیا۔ میں نے چیخ کر کہا ”تیر چلاؤ۔“

حکم سنتے ہی ہمارے ساتھ آئے لڑاکا دستے نے تیر کی بارش کر دی۔ ادھر سے بھی تیر چلنے لگے۔ یہ ایک ایسی جنگ شروع ہو گئی تھی جس کا اختتام سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ادھر زیادہ لوگ تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ ان پر یکایک حملہ کروں گا تو وہ سب افراتفری کا شکار ہو جائیں گے مگر ہوا الٹا تھا۔ وہ گویا تیار تھے یا پھر انہیں شبہ تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ تمام کے تمام سپاہی ڈٹ گئے تھے۔ میں جلد سے جلد اس بے معنی جنگ کا خاتمہ چاہتا تھا۔ اس لیے دوبارہ تیر کی بارش کا حکم دیا۔ ایک ساتھ تمام تیر اندازوں نے تیر چلائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ادھر کے سپاہیوں نے تیروں سے بچنے کے لیے بڑے بڑے ڈھال آگے کر لیے ہیں۔ اس طرح مقابلہ کرتے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی مگر میری حیرت تب بڑھ گئی جب ادھر سے تیروں پر کپڑے یا اس قبیل کی کوئی چیز لپیٹ کر اس پر روغن لگا کر آگ والے تیر چلائے جانے لگے۔ یہ طریقہ میں نے سامیرا کی فوج کو سکھایا تھا۔ گویا سامیرا کی فوج میں ان کے جاسوسوں نے وہ طریقہ دیکھا اور اب یہ لوگ اسی طریقہ کو آزما رہے تھے۔ گویا میری بلی ہمیں سے میاؤں کر رہی تھی۔ میں بھی اگر آگ بھڑکانے والے روغن لے کر آتا تو اسی طرح جلتے ہوئے تیر ان پر پھینک سکتا تھا۔ میں نے ایک اور نئی بات دیکھی۔ اس سے پہلے شاہی فوج جو بڑے بڑے ڈھال استعمال کرتی تھی وہ عام سی لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے تھے مگر اب میں نے مشعلوں کی روشنی میں دیکھا کہ ان کے ڈھالوں پر کسی جانور کی موٹی کھال منڈھ دی گئی تھی۔ شاید یہ طریقہ انہوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ اگر جلتے ہوئے تیر ڈھال سے ٹکرائیں تو ڈھال فوراً آگ نہ پکڑ لے۔ گزشتہ بار جب شاہی فوج سے ٹکراؤ ہوا تھا تو جلتے ہوئے تیروں نے لکڑی کے ڈھالوں کو جلا دیا تھا۔

ابھی تک دونوں طرف سے صرف تیر چل رہے تھے۔ دوبدو جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایسی حالت میں اگر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یلغار کرتا تو ہمارا ہی نقصان ہوتا کیونکہ وہ سب مورچہ بند ہو گئے تھے۔ میں نے گن کو کندھے سے لٹکے پٹے سے نکالا اور ہاتھ میں لے کر نشانہ سادھنے کی کوشش کی۔ یہ میرا آخری حربہ تھا لیکن میں مخمصے میں تھا کہ گن استعمال کروں یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے پاس صرف ایک میگزین تھی۔ اب یہ نہیں پتا کہ اس میگزین میں کتنی گولیاں باقی رہ گئی ہیں۔

میں گن استعمال کرنے پر غور ہی کر رہا تھا کہ عقب سے چیخ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے رونکا اور اس کے پیچھے ایک منحنی سا آدمی تھا جو گوپھن میں پتھر رکھ کر پھینکنے کا ماہر تھا۔ بہت بہادر نہایت جی دار۔ کئی موقعوں پر اس نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ معبد میں بھی

اور محل میں بھی۔ ابھی بھی اس کے پھینکے ہوئے پتھر شاہی دستے پر قیامت ڈھا رہے تھے۔ وہ ایسے تاک تاک کر پتھر مار رہا تھا کہ اس کا نشانہ خالی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے کئی دشمنوں کا سر پھاڑ کر اپنی بہادری کی دھاک بٹھا دی تھی لیکن اب وہ خود زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ دشمنوں کی تیروں کا وہ شکار ہوا ہے۔ اسے سنبھالنے کے لیے دو شخص لپکے۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں بھی اس کی جانب متوجہ ہو جاتا۔ میری ساری توجہ دشمنوں کی طرف تھی۔ ان کے پھینکے ہوئے آگ والے تیر جنگل میں آگ بھڑکانے کا سبب بن رہے تھے۔ میرے ساتھ کل گیارہ لوگ تھے جن میں سے دو پہلے ہی تیر کا شکار ہو چکے تھے اور اب یہ تیسرا بھی کم ہو گیا۔ اتنے کم لوگوں سے میں کیسے فتح پاؤں میں اسی سوچ میں تھا اور ان کے تیر کو آگ بھڑکانے سے پہلے ہی ان کی طرف کمان کے ذریعہ پھینک رہا تھا۔ اس وقت میں خود بھی زمانہ قدیم کا جنگجو بن چکا تھا۔ روغن سے میرے ہاتھ سنے ہوئے تھے۔ شاہی فوج آگ بھڑکانے کے لیے جو تیروں پر روغن لگا کر ہماری طرف پھینک رہی تھی اسے واپس کرتے وقت میں ہاتھ سے ہی اٹھاتا تھا اسی روغن کی وجہ سے میرا ہاتھ چپچپا ہو گیا تھا۔ رو بیر بھی مسلسل تیر اندازی کیے جا رہی تھی۔ آسمان پر صبح کاذب کی سفیدی پھیلنے لگی تھی کہ میری نظر رونکا پر پڑی اور میں نے اپنی جگہ سے اچھال بھری۔ اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو رو بیر بھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی۔

میں گویا اڑتا ہوا رونکا پر جا گرا تھا۔ یہ تین ہاتھ کی دوری ایک لمحے میں طے کر لی تھی۔ رونکا کے ہاتھ میں ننگی چاقو تھا۔ رو بیر ہر جانب سے بے پروا ہو کر کمان کا چلا کھینچ رہی تھی۔ اسی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رونکا نے اس کی گردن پر وار کرنا چاہا تھا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب تک جتنے لوگ مرے ہیں وہ اسی کے خنجر کا نشانہ بنے ہیں۔ وہ ہماری ہمدردی حاصل کر کے ہمارے ہی بندوں کو مار رہا تھا۔ اگر آسمان پر سفیدی نہ ہوتی تو یہ راز راز ہی رہ جاتا کہ کس کے وار سے بندہ مرا۔ ایسے شخص کو آزاد چھوڑ دینا ظلم ہوتا جس نے میرے تین ساتھیوں کو لقمۂ اجل بنایا تھا۔ میں نے بلا جھجک اس کے حلقوم پر اپنا خنجر چلا دیا۔ رو بیر پر تو سکتہ چھا گیا تھا کہ وہ ابھی مرنے والی تھی۔

اس کی لاش کو دور پھینک کر میں نے دوبارہ سے پڑاؤ کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف کے لوگ اب بہ آسانی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ادھر سے تیر اندازی کرنے والے کھلے میدان میں تھے جب کہ ہمارے تیر انداز جس جگہ تھے وہ جنگل سے قریب جگہ تھی اس لیے وہاں جھاڑیاں اور چھوٹے درخت بے حساب تھے اور انہوں نے خود کو ان میں پوشیدہ کر رکھا تھا اس لیے دشمن ان پر صحیح طور سے نشانہ نہیں لگا پا رہا تھا جب کہ ہمارے تیر انداز نشانہ لے کر تیر چھوڑ رہے تھے۔ ادھر جتنے تیر انداز نظر آ رہے تھے اسے دیکھ کر مجھے اطمینان سا ہو گیا تھا۔ میں نے رات میں جو حساب لگایا تھا اس سے بہت کم سپاہی نظر آ رہے تھے مگر جتنے بھی تھے وہ جی دار تھے اور میدان چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اب میں نے اس جنگ کو اختتام دینے کا سوچا اور اپنی گن کو سنبھال لیا۔ میں نے میگزین چیک کیا۔ اچھی خاصی گولیاں تھیں۔ یوں بھی میں نے بہت کم فائر کیے تھے۔ گن کا کرشمہ دکھانے سے پہلے میں نے رو بیر کو آواز دی۔ وہ میرے قریب کی جھاڑی میں دبکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی۔ وہ کمان سنبھالتی ہوئی باہر آئی، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ سامنے والوں کا نشانہ نہ بن جائے۔

"جی جناب۔" اس نے قریب آ کر کہا۔

تھکن اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ اس کا گورا چہرہ مسلسل مشقت کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ خون کی سرخی نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ قریب بیٹھتے ہوئے بولی "بولیں... وقت کم ہے۔ اگر ہم ذرا بھی کمزور پڑیں تو وہ لوگ ہمیں موت کی نیند سلا دیں گے۔"

"اب میں بھی تھک گیا ہوں اور اس جنگ کا خاتمہ چاہتا ہوں۔"

"کیسے کریں گے خاتمہ؟ یہ لوگ "زرگی" ہیں۔ یہ صرف مرنا مارنا جانتے ہیں۔ ان کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ مجھے اگر پتا ہوتا کہ یہ زرگی ہیں تو میں آپ کو روک لیتی۔ ان سے ٹکرانے نہیں دیتی۔ ان کے جنگی جنون کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ زرگی ہیں۔"

"زرگی ہیں یا مرغی مجھے کوئی پروا نہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے میں مغالطے میں آ گیا تھا.... میں سمجھا تھا کہ ان کی تعداد زیادہ ہے لیکن یہ تو بہت کم ہیں اس لیے میں جو کہہ رہا ہوں اس کا ترجمہ کرو۔ بلند آواز سے ان سے کہو۔"

"جی بولیں۔"

"ان سے کہو کہ اب بھی وقت ہے۔ موت تم سب کے سروں پر رقص کر رہی ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ظلم



اور جبر کے خاتمہ کے لیے ہمارا ساتھ دو۔ سامیرا تمہیں بخش دے گی۔ بس تم لوگ اپنے گناہ دھونے کے لیے اپنے ہتھیار پھینک دو۔ ورنہ اب تم سب پر دہاڑنے والے ہتھیار سے حملہ ہوگا اور تم سب مارے جاؤ گے۔ آگ کے تیر تمہارے جسموں میں سوراخ کریں گے اور تم پر رونے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔"

رو بیر نے میرے جملوں کو اپنی زبان سے ادا کیا لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔ اس پر ایک ساتھ کئی تیر چلائے گئے تھے۔ اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے گن سیدھی کی اور بالکل سامنے کھڑے تیر انداز کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دھماکے سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ وہ گرا تھا کہ میں نے دوسرے پر شست باندھ لی اور اسے بھی گرا دیا۔ پانچ فائر کیے اور پانچ بندے خاک اور خون میں لوٹنے لگے۔ ادھر سے تیر کا مینہ برسنا بند ہو چکا تھا۔ تیر انداز اب آڑ میں ہو گئے تھے یا دور بھاگ گئے تھے۔ تبھی میں نے رو بیر سے کہا "اب ایک اور کوشش کرو۔ ان سے کہو کہ اب بھی وقت ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ سب کے سب مارے جاؤ گے اس لیے کہ آگ برسانے والا ہتھیار جاگ چکا ہے۔ اس ہتھیار کا مقابلہ کرنا تم میں سے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

رو بیر نے چیخ کر جیسے ہی یہ جملہ ادا کیا۔ ادھر سے خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا۔ ایک ساتھ کئی سپاہی نے چیخ کر کہا "رحم رحم۔" پھر کئی کمان اڑ کر میدان میں گرے۔ جسے انہوں نے پھینک کر اشارہ دیا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ میں نے رو بیر سے کہا کہ ابھی وہ سامنے نہ آئے۔ اسی طرح جھاڑیوں کے عقب سے کہے کہ تمام لوگ سامنے آ کر بیٹھ جائیں۔ اب ان پر کوئی تیر نہیں چلائے گا۔ دہاڑنے والا ہتھیار بھی نہیں چلے گا۔

رو بیر نے جیسے ہی یہ بات کہی ایک ساتھ بہت سے سپاہی خیموں سے نکل نکل کر، جھاڑیوں اور پیڑوں کے پیچھے سے باہر آ گئے۔ اب جو میں نے ان کی تعداد گنی تو حیران رہ گیا۔ سو سے زیادہ ہی لوگ ہوں گے۔ گن کے خوف نے ان سے بہادری چھین لی تھی۔ اگر ہم تیروں سے جنگ کرتے رہتے تو شاید اتنی جلدی کامیابی نہ ملتی۔

اپنے ساتھیوں میں سے تین بہادروں کو ان کی طرف بھیجا کہ وہ جا کر ان سب کے ہاتھ پشت پر باندھ آئیں۔ ہاتھ باندھنے کے لیے ایک پیڑ کی جٹاؤں کو استعمال کیا گیا۔ ان سب کو پیڑ کے لمبے لمبے ریشوں سے جکڑنے کے بعد انہیں قیدی بنانے کے بعد میں نے دو جانبازوں کو حکم دیا کہ وہ انہیں بھی وہیں لے جائیں جہاں ہم قیدیوں کو رکھ رہے ہیں۔

ان سب کو قیدی بنا کر ہم نے بہت بڑی فتح حاصل کر لی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہو گیا تھا۔ اب سامیرا کا لشکر بہت حد تک محفوظ ہو گیا تھا۔ ریناٹ کا پلان فیل ہو چکا تھا کہ سامیرا کا لشکر جب آگے بڑھے گا تو یہ دستہ اس پر عقب سے حملہ کرے گا۔

اگر عقب سے حملہ ہو جاتا تو سامیرا کا بہت نقصان ہوتا۔ فوج افراتفری کا شکار ہو جاتی۔ مجھے تو خوشی تھی ہی مجھ سے زیادہ خوش رو بیر تھی۔ اس نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے۔ سامیرا مجھے معاف کر دے گی نا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے اس کا دل بڑھایا۔

"اس کامیابی کے صلہ میں جو کچھ میں مانگوں گی مجھے وہ دے گی نا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں کیا مانگوں گی؟" رو بیر نے قاتل نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

## ذرا سی بات

ایک لباس ہے جو دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے انسان پر جچتا ہے اور وہ ہے مسکراہٹ۔

## جامع مسجد

وہ مسجد جس میں جمعے کی نماز ادا کی جائے۔ جامع مسجدوں میں زیادہ سے زیادہ وسعت کا خیال رکھا جاتا ہے تاکہ جمعہ، جمعۃ الوداع اور عیدین پر زیادہ سے زیادہ نمازی شریک ہو سکیں۔ دنیا میں سب سے پہلی جامع مسجد مدینے کے قریب مسجد قبا ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکے سے ہجرت کے بعد پہلی دفعہ نماز جمعہ ادا کی۔

مرسلہ: فیروزہ اکبری۔ مظفر گڑھ

9 سال سے قارئین کو گرویدہ کیے رکھنے والی طویل کہانی کا اختتام کرنے سے قبل ہی مصنف کاشف زبیر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسی مقبول کہانی کو بغیر اختتام چھوڑنا کہانی کے ساتھ ظلم ہوتا اس لیے ایک دوسرے رائٹر سے اختتام کرایا جارہا ہے لیکن کس رائٹر نے اختتام کیا اس راز سے پردہ تبھی اٹھے گا جب آخری قسط ہو گی۔ کہانی حد سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے اس لیے اس ماہ اختتام کرنا ممکن نہ تھا اس لیے مصنف کا نام مخفی رکھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اندازِ تحریر سے مصنف کا نام بتایا ہے وہ کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا گیا ہے۔ جنہوں نے اب تک اس مقابلے میں حصہ نہیں لیا ہے وہ اس ماہ بھی اندازے لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں شاید 5000 روپے کا انعام ان کو مل جائے۔ طریقہ کار گزشتہ شمارے میں دیا جا چکا ہے۔

اس کی آنکھوں نے مجھے اس کے دل میں چھپی بات بتادی تھی لیکن وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کو ٹوکتا کہ بی بی تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ جبکہ خود میری زندگی سراب ہے کہ میں دوڑ رہا ہوں' خوشی کی اُمید پر، جہاں بھی خوشی کی جھلک نظر آتی ہے میں دوڑ پڑتا ہوں اور خوشی ہے کہ وہ روٹھی روٹھی ہی نظر آتی ہے۔ منزل سامنے آتی ہے اور پھر دور ہو جاتی ہے۔ میری زندگی کو سراب بنانے والا مرشد بڑے آرام سے اپنی نئی خانقاہ میں بیٹھا ہوگا اور میں یہاں اپنوں سے دور زندگی کا جوا کھیل رہا ہوں۔ کسی دوسرے کی لڑائی کو اپنا سمجھ کر لڑ رہا ہوں جس کا نتیجہ کسی بھی وقت موت کی شکل میں سامنے آسکتا ہے۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ میں یہاں سے زندہ واپس بھی نہ جا پاؤں۔

مجھے فکر میں غلطاں دیکھ کر اس نے کہا ''کیا سوچنے لگے۔''

وہ خطرناک حد تک میرے قریب آگئی تھی۔ اسے یہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی بھی شخص اس جھاڑی کی طرف آسکتا ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس پر پھر سے خناس چڑھنے لگا ہے۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور جھاڑیوں سے نکلتے ہوئے بولا ''ہمیں اب سامیرا کے لشکر کی طرف چلنا چاہیے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کہتے ہوئے روبیر نے کمان کو کندھے پر لٹکا کر ترکش کو پیٹھ پر باندھا اور چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ دوسرے لوگ بھی میرے ساتھ چل پڑے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ دور سے کسی اُلو کے چیخنے کی آواز آئی اور میں چونک گیا۔ اُلو ایک ایسا پرندہ ہے جو تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں اسے خوش قسمتی کا نمائندہ کہا جاتا ہے اور کہیں اسے منحوسیت کی علامت۔ یہاں اسے کس قسم کا خطاب دیا گیا ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ یہاں کے جنگل میں میں نے اُلو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس وقت اس کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ تبھی اُلو کے چیخنے کی آواز دوبارہ سنائی دی تو میں.... مسکرا دیا اس لیے کہ میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ اُلو کی آواز نہیں تھی۔ یہ آواز وسیم کی تھی۔ بقول اس کے کہ جب وہ اسلحہ کی اسمگلنگ کرتا تھا تو یہ آواز نکال کر وہ اپنے خریداروں کو بلاتا تھا۔ میں نے منہ میں دو انگلی ڈالی اور ایک تیز سیٹی پورے جنگل میں گونج گئی۔ میں جو چاہتا تھا وہی ہوا۔ ادھر سے بھی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ میری سیٹی اس نے سن لی ہے۔ میں اسی آواز کی سمت بڑھ رہا تھا کہ ایک عجیب بات رونما ہو گئی۔ میرے بالکل سامنے لمبی لمبی جھاڑیاں تھیں۔ یکایک ان جھاڑیوں میں ہلچل مچی۔ میں ٹھٹک گیا۔ ابھی ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ جھاڑیوں کے عقب سے ایک ہارن نے چھلانگ لگائی اور بالکل میرے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ اس عفریت کو دیکھ کر میں سکتے میں آگیا تھا۔ اس کی خون آشامی، درندگی سے واقف تھا کہ کس قدر انسانوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس کا مظاہرہ بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے لاتعداد بار بہادری کے جوہر دکھائے تھے مگر اس وقت خدا گواہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔

کہانی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ کریں



# بیت بازی

(نجمی رحمٰن یو ایس اے کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد
ابھی سے وہ دامن چھڑانے لگا ہے
جو اب تک مرے ہاتھ آیا نہیں ہے

رانا محمود الحسن.........جہلم
احتیاطاً لوگ یوں جیتے رہے
رسم سی جیسے ادا کر دی گئی

جاوید افسر.........سیالکوٹ
ابھی سکون میسر نہیں رعایا کو
ہیں نقص طرزِ حکومت میں بے شمار ابھی

احمد علی سولنگی.........جیکب آباد
انساں سے محبت کی سزا کتنی کڑی تھی
نفرت کے طمانچے میرے رخسار تک آئے

نسیم نکہت.........اٹک
امتحاں اور میرے ضبط کا تم کیا لو گے
میں نے دھڑکن کو بھی سینے میں چھپا رکھا ہے

نازنین ناز.........العین یو اے ای
اتنا بے حس کہ پگھلتا ہی نہ تھا باتوں سے
آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا

سید امتیاز حسین بخاری.........سرگودھا
ایسا اجڑا ہوں محبت میں تیری اے دوست
اب مجھے یاد وہ پہلی بھی ملاقات نہیں

(رابعہ کنول اسلام آباد کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........ہارون آباد
افسردگی گناہ کی تمثیل ہے ندیم
بے چینیاں حرام ہیں تو جاگ تو سہی

اشرف علی صحر.........نواں شہر
الفت کی راہ جادۂ بے امتیاز ہے
محمود اس فضا میں غلامِ ایاز ہے

فوزیہ مشتاق.........شیخوپورہ
اکسیر کے آجاتے ہیں اوصاف بشر میں
سو فائدے ہیں ایک محبت کے ضرر میں

سونو.........لاہور
اٹھتی ہیں کبھی دل سے غموں کی جو گھٹائیں
احساس کا دریا بھی بہا دیتی ہیں آنکھیں

فدا حسین طوری.........پاراچنار
اپنے دامن پر وہ اک قطرۂ اشک
اک شکستہ ساغر یاد آیا

(فلک شیر ملک رحیم یار خان کا جواب)

عبدالحکیم شمر.........کراچی
دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں اسے آرام گہہ نورجہاں ہے

حیات مرزا.........حیدرآباد
دیکھ لے سوکھی ٹہنیوں کی طرف
پوچھ مت انتظار کیا شے ہے

ملک ادریس.........ڈیرہ اسماعیل خان
دستِ گیہ تراش تو ہے خشک ہو چکا
افضل رہیں گے گھاس کے میدان ہرے بھرے

زاہدہ ممتاز شیخ.........جھنگ صدر
دل برباد ہے اب اس طرح اشکوں کے نرغے میں
کہ جیسے اک شکستہ ناؤ طوفانوں کے ہاتھ آگئی

(مرزا حمزہ بیگ حیدرآباد کا جواب)

ناعمہ تحریم.........کراچی
تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھن گئی جب سے
کوئی بھی لفظ لکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

سلمیٰ شاہین.........فیصل آباد
تو نام کا دریا ہے روانی نہیں رکھتا
بادل ہے وہ بے فیض جو پانی نہیں رکھتا
یہ آخری خط آخری تصویر بھی لے جا
میں بھولنے والوں کی نشانی نہیں رکھتا

(عبدالجبار رومی انصاری کراچی کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

اور پھر کرنا پڑا گوشت سے ناخن کو جدا
یہ ضروری تھا کسی زخم کو بھرنے کے لیے

(نازیہ نسرین محبوب کراچی کا جواب)

عبدالحکیم شمر.........کراچی

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

(وحید الحسن ملتان کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

رسم وفا ہم نے ہی نبھائی اور ہم ہی بدنام ہوئے
حسن و عشق کی اس دنیا میں ہم ایسے دیوانے ہوئے

فصیح الدین.........سکھر

ریت کے ذرے بن کر چمکے
کتنے موتی رُلتے رُلتے

عباس علی.........سکرنڈ

رنگ لائیں گی اک دن یہ خوش فہمیاں
آپ کے راز داروں سے ڈرتے ہیں ہم

سیف اللہ.........ملک وال

رو کے میت پہ میری وہ یوں کہنے لگے
تو ہی نکلا بے وفا تیری وفا پہ ناز تھا

(زویا اکبر لاہور کا جواب)

بادیہ ایمان، ماہا ایمان.........ہارون آباد

دل کی تسکین بھی ہے آسائش ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں

ابریز اسد.........میانوالی

دن میں جو بنائے وہ شام تک نہ رہ پائے
ریت پہ گھروندوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

مہوش صدیقی.........بھمبر کشمیر

دوچار نہیں مجھ کو فقط ایک دکھا دو
انسان جو اندر سے بھی باہر کی طرح ہو

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

ندیم یامین.........کراچی

ہزاروں غم ہیں جو مجھے مصروف رکھتے ہیں
مگر تم اتنے انمول ہو کہ پھر بھی یاد آتے ہو

(نسیم منظر کراچی کا جواب)

منشی عزیز مے.........وہاڑی

آنکھیں ہی کہا کرتی ہیں سب دل کے چھپے راز
کیوں تجھ کو یقین میری نگاہوں پہ نہیں ہے

ہما اختر.........مظفر گڑھ

اب تو یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے بہت دور بسائی ہیں بستیاں

سیف الرحمٰن.........ساہیوال

اندر لگی تھی آگ مگر بے خبر تھے لوگ
جلتے ہوئے مکان کے باہر دھواں نہ تھا

(نورین فاطمہ سکھر کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری.........لاہور

یونہی زندگی سنور جاتی ہے
ذرے سے موتی بنتے بنتے

ہما علی.........بھٹیاں

یہ ہم بھی جانتے ہیں زندگی ایک خواب ہے افسر
مگر اس خواب کی آخر کوئی تعبیر بھی ہو گی

سبین اقبال.........لیاقت پور

یوم آزادی منایا ہم نے کچھ اس طور سے
نوجواں تھے رقص تھا اور ہو جمالو کی دھمال

محمد احمد حسن.........وادو

دلوں کے قرب کی پہچان ہے یہی شوکت
نظر نظر میں جل اٹھیں صداقتوں کے چراغ

نصرت شاہین.........سرگودھا

ہم کو ڈر ہے کہ نہ بہہ جائیں نشیمن اپنے
ہم کو اس سال بھی برسات سے ڈر لگتا ہے

فرحت اللہ.........پشاور

اے زندگی تو ہی بتا کیسے تجھے پیار کروں
تیری ہر سانس میری عمر گھٹا دیتی ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

# علمی آزمائش۔ 125

ادارہ

**ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ**

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماهنامه سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماهنامه پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک تحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مئی 2016ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

## اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر رائل ملٹری کالج سینٹ ہرسٹ انگلینڈ سے ڈگری حاصل کی اور رائل آرمی میں شامل ہوگئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر ایک بٹالین کی کمان کی۔ 1951 میں افواج پاکستان کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔

## علمی آزمائش 123 کا جواب

جمیل الدین عالی والی لوہارو کے ہاں پیدا ہوئے۔ دہلی اور کراچی میں تعلیم مکمل کی۔ 1948ء میں وزارت تجارت میں شمولیت اختیار کی اور 1965ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ کالم نگاری کی۔ شاعری میں مقام بنایا۔ سینٹ کے رکن بھی رہے۔ گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال ہوا۔

## انعام یافتگان

**1**۔ محمد ایوب انصاری، حیدرآباد **2**۔ ملک عنایت اللہ، فیصل آباد **3**۔ نورعین فاطمہ، کوئٹہ

**4**۔ ارشد بلوچ، حب **5**۔ بابر علی بابر، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے فراز وکیل عثمان خان، مسرت حسین رضوی، مشفع احمد، شاہد اقبال شاہد، ناعمہ تحریم، خادم حسین، شاہد رضا زیدی، عزیز الدین، شاہد احمد، وکیل الرحمن، محمد عثمان، انتساب احمد، رفیع الدین، زین علی شاہ، نکہت شیرازی، انور حسن زئی، یوسف حسن خان، کلیم اختر کلیم، بشریٰ صدیقی، توحید الاسلام، آفاق احمد آفاق، حسن قریشی، سلطنت بانو، زبیر حسن، وحید خان۔ لاہور سے پروفیسر محمد رضا زیدی، امداد العصر، انعام اللہ، فصیح محمد بٹ، عابد چوہان، برکات صدیقی، وحید اشرف، نیاز حسن، شکیل ایاز، اللہ دتہ، فہیم الحسن، قیام علی، عنایت اللہ عنایت، ظہور آفاقی، صدق الحسن، زدیا حسن، ملک ممتاز، شیخ فیض الحسن۔ ملتان سے منیبہ ربانی، محمد افتخار، محمد معین چشتی، خواجہ محمد حسنین، ناصر بیگ، فرحت مرزا، سلطان خان، عباس حیدر زیدی، نعمان ربانی، صفدر کاظمی، خورشید حیات، زاہد علی چنگیزی، تبریز عالم، فتح دین ملک، عابد علی، نواز خان۔ کوئٹہ سے حجاب علوی، شاہین بخش، نادر علی مغل۔ اٹک سے رضوان ارشد، صبا گل، احمد جاوید، رضوان طاہر۔ پشاور سے شیر نواز گل، شہباز خان، مفتی اکبر، عمران وروگ، نعمان شہزاد خان، نزہت جمال، مرشد علی خان، مفتی طوری بخش، صفدر علی خان۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، افتخار الاسلام، ملک نوروز عباس، سعید محمد علی زیدی، عباس بھرگڑی، عنایت علی حسینی، سلطان اسلم بھٹی، فرحت پروین، سلطان نصیر، فیض محمد خان، زوہیب علی سید، نادر علی، ملک سلمان، فرحت الدین۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، شبیر احمد بشیر، انور یوسف زئی، محمد بلال، محمد ریاض راحیل، راؤ امتیاز، شیخ نظامت علی، محمد فاروق پراچہ، ممتاز علی، اعجاز حسین بھٹی، عبدالجبار، فہیدہ تسلیم، نیلوفر شاہین۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، فیض الحسن، معظم علی سید، محمد جنید فراز علی، نسیمین اچکزئی، کامل حمد، ناصر انصاری، فیض احمد، یاسین قریشی۔ حیدرآباد سے محمد حسین شاہ، حیات مرزا، خوشنود حسن، ماہ رخ، توقیر جمالی، مسکان بھٹو، نسرین رانا، امجد حسین۔ مظفر گڑھ سے محمد ایاز قریشی، فرحت اعجاز، ناصر حسین (کوٹ ادو)، شریف الدین (شہر سلطان)۔ سیالکوٹ سے طاہر سلیم، ادریس ملک، شہباز علی خان، آنسہ فرحت، زیب علی، محمد معین قزلباش، شکیل حسن ادریس۔ قصور سے عبدالحلیم، نیاز احسن، قربان سلطان جیلانی۔ ڈیرہ غازی خان سے عدنان منور، رفیق احمد ناز، نازش ممتاز، فہیم احسان زئی، خان محمد خان، فراست رضوی، شکیل ادریس، عطاء اللہ خان، زین شاہ، انعام الحسن۔ سرگودھا سے رفعت بانو، سید امتیاز حسین بخاری، نواب احسن نواب، خیال مظہری، کائنات بتول۔ عباس حیدر سید، فہیم اللہ خان، نوازش حسن، عباس علی مجاہد۔ چکوال سے ملک طارق رشید، خاقان خان، مظہر علی مظہر، محمد ریاض۔ قلعہ سیف اللہ سے عباس اطہر۔ صوابی سے احسن شاہ۔ لیہ سے خالد قتیل، ابرار مصطفیٰ۔ میانوالی سے عبدالخالق، اشتیاق حسین، وحید الدین خان، فرحت اللہ، عباس علی، فہد اشتیاق، عدنان حسن خان، شعیب ملک، کائنات فاطمہ، بی بی زین۔ مردان سے م انور، سیف زلفی۔ پاک پتن سے علی محمد۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے انیس الزمان، بھمبر آزاد کشمیر سے نیاز بھٹ۔ رحیم یار خان سے خالد احسن، سلیم ملک، فرقان مجیدی۔ پاک پتن سے عابد علی، محمد ادریس۔ راجن پور سے ملک اشفاق۔ جام شورو سے نیاز ملکھانی۔ خانیوال سے غرید الحسن، شعیب بلوچ۔ ڈی آئی خان سے اقبال فرید، نصیبو، اکبر جلال شاہ، اشتیاق۔ ڈی جی خان سے محمد اکمل مجاہد، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے لیاقت بلوچ۔ نوشہرو فیروز سے نزاہت علی امجد۔ ساہیوال سے فرید محمد خان۔ اٹک سے شاہینہ اسلم، شعیب عباس، فرید الدین۔ سرگودھا سے فرید گوجر، محمد نیاز، محمد سعید۔ سیالکوٹ سے عارف علی، خواجہ انعام علی، زین حسن فرحت عباس، حیدر شاہ، نقی زیدی، عباس عابدی، نذر حسین بھٹی، بابر زمان خان، نظیر شاہ، ضغیم عباس زیدی۔

گلگت سے: محمود الحسن شاہ، جان شاہ، حب علی، ولدار حسن۔ حیدرآباد سے: آصف کریم، نسرین یاسین، ملک نوروز، فتح محمد، نعمان قریشی، مرزا اسد بیگ، ابرار شیخ، رفیع اللہ انصاری، صلاح الدین، نعیم انصاری، نصرت جہاں۔ بہاولنگر سے: سلیم کامریڈ (کھاناں) ضیغم علی۔ ڈگری سے: نعیم شاہ، فرحال ٹھوکر، شازیہ حسن۔ بہاولپور سے: آمنہ ملک، زرولی خان، اشرف حسین۔ چنیوٹ سے: مصطفیٰ حسن زیدی۔ بگرام سے: آصف خان اچکزئی۔ دیپال پور سے: امیر الدین نظامی۔ گوجرہ سے: انجم تاثیر، نوید حسن۔ گھوٹکی سے: مہوش حسن، پروین فرحت۔ منڈی بہاؤالدین سے: فیصل خان، فہیدہ ارشد۔ ہارون آباد سے: غزالہ فرحت۔ گجرات سے: سید اظہار الحسنین جعفری۔ حویلی لکھا سے: دلنواز خان حسن زئی۔ ڈی جی خان سے: محبوب حسین نادر۔ پاک پتن سے: کاشان حسین۔ ڈی آئی خان سے: شازیہ ارم۔ بنوں سے: معظم طارق۔ میاں چنوں سے: فہیم حسن، خالق کریم کریمی۔ بھیرہ سے: محمد طفیل۔ حاصل پور سے: محمد ناصر۔ فاضل پور سے: شاہد آفریدی۔ جہلم سے: محمد خلیل چودھری (دینہ) شیر محمد، شبیر دائین، نوشین اطہر۔ نوشہرہ سے: فضل محمد، نعمت اللہ۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، عباس لائکی۔ پشاور سے: فائزہ شہزاد، جویریہ شیر نواز، شمشیر سنگھ خالصہ۔ جام شورو سے: منصور احمد، ابرار بھٹو، نواز علی لاشاری، محمد شاہد خان۔ حافظ آباد سے: محمد ابراہیم، محمد صدیق مستری۔

بیرونِ ملک سے: سلیم احمد شیخ (اونٹاریو کینیڈا)، جمیل پراچہ (العین دبئی)، ظاہر شاہ (یو کے)۔






WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

# معصوم مجرمہ

محترم ایڈیٹر

سلام تہنیت

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنے گناہوں کو لکھ کر آپ قارئین کے سامنے پیش کررہا ہوں تاکہ میری طرح کوئی اور صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکے، اپنے بچوں کی زندگی میں اپنے مفاد کی خاطر زہر نہ گھولے۔ میں تو تائب ہو چکا ہوں اس لیے سوچا کہ دوسروں کو بھی عبرت کا درس دے دوں۔

رشید احمد

(کراچی)

میں نے ایک مصروف علاقے میں بینک کے سامنے رکشا روک دیا اور سواری کا انتظار کرنے لگا۔ میری چھ سالہ بیٹی راحیلہ میرے ساتھ ہی اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ نئے سی این جی رکشوں کی نہ صرف ڈرائیونگ سیٹ خاصی کشادہ ہوتی ہے بلکہ ان میں پیچھے بھی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ بہت سے رکشا والوں نے تو پچھلے حصے میں ایک اضافی سیٹ بھی لگالی ہے۔ یوں ٹیکسی والوں کا بزنس بالکل ٹھپ ہوکر رہ گیا ہے۔

سامنے سے ایک ادھیڑ عمر شخص میرے نزدیک آیا اور بولا۔ ''حیدری چلو گے؟''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکشا خالی نہیں ہے صاحب! میں اپنی سواری کا انتظار کررہا ہوں۔'' وہ شخص مایوس ہوکر چلا گیا۔

پھر کالج یونیفارم میں ملبوس دو لڑکیاں آئیں۔ ان کے دوپٹے شانوں سے جھول رہے تھے۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھی اور دوسری چیونگم کی جگالی کررہی تھی۔

جگالی کرنے والی لڑکی مجھ سے کچھ کہے بغیر رکشا میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''انچولی کیا لوگے؟'' پھر وہ میرا جواب سنے بغیر بولی۔ ''جیفورو!''

مجھے اس قسم کی سواریوں سے چڑ ہے جو یوں ڈھٹائی سے رکشا میں سوار ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''رکشا خالی نہیں ہے بی بی۔''

''خالی نہیں ہے!'' جگالی کرنے والی حیرت سے بولی۔ ''لیکن مجھے تو یہاں کوئی نظر تو نہیں آرہا ہے۔''

''سواری آگے بیٹھی تو ہے صائمہ۔'' دوسری لڑکی نے شاید طنز کیا تھا۔ اس نے اپنی بوتل سے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور بولی۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ انچولی تک کا کیا لوگے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ رکشا خالی نہیں ہے۔'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کسی کا ویٹ کررہا ہوں۔''

وہ دونوں بکتی جھکتی اتر گئیں۔

اسی وقت ایک خاتون بینک سے باہر نکلیں۔ انہوں نے ادھر دیکھا پھر وہ آگے بڑھ گئیں۔ میں ہاتھ مل کر رہ گیا۔ مجھے ایسی ہی کسی سواری کا انتظار تھا جو منہ مانگے پیسے دے سکے۔ ہم لوگوں کو سواری کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سے کتنا کرایہ مل سکے گا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا وہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک رکشا والے سے بات کررہی تھیں۔ رکشا والے نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے نزدیک پہنچ گئیں اور بولیں۔ ''نارتھ ناظم آباد چلو گے؟''

''آپ نارتھ ناظم آباد میں کہاں جائیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے بلاک اے کی طرف جانا ہے۔''

''بلاک اے!'' میں نے سوچا۔ ''خاتون صاحب حیثیت بھی ہیں۔ نارتھ ناظم آباد کے بلاک اے میں بڑے بڑے بنگلے بنے ہوئے ہیں اور وہاں خاصے خوش حال لوگ رہتے ہیں۔

''بیٹھیے!'' میں نے کہا۔

''کرایہ کیا لوگے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جو مناسب ہو دے دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''میں دوسو روپے سے زیادہ نہیں دوں گی۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں ابھی اتنے ہی پیسے دے کر یہاں آئی ہوں۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ جو رکشا والا انہیں یہاں لایا تھا اس نے بھی ان سے اچھا خاصا کرایہ وصول کیا۔ نارتھ ناظم آباد کے ڈیڑھ سو سے زیادہ کوئی نہیں دیتا تھا بلکہ اکثر لوگ تو ایک سو تیس اور ایک سو بیس روپے پر اڑ جاتے تھے۔

''بیٹھیے۔'' میں نے ان کی بات مانتے ہوئے کہا۔

وہ رکشا میں بیٹھ گئیں۔ میں نے رکشا اسٹارٹ کیا اور روانہ ہوگیا۔

خاتون نے اچانک پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ یہ بچی کون ہے؟''

''میری بیٹی ہے بیگم صاحبہ!'' میں نے جواب دیا۔

''تمہاری بیٹی؟'' انہوں نے کہا۔ ''تم اسے ساتھ لیے کیوں گھوم رہے ہو؟''

''کیا کروں بیگم صاحبہ! مجبوری ہے۔ میری بیوی تو دو برس پہلے مرگئی تھی۔ میرے پاس جتنا پیسا تھا، اس کے علاج پر خرچ ہوگیا۔ میں ان دنوں ایک دفتر میں کلرک تھا۔''

''تم پڑھے لکھے ہو؟'' خاتون نے چونک کر پوچھا۔

''جی ہاں، میں نے گریجویشن کیا ہے۔ بیوی کے علاج کے لیے میں نے گھر کی ایک ایک چیز بیچ دی، آخر میں گھر بھی بیچ دیا لیکن بیوی کو نہ بچا سکا۔'' میرا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ اس بچی کے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے میں نے جیسے تیسے یہ رکشا خرید لیا۔ اس کی قسطیں بھی ابھی باقی ہیں۔ بس کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو رہا ہے۔''

''تم رہتے کہاں ہو؟'' بیگم صاحبہ کے لہجے میں اب مجبوری تھی۔

''میں کہاں رہوں گا، گھر بار تو کوئی ہے نہیں رات کو جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتا ہوں، بچی کو پچھلی سیٹ پر سلا دیتا ہوں اور خود کسی فٹ پاتھ پر یا دکان کے چبوترے پر لیٹ کر سو جاتا ہوں۔ رکشے کی سیٹ کے نیچے میرے اور بچی کے کپڑے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیں یہ رکشا میرا گھر ہے۔''

''اوہ!'' خاتون نے تاسف سے کہا۔ ''تم کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پہ لے لو۔ ایک کمرے کا بھی گھر تو ہوتا ہے۔''

''ابھی تو مجھے رکشے کی قسطیں اتارنا ہیں۔ اس کے بعد کچھ سوچوں گا۔'' پھر میں نے افسردگی سے کہا۔ ''اس کے بعد بھی کیا ہوتا۔ بچی کو تو ساتھ ہی رکھنا پڑے گا۔ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''تم جاب کر وگے؟'' خاتون نے پوچھا۔

''جاب سے اچھا تو یہ رکشا ہے بیگم صاحبہ۔'' میں نے کہا۔ ''جاب کرنے کے بعد بھی مجھے فائدہ کیا ہوگا کیا میں اس بچی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' خاتون نے کہا۔

اچانک میری بیٹی راحیلہ کچھ بے چین ہونے لگی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو! سیٹ بہت گرم ہو رہی ہے۔'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''ٹھہر جا بیٹی۔ میں سیٹ پر کوئی موٹا کپڑا رکھ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ابو! مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔'' راحیلہ نے کہا۔

''کیا ہوا؟'' خاتون نے پوچھا۔

''میری بچی کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے بیگم صاحبہ۔'' میں نے بتایا۔ ''صبح سے مچل رہی ہے۔ یہ سیٹ انجن کی وجہ سے گرم ہو جاتی ہے اس لیے اسے بے چینی ہو رہی ہے۔'' پھر میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں راحیلہ کو آپ کے ساتھ بٹھا دوں؟''

''ہاں..... ہاں!'' اس خاتون نے کہا۔ ''میری سیٹ خالی ہے۔ مجھے بھلا اس بچی کے بیٹھنے پر کیا اعتراض ہوگا۔ آجاؤ بیٹا۔''

میں نے رکشا ایک طرف روکا اور راحیلہ کو پیچھے بٹھاتے ہوئے خاتون سے بولا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے بیگم صاحبہ! بعض لوگ تو صاف انکار کر دیتے ہیں۔''

انہوں نے راحیلہ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور بولیں۔ ''بیٹا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''مجھے چکر آرہے ہیں آنٹی۔'' راحیلہ نے کہا۔

''سنو!'' خاتون نے مجھے مخاطب کیا۔ ''مجھے گھر چھوڑنے کے بعد تم اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا، ایسی پھول سی بچی کس مصیبت میں گرفتار ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ''وقت ملے تو کل میرے گھر آجانا میں تمہارے لیے کچھ سوچتی ہوں۔''

''آپ کی بہت مہربانی بیگم صاحبہ!'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

میں نے خاتون کو ان کے بنگلے کے سامنے اتارا تو انہوں نے مجھے پانچ سو روپے دیے۔

''میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں بیگم صاحب۔'' میں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ پیسے رکھ لو اور بچی کو فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''نہیں بیگم صاحبہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھکاری نہیں محنت مزدوری کرتا ہوں۔ جتنا میرا حق ہے اتنا ہی لوں گا۔ شاید میرے پاس کھلے پیسے نکل ہی آئیں۔''

''تم تو برا مان گئے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''یہ میں بچی کو دے رہی ہوں۔''

میں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ان سے نوٹ لے کر رکھ لیا۔

میں چلنے لگا تو بیگم صاحبہ نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ ''وقت ملے تو کل پرسوں ضرور میرے گھر آجانا۔ میں تمہارے مسئلے کا کوئی حل سوچوں گی۔''

''آپ کی بہت مہربانی۔'' میں نے کہا اور رکشا آگے بڑھا دیا۔

یہاں سے میں سیدھا ایک ہوٹل پہنچا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ بچی بھی سوگئی۔

ہوٹل کے ایک گوشے میں بیٹھ کر میں نے راحیلہ سے کہا۔ ''لا نکال بیٹا کیا لائی ہے؟''

''ابو! آج تو مجھے بہت سے پیسے ملے ہیں۔ سونے کی دو چوڑیاں اور ایک موبائل بھی ہے۔''

''لا پہلے موبائل مجھے دے دے میں اسے تو آف کر دوں۔'' میں نے بچی سے موبائل لیا۔ وہ موبائل بھی خاصا قیمتی تھا۔ میں نے موبائل آف کر کے اس کی بیٹری اور سم کارڈ نکال لیا۔

''آپ حیران نہ ہوں۔ میں ایک چور ہوں چوری کرنا میرا پیشہ تو نہیں تھا لیکن وقت اور حالات نے مجھے



چوری پر مجبور کر دیا۔

میری کہانی میں یہ بات تو صحیح تھی کہ میں ایک بڑی کمپنی میں کلرک تھا۔ پڑھا لکھا بھی ہوں لیکن یہ جھوٹ تھا کہ میں بے گھر ہوں۔ نیو کراچی میں میرا گھر ہے۔ بیوی ہے، دو بچے راحیلہ اور فرحان ہیں۔ راحیلہ بڑی ہے اور فرحان چھوٹا۔

میری ایک ذرا سی غلطی پر مجھے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت میری شادی ہو چکی تھی اور راحیلہ بھی چھوٹی تھی۔

پھر میں ملازمت کی تلاش میں دھکے کھاتا رہا لیکن کوشش کے باوجود مجھے کوئی ملازمت نہیں ملی۔ میں ہر صبح ایک نئی اُمید کے ساتھ گھر سے نکلتا اور شام کو مایوس لوٹ آتا۔ اچھے وقت میں میری بیوی سلمٰی نے جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ بھی اب تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک ایک پیسا ختم ہو گیا۔ میں ابھی تک بے روزگار تھا۔ راحیلہ ان دنوں صرف دو سال کی تھی۔ ہم خود تو بھوکے رہ سکتے تھے لیکن بچی کی بھوک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن میں گھر سے نکلا تو میرے پاس صرف پچاس روپے کا ایک نوٹ تھا۔ گھر میں آٹا تھا نہ دالیں، نہ چاول۔ راحیلہ کا دودھ بھی نہیں تھا۔

گلی کے نکڑ پر کریانے کی ایک بڑی سی دکان تھی۔ میں گھر کا راشن وہیں سے لیا کرتا تھا۔ میں دکان پر پہنچا اور گاہکوں کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ دکان کے مالک عقیل بھائی بہت خوش اخلاق آدمی تھے۔ شاید اسی لیے ان کی دکان پر گاہکوں کا اژدہام رہتا تھا۔ وہ مجھے جانتے تھے کہ میں ایک بڑی کمپنی میں ملازمت کرتا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''جی رشید صاحب! کیا چاہیے آپ کو؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، خوش پوش سے ایک صاحب وہاں آئے اور بولے۔ ''آپ کے پاس پانچ ہزار روپے کی چینج ہوگی؟''

عقیل بھائی نے نوٹ ہاتھ میں لیا تو اس پر نظر پڑتے ہی مجھے شبہ ہوا کہ وہ جعلی نوٹ ہے۔ میں کمپنی میں دو سال تک کیش بھی ڈیل کرتا رہا تھا اس لیے مجھے اصلی اور جعلی نوٹ کی پرکھ تھی۔ اس سے پہلے کہ عقیل بھائی اسے چینج دیتے میں نے کہا۔ ''میرے پاس کھلے پیسے ہیں۔ لائیے میں دے دوں۔''

عقیل بھائی نے نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے نوٹ کو ہاتھ میں لے کر چٹکی میں مسلا تو میرے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ نوٹ واقعی جعلی تھا۔ میں نے گھوم کر نوٹ دینے والے کو دیکھا اس کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔ اس نے خاصا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ربن کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور ہاتھ میں غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ تھا۔

میں نے اسے گھور کر کہا۔ ''آپ دیکھنے میں تو معزز اور شریف آدمی لگتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نوٹ جعلی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو شرم نہیں آتی ایسا گھٹیا کام کرتے ہوئے؟''

''وہاٹ؟'' وہ شخص غصے میں چیخا۔ ''میں یہ نوٹ ابھی بینک سے لایا ہوں اور......''

''اس کا فیصلہ تو پولیس کرے گی۔'' میں نے کہا اور عقیل بھائی سے مخاطب ہوا۔ ''عقیل بھائی! آپ پولیس کو فون کریں۔''

''دیکھیے آپ کو چینج نہیں دینا ہے تو نہ دیں لیکن مجھ پر اتنا بڑا الزام مت لگائیں۔ میں گریڈ سترہ کا سرکاری افسر ہوں اور......''

''کیا گریڈ سترہ والوں کے لیے جعلی نوٹ استعمال کرنا جائز ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''عقیل بھائی!'' میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''آپ پولیس کو کال کریں۔ جرم کرنے والا گریڈ سترہ کا ہو یا بائیس کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''میں یہ نوٹ ابھی بینک سے لایا ہوں۔'' اب وہ مجھے کچھ بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اگر ان ہی لوگوں نے جعلی نوٹ دیا ہے تو میں تو قصوروار نہیں ہوں۔''

''آپ کو چینج چاہیے تھی تو بینک ہی سے چھوٹے نوٹ کیوں نہیں لیے؟'' میں نے کہا۔

''میں نے وہاں سے بیس ہزار روپے نکالے تھے۔ کیشیئر نے پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ دے دیے۔ میں نے چھوٹے نوٹوں کے لیے کہا تو اس نے معذرت کر لی۔''

''یہ سب باتیں آپ پولیس کو بتائیے گا۔ پولیس خود تفتیش کر لے گی۔'' میں نے کہا۔

''اور آپ کو کوئی پرابلم ہے؟'' اس نے کہا۔ ''میں

نے نوٹ آپ کو تو نہیں دیا تھا۔" وہ اب کچھ سنبھل گیا تھا۔
"عقیل بھائی!" میں نے کہا۔" آپ پولیس کو کال نہیں کریں گے تو میں کرلوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے اپنا سیل فون نکال لیا۔
"دیکھیے! میں اس وقت جلدی میں ہوں۔" وہ شخص بری طرح گھبرا گیا۔" آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ نوٹ مجھے واپس کردیں۔ بینک والوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔"
میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر نمبر ڈائل کر چکا تھا لیکن پولیس کا نہیں اپنے ایک دوست کا، اس کا وہ نمبر ہمیشہ آف ہوتا تھا۔ میں نے چند لمحوں بعد کہا۔" ہیلو! پولیس اسٹیشن۔"
میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ شخص اچانک بھاگ نکلا۔ میں اس کے پیچھے لپکا کچھ فاصلے پر اس کی بائیک کھڑی تھی۔ میں نے بائیک پر بیٹھنے سے پہلے ہی اسے دبوچ لیا اور بولا۔" بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟"
"مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کردو پلیز۔"
"اور کتنے جعلی نوٹ ہیں تمہارے پاس؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔
"چار نوٹ اور ہیں۔" وہ بولا۔ پھر خوشامدی انداز میں بولا۔" مجھے معاف کردیں پلیز۔ مجھے جانے دیں میری بچی بیمار ہے۔"
اس دوران میں کچھ لوگ وہاں جمع ہوگئے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے درشت لہجے میں کہا۔" کیا بات ہے بھائی یہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے؟ یہ میرا دوست سہیل ہے۔ دوستوں میں مذاق تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"
لوگ واپس جانے لگے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "باقی نوٹ بھی نکال کر مجھے دے دو ورنہ ابھی پولیس کو ٹیلی فون کرلوں گا۔"
"لیکن......!"
"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" میں نے کہا۔" جلدی کرو۔"
اس نے بقیہ چار نوٹ بھی نکال کر میرے حوالے کردیے۔
"اب یہاں سے چلتے ہوئے نظر آؤ۔" میں نے کہا۔
وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے وہاں سے ایسا بھاگا کہ لمحوں میں نظروں سے غائب ہوگیا۔
میں دوبارہ عقیل بھائی کی دکان پر پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔" رشید صاحب! آپ ناحق اس لفنگے کے پیچھے بھاگے۔ اس قسم کے لوگ عموماً مسلح بھی ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔"
"اس قسم کے لوگ ہی تو عوام کی جیبوں پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔" میں نے کہا۔" میں کمپنی میں کیش ہی کی ڈیلنگ کرتا ہوں۔ جعلی نوٹ دیکھتے ہی مجھے شبہ ہو جاتا ہے اس لیے تو میں نے نوٹ مانگا تھا کہ اپنے شبے کی تصدیق کرسکوں۔"
"دفع کریں اسے۔" عقیل بھائی نے کہا۔" آپ بتایئے کیا لینے آئے تھے؟"
"مجھے ضرورت تو کئی چیزوں کی ہے عقیل بھائی!" میں نے کہا۔" لیکن ابھی مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں پیسے تو ہیں نہیں، میں......"
"آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں۔" عقیل بھائی نے کہا۔" آپ بتایئے آپ کو کیا چاہیے۔ پیسے تو آپ بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔"
میں نے ان سے راحیلہ کے لیے دودھ کا ایک ڈبا، چینی، پتی اور اسی طرح کی دوسری ضروری چیزیں لیں اور ان سے کہا کہ پیسے میں کل یا پرسوں تک دے دوں گا۔
میں سامان لے کر گھر پہنچا تو سلمیٰ پہلے تو حیران رہ گئی پھر اس نے چونک کر کہا۔" یہ سارا سامان آپ کہاں سے لائے ہیں؟"
"بس کہیں نہ کہیں تو اللہ بندوبست کر ہی دیتا ہے۔"
"آپ نے ادھار تو نہیں لیا ہے؟" سلمیٰ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اسے ادھار سے چڑ تھی۔
"ادھار لیا ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔" چوری نہیں کی ہے؟ تم کیا چاہتی ہو راحیلہ بھوک سے بلکتی رہے اور میں اپنے اصولوں کو لیے بیٹھا رہوں۔ میں خود بھی ادھار کا قائل نہیں ہوں سلمیٰ لیکن جب بات اولاد کی ہو تو پھر بہت سی باتوں پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"
میرا موڈ دیکھ کر سلمیٰ ایک لفظ بھی نہ بولی۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ہمیشہ خاموش ہو جاتی تھی۔
میں نے صبح سے چائے تک نہیں پی تھی نہ کچھ کھایا تھا۔ میں نے سلمیٰ سے ڈبل روٹی اور چائے لانے کو کہا۔
میں ناشتا کرکے اطمینان سے اخبار لے کر بیٹھ گیا تو سلمیٰ نے سوال کیا۔" آپ تو شاید کہیں جانے کو نکلے تھے۔"
"اب نہیں جا رہا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "آج دفتر جانے کا موڈ نہیں ہے۔ پھر شام کو مجھے ایک دوست کی شادی میں جانا ہے۔"
جب میں شام کو گھر سے نکلنے لگا تو سلمیٰ نے کہا۔
" آپ شادی میں تو جا رہے ہیں لیکن وہاں دیں گے کیا؟"
"کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ میں مزید وہاں رکتا تو وہ سوالات کرکے مجھے پریشان کرتی۔
میں نے سوچا تھا کہ میں وہ جعلی نوٹ چلانے کی کوشش کروں گا۔
اچانک میری نظر اپنے پڑوسی پر پڑی۔ وہ اس وقت آفس سے آیا تھا اور موٹر سائیکل سے اتر کر اپنا ہیلمٹ اتار رہا تھا۔
اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا۔ وہ جعلی نوٹ پیٹرول پمپ پر چل سکتا تھا۔ میں نے اپنے پڑوسی سے کہا۔" آصف صاحب! اب آپ کو کہیں جانا تو نہیں ہے؟"
اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔" نہیں اب میں کہاں جاؤں گا؟"
"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کی بائیک لے جاؤں؟"
"رشید صاحب! برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ ضرور لے جائیں۔"
چند ماہ پہلے میرے پاس بھی موٹر سائیکل تھی اور آصف نے کئی دفعہ مجھ سے مانگی بھی تھی۔ پھر وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔
میں نے بائیک کو کک لگائی تو وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "رشید صاحب! بائیک میں پیٹرول بہت کم ہے۔"
"اس کی آپ فکر مت کریں۔" میں نے کہا اور روانہ ہوگیا۔
میرے گھر کے نزدیک بھی ایک پیٹرول پمپ تھا۔ اس پیٹرول پمپ کے لوگ مجھے پہچانتے تھے۔
میں ایک دوسرے مصروف پمپ پر پہنچا۔ وہاں موٹر سائیکلوں کی قطار تھی۔
میں نے بہت اعتماد سے دو لیٹر پیٹرول ڈلوایا اور پمپ والے کو ان ہی جعلی نوٹوں میں سے ایک دے دیا۔ نوٹ کو ہاتھ سے مسل کر اور زمین پر رگڑ کر میں نے نہ صرف اس کا نیا پن ختم کردیا تھا بلکہ بال پوائنٹ سے اس پر کچھ

اسلٹے سیدھے ہندسے بھی لکھ دیے تھے اس کے باوجود میرا دل بہت بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کیشیئر نے ایک نظر نوٹ پر ڈالی۔ پھر اسے دوسرے نوٹوں میں ملا کر بقیہ رقم میرے حوالے کر دی۔

اس سے میرا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ میں نے وہاں سے دوسرے مصروف ترین پیٹرول پمپ کا رخ کیا۔ میں دو گھنٹے میں چار نوٹ استعمال کر چکا تھا۔ اب میری جیب میں تقریباً انیس ہزار روپے تھے۔ میں نے آخری نوٹ بھی دور دراز کے ایک پیٹرول پمپ پر چلایا اور وہاں سے ایک سپر اسٹور کی طرف نکل گیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے کچھ شاپنگ کی تو سلمٰی سینکڑوں سوالات کرے گی کہ شاپنگ کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟

میں یوں ہی بے مقصد گھومتا رہا۔ موٹر سائیکل کی ٹنکی تقریباً فل ہو چکی تھی۔

میں رات گئے گھر پہنچا تو سلمٰی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

کھانا تو میں کھا کر ہی آیا تھا۔ میں نے سلمٰی سے چائے لانے کو کہا اور چائے پیتے ہوئے میرے ذہن میں ایک بہانہ آ گیا میں نے اس سے کہا۔ ”شادی میں دفتر کا ایک ساتھی رزاق ملا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم اپنے بقایا جات تو لے جاؤ۔“

”بقایا جات؟“ سلمٰی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں یار میں تو غصے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گیا تھا۔“

”تو پھر آپ کل جا کر اپنے بقایا جات لے لیں۔ یہ تو آپ کا حق ہے۔“

میں دوسرے دن پھر ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ اب مجھے اتنا اطمینان تھا کہ وہ رقم دو مہینے تک تو چل ہی جائے گی۔ مکان میرا اپنا تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔

پھر میں دفتروں کے دھکے کھاتا رہا لیکن مجھے ملازمت نہ ملی۔ گھر کا سامان تک بکنے کی نوبت آ گئی۔ پہلے میں نے ٹی وی بیچا، پھر فریج، اس کے بعد سلمٰی کے زیورات بھی بک گئے اس بے چاری کے پاس زیور تھے ہی کتنے، غرض ہر وہ چیز بک گئی جو بک سکتی تھی۔ بیڈ، الماری، ڈریسنگ ٹیبل، قیمتی برتن، سبھی کچھ ٹھکانے لگ گیا۔ میں ہر مرتبہ سلمٰی سے یہی کہتا تھا کہ ملازمت ملتے ہی میں سب کچھ ایک مرتبہ پھر خرید لوں گا۔

اس طرح دھکے کھاتے مجھے دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ راحیلہ اب بڑی ہو گئی تھی اور وہ بولنے لگی تھی۔ سلمٰی اسے اسکول میں داخل کرنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پاس تو کھانے کے پیسے نہیں تھے تو اسکول کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔ میرے کپڑے اور جوتے بوسیدہ ہو چکے تھے ملگجا لباس اور مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی رشید ہے جو کبھی بہت خوش لباس اور خوبرو جوان تھا۔ اب تو میں کئی کئی دن شیو بھی نہیں کرتا تھا۔

سلمٰی نے خود بھی ملازمت کی کوشش کی لیکن وہ بے چاری زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، صرف میٹرک تک پڑھی تھی۔ اسے بھلا کہاں ملازمت ملتی۔

وہ دن میری زندگی کا تلخ ترین دن تھا۔ میں اور سلمٰی دو دن کے فاقے سے تھے۔ راحیلہ کو تو جیسے تیسے پڑوسیوں سے مانگ کر سلمٰی نے کچھ کھلا دیا تھا لیکن ہم دونوں بھوکے تھے۔

میں بستر پر پڑا سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں سلمٰی اور راحیلہ کو قتل کر کے خودکشی کر لوں؟ پھر میں نے سوچا کہ کہیں سے ایک ٹی ٹی پستول حاصل کر کے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دوں؟ یہ دونوں ہی کام میرے بس کے نہیں تھے۔ نہ ہی سلمٰی اور راحیلہ کو قتل کر سکتا تھا نہ ڈکیتی کر سکتا تھا۔

اب دفتروں کے دھکے کھانا گویا میری عادت بن چکی تھی۔ میں تو چپراسی تک کی نوکری کرنے کو تیار تھا لیکن وہ بھی مجھے نہیں مل رہی تھی۔ میرے پاس بس میں سفر کرنے کا کرایہ نہیں ہوتا تھا۔ دو چار دفعہ تو میں نے بس کنڈیکٹر سے بہانہ بنا دیا کہ میری جیب کٹ گئی ہے۔

شروع شروع میں تو کنڈیکٹروں نے میری بات پر اعتبار کر لیا لیکن ایک دن ایک کنڈیکٹر نے بری طرح ذلیل کر دیا کہ تمہاری جیب ہمیشہ کٹ جاتی ہے اترو گاڑی سے۔

میں فوراً بس سے اتر گیا۔ وہ کنڈیکٹر شاید دوسری مرتبہ مجھے ملا تھا۔ اپنی تذلیل پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں دیر تک سڑک کے درمیان بنی ہوئی گرین بیلٹ پر بیٹھا روتا رہا۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ ہم دو دن کے فاقے سے ہیں۔ سلمٰی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں خالی ہاتھ لوٹا تو وہ کتنی مایوس ہوگی۔

میں کچھ سوچ کر ایک نئے عزم کے ساتھ بس میں دوبارہ سوار ہو گیا۔ آج کل بسیں یوں بھی کھچا کھچ بھری ہوتی



ہیں۔ ایک صاحب نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور کنڈیکٹر کو کرایہ دینے کے بعد پرس دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ میں ان صاحب کے بالکل برابر میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے تو لوگ ایک دوسرے پر لد گئے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ان صاحب کی جیب سے پرس نکال لیا۔ انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا دروازہ تک پہنچا اور اگلے اسٹاپ پر اتر گیا۔ میں نے ایک گوشے میں جا کر پرس کا جائزہ لیا اس میں بہت سے وزیٹنگ کارڈ، ان صاحب کا قومی شناختی کارڈ، بہت سے کاغذات اور تقریباً ڈھائی ہزار روپے تھے۔ میں نے پیسے نکال کر پرس کوڑے دان میں پھینکنا چاہا پھر کچھ سوچ کر رک گیا میرا ضمیر تو پہلے ہی مجھے اس واردات پر ملامت کر رہا تھا لیکن میں نے یہ جواز گھڑ لیا تھا کہ بھوک میں تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ ہاں میں ان صاحب کے پرس کی چیزیں ڈاک کے ذریعے انہیں بھیج سکتا تھا۔

فی الحال تو بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہوٹل سے نہاری اور روٹی خریدی اور رکشا پکڑ کر گھر پہنچ گیا۔ گھر کے نزدیک والی دکان سے میں نے راحیلہ کے لیے بسکٹ کا ایک پیکٹ، دودھ اور ڈبل روٹی خرید لی تھی۔

میں نے کھانے کا شاپر سلمٰی کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس کے نقاہت زدہ جسم میں گویا بجلیاں بھر گئیں۔ جب تک میں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ اس نے کھانا پلیٹوں میں نکال لیا۔ ہم دونوں دو دن کے بھوکے تھے اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ نہ سلمٰی نے مجھ سے کھانے کے بارے میں کوئی سوال کیا نہ میں نے اسے جواب دیا۔

کھانے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”یہ کھانا آپ کہاں سے لائے؟“

”سچ بتاؤں یا جھوٹ بولوں؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”سچ بتا دیں۔“ سلمٰی نے کہا۔

”میں نے ایک آدمی کی جیب کاٹی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہائے اللہ۔“ سلمٰی سہم کر بولی۔ ”اگر اسے معلوم ہو جاتا تو؟“

”تو کیا پہلے تو لوگ مجھے کتے کی طرح مارتے پھر شاید پولیس کے حوالے بھی کر دیتے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

سلمٰی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولی۔ ”آپ خود کو قصوروار کیوں سمجھ رہے ہیں؟ آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔“

مجھے سلمٰی کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ سلمٰی چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے گی۔ مجھے لعن طعن کرے گی لیکن وہ تو الٹا مجھے دلاسا دے رہی تھی۔

دوسرے دن میں نے ایک خوش پوش آدمی کی جیب سے پرس نکال لیا اس میں زیادہ رقم نہیں تھی صرف چھ سو روپے تھے۔ پہلے کی طرح میں نے اس کے کاغذات بھی ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیے۔ میں جانتا تھا کہ شناختی کارڈ بنوانے میں لوگوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے یا کوئی ضروری کاغذ گم ہو جائے تو انہیں رقم سے زیادہ اس کی فکر ہوتی ہے۔ اس طرح میں اپنے گناہ کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

کئی وارداتوں کے بعد مجھ میں خاصا اعتماد پیدا ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں کچھ صفائی آ گئی تھی۔ میں جان بوجھ کر ایسے لوگوں سے چپک کر کھڑا ہوتا تھا جن کی جیب میں کچھ مل جانے کی توقع ہوتی تھی۔

اس دن بھی میں شلوار قمیص میں ملبوس ایک صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے ان کا پرس بھی دیکھ لیا تھا۔ بس موقع کی تلاش میں تھا۔ دو اسٹاپ گزرنے کے بعد بس کھچا کھچ بھر گئی۔ لوگ چھت پر بھی چڑھ گئے۔ بس کے اندر لوگ ایک دوسرے پر گر پڑ رہے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔

اب میں بس سے اترنے کی فکر میں تھا۔

میں دروازے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ان صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ آہستہ سے بولے۔ ”ابھی کچھ کچے ہو برخوردار۔“

”جی۔“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”میں نے کہا ہے کہ ابھی تم اس فن میں کچے ہو۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے بس سے اتر گئے اور بولے۔ ”کب سے کر رہے ہو یہ کام؟“

”مجھے معاف کر دیں۔“ میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں بہت مجبور ہوں۔“

"ارے یار میں سوال کیا کر رہا ہوں اور تم جواب کیا دے رہے ہو؟" ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔"

"مجھے یہ کام کرتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ ابھی گزشتہ دو ماہ سے کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"صرف دو مہینے سے کر رہے ہو؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔ "تمہیں یہ کام کس نے سکھایا ہے؟"

"حالات نے، فاقوں اور مفلسی نے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ہم دونوں ایک چھوٹے سے ایک ہوٹل میں پہنچ چکے تھے۔

"آؤ چائے پیتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے بولے اور ہوٹل میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ مسکرا کر بولے۔ "میں پرس میں کچھ نہیں رکھتا سوائے بیس پچیس روپے کے۔ اصل مال تو ادھر ہے۔" انہوں نے اپنی بغل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں ایک جیب ہے جو کسی کو نظر نہیں آسکتی۔"

"لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"اس لیے کہ میں خود بھی یہ ہی کام کرتا ہوں اور گزشتہ چالیس سال سے کر رہا ہوں۔ یہ سمجھ لو دس برس کی عمر میں یہ کام شروع کر دیا تھا لیکن باقاعدہ تربیت کے بعد۔"

"تربیت؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ بھی ایک فن ہے۔" وہ صاحب بولے۔ "اس لیے تو مجھے حیرت ہوئی تھی کہ تم نے صرف تین مہینے پہلے یہ کام شروع کیا ہے اس کے باوجود تمہارے ہاتھوں میں اتنی صفائی ہے ذرا اپنی انگلیاں دکھاؤ۔"

میں نے اپنا ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔

"واہ کیا فنکارانہ انگلیاں ہیں۔" وہ بولے۔ ان کے لہجے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر طنز کر رہے ہیں یا میری تعریف کر رہے ہیں؟

"میں تو بس موقع کی تلاش میں رہتا ہوں موقع ملتے ہی میں کام کر جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کرتے یا پینٹ کی پچھلی جیب سے پرس نکالنا کوئی فن نہیں ہے اصل فن تو وہ ہے کہ آپ کوٹ کی اندرونی جیب یا شلوار کی جیب سے مال نکال لیں۔ اس کے لیے بہت مہارت سے جیب کاٹنا پڑتی ہے۔"

"میں نے آج تک کسی کی جیب نہیں کاٹی۔" میں نے کہا۔

"تو چلو میرے ساتھ۔" انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں اس فن میں بھی طاق کر دوں گا تمہاری انگلیاں تو ویسے بھی بہت بہترین ہیں۔"

اس استاد جیب تراش کا نام افضل تھا۔ میں حالات سے اتنا دلبرداشتہ تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی استاد کے ساتھ چلا گیا۔ وہ لالو کھیت کے علاقے میں رہتا تھا۔ بیوی بچوں والا آدمی تھا اور محلے میں بہت مہذب اور شریف آدمی سمجھا جاتا ہے۔

اس نے اپنے گھر کے دو حصے بنا رکھے تھے۔ گھر کے داخلی حصے میں بڑا سا ایک کمرا تھا جہاں فرشی نشست تھی وہاں مجھے بارہ تیرہ سال کے دو لڑکے دکھائی دیے۔ چہروں سے انتہائی معصوم اور بھولے بھالے۔

"یہ آپ کے بیٹے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

استاد نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "کاش میرے بیٹے ہوتے۔ میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ یہ تو میرے شاگرد ہیں۔"

"شاگرد؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ دونوں شکل سے معصوم نظر آتے ہیں لیکن اتنے معصوم ہیں نہیں، ان کی انگلیوں میں جادو ہے۔ مجھے یہ دونوں لاوارث ملے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ غلط ہاتھ میں نہ پڑ جائیں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا۔"

مجھے اچانک ہنسی آ گئی۔ اس وقت وہ کون سے صحیح ہاتھوں میں تھے؟

میرے ہنسنے پر استاد نے ناگواری سے کہا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تم اس بات پر ہنس رہے ہو کہ یہ اب بھی غلط ہاتھ میں ہیں؟ اس سے بہتر ہے کہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو جاتے۔ منشیات فروش بنتے یا قتل کی وارداتیں کرتے۔ پھر پھانسی کا پھندا ان کا مقدر ہوتا۔ جیب کاٹتے ہوئے اگر یہ پکڑے بھی گئے تو انہیں پھانسی کی سزا تو نہیں ہوگی۔"

استاد کا فلسفہ عجیب تھا، وہ اپنے پیشے کو فن کا نام دے رہا تھا۔ اس نے ہنس کر مجھ سے کہا۔ "تم ذرا اپنی جیب کی تلاشی لو۔"

میں شلوار قمیص تو پہنتا نہیں تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ پہنتا تھا اور اپنے پیسے جینز کی سامنے والی جیب میں رکھتا تھا۔ وہاں سے تو وہ مجھ ہی سے بہت مشکل سے نکلتے تھے، میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا پیسے موجود تھے۔

استاد نے اپنے ایک شاگرد کو کہا۔ "ارے جمی! اس کی جیب میں تو پیسے موجود ہیں۔ یہ استاد کے لیے بھی خفگی تھی۔ دروازہ جمی ہی نے کھولا تھا اور وہ میرے ساتھ ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔

"استاد!" جمی نے کہا۔ "یہ آپ کے مہمان ہیں ان کی جیب میں اس وقت صرف پانچ سو ستائیس روپے ہیں۔ سو سو کے چار نوٹ اور پچاس کے نوٹ دو اور بیس کے نوٹ اور سات روپے کے سکے۔ میں نے وہ واپس ڈال دیے۔"

میں نے جیب سے پیسے نکالے۔ واقعی وہ اتنی ہی رقم تھی جتنی اس لڑکے جمی نے بتائی تھی۔ نوٹ بھی اتنے ہی تھے اور سکے بھی۔

میں نے بوکھلا کر استاد کی طرف دیکھا۔ استاد کے چہرے پر فخریہ تاثرات تھے وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ "کیسی رہی؟" پھر وہ جمی سے مخاطب ہوئے۔ "جاؤ ذرا بہترین سی چائے لے کر آؤ۔"

استاد نے اس دن کے بعد سے میری بھی تربیت شروع کر دی۔ بلیڈ کتنا بڑا ہو، اسے انگلیوں کے درمیان کیسے پکڑا جائے اور کٹ کیسے لگایا جائے۔

میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ مفلسی اور فاقوں نے مجھ جیسے شریف النفس اور پڑھے لکھے آدمی کو جیب کترا بنا دیا۔ استاد کا فلسفہ یہ تھا کہ اس طرح تم دنیا سے ناانصافی اور حق تلفی کا انتقام لے رہے ہو۔ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ ضمیر وغیرہ سب کتابوں میں ہوتا ہے۔ جب انسان فاقے کر رہا ہو تو ضمیر روٹی نہیں دیتا، بچوں کی دوا نہیں دلواتا۔

مجھے استاد کے پاس جاتے ہوئے تیسرا مہینا تھا۔ بہ قول استاد کے میں نے بہت کم وقت میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اس دن بھی میں دو کامیاب ہاتھ مارنے کے بعد استاد کے گھر پہنچا تھا کہ دروازے پر ایک رکشا آ کر رکا۔ جمی نے دروازہ کھولا تو تقریباً چالیس سال کا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ آٹھ نو سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ شخص اپنے چہرے اور حلیے سے بہت شریف اور سیدھا سادا لگ رہا تھا۔ بچے کے چہرے پر بھی معصومیت تھی۔

استاد نے ہنس کر کہا۔ "آؤ قمرو! بہت دن بعد آئے۔"

"بس استاد اس طرف آنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" اس نے جواب دیا۔ "آج اس طرف کی ایک سواری ملی تو چلا آیا۔"

"کام تو ٹھیک چل رہا ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"ہاں استاد اب تو عارف کی انگلیوں میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ لوگ اس کی معصوم شکل اور اداکاری پر دھوکا کھا جاتے ہیں اور یہ اپنا کام کر جاتا ہے۔"

استاد نے مجھے بتایا۔ "یہ قمرالدین ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح حالات کا مارا ہوا ہے، پہلے میں نے اسے ٹرینڈ کیا پھر اس کے بچے عارف کو۔ اب ساری وارداتیں عارف کرتا ہے۔ قمرو تو صرف رکشا چلاتا ہے۔"

میں نے حیرت سے قمرو کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔ "بس استاد کی مہربانی ہے، وقت اچھا گزر رہا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد استاد نے بتایا کہ آج کل جیب تراشی میں اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہے۔ "تمہیں خود ہی اندازہ ہوگا کہ ہفتے میں مشکل سے پانچ چھ ہزار کا دھندا کر پاتے ہو۔ اس میں سے بڑا حصہ دینے کے بعد تمہارے پاس بچتا ہی کیا ہے۔ پھر پکڑے جانے کا اندیشہ الگ ہے۔ لوگ آج کل پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے جیب کتروں، چوروں اور ڈکیتوں کی خود ہی مرمت کر کے پھینک دیتے ہیں۔ بعض اوقات لوگوں کے ہاتھ پیر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر اگر بات پولیس تک پہنچ جائے تو ان لوگوں کو مزید کھلانا پڑتا ہے۔"

"ہاں استاد یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا۔ "آج کل لوگ جیبوں میں زیادہ رقم نہیں رکھتے۔ بسوں میں سفر کرنے والوں تک کے پاس بینکوں کے اے ٹی ایم کارڈ ہوتے ہیں اب ان کارڈوں کو سوائے پھینکنے کے کیا کیا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے قمرو کو مشورہ دیا کہ تو ایک رکشا خرید لے۔ اپنے بیٹے کو اس فن میں طاق کرا اور اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ۔"

پھر استاد نے وہی طریقہ کار بتایا جو اس نے بعد میں مجھے بتایا تھا۔

انسان غرض اور لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے۔ میں نے راحیلہ کو ٹرینڈ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں کس کرب سے گزرا ہوں گا۔ اب راحیلہ پانچ برس کی ہو رہی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بیٹے اور تھے۔ گھر کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے اور گھر میں

پیسے کی آمد سے ہمارا معیارِ زندگی بھی کافی بدل گیا تھا۔

سلمٰی نے راحیلہ کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو سلمٰی کو راضی کرنے کا تھا۔ میں نے اسے بہت مشکل سے دلائل دے کر راضی کیا کہ اگر میں نے یہ کام چھوڑ دیا تو راحیلہ کے ساتھ ساتھ ہمارے آنے والے بچے بھی ان پڑھ رہ جائیں گے۔ پھر وہ دونوں بھی یہ ہی کریں گے جو میں کر رہا ہوں۔

''راحیلہ پڑھے گی کس وقت؟'' سلمٰی نے پوچھا۔

''میں اسے ہفتے میں ایک دن اپنے ساتھ لے کر جایا کروں گا۔'' میں نے سلمٰی کو راضی کرنے کو کہا۔ ''راحیلہ بہت ذہین بچی ہے۔ وہ بہت جلد سب کچھ سیکھ جائے گی۔''

سلمٰی بھی مفلسی اور فاقوں سے اتنی تنگ آ چکی تھی کہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر مجھے اجازت دے دی۔ میں نے سوچا تھا کہ دو چار سال یہ کام کرنے کے بعد سب کچھ چھوڑ دوں گا اور اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لوں گا۔

سلمٰی نے اتنے پیسے پس انداز کر رکھے تھے کہ ان سے ایک رکشا خریدا جا سکتا تھا۔ اس کی عقل بھی شدید تنگ دستی اور فاقوں نے سلب کر لی تھی ورنہ وہ کہہ سکتی تھی کہ آپ رکشے ہی سے باعزت روزی کما سکتے ہیں پھر راحیلہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔

پھر میں راحیلہ کو استاد کے پاس لے جانے لگا۔ استاد نے راحیلہ کی ٹریننگ شروع کر دی۔

استاد اکثر کہتا تھا کہ ''رشید میں نے اپنی زندگی میں اتنی ذہین بچی نہیں دیکھی۔ اس کی انگلیوں اور ہاتھوں میں تم سے بھی زیادہ پھرتی ہے۔''

''اب قمرو کی طرح تم بھی رکشا لے لو۔'' استاد نے کہا۔ ''پکڑے جانے کا رسک نہ ہونے کے برابر اور آمدنی دگنی سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔''

میں نے استاد کے مشورے سے دوسرے ہی دن رکشا خرید لیا۔

آئی آئی چندریگر روڈ پر خوش پوش سے ایک صاحب نے رکشا روکا اور مجھ سے ڈیفنس چلنے کو کہا۔ راحیلہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ چھوٹی سی کوئی بچی بیٹھی ہو تو ہر شخص کو تجسس ہوتا ہے۔ ان صاحب نے بھی پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''میری بیٹی ہے سر!'' میں نے کہا۔ پھر انہیں بھی وہی کہانی سنا دی جو میں نے اس موقع کے لیے تیار کی تھی۔

حسبِ پروگرام تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے راحیلہ کو عقبی نشست پر بھیج دیا۔ میں نے راحیلہ کو سمجھا دیا تھا وہ بیٹھتے ہی کام نہیں کرے بلکہ خاموشی سے دبک کر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر میں کئی جگہ رکشے کو جھٹکے دیتا تھا تو راحیلہ سمجھ جاتی تھی کہ اب عمل کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وہ فوراً ہی اپنا کام دکھا دیتی تھی۔

ڈیفنس پہنچے تو کرایہ دینے کے لیے ان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ان کا ہاتھ نیچے نکل گیا۔ انہوں نے گھبرا کر ہاتھ نکالا۔ پھر جیب کا جائزہ لیا اور بولے۔ ''شٹ! کسی نے میری جیب کاٹ لی۔''

''جیب کاٹ لی؟'' میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت برا ہوا سر۔''

''کتنا کرایہ ہوا تمہارا؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''میں ابھی گھر سے لا کر دے دیتا ہوں۔''

''چھوڑیں صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میری بچی بیمار ہے میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا۔ آئندہ بھی آپ سے ملاقات ہوئی تو کرایہ لے لوں گا۔''

''ارے نہیں۔'' وہ صاحب جلدی سے بولے۔ ''میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔ تم نے بتایا نہیں کرایہ کتنا ہوا؟'' ان صاحب نے تو رکشا میں بیٹھنے سے پہلے کرایہ بھی طے نہیں کیا تھا ورنہ آج کل تو سواری چاہے کلفٹن ڈیفنس کی ہو یا پھر نیو کراچی کی، کرایہ پہلے طے کرتی ہے۔

''آپ تین سو روپے دے دیں صاحب۔'' میں نے یوں کہا جیسے ان کی سات پشتوں پر احسان کر رہا ہوں۔

وہ صاحب گھر میں داخل ہو گئے۔ راحیلہ کسی بھی سواری پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد بہت ہوشیاری سے مال رکشا کی سیٹ میں پشت کی جانب سے اندر ڈال دیتی تھی۔ میں نے رکشا کی سیٹ کو مخصوص انداز میں بنوا رکھا تھا۔ یوں سمجھ لیں پیچھے کی طرف ایک خفیہ خانہ تھا۔ اس طرح کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔

فوراً ہی وہ صاحب واپس آ گئے۔ انہوں نے پانچ سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''لو یہ پیسے رکھ لو اور بیٹی کو فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے نوٹ لیتے ہوئے کہا اور انہیں سلام کر کے رکشا آگے بڑھا دیا۔ وہاں سے تقریباً چھ سات کلو میٹر دور آنے کے بعد میں نے ایک جگہ رکشا روکا اور راحیلہ سے کہا۔ ''چلو بیٹا نیچے اترو، میں ذرا مال نکال لوں۔''



مال نکالنے کے لیے مجھے سیٹ کی پشت کھولنا پڑتی تھی۔

سیٹ کے نیچے خفیہ خانے میں ان صاحب کا پرس اور قیمتی موبائل موجود تھا۔ خاصا قیمتی موبائل تھا۔ اس آئی فون کی قیمت تقریباً پینسٹھ ہزار روپے ہے لیکن جبار مجھے اس سیل فون کے بہت بحث مباحثے کے بعد شاید بیس ہزار دے دیتا۔

پھر میں نے پرس کھول کر نقد رقم کا جائزہ لیا اس میں ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی صورت میں سترہ ہزار روپے تھے۔ کچھ سو روپے کے نوٹ بھی تھے۔ بہت سے لوگوں کے پرس میں خفیہ جیب بھی ہوتی ہے۔ میں نے وہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو اس میں موجود کچھ رسیدیں اور کارڈز پھسل کر باہر گر پڑے۔

اس میں ان صاحب کا قومی شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس کے نیچے ایک اور کارڈ تھا جسے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ کارڈ ایس ایس پی کرائمز اکبر درانی کا تھا۔ کارڈ پر ان صاحب کی باوردی تصویر تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

راحیلہ بہت غور سے میری شکل دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ابو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں بیٹا، میں ٹھیک ہوں تو ذرا مجھے پانی کی بوتل اٹھا دے۔'' میں نے رومال سے اپنے چہرے کا پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہم بال بال بچ گئے تھے۔ اس پولیس آفیسر کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو میں اس وقت راحیلہ سمیت سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ شاید وہ راحیلہ کی معصومیت سے دھوکا کھا گیا تھا۔ بس اللہ نے مجھے بال بال بچا لیا تھا۔ اگر سلطان خان کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو وہ پورے رکشے کی تلاشی لیتا۔ نہ جانے وہ کس مجبوری کے تحت رکشا میں سفر کر رہا تھا۔

میں نے راحیلہ کو اتنا تو سکھا ہی دیا تھا کہ کسی کی جیب سے موبائل نکالتے ہی اسے فوری طور پر بند کر دیا کرو۔ وہ سب سے پہلے موبائل آف کرتی تھی۔

جبار عبداللہ ہارون روڈ پر ایک موبائل شاپ چلاتا تھا اور چوری کے موبائل بھی دھڑلے سے بیچتا تھا۔ اس نے پولیس سے ساز باز کر رکھی تھی ورنہ چوری کی اشیاء خصوصاً موبائل فون کا دھندا بغیر پولیس کی ساز باز کے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے بھی دو نمبر کام کرتا تھا۔ وہ استعمال شدہ موبائل اونے پونے ضرورت مندوں سے خرید لیتا تھا۔ پھر وہ انہیں نئے سرے سے ڈبے میں سیل بند کر کے دوبارہ بیچ دیتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے دکان کے عقبی حصے میں ایک مشین بھی لگا رکھی تھی۔

میں جبار کی دکان پر گیا لیکن پولیس کے اس افسر کا سیل فون بیچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بہت زیادہ قیمتی سیل فونز آسانی سے ٹریس ہو جاتے ہیں پھر وہ تو ایک پولیس افسر کا سیل فون تھا۔ اس کا خریدار پکڑا جاتا تو لازمی طور پر میں بھی پکڑا جاتا۔

میں نے اب سوچ لیا کہ آئندہ بہت محتاط ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

میری بیوی سلمٰی نے پہلے تو بہت شور شرابا کیا، کئی دن مجھ سے ناراض رہی لیکن پھر شاید اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس ناگوار صورتِ حال کو برداشت کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے سلمٰی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی بلکہ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت رہتی تھی۔ اسے سب سے زیادہ صدمہ راحیلہ کی وجہ سے تھا۔ میں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنی معصوم بچی کو ابھی سے جرائم کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

اس کے لیے بھی سلمٰی نے ایک شرط رکھی تھی کہ راحیلہ میرے ساتھ اسکول کے بعد ہی جائے گی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ سلمٰی راضی ہو گئی تھی۔

راحیلہ بہت ذہین بچی تھی۔ وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ خوب صورت اور معصوم بچی چوری اور جیب تراشی جیسا مذموم کام بھی کرتی ہے۔

میں حسبِ معمول واردات کرتا رہا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس سے میری معصوم بچی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اب میں کوشش کرتا تھا کہ مردوں کو کم سے کم نشانہ بناؤں، عورتوں پر ہاتھ صاف کرنا راحیلہ کے لیے بھی آسان تھا۔

اس دن میں سواری کی تلاش میں حیدری مارکیٹ پر کھڑا ہوا تھا دو خواتین بہت سارے سامان کے ساتھ آئیں اور مجھ سے فیڈرل بی ایریا چلنے کو کہا۔

''جی ہاں لے جاؤں گا، بیٹھیے۔'' میں نے انتہائی مہذب انداز میں کہا۔

''پیسے کتنے لوگے بھائی؟'' ان میں سے ایک عورت بولی۔

’’آپ جو مناسب سمجھیں دے دیجیے گا۔‘‘ میں نے اپنا مخصوص جملہ استعمال کیا۔

’’ویسے آپ جتنے پیسے دے کر آئی تھیں اتنے ہی پیسے دے دیجیے گا۔‘‘

’’ہم تو دو سو روپے میں آئے تھے۔‘‘ دوسری عورت بولی۔ وہ پہلی کے مقابلے میں جوان تھی۔

’’بیٹھیے۔‘‘ میں نے گویا رضامندی کا اظہار کر دیا۔

وہ دونوں رکشا میں بیٹھ گئیں تو ان کی نظر راحیلہ پر پڑی۔ وہ حسب معمول میرے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

’’یہ بچی کون ہے؟‘‘ ایک عورت نے پوچھا۔

میں نے اس کے جواب میں وہی دکھ بھری کہانی سنا دی جو مجھے اب ازبر ہو چکی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد میری ہدایت کے مطابق راحیلہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ میں نے رکشا روک کر اسے پانی پلایا اور اس سے کہا۔ ’’بیٹا! بس تھوڑی دیر کی بات ہے پھر تم آرام سے بیٹھ جانا۔‘‘

’’کیا ہوا بھائی؟‘‘ جوان عورت نے پوچھا۔ ’’بچی کیا کہہ رہی ہے؟‘‘

’’باجی، میری بچی کو بخار ہے انجن کی وجہ سے میری سیٹ بھی گرم ہو رہی ہے اسے اس سے بے چینی ہے۔‘‘ پھر میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنی بچی کو آپ کے ساتھ پیچھے بٹھا دوں؟‘‘

’’ہاں ہاں اعتراض کیسا۔‘‘ عمر رسیدہ خاتون نے کہا۔ ’’بچی کے لیے تو جگہ نکل آئے گی۔‘‘ پھر وہ راحیلہ سے بولیں۔ ’’آ جاؤ بیٹا پیچھے آ جاؤ۔‘‘

میں ان کی گفتگو پہلے ہی سن چکا تھا کہ انہوں نے حیدری کی جیولری مارکیٹ سے زیورات کے دو سیٹ اور سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھی وغیرہ خریدی ہے۔ عمر رسیدہ عورت جوان عورت سے کہہ رہی تھی کہ اگر تم میرے کہنے پر لیاقت آباد سے زیور خریدتیں تو اس سے کہیں کم پیسوں میں ملتا۔‘‘

’’وہاں اتنے اچھے ڈیزائن اور ورائٹی کہاں ملتی بھابی!‘‘ دوسری عورت نے کہا۔ ’’پھر ہمیں یہاں سے دوسری چیزیں بھی تو خریدنا تھیں۔ کیا اس کے لیے ہم پھر... یہاں آتے۔ دو چار سو روپے کے فرق سے کوئی پرابلم نہیں ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا ان دو سیٹوں میں لالوکھیت والے دکان دار کتنے پیسوں کی کمی کرتے؟‘‘

ان کی بات سن کر میں خوش ہو گیا تھا کہ کافی دنوں بعد ایسا شکار ملا تھا ورنہ دو چار ہزار سے زیادہ کی آسامی ہاتھ نہیں لگتی تھی۔ رکشا میں اتنے آسودہ حال لوگ تو سفر نہیں کرتے جو اپنے ساتھ ہزاروں روپے لے کر گھومیں۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، راحیلہ بالکل چوکس تھی۔ میں نے جان بوجھ کر ایک اسپیڈ بریکر پر رکشا کو خاصا زوردار جھٹکا دیا۔ اس سے آگے ایک اسپیڈ بریکر اور تھا پھر کچھ فاصلے پر سڑک ایک طرف سے کچھ ادھڑی ہوئی تھی میں نے دوسرے اسپیڈ بریکر پر بھی رکشا کو جھٹکا دیا پھر جان بوجھ کر رکشا کو سڑک کے ٹوٹے ہوئے حصے پر سے گزار دیا۔

پے در پے جھٹکے لگنے سے عمر رسیدہ عورت بولی۔ ’’بھائی ذرا دیکھ کر چلاؤ، میری کمر میں پہلے ہی تکلیف ہے۔‘‘

’’باجی سڑک ہی جگہ جگہ سے خراب ہے میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ کم سے کم جھٹکے لگیں۔‘‘

’’ابو پانی!‘‘ راحیلہ نے کہا۔ یہ ہمارا کوڈ ورڈ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ راحیلہ نے اپنا کام کر لیا ہے۔

میں نے پانی کی بوتل اٹھا کر پیچھے کی طرف بڑھا دی اور اطمینان سے رکشا چلانے لگا۔ اب میری رفتار خاصی تیز تھی۔ مبادا ان عورتوں کو اس چوری کا علم ہو جائے۔

میں نے انہیں فیڈرل بی ایریا میں ایوب منزل کے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے انہیں چھوڑ دیا۔ میری ہدایت کے مطابق راحیلہ نے ان کے پرس سے نقدی نہیں نکالی تھی۔ صرف موبائل فون ہی نکالے تھے۔ انہوں نے کرایہ ادا کیا اور اپنا سامان سمیٹ کر گھر میں داخل ہو گئیں۔ میں نے بھی اپنی راہ لی۔

اس دن میرے ہاتھ اچھا خاصا مال لگا تھا۔ زیور کے دو سیٹ تھے، چوڑیاں تھیں، انگوٹھیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی مالیت تین لاکھ روپے سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ زیورات کے ایک ڈبے میں دکان کی رسید بھی موجود تھی جس پر دکان کا نام اور زیور کی قیمت لکھی ہوئی تھی۔ رسید اگر موجود ہو تو دکان دار قیمت میں کمی نہیں کرتا ہے وہ بلا خوف و خطر زیور خرید لیتا ہے۔ دونوں موبائل فون سستے قسم کے تھے۔ مارکیٹ میں ان کی قیمت آٹھ دس ہزار روپے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے جبار کو وہ دونوں سیل فون چار ہزار روپے میں فروخت کر دیے۔ ان پیسوں سے میں نے چکن کڑاھائی، بریانی اور شیرمال وغیرہ خریدے۔ میں اپنی خوشی میں سلمٰی کو بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔ میں نے راحیلہ کے لیے اس کی پسندیدہ چاکلیٹ بھی خرید لی تھی۔

جب میں نے کھانا سلمٰی کے حوالے کیا تو وہ سرد لہجے میں بولی۔ ’’میں تو کھانا کھا چکی ہوں، آپ کو نکال دیتی ہوں۔‘‘

میرا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ سلمٰی ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ وہ کبھی خوشی خوشی نہ میرا لایا ہوا اچھا کھانا کھاتی تھی نہ کپڑے استعمال کرتی تھی۔ میں نے تلخ لہجے کہا کہا۔ ’’آج تم نے سرِ شام کھانا لیا؟‘‘

’’ہاں، مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔‘‘

’’بہانے بازی مت کرو سلمٰی۔‘‘ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ’’تم کبھی ہنسی خوشی میری لائی کوئی چیز استعمال نہیں کرتی ہو۔‘‘

’’اس میں ہنسی خوشی کی کون سی بات ہے؟‘‘ سلمٰی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’کیا آپ یہ سب اپنی محنت کی کمائی سے لاتے ہیں؟‘‘

’’اچھا، بند کرو اپنا لیکچر۔‘‘ میں نے بھنّا کر کہا۔ ’’تمہیں تو رہ رہ کر دورے پڑتے ہیں۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ سلمٰی نے کہا۔ ’’یہی سمجھ لیں آخر یہ سب کب تک چلے گا؟ آپ کو راحیلہ کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ ابھی سے اس قسم کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہو جائے گی تو اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ دولت کی ہوس نے آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ دی ہے۔ آپ یہ بھی بھول گئے کہ راحیلہ آپ کی سگی اولاد ہے۔ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا یا میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو میں اس گھر میں ایک لمحہ بھی نہ رکتی۔ راحیلہ کو لے کر ہمیشہ کے لیے چلی جاتی۔ آپ کو تو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ آپ ایک مرتبہ پھر باپ بننے والے ہیں۔‘‘

’’واقعی؟‘‘ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ’’تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟‘‘

’’میں کیا کرتی بتا کر؟‘‘ سلمٰی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’معاشرے میں ایک اور جرائم پیشہ فرد کا اضافہ ہونے والا ہے۔‘‘

’’تمہیں آج ہوا کیا ہے؟‘‘ میں نے بھنّا کر کہا۔

’’مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ حرام کے اس ترلقمے سے کہیں اچھی سوکھی روٹی ہے جسے کھا کر ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ آپ خود تو اس گناہ کے مرتکب ہو ہی رہے ہیں اپنی اولاد کے پیٹ میں بھی جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔‘‘ سلمٰی یہ کہتی ہوئی پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

میں دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا لیکن یہ سب کچھ میں اپنی مرضی سے تو نہیں کر رہا تھا۔ میں تو خود مفلسی اور فاقوں سے مجبور ہو کر اس راہ پر چل نکلا تھا۔

دوسری صبح میں ناشتے کے لیے بیٹھا تو میرا لایا ہوا کھانا جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ سلمٰی نے وہی میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے گھور کے اسے دیکھا اور کوئی سخت بات کہنا چاہی لیکن اس وقت راحیلہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر آ گئی۔ میں ہی اسے اسکول چھوڑنے جاتا تھا اور جب بھی موقع ملتا تھا واپس بھی لے آتا تھا ورنہ سلمٰی کو ٹیلی فون کر دیا تھا کہ تم اسکول جا کر راحیلہ کو لے آؤ۔

میرا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ میں نے کھانے پینے کا سامان ایک طرف سرکا دیا اور چائے کی ایک پیالی پی کر جانے کو تیار ہو گیا۔

اسکول گھر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں نے راحیلہ کو علاقے کے بہترین اسکول میں داخل کرایا تھا۔

اسے اسکول چھوڑ کر بس اسٹاپ پر آ گیا۔ صبح کے وقت وہاں سے دفتروں کی طرف جانے والی سواریاں مل جاتی تھیں۔

میرے نزدیک ہی لڈن اپنے رکشے میں کھڑا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ’’کیا بات ہے یار! آج کل تمہیں کچھ زیادہ سواریاں مل رہی ہیں یا اس کے علاوہ کوئی اور کام بھی کر رہے ہو؟‘‘

''ہاں اگر محنت سے ایک ہی کام کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں بھی برکت دے دیتا ہے۔''

میں نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی لیکن پھر دل ہی دل میں خود شرمندہ ہوگیا۔ کیا میں سخت کام کررہا تھا؟ مجھے ایسی بات کہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

اس وقت ایک صاحب میری طرف بڑھے اور بولے۔ ''آئی آئی چندریگر روڈ چلو گے؟''

''بالکل چلوں گا صاحب!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''چندریگر روڈ تو بہت بڑا ہے آپ کہاں جائیں گے؟''

''مجھے شاہین کمپلیکس کی طرف جانا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

میں نے چار سو روپے کرایہ بتایا وہ بغیر کسی بحث کے رکشا میں بیٹھ گئے اور بولے۔ ''ذرا جلدی چلو یار، میں آفس سے پھر لیٹ ہوگیا۔''

میں نے ٹریفک کی زیادتی کے باوجود بیس منٹ کے اندر اندر شاہین کمپلیکس پہنچا دیا۔

اس سے پیسے لے کر میں فارغ ہی ہوا تھا کہ پریشان حال سا ایک نوجوان میری طرف بڑھا اور بولا۔ ''دستگیر چلو گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بہت عجلت میں سوار ہوگیا اور بولا۔ ''ذرا جلدی چلو۔''

''میں وہاں کے چار سو روپے لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''لے لینا بھائی لیکن مجھے ذرا جلدی وہاں پہنچا دو۔ گھر میں ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میں آفس کا سارا کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ پلیز ذرا مجھے جلدی پہنچا دو۔''

''میں کوشش کروں گا صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت سڑکوں پر ٹریفک کا بے پناہ رش ہوتا ہے۔'' میں نے رکشا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''اس سے پہلے تو امی کو کبھی دل کی شکایت نہیں ہوئی۔ کل اچھی بھلی وہ شاپنگ کے لیے گئی تھیں۔ بس اس کے تیسرے دن ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔''

''ہارٹ اٹیک بہت موذی مرض ہے صاحب! یہ اچانک ہی کسی کو بھی جکڑ لیتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں اللہ نے چاہا تو آپ کی والدہ جلد صحت یاب ہوجائیں گی۔'' میں نے اس کی دلجوئی کی۔

''اگلے ہفتے میری بہن کی شادی ہے اور امی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آگیا۔'' وہ مجھے ہمدرد پا کر اپنا دل ہلکا کررہا تھا۔ میں نے بھی اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ خاموش ہوتا تو پھر جلدی پہنچنے کی رٹ لگاتا۔

''اصل میں انہیں شدید صدمہ پہنچا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ حیدری سے شادی کی شاپنگ کرکے آرہی تھیں۔ ان ہی شاپروں میں جیولری کے ڈبے بھی تھے وہ گھر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ زیورات کے ڈبے تو رکشا میں ہی بھول گئی ہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ نوجوان یقیناً ان ہی خواتین کی بات کررہا تھا جنہیں کل میں نے حیدری سے دستگیر پہنچایا تھا۔ ندامت سے میرے چہرے پر پسینا آگیا تھا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کو کہا۔ ہوسکتا ہے یہ نوجوان کسی اور خاتون کی بات کررہا ہو؟

''یہ خواتین بھی شاپنگ میں ایسی محو ہوجاتی ہیں کہ انہیں پھر کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ گھر پہنچ کر انکشاف ہوا کہ ان دونوں کے موبائل فون بھی غائب ہیں یا تو انہوں نے شاپنگ کرتے ہوئے موبائل فون خود ہی گرا دیئے یا پھر مارکیٹ میں کسی نے ان کے پرس سے موبائل نکال لیے۔''

اس وقت تک ہم فیڈرل بی ایریا پہنچ چکے تھے۔ وہاں پہنچ کر نوجوان نے اسی گلی کا پتا بتایا تھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم گلی میں داخل ہوئے تو اس گھر کے آگے ایک ایمبولینس کھڑی تھی اور ایمبولینس والے اسٹریچر پر کسی کو لا رہے تھے۔

نوجوان رکشا سے کود کر دیوانہ وار ایمبولینس کی طرف امی امی چیختا ہوا بھاگا۔ اس افراتفری اور وحشت میں وہ مجھے کرایہ دینا بھی بھول گیا۔ مجھے کرائے کی اتنی فکر نہیں تھی میرا ضمیر تو مجھے کچوکے لگا رہا تھا کہ میری وجہ سے ایک ہنستی کھیلتی عورت موت کے منہ میں چلی گئی۔ مجھے رہ رہ کر سلمٰی کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں اگر چوری چکاری چھوڑ کر محنت سے دن رات رکشا چلاتا تو اتنا تو کما ہی لیتا کہ اپنی، سلمٰی اور راحیلہ کی تمام ضروریات پوری کرسکوں۔ دو وقت پیٹ بھر کے روٹی کھا سکوں۔ حرام کی کمائی سے تو بہتر تھا کہ میں محنت کی سوکھی روٹی کھاتا۔ اس واقعے کے بعد تو میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔

میں واپس جانے کے ارادے سے مڑنے ہی والا تھا کہ وہی نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''سوری بھائی! میں گھبراہٹ اور پریشانی میں تمہیں کرائے کے پیسے دینا بھی بھول گیا۔'' اس نے مجھے پیسے دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ایمبولینس بروقت پہنچ گئی اس میں آکسیجن سمیت ہر قسم کی طبی امداد کا جدید سامان تھا۔ اب انہیں لیاقت نیشنل اسپتال لے جارہا ہوں۔''

''اللہ نے چاہا تو آپ کی والدہ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا اور رکشا موڑ کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا میں ان خاتون کے زیورات واپس کرنے کے ارادے سے گھر جارہا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ یہ بھی کیا تھا کہ آئندہ میں حلال روزی کماؤں گا۔''

مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں انہیں بار بار رومال سے صاف کررہا تھا کیونکہ مجھے رکشا چلانے میں دشواری ہورہی تھی۔

میں نے گھر کے باہر رکشا روکا اور تقریباً بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

اس حال میں دیکھ کر سلمٰی بوکھلا گئی۔ وہ سمجھی کہ میں کوئی واردات کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں اور پولیس سے بچ کر بھاگا ہوں۔

''خیریت تو ہے؟'' سلمٰی نے پوچھا۔ ''آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟''

''ہاں خیریت ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اندر کمرے کی طرف بھاگا۔ میں مسروقہ مال دو چھتی میں چھپا کر رکھتا تھا۔ زیور کے دونوں ڈبے بھی وہیں رکھے ہوئے تھے۔ دونوں ڈبے شاپر میں تھے۔ میں نے زیورات دیکھ کر ڈبے میں بند کر دیے تھے۔

میں نے وہ شاپر اٹھایا اور دیوانہ وار باہر کی طرف لپکا۔

''سنیے تو۔'' سلمٰی نے کہا۔ ''کچھ مجھے تو بتایئے کہ آخر بات کیا ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''میں ابھی تھوڑی دیر میں آکر سب کچھ بتا دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں مجھے دیر ہوجائے تو تم راحیلہ کو اسکول سے لے آنا۔'' یہ کہہ کر میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''سلمٰی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ وہ بہت بری طرح گھبرا گئی تھی اور یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ میں چوری کا مال واپس کرنے جارہا ہوں۔ شاید پولیس والوں نے مجھے اس پر مجبور کیا ہوگا۔

میں عجلت میں اس لیے تھا کہ اس نوجوان کی واپسی سے پہلے وہ زیورات اس کے گھر پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ نوجوان تو مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ پھر سوچتا کہ زیورات اس رکشے والے کے پاس تھے تو اس نے اس وقت کیوں نہ بتایا۔ ویسے بھی میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں آناً فاناً دستگیر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت گھر میں یا تو بچے ہوں گے یا پھر وہ لڑکی ہوگی جس کی شادی ہونے والی ہے۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے اپنے بے قابو دل کو سنبھالا اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

''میں رکشا والا ہوں جی۔'' میں نے کہا۔ ''کل میں نے یہاں دو خواتین کو چھوڑا تھا۔ وہ زیورات کے ڈبے میرے رکشے میں ہی بھول گئی تھیں آپ اپنی امانت لے لیں۔''

فوراً ہی دروازہ جھپاک سے کھلا اور خوب صورت سی ایک لڑکی اچانک میرے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں شاید وہ رو رہی تھی۔

پھر اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی۔ ''صائمہ کون ہے؟''

''نانی اماں......!'' لڑکی کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ ''یہ رکشے والے ہیں۔ امی اور چچی جان زیورات کے ڈبے رکشے میں بھول گئی تھیں وہی واپس کرنے آئے ہیں۔''

''بیٹا اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ ایمان سلامت رکھے تم نے تو بیٹا ہماری لاج رکھ لی ورنہ صائمہ کی شادی تو ہونی ہی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے تو پہلے ہی سونے کے دو سیٹوں کا مطالبہ کردیا تھا۔'' بڑی بی نے کہا۔ ''اللہ تمہیں بہت

خوشیاں دے۔ تمہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔''

بڑی بی مجھے جتنی دعائیں دے رہی تھیں میں اتنا ہی ندامت کی دلدل میں دھنستا جارہا تھا۔

میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ ''خالہ! آپ اپنی امانت سنبھالیں اور اچھی طرح دیکھ لیں کوئی چیز کم تو نہیں ہے؟''

''ارے بیٹا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ کوئی چیز کم کیسے ہوسکتی ہے تمہیں رکھنا ہوتا تو پورے زیورات رکھ لیتے۔''

''مجھے اب اجازت دیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں بیٹا اندر آؤ، کم ازکم چائے تو پی لو۔''

''نہیں خالہ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے ابھی بچی کو اسکول سے بھی لینا ہے۔ مجھے دیر ہوئی تو وہ پریشان ہوجائے گی۔''

''جیتے رہو بیٹا۔'' بڑی بی نے کہا۔ پھر بولیں۔

''صائمہ! بھائی کو شادی کا کارڈ تو دے دے۔''

صائمہ نے جھٹ ایک کارڈ لا کر مجھے دے دیا تو بڑی بی زور دے کر بولیں۔ ''بیٹا! شادی میں ضرور آنا اور ہاں اپنی بچی کو بھی لے آنا۔'' پھر وہ بولیں۔ ''صائمہ! سہیل کو ٹیلی فون کرکے بتا دے کہ زیورات مل گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی صدیقہ کی زندگی میں نئی لہر دوڑ جائے گی۔'' صدیقہ غالباً ان ہی خاتون کا نام تھا جو صائمہ کی والدہ تھیں۔

میں وہاں سے باہر نکلا۔ میرے ضمیر سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔

میں وہاں سے باہر نکلا تو مجھے شاہ فیصل کالونی کی ایک سواری مل گئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کرایہ بھی اتنا ہی لوں گا جتنا جائز ہوگا۔

پھر ایک بعد دوسری اور تیسری سواری ملتی گئی۔ یوں میں شام کو گھر پہنچا۔

سلمٰی شدید پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تھی۔ مجھے باخیریت اور پُرسکون دیکھ کر اس نے بھی سکون کا سانس لیا اور بولی۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں تھے اور اتنی جلدی میں کہاں گئے تھے؟''

میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تمام قصہ سنا دیا اور مسکرا کر بولا۔ ''سلمٰی! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد حلال روزی کماؤں گا۔ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کرے۔''

سلمٰی یہ سن کر اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ساتھ میں بھی رونے لگا۔

ہم دونوں کو روتا دیکھ کر راحیلہ گھبرا گئی اور بولی۔ ''ابو! آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ''راحیلہ بیٹا! آج کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اب تم صرف اور صرف پڑھائی کرو اور بھول جاؤ کہ میں نے تم سے اتنے گھٹیا کام بھی کرائے ہیں۔''

اس دن میں باہر سے ایک مرتبہ پھر چکن کڑھائی، بریانی اور شیرمال لے آیا۔ سلمٰی نے میرے ساتھ خوشی خوشی کھانا کھایا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی زندگی ابھی شروع کی ہو اور اس کے چہرے پر اس وقت وہی سکون تھا جو شادی کے وقت تھا۔

دوسرے دن میں رکشا لے کر نکلا تو بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔ میں نے اس دن سے نماز بھی باقاعدگی سے پڑھنا شروع کردی تھی۔ حلال کی کمائی واقعی بابرکت ہوتی ہے۔ میرے گھر میں اب صرف خوشیاں رقص کررہی تھیں ورنہ اس سے پہلے تو پیسا ہونے کے باوجود گھر میں ہر وقت نحوست ہی رہتی تھی۔

مجھے ایمان داری سے کام کرتے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ میرے مہینے بھر کی آمدنی بھی خاصی معقول ہوگئی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ نے بھی میرے تمام گناہ معاف کردیے تھے۔ میری کمائی میں بھی برکت ہوگئی تھی کہ میں بالکل بھی فارغ۔۔۔۔ کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک مجھے سواریاں ملتی رہتی تھیں۔

صائمہ کا دیا شادی کارڈ میرے پاس محفوظ تھا۔ اس میں ان کے گھر کا ٹیلی فون نمبر اور سہیل کا سیل نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔

میں نے ایک ہفتے بعد ٹیلی فون کرکے ان خاتون کی خیریت معلوم کی تھی۔ یہ جان کر میرے سر سے منوں بوجھ ہٹ گیا کہ وہ صحت یاب ہوکر اسپتال سے واپس آگئی تھیں اور صائمہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اس رات راحیلہ کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اسے شدید بخار ہوگیا۔ میں نے راحیلہ کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں نے احتیاطاً راحیلہ کو اپنے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا تھا کہ کہیں وہ پیچھے بیٹھ کر لڑھک نہ جائے۔

میں ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے پولیس کے ایک افسر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں نظرانداز کردیتا لیکن وہ



پولیس افسر تھا اس لیے رکنا پڑا۔

''مجھے علاقے کے تھانے لے چلو۔''

''صاحب! آپ کوئی اور رکشا دیکھ لیں میری بیٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس جارہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی ڈاکٹر ہی کے پاس جانا ہے۔ وہیں تمہاری بیٹی کو بھی دکھا دیں گے۔''

میں نے دل ہی دل میں پولیس کو گالی دی۔ یہ لوگ سڑک پر چلنے والی ہر سواری کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ انسانیت تو ان کے پاس چھو کر بھی نہیں گزری۔

کچھ دور چلنے کے بعد راحیلہ بری طرح پہلو بدلنے لگی۔ بخار کی وجہ سے ویسے بھی غنودگی میں تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے اور سیٹ بھی بہت گرم ہورہی ہے۔''

''صاحب!'' میں نے پولیس افسر کو مخاطب کیا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں رکشا روک کر اپنی بیٹی کو پانی پلا دوں۔''

''پلا دو۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے رکشا روکا اور پانی کی بوتل سے راحیلہ کو پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ پھر پہلو بدلنے لگی اور بولی۔ ''ابو! سیٹ بہت گرم ہورہی ہے۔۔۔۔۔ ابو۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔''

میں نے مضبوطی سے اسے تھام لیا ورنہ وہ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے ایک طرف گر جاتی۔

''صاحب!'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو بچی کو اپنے ساتھ بٹھالیں۔ یہاں سیٹ کی گرمی سے اس کا بخار بڑھتا ہی جارہا ہے۔''

''بند کردو یہ ڈراما!'' وہ دہاڑ کر بولا۔ ''ایک ڈراما بار بار نہیں چل سکتا۔''

''میں سمجھا نہیں صاحب۔'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم اس معصوم بچی کے ذریعے کب سے یہ وارداتیں کررہے ہو؟''

''کیسی وارداتیں صاحب؟'' میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس پولیس افسر کو ان وارداتوں کے بارے میں علم ہوگیا ہے جو میں گزشتہ دنوں کرتا رہا ہوں۔

''پولیس اسٹیشن یہاں سے نزدیک ہی ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''بچی کو پچھلی سیٹ پر بھیج دو اور پولیس اسٹیشن چلو۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے راحیلہ کو عقبی نشست پر بھیج دیا اور رکشا آگے بڑھا دیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''واہ رے اللہ میاں! جب میں جیب تراشی کرتا تھا تو ایک بار بھی نہیں پکڑا گیا اب جب میں ہر جرم سے تائب ہو چکا ہوں تو مجھے پکڑ لیا گیا ہے۔ یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں تھی میں نے اب تک جو گناہ کیے تھے ان کی سزا تو مجھے ملنا ہی تھی۔

''بیٹا! کیا نام ہے تمہارا؟'' پیچھے سے پولیس افسر کی آواز آئی۔

''را۔۔۔۔۔ حیلہ۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ ی۔۔۔۔۔ میرا نام۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔''

''بیٹا آرام سے بیٹھو۔ کیا ہوا تمہیں؟'' اس کی آواز آئی۔ پھر وہ بولا۔ ''ارے اسے تو واقعی بہت شدید بخار ہے۔'' پھر اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''رکشا موڑو اور بچی کو اسپتال لے چلو تم سے میں بعد میں نمٹوں گا۔''

میرے تو ہاتھ پیر قابو میں نہیں تھے۔ میں نے رکشا موڑا اور اس پولیس افسر کے کہنے پر اسے علاقے کے ایک پرائیویٹ اور مہنگے اسپتال میں لے گیا۔ میں تو راحیلہ کو بھی چھوٹے موٹے ڈاکٹر یا سرکاری اسپتال میں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا میری کم ازکم چار دن کی کمائی تو یہیں خرچ ہوجائے گی۔ اس وقت تو میری جیب میں صرف سات سو روپے تھے۔

پولیس افسر کی وجہ سے ڈاکٹرز نے ہم پر فوری توجہ دی اور راحیلہ کو ایمرجنسی میں لے گئے۔

''رشید صاحب! اسپتال کے ایک ملازم نے میرے نزدیک آکر کہا۔ ''آپ کاؤنٹر پر اسپتال کی فیس وغیرہ جمع کرا دیں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے پولیس افسر سے کہا۔ ''سر میری جیب میں تو اس وقت صرف سات سو روپے ہیں۔''

''تمہاری بچی بہت معصوم اور خوب صورت ہے بالکل گڑیا جیسی۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''اس کے علاج کے پیسے میں دوں گا۔'' پھر وہ کاؤنٹر کی طرف گیا اور ان لوگوں سے کچھ بات کرکے واپس آگیا۔

"تم یہ وارداتیں کب سے کر رہے ہو؟" پولیس افسر نے پوچھا۔ "جھوٹ مت بولنا۔ تمہاری اس کارروائی کا نشانہ ایک دفعہ میں بھی بن چکا ہوں۔"

اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ یہ پولیس افسر کرائم برانچ کا وہی ایس پی ہے۔ راحیلہ ایک دفعہ اس کی جیب بھی صاف کر چکی ہے۔

"آپ شاید یقین نہ کریں ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں یہ وارداتیں کرتا تھا لیکن ایک واقعے کے بعد میں جیب تراشی اور چوری سے تائب ہو چکا ہوں اور اب شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں۔"

"بکومت!" وہ درشت لہجے میں بولا۔ "تم نے یہ بھی جھوٹ بولا تھا کہ تمہارا کوئی گھر ہے نہ بیوی بچے۔ ابھی ٹیلی فون کر کے اپنی بیوی کو یہاں بلاؤ۔ میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں یہ تو میرے لیے بھی شرم کی بات ہے کہ کرائم برانچ کے ایک تجربہ کار ایس پی کو معصوم سی ایک بچی نے لوٹ لیا۔"

اس وقت ایک نرس نے آکر بتایا کہ ایس پی صاحب! بچی کا بخار اب اتر گیا ہے لیکن اسے آرام کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کو بلا رہی ہے۔

"چلو بچی کے پاس۔" ایس پی نے کہا۔

میں راحیلہ کے پاس پہنچا تو وہ بیڈ پر لیٹی تھی لیکن اس وقت بالکل ٹھیک تھی۔

ایس پی ٹکٹکی باندھے راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو تین قطرے نکلے جنہیں اس نے جلدی سے صاف کر لیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا بڑا افسر رو کیوں رہا ہے؟

"رشید!" اس نے کہا۔ "تم نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے اگر میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں تو بچی بھی اس کی زد میں آئے گی میں نہیں چاہتا کہ بچی پر کوئی آنچ آئے۔ میں اپنی بیٹی کھو چکا ہوں اولاد کا درد جانتا ہوں۔ میری بیٹی بالکل راحیلہ کی طرح خوب صورت اور معصوم تھی۔ وہ نہ جانے کیسے پانی کے انڈر گراؤنڈ ٹینک میں گر گئی۔ مجھے اس وقت علم ہوا جب اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔" وہ ایک مرتبہ پھر آبدیدہ ہو گیا۔ "وہ بالکل راحیلہ کی طرح تھی۔ وہی آنکھیں، وہی بال، چہرے پر وہی معصومیت۔"

"سر! آپ یقین کریں یا نہ کریں میں اب تائب ہو چکا ہوں۔"

"تمہارے پاس ان لوگوں کا ٹیلی فون نمبر تو ہوگا، تم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے تمہیں شادی کارڈ بھی دیا تھا؟"

"جی صاحب! وہ کارڈ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔" میں نے کہا، "یہ میرے رکشا کی سیٹ کے نیچے ہے۔"

"وہ نمبر مجھے دو۔" ایس پی نے کچھ سوچ کر کہا۔

میں فوراً باہر گیا اور شادی کارڈ لے آیا۔

ایس پی نے بغور کارڈ کا جائزہ لیا پھر کارڈ میں موجود ایک نمبر پر ٹیلی فون کر دیا اس نے مجھے سنانے کے لیے فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"سہیل صاحب بول رہے ہیں؟" ایس پی نے پوچھا۔ "بہن کی شادی بہت مبارک ہو۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" دوسری طرف سے سہیل کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

"میں ایس پی سلطان بول رہا ہوں کرائم برانچ سے۔ آپ ہی کے کسی رشتے دار نے رپورٹ درج کرائی تھی کہ آپ کے زیورات چوری ہو گئے تھے؟"

"نہیں سر وہ چوری نہیں ہوئے تھے۔" سہیل جلدی سے بولا۔ "وہ تو رکشا میں رہ گئے تھے۔ رکشا والا بہت شریف اور ایمان دار تھا۔ وہ دوسرے ہی دن شام کو زیورات واپس کر گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایس پی نے سلسلہ منقطع کیا اور مجھ سے بولا۔ "رشید! میں اس معاملے کی مزید تحقیقات کروں گا۔ ممکن ہے یہ سہیل بھی تمہارا ساتھی ہو اور یہ شادی کارڈ بھی جعلی ہو۔ میں تمہیں صرف راحیلہ کی وجہ سے فی الحال اپنی ضمانت پر چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوگی تو میں تمہیں کراچی کیا دنیا کے کسی بھی کونے سے پکڑ لوں گا۔ پھر میں راحیلہ کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ بس اب جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا اور بولا۔ "ہاں اسپتال کا بل میں نے خود ادا کر دیا ہے۔ بس اب مجھے تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہیں ملنا چاہیے بلکہ ایسا کوئی غیر قانونی کام ہوتا دیکھو تو مجھے اطلاع دینا۔" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور مجھے دے دیا۔ "ہاں! تم کبھی کبھی راحیلہ کو لے کر میرے گھر آجایا کرنا۔"

پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتا واپس چلا گیا۔ میں حیرت سے دیکھتا رہ گیا کہ پولیس میں بھی ایسا دردمند دل رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں؟



# بددعا

محترم مدیر

السلام علیکم

میں سرگزشت ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس بار ایک جاننے والی کی حالاتِ زندگی کو کہانی کے انداز میں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ یہ سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو ظاہری چمک دمک دیکھ کر اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ کاش ہماری بہنیں بیٹیاں زندگی کا ہمسفر منتخب کرتے وقت عقل سے کام لیں۔

جمیل حیات

(اکھوری، اٹک)



اس روز شام کو زور سے آندھی چلی۔ ساون کا مہینا تھا، بادل چھائے ہوئے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس موسم سے نوید کو ہمیشہ خوف آتا تھا، اس کا دل بے چین ہو جاتا، رات کو جب بادل گرجتے، بجلی چمکتی اور بارش شروع ہوتی تو نوید ڈر کے مارے کانپنے لگتا۔ ساون کا مہینا اس کے لیے بدقسمتی کی علامت تھا۔ اس مہینے نے اسے ہمیشہ دکھ ہی دکھ دیے تھے۔ پہلی بار جب سائیکل کے پچھلے پہیے میں اس کا پاؤں آیا تو اس وقت بھی جولائی کا مہینا تھا اور

ساون کا موسم تھا۔ پھر جب اسے بھڑوں نے کاٹا تب بھی ساون کا مہینا تھا۔ وہ سوچتا کہ کاش یہ ساون کا مہینا ہی نہ ہوتا۔

وہ ایک کسان کا بیٹا تھا، اگرچہ اس کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا تاہم رزق حلال کھانے کا سبق اس نے اپنے باپ سے سیکھا۔ وہ میٹرک پاس تھا۔ گھر کے حالات نے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دی، اب وہ کھیتوں میں اپنے بابا کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

اس کی منگنی اس کی چچا زاد صوفیہ سے طے تھی۔ وہ صوفیہ سے بہت پیار کرتا تھا، وہ تھی بھی ایسی، دبلی پتلی، ریشمی بال جو کمر تک چلے آتے تھے اس کے حسن میں اضافہ کرتے تھے اوپر سے اسے مٹک مٹک کر چلنے کا بہت شوق تھا۔ اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر اسے بھی انھی کی طرح بننے کا شوق چرایا تھا۔ اس کے والد انکم ٹیکس میں کلرک تھے، اس وجہ سے ان کے گھریلو حالات گاؤں کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کافی بہتر تھے۔ تھوڑی بہت زرعی زمین تھی جو کہ نوید کے والد کے تصرف میں تھی، البتہ فصل دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ سترہ سالہ صوفیہ میٹرک کرنے کے بعد قریبی شہر کے گرلز کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔ کالج میں جب اس نے آزادی اور رنگینی دیکھی تو وہ اسی رنگ میں رنگتی چلی گئی۔

☆......☆

اکتوبر کا مہینا تھا، گندم کی فصل بوئی جا رہی تھی، زرینہ نے احمد گل سے کہا۔ "نوید کے ابا! میری مانو تو محمود بھائی سے شادی کی تاریخ لے لو۔"

"ماشاء اللہ اب نوید تیرا ہاتھ بٹانے لگا ہے۔ ہمارا اور ہے بھی کون نوید کے سوا۔ سب کچھ اسی کا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ محمود بھائی آجائیں تو بات کرتا ہوں۔"

"صوفیہ شہر جاتی ہے بالکل شہری ہی ہوگئی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہاتھ سے ہی نکل جائے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو، وہ نوید کی منگ ہے۔"

"پتا نہیں کیوں میرے دل کو کچھ ہو جاتا ہے۔"

"تو خوامخواہ نہ ڈرا کر، کچھ نہیں ہوتا۔"

☆......☆

صوفیہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، باپ کی لاڈلی تھی، وہ جانتی تھی کہ نوید اسے بہت زیادہ چاہتا ہے اور کالج میں داخلہ لیتے وقت تک وہ بھی نوید کو پسند کرتی تھی، لیکن کالج میں جب اس نے لڑکیوں کے رنگ ڈھنگ دیکھے۔ سہیلیوں نے اسے اپنے آئیڈیل بتائے تو اسے اپنی یہ منگنی پسند نہ آئی، اوپر سے جب ثانیہ نے اسے اپنی بہن کی شادی میں مدعو کیا تو رہی سہی کسر پوری ہوگئی۔

ثانیہ شہر کے دولت مند کاروباری شخصیت عبدالغفور کی بیٹی تھی۔ انہوں نے بڑی بیٹی کی شادی پر پیسا پانی کی طرح بہایا تھا۔ اسی شادی کی تقریب میں ثانیہ کے خالہ زاد ارسلان نے صوفیہ کو دیکھا اور اس ایک لمحے میں، جب صوفیہ خوفزدہ ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، ارسلان کے دل کو بھا گئی۔ سلیقے سے سر پہ لیے گیے دوپٹے نے ارسلان کو گرویدہ کر لیا۔ ارسلان نے جب اسے مخاطب کیا تو وہ کسی خیال میں بری طرح محو تھی، اس کی آواز پر ایسے چونکی کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا مشروب کا گلاس چھناکے سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

"ارے! یہ کیا؟" ارسلان نے اس کی بدحواسی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ...... یہ...... وہ...... وہ میں......"

"ارے کیا ہوا جناب! گلاس ہی تو تھا، ٹوٹ گیا۔"

"وہ...... وہ...... میری...... غ...... غلطی...... ن...... نہیں تھی۔" صوفیہ نے ہکلاتے ہوئے بات پوری کی۔

"کوئی بات نہیں جناب۔" ارسلان نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"ویسے مجھے ارسلان کہتے ہیں، اور آپ کی تعریف۔"

"صوفیہ!" اس نے بھی اپنے آپ پر قابو پایا اور با اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس کے مشاغل اور تعلیم کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ کھلتی رنگت کا مالک، پانچ فٹ نو انچ قد والا ارسلان وجیہہ و جمیل نوجوان ہے۔ اس نے صوفیہ کو اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایم بی اے کر رہا ہے، اس کا باپ ایک کمپنی کا مالک ہے، دولت کی ریل پیل ہے۔ "صوفی! مجھے اس سے پہلے، پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں تھا پر اب تمہیں اتنے قریب دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک آرہا ہے۔" پہلی ہی ملاقات میں اس نے صوفیہ کو صوفی کہنا شروع کر دیا۔

صوفیہ نے اسے لرزیدہ لہجے میں بتایا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے تو ارسلان نے یہ کہہ کر اسے دلاسا دیا کہ کوئی بات نہیں منگنی ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ ارسلان نے صوفیہ کو بتا دیا کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی تھی، اپنی کلاس کی کئی لڑکیوں کے ساتھ وہ ان



کے بیڈروم تک کا ساتھی بن چکا تھا لیکن اسے ایک غریب گھرانے کی قدامت پرست صوفیہ بھا گئی تھی صرف اس لیے کہ وہ تبدیلی چاہتا تھا۔ اسے صوفیہ ایک بالکل مختلف لڑکی لگی تھی، اس کے خیال میں اس نے کپڑے بھی بہت عام سے پہن رکھے تھے۔ ارسلان نے جب اس سے فون نمبر مانگا تو اس نے کہہ دیا کہ اس کے پاس موبائل نہیں ہے۔

"کوئی بات نہیں! تم یہ لے لو۔" اس نے اپنا بیش قیمت موبائل اسے دیا۔

صوفیہ کا دل ایک دم دھڑکا۔ اتنی دیر میں وہ اپنی سم نکال کر موبائل میں ایک اور سم ڈال رہا تھا جو اس نے اپنے والٹ سے نکالی تھی۔ اس ایک لمحے میں صوفیہ بھی ارسلان کو دل دے بیٹھی، وہ سوچ رہی تھی کہ جس نے موبائل دینے میں ایک لمحہ بھی نہ سوچا وہ کتنی سہولتیں دے گا۔ اس ایک لمحے میں صوفیہ کو نوید بہت پیچھے نظر آیا اور اس نے ارسلان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اسی دن سے اس نے صوفیہ کو اپنانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ دوسرے دن ارسلان نے اسے کالج سے گاڑی میں بٹھایا، پہلے وہ گھومتے رہے پھر ایک ریسٹورنٹ سے آئس کریم کھائی، ارسلان نے اسے پانچ ہزار روپے دیے کہ اپنے لیے کوئی ڈھنگ کے کپڑے اور جوتے لے لینا۔ پھر وہ اسے اپنے دفتر لے گیا، یہ اس کے باپ کی کمپنی تھی جہاں وہ کچھ وقت کے لیے آتا تھا۔ ابھی وہ سیکھنے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ ایم بی اے میں اس کا آخری سال تھا۔ صوفیہ نے اسے بتایا کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے تو یہ کہہ کر ارسلان نے اسے چپ کرا دیا کہ تم بعد میں بھی پڑھتی رہنا۔

جب ارسلان نے تنہائی پا کر اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تو اس نے اسے اپنے سے دور کر دیا۔ "نہیں! میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، اگر آپ نے یہی کرنا ہے تو پھر آپ رشتہ بھیجیں شادی کر لیں۔ پھر میں آپ کا ساتھ دوں گی۔"

ارسلان کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔ اس کے بعد جب بھی ان کی ملاقات ہوتی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ارسلان اس کی قربت سے محظوظ ہوتا لیکن وہ ایک حد سے اسے آگے نہ جانے دیتی۔ اتنی بات تو صوفیہ بھی جانتی تھی کہ اگر ابھی وہ اپنا سب کچھ ارسلان کو دے دیتی ہے تو پھر اس کے پاس کیا بچے گا؟ اس لیے وہ اس کے شوق کو ہوا دیتی رہی یہاں تک کہ اس نے صوفیہ کے گھر رشتہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

اصل میں وہ صوفیہ کے تاثرات بھانپ چکا تھا، جب اس کے ہاتھ سے گلاس ٹوٹ کر گرا تھا۔ گلاس ٹوٹنے کا غم اور بے عزتی کا احساس، ارسلان کی نظروں سے چھپ نہ سکا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت صوفیہ کو اس کے پاس ضرور لائے گی۔ وہ ہر چیز کو دولت کے ترازو میں تولنے کا عادی تھا، وہ جو چاہتا، حاصل کر لیتا تھا۔

☆......☆

صوفیہ کا گھر گاؤں کے مرکز میں تھا۔ دونوں بھائیوں کے گھر ایک ہی جگہ تھے، درمیان میں صرف ایک دیوار تھی۔ گاؤں چھوٹا سا تھا اس لیے جب اتنی خوبصورت اور مہنگی کار ان کے گھر سے تھوڑا فاصلے پر رکی اور اس میں سے جدید وضع کا لباس پہنے ادھیڑ عمر مرد اور عورت اور دو نوجوان لڑکیاں اتریں تو سارے گاؤں والوں کو خبر ہوگئی۔ تاہم کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ آگے آکر ان سے سوال و جواب کرنے۔ ایک بوڑھے آدمی سے ڈرائیور نے محمود گل کے گھر کا پوچھا اور پھر یہ چھوٹا سا قافلہ نیم کے درخت والے گھر کے پاس آکر رکا۔ اتوار کا دن تھا محمود گل بھی گھر پہ ہی تھا۔ دستک کے جواب میں جب نفیسہ نے دروازہ کھولا تو انجان چہروں والے چار لوگوں کو جن میں تین خواتین اور ایک مرد شامل تھا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ ان لوگوں نے اندر آنے کی اجازت چاہی کہ وہ صوفیہ کو دیکھنے آئے ہیں۔ ڈرائیور دو بڑے بڑے پیکٹ لے آیا۔

"یہ آپ لوگوں کے لیے ہیں۔" مسز حبیب نے کہا۔

نفیسہ حیران ہو رہی تھی، محمود گل بھی شش و پنج میں تھا۔ انہیں گھر میں ایک کمرے میں بٹھایا، چائے سے ان کی تواضع کی گئی۔ بعد ازاں مسز حبیب نے نفیسہ اور محمود گل سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اپنے بیٹے ارسلان کے لیے صوفیہ کا رشتہ مانگنے آئی ہیں، گو کہ وہ میرا سگا بیٹا نہیں ہے۔ ہم لاولد ہیں۔ یتیم خانے سے اسے گود لیا ہے پھر بھی اسے اپنا قانونی بیٹا سمجھتے ہیں تو دروازے کے پیچھے کھڑی صوفیہ کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ آکر بکھر سے گئے۔

محمود گل نے جواب دیا۔ "بہن جی! بات یہ ہے کہ میری بیٹی کی منگنی اس کے چچا کے بیٹے سے طے ہو چکی ہے، ویسے مجھے حیرانگی اس بات کی ہے کہ آپ کو ہمارے گھر کا اور خصوصاً صوفیہ کا کس نے بتایا؟"

"بھائی صاحب! ہمیں علم ہے کہ صوفیہ کی منگنی ہو چکی ہے لیکن میرے بیٹے کی ضد ہے اس لیے ہم آگئے اور منگنیاں تو ہوتی رہتی ہیں اور ٹوٹتی بھی رہتی ہیں۔" مسز حبیب نے

محمود گل کی بات کا جواب دیتے ہو کہا۔ ''آپ کی بیٹی کو میرے بیٹے نے حانیہ کی شادی میں دیکھا تھا اور پسند کر لیا تھا۔''

محمود گل کو اس کا لہجہ پسند نہ آیا۔ ''بات یہ ہے بہن جی! ہم لوگ جب رشتہ دے دیتے ہیں تو پھر دے دیتے ہیں منگنی ٹوٹنے کا مطلب ہمارے یہاں موت ہوتا ہے، میں نے بیٹی بھائی کے بیٹے کو دی ہے اس لیے آپ یہ توقع نہ رکھیں۔''

نفیسہ نے بھی محمود گل کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''بہن جی! آپ بے شک ہزار بار آئیں لیکن اس بات کے لیے نہ آئیں کیونکہ ہم لوگ زبان دے کر پھرنے والے نہیں۔''

☆......☆

''امی! یہ آپ نے کیا کہہ دیا'' صوفیہ، جو ماں باپ کے انکار سے آگ بگولہ ہو رہی تھی مہمانوں کے جانے کے بعد اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ ماں پر برس پڑی۔ محمود گل مہمانوں کے ساتھ ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ ''آپ کو پتا ہی نہیں ہے کہ ان کے پاس کتنا پیسا ہے کتنی دولت ہے ان کے پاس، لمبی لمبی گاڑیاں، اتنا بڑا گھر......اف یہ کیا کر دیا آپ نے۔'' وہ بے چینی سے ہاتھ مسلتے ہوئے ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہتی رہی۔ ''مجھے ویسے بھی نوید پسند نہیں، میٹرک پاس، ہونہہ! کیا کرے گا، کچھ بھی نہیں کر سکتا، دوبارہ وہ لوگ آئیں تو آپ ہاں کر دیں۔''

نفیسہ ہکا بکا کھڑی صوفیہ کی باتیں سن رہی تھی، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہو کیسے گیا؟ بالآخر اس نے گرج کر صوفیہ کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ ''بکواس بند کرو! تمہارے بابا نے سن لیا تو زبان کاٹ کے رکھ دیں گے۔''

صوفیہ بھی اس وقت غصے سے بے قابو ہو رہی تھی لگتا ہی نہیں تھا یہ وہ صوفیہ ہے جو ان کے گھر میں رہ رہی تھی وہ بولے جا رہی تھی۔ ''میں نے کون سا غلط کہہ دیا؟ شادی لڑکی لڑکے کی رضامندی سے ہوتی ہے، مجھے جب نوید پسند ہی نہیں تو میں اس سے شادی کیوں کروں؟ آپ کو اتنا ہی شوق ہے نوید کو داماد بنانے کا تو عافیہ سے کر دیں اس کی شادی۔''

''آپ بابا کو بھی کہہ دیں، میں نوید سے شادی نہیں کروں گی۔''

یہ باتیں اتنی اونچی آواز سے ہو رہی تھیں کہ نوید اور اس کی ماں نے بھی سن لیں جو شہری مہمانوں کے جانے کے بعد ان کے آنے کی وجہ جاننے کے لیے صوفیہ کے گھر آئے تھے اور گنگ کھڑے تھے۔ صوفیہ جس لہجے میں بات کر رہی تھی وہ زرینہ اور نوید دونوں کے لیے بالکل نیا تھا۔ زرینہ نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا، سب سے پہلے صوفیہ کی چھوٹی بہن، عافیہ کی نظر ان پر پڑی۔ ''نوید بھائی! آئیں نا۔''

صوفیہ اس وقت بالکل اجنبی لگ رہی تھی نوید کے لیے اس کا یہ روپ انوکھا تھا، اس نے نوید کو بھی منہ پر کہہ دیا۔ ''سنو نوید! میں اب ارسلان کو پسند کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی۔ تم سے مجھے کوئی محبت نہیں ہے اس لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہ منگنی توڑ دو ورنہ میری طرف سے ٹوٹی سمجھو۔'' یہ کہہ کر اس نے انگلی سے انگوٹھی اتاری اور نوید کے ہاتھ میں تھما دی۔

نوید کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ماں کو لے کر چپ چاپ ان کے گھر سے نکل گیا۔ جب محمود گل واپس آیا تو نفیسہ نے اسے ساری بات بتا دی۔ محمود گل نے صوفیہ کو بلایا اور اسے پیار سے سمجھایا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا جاتا۔ دیکھنے میں بھی برا لگتا ہے اور عزت بھی نہیں رہتی۔ لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ شادی کروں گی تو صرف ارسلان سے۔

محمود گل نے اسے بتایا کہ دونوں بھائی الگ ہو جائیں گے، ایک دوسرے سے بہت دور چلے جائیں گے۔ ماں نے بھی سمجھایا کہ نوید تمہیں بہت چاہتا ہے لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی۔ پھر باپ نے فیصلہ سنا دیا کہ اس کا کل سے کالج جانا بند۔ صوفیہ نے بھی کہہ دیا کہ اگر میری شادی ارسلان سے نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گی یا گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ محمود گل چپ ہو گیا۔ خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کے رونے لگا۔

جب نفیسہ محمود گل کے پاس گئی تو اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کہتا تھا نا کہ رزق حلال میں برکت ہوتی ہے۔ تم کہتی تھی کہ جب سارے کھا رہے ہیں تو تم بھی کھاؤ، دیکھ لیا نتیجہ۔ ہائے! میری بیٹی میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہائے!'' اس نے دیوار سے ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔

نفیسہ نے بہت مشکل سے اسے سنبھالا۔ ''ابھی بات گھر سے نہیں نکلی ہے، تم احمد بھائی سے بات کرو۔ جب لڑکی کا دل نہیں ہے تو ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے نا۔'' پھر وہ سرگوشی میں بولی۔ ''بہت امیر ہیں وہ لوگ، ہماری بیٹی راج کرے گی۔ نوید کو عافیہ سے بیاہ دیں گے تم احمد بھائی سے بات تو کرو۔''

☆......☆

احمد گل غصے سے پاگل ہو رہا تھا نوید کی ماں اور بہن



چپکے چپکے رو رہی تھیں جب کہ نوید دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ زرینہ نے بالآخر خاموشی توڑی۔ ''میں نہ کہتی تھی نوید کے ابا کہ لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی، وہی ہوا نا۔ ہائے کیسے پٹر پٹر جواب دے رہی تھی، آنکھیں سفید ہو گئیں اس کی۔''

احمد گل نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ نوید کو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ لگیں، وہ آنکھیں۔ وہ پریشان ہو گیا اسے لگا کہ اس کا بابا کوئی غلط فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے بابا کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''بابا! آپ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے۔'' نوید کیا گھر میں سبھی احمد گل کے غصے سے ڈرتے تھے، اسی لیے نوید نے انہیں روکا۔ ''دیکھو بابا! جب ایک لڑکی میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تو آپ کس لیے اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں؟''

احمد گل تڑپ اٹھا۔ ''بیٹا! وہ تمہاری منگ ہے، ہماری عزت ہے وہ، تجھے اور ان کا کیا خیال ہے وہ اتنی آسانی سے میرے بیٹے کی پسند کو لے جائیں گے میں ٹانگیں توڑ دوں گا سب کی۔''

نوید ہنس پڑا لیکن سبھی جانتے تھے کہ یہ ہنسی نہیں، ماتم ہے اپنی آرزوؤں کے جل جانے کا۔ وہ پھر بابا سے مخاطب ہوا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو بابا! لیکن میں ایک ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا جو کسی اور کے خواب دیکھ رہی ہو، بھول جاؤ اسے بابا۔'' وہ کمرے سے نکل گیا۔ اتنی بات وہ سمجھتا تھا کہ وہ صوفیہ کو قید نہیں کر سکتا تھا نہ ہی وہ یہ بات برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی منگیتر کسی غیر مرد کا نام زبان پر لائے اسی لیے اس نے خود ہی کنارہ کر لیا۔ دوسری طرف صوفیہ کو ماں باپ سمجھا سمجھا کے تھک گئے، ماں نے بہتیرا کہا کہ دولت تو ہاتھوں کی میل ہے، دولت کے پیچھے نوید جیسے ہیرے کو چھوڑنا حماقت ہے لیکن صوفیہ کی آنکھیں تو دولت کی چمک سے چندھیا گئی تھیں اسے کیا نظر آتا۔

☆......☆

نوید کے لیے وہ بہت اذیت ناک، بہت ہی تکلیف دہ دن تھے۔ سارا دن بیٹھا پتا نہیں وہ کیا کیا سوچتا رہتا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے لیکن جب اس کا ذہن صوفیہ کی طرف جاتا تو پھر یکلخت ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اس کے ماں باپ کو بھی جیسے چپ لگ گئی تھی۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے، چار افراد پر مشتمل اس کنبے کی نیند روٹھتی جا رہی تھی۔ بھوک بھی مر گئی تھی۔

نومبر کا پہلا ہفتہ تھا، شام ہو رہی تھی، سرخی مائل سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ نوید نے چار نوالے مشکل سے کھائے تھے جب اس کی چچی نفیسہ اور اس کا چچا محمود اس کے گھر میں آئے۔ دونوں خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سب خاموش تھے بالآخر نفیسہ نے زبان کھولی۔ ''بھائی! صوفیہ کی طرف سے ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں لیکن میں آپ کے پاس اس مسئلے کا ایک حل لے کے آئی ہوں۔''

سب اس کی طرف دیکھنے لگے جب کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ بولی۔ ''ہم نوید کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور عافیہ کا رشتہ......''

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ احمد کی گرجدار آواز آئی۔ ''بس بھابی! ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے۔'' اس کی آواز غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ''ہمیں کوئی گلہ نہیں ہمارا اپنا نصیب۔''

جب نفیسہ اور محمود وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو نوید سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں بھائیوں کی آخری ملاقات ہے شاید پھر یہ خاندان اکٹھا نہ ہو سکے۔

☆......☆

محمود گل کے گھر میں اگرچہ شادی کا سماں تھا، آج صوفیہ کی برات تھی تاہم سب کے دل بجھے ہوئے تھے۔ نوید، اس کی ماں، باپ اور اس کی بہن، تین دن سے گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔ ایجاب و قبول کے بعد جب رخصتی کا وقت آیا تو دلہا، دلہن کے ماں باپ سے ملنے کے لیے آگے بڑھا تو نوید کی ماں جو خدا جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھیں نے جو جملے کہے، ان جملوں نے ساری محفل کو ایک لمحے کے لیے مبہوت کر دیا۔ ''خدا کرے جس دولت کے بل پر آج تم میرے بیٹے کی خوشیاں چھین کر جا رہے ہو وہ دولت تمہارے کسی کام نہ آئے۔''

وہ روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے صوفیہ کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ ارسلان بھی بوکھلا گیا، تاہم باقی ساری تقریب بغیر کسی بدمزگی کے نمٹ گئی۔

☆......☆

حجلہ عروسی کو بہت اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ لاڈلے بیٹے کی شادی میں احمد حسیب نے بہت زیادہ سخاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ارسلان کی خوشی دیدنی تھی، وہ رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی

بہنیں، اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور بار بار اس کو چھیڑ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے رات ایک بجے وہ بے تابی کے ساتھ دلہن کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جب اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی، اس وقت صوفیہ آدھی نیند لے چکی تھی اور اس وقت بھی وہ نیند کی ہی کیفیت میں تھی جب ارسلان نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جگایا تو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ارسلان کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی۔

دراز قد ارسلان، حسن و خوبصورتی میں بے مثال تھا، اس وقت وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ بال سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ کتنا بے تاب تھا۔ دوسری طرف صوفیہ کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ سرخی مائل آنکھوں کے ساتھ اس کی اچانک شرما کے سمٹنے کی ادا، ارسلان کو گھائل کر گئی۔ ”صوفیہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج تم جیسی حسین لڑکی سے اس ماحول میں ہم کلام ہو رہا ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“ صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر جذبات میں رندھی ہوئی آواز میں ارسلان نے کہا۔ ”آج تم میرے ساتھ بس صرف میرے ساتھ رہنے کا، زندگی گزارنے کا عہد کرو۔ مجھے تمھاری پچھلی زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ اب تمھاری زندگی صرف میرے نام ہونی چاہیے۔“

صوفیہ اس کی باتیں سنتی رہی، اس کا بدن کپکپا رہا تھا۔ آج تک کسی مرد نے اس کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ آنے والے وقت کے تصور سے ہی اس کے بدن میں عجیب سی سرخوشی طاری تھی۔ اس نے ارسلان کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا۔ اس کی آواز ایسے کانپ رہی تھی جیسے سخت سردی میں کسی کے دانت بج رہے ہوں۔ ”آپ نے مجھے اپنی دلہن بنایا۔ مجھے اتنی عزت دی۔ میں بہت خوش ہوں۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں، نوید میرا چچا زاد تھا محبت صرف آپ سے تھی اور آپ سے ہی رہے گی۔“

وارفتگی کے عالم میں ارسلان نے صوفیہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر دونوں جذبات کے ریلے میں بہتے چلے گئے۔

☆......☆

وہ رات نوید کے لیے بہت عذاب ناک تھی، صوفیہ کی برات جا چکی تھی یہاں تک تو اس نے برداشت کر لیا تھا لیکن جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے، اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے گھر والے اس کی کیفیت سے بے خبر نہیں تھے لیکن وہ اس کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کی ماں کافی دیر اس کے پاس بیٹھی اس کی دلجوئی کرتی رہی۔ بہن کھانا لے کر آئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ وہ تھوڑا سا ہی کھا لے لیکن اس کی ناں کو ہاں میں نہ بدل سکی۔ وہ بیٹے کے جذبات سے آگاہ تھی، جانتی تھی کہ ہر گزرتا لمحہ اس کے بیٹے کی دل آزاری کا باعث بن رہا ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی سو دل مسوس کر رہ گئی۔

گاؤں میں ویسے بھی رات جلدی ہو جاتی ہے، اور اس وقت تو سناٹا ضرورت سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ نوید اپنے کمرے میں اکیلا چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا، اس کے ماں، باپ اور بہن دوسرے کمرے میں تھے۔ کمرے میں نائٹ بلب کی زرد روشنی ماحول کو مزید افسردہ بنا رہی تھی۔ جوں جوں وقت بیت رہا تھا، نوید کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔

چونکہ وہ ایک حساس نوجوان تھا، اس وقت اس کی سوچیں بہت پراگندہ تھیں۔ وہ اپنی محبت کو کسی دوسرے کی بانہوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کا اثر اپنے دل پہ لے رہا تھا۔ جتنا سوچتا، اتنا ہی اس کی حالت خراب ہوتی۔ رات کے ایک بجے اس کے سینے میں اچانک درد شروع ہوا اور یہ اتنا تیز تھا کہ اس سے ہلا بھی نہ گیا۔ اس نے مدد کے لیے پکارنے کی کوشش کی تاہم اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس نے دل پہ ہاتھ رکھا اور اٹھنے کی کوشش کی تو چارپائی سے نیچے گر پڑا۔ اسی دوران چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی کے بازو سے اس کا سر ٹکرایا، اس کے منہ سے ہائے کی آواز کے ساتھ ناک سے خون بھی بہہ نکلا۔

ایک محبت کرنے والے کی زندگی کی آخری سانسیں بہت اذیت ناک تھیں۔ وہ آخری لمحوں میں بھی صوفیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب وہ اپنے شوہر کی بانہوں میں ہوگی۔ یہی لمحات تھے جب وہ تھک گیا، اس سے زیادہ سوچ نہ سکا کہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ حاصل حیات یہی تھا کہ ایک ایسی لڑکی کے لیے بیکار زندگی گنوائی جس کے لیے جذبات اور رشتے کوئی اہمیت اور قیمت نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے کمرے میں گھر کے باقی تینوں افراد بھی جاگ رہے تھے۔ زرینہ، احمد سے کہہ رہی تھی کہ اب یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ”تم محمود سے بات کر لو، اب صوفیہ یہاں آئے گی تو ہم برداشت نہیں کر سکیں گے اسے کسی اور کے ساتھ۔ گھر کا بٹوارہ کر دو، پیسے لو کہیں اور چلے جائیں گے۔ میں نوید کو برباد



ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“

احمد نے اس کی طرف دیکھا، وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو، کچھ دن گزر جائیں پھر بات کرتا ہوں۔“ اس نے اپنے بیٹی کو مخاطب کیا۔

”ثمینہ! بیٹا جاؤ بھائی کو کھانا کھلا کے آؤ۔“ ثمینہ نے باورچی خانے سے برتن لیے اور بھائی کے کمرے میں چلی گئی، دروازہ کھلا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ روشنی ناکافی تھی اس نے بٹن دبا کے لائٹ جلائی اور الٹے پاؤں بھاگی۔ اس کی چیخوں نے ماں باپ کو پریشان کر دیا۔ وہ دونوں بھی نوید کے کمرے کی طرف بھاگے۔ بیٹے کی حالت دیکھ کر انہیں جیسے غش آ گیا۔

بیٹا فرش پہ آڑا ترچھا لیٹا تھا۔ ماں دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی، اسے سیدھا کیا اور پھر اس کے منہ سے نکلنے والی چیخوں نے سارے محلے کو جگا دیا۔ ”ہائے میرا بیٹا! ہائے ڈائن کھا گئی میرے بیٹے کو۔“

”نوید! میرے بیٹے، میرے لال! اٹھ نا۔“ اس نے سر پہ دوہتڑ مارنے شروع کر دیے۔ روتے روتے زرینہ بیہوش ہو گئی۔ رات کے آخری پہر احمد گل کے گھر سے آنے والی چیخوں نے سارے محلے کو جگا دیا۔ لمحوں میں لوگ ان کے گھر پہنچ گئے۔ جب انہیں نوید کی المناک موت کا پتا چلا تو سارا گاؤں افسردہ ہو گیا۔ نوید ہر دلعزیز تھا۔ سب ہی اسے چاہتے تھے۔ صبح ہوئی تو سارے گاؤں کو پتا چل گیا۔ گاؤں والے صوفیہ کو کوس رہے تھے جس نے اپنی خوشی کے لیے نوید جیسے چاہنے والے کی جان لے لی تھی۔ زرینہ ہوش میں ہی نہیں تھی، احمد گل نے تو جیسے چپ سادھ لی تھی۔ ثمینہ کبھی رونے لگتی تھی کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتی تھی اور پھر رونا شروع کر دیتی۔ اس کے بین لوگوں کا کلیجہ چیر رہے تھے۔ محمود گل اور اس کی بیوی بھی آئے تھے لیکن کسی نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ گھر والے تو ہوش میں ہی نہیں تھے۔ گاؤں والوں کی نظر میں محمود گل بھی برابر کا مجرم تھا اس لیے سب نے ہی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ جنازہ اٹھا تو زرینہ بے ہوش ہو گئی۔ احمد گل بھی ایک دن میں ہی برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ ثمینہ کے بین لوگوں کو رلا گئے اس نے کہا۔ ”صوفیہ تو کبھی آباد نہیں ہوگی۔ اللہ کرے تو برباد ہو، دولت تیرے کام نہ آئے۔ ہائے میرا بھائی!“

☆......☆

صبح جب صوفیہ اٹھی تو اس نے دیکھا کہ ارسلان نے اسے دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں لے رکھا تھا ارسلان کی طرف اس کی پشت تھی، اس نے آہستگی سے اس کی بانہوں کو اپنی گردن سے علیحدہ کیا، اپنے بالوں کو سنوارا۔ کپڑے اٹھائے اور باتھ روم کی طرف چل دی۔ غسل کر کے وہ باہر نکلی، پھر ارسلان کو جگایا۔ وہ باتھ روم کی طرف گیا تو اس نے اپنے موبائل کی طرف دیکھا۔ اس کی ماں کی بہت سی کالیں آئی ہوئی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی تاہم اس نے نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ماں نے اسے نوید کی موت کی خبر سنا دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا۔ اس کی ٹانگوں نے جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ایک ایک کر کے وہ تمام لمحات اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے جن میں نوید اس کے ساتھ تھا۔ تاہم اس نے جلد ہی اپنی حالت پہ قابو پا لیا کہ اب نوید اس کے لیے شجر ممنوعہ تھا۔ ارسلان نہا کر باہر آیا تو اس نے نہایت اطمینان سے اسے نوید کی موت کا بتایا۔ وہ بھی بھونچکا رہ گیا، تاہم اس نے اپنے دلی جذبات کو چھپا لیا اور نہایت دردناک لہجے میں اس سے افسوس کیا۔

صوفیہ نے محبت بھری نظروں سے ارسلان کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”اب تو آپ مطمئن ہیں نا، اب تو میں صرف آپ کی ہوں۔ کانٹا تو نکل گیا۔“

ارسلان ایک دم چونکا جیسے سر بازار اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ”کیا مطلب؟“

”نوید مر گیا، میری پریشانی ختم ہو گئی اگر وہ زندہ رہتا تو آپ بھی پریشان رہتے۔“

”ہاں یہ تو تم نے صحیح کہا۔“ ارسلان نے جواب میں اسے کہا تاہم اس بات کی سمجھ اسے نہیں آئی کہ صوفیہ نے نوید کی موت کا کوئی اثر نہیں لیا، وہ نہ صرف صوفیہ کا چچا زاد تھا بلکہ منگیتر بھی تھا اور اس کی برات والے دن جب وہ کسی اور کی دلہن بن کر اپنے گھر سے گئی تھی، نوید اسی رات مر گیا تھا۔ صوفیہ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ نوید نے خودکشی کی ہے۔

”اچھا، چلو ناشتا کرتے ہیں بہت بھوک لگی ہے۔“

ارسلان جو کہ کسی خیال میں گم تھا، چونکا۔ ”ہاں! ٹھیک ہے پھر تیار بھی ہونا ہے آج ولیمہ ہے۔“ ارسلان کا لہجہ اس کے کہے گئے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

☆......☆

صوفیہ، نوید کی وفات پر اس کے گھر جانا چاہتی تھی لیکن ماں نے فون پہ ہی اسے منع کر دیا کہ پہلے ہی وہ لوگ

ٹوٹے ہوئے ہیں ان کے زخموں پر اور نمک نہ چھڑکو۔ ماں سے ہی اسے پتا چلا کہ نوید طبعی موت مرا تھا۔ ارسلان کے سامنے تو اس نے کہہ دیا کہ اسے نوید کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہے لیکن وہ دلی طور پر افسردہ تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچتی تھی کہ نوید کہاں اسے ٹوٹ کے چاہتا ہوگا۔ وہ نوید کی دیوانگی کی حد تک کی جاتی محبت کو نہ جان پائی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نوید کی موت کی ذمہ دار ہے تاہم یہ سوچ تھوڑی دیر تک ہی اس کے دماغ پر حاوی رہ سکی۔ اس کی نندیں آگئی تھیں۔ ان کی شوخیاں، معنی خیز جملے اور پھر ولیمے کی تیاری..... نوید اس کے ذہن سے نکل گیا۔

یہ بھی قدرت کی عجیب تقسیم تھی۔ ایک طرف خوشی کے شادیانے تھے، محفل ہاؤ ہو تھی۔ طرح طرح کے کھانے تھے، زرق برق لباس پہنے حوا کی بیٹیاں اِدھر اُدھر بے حجابانہ گھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف موت کا... سماں تھا۔ نوید کے گھر پر تو جیسے خاموشی اور ویرانی نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ جس وقت ولیمے کی تقریب میں ارسلان اور صوفیہ بانہوں میں بانہیں ڈالے صوفے پر بیٹھے سلامی لے رہے تھے عین اسی دن نوید کو گاؤں کے قبرستان میں قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ اس کی موت پر پورا گاؤں اشک بار تھا۔

وہ دن صوفیہ کے لیے خواب ناک تھے، اس نے زندگی میں کبھی اتنے ٹھاٹ باٹ نہیں دیکھے تھے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ارسلان نے اسے بہترین موبائل فون لے کر دیا تھا جس پر وہ سارا دن گیم کھیلتی رہتی تھی یا گانے سنتی رہتی تھی۔ ہنی مون منانے کے لیے وہ لوگ شمالی علاقہ جات کی طرف چلے گئے۔ ناران، کاغان سے ہوتے ہوئے وہ وادی سوات میں آئے۔ قدرتی مناظر کے دلنشیں حسن نے صوفیہ کو مبہوت کر دیا۔ ان دنوں سوائے ارسلان کے اسے کوئی بھی یاد نہیں تھا۔ ارسلان بھی اسے ٹوٹ کے چاہتا تھا۔ اپنی کلاس کی کئی لڑکیوں کے ساتھ گرچہ اس کے بہت قریبی تعلقات رہے تھے لیکن صوفیہ نے جیسا اسے سکون دیا تھا اس سے ارسلان پہلے کبھی لطف اندوز نہیں ہوا تھا۔ صوفیہ کنواری تھی۔ اس لیے اس کی خود سپردگی میں بھی عجب والہانہ پن تھا اور اسی بات نے ارسلان کو صوفیہ کا دلدادہ کیا تھا۔

یہ ایک ہفتہ ایسے گزرا جیسے کہ کچھ پل، صوفیہ کا آنے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن ارسلان کو کاروبار کے سلسلے میں جانا تھا اس لیے مجبوراً واپس آنا پڑا۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد جب اس نے اپنے گھر امی ابو سے ملنے کی خواہش کی تو اس کی نندوں اور ساس سسر کے ساتھ ساتھ ارسلان نے بھی ناک بھوں چڑھائی۔ کہاں شادی کے سلسلے میں وہ سب اس کے والدین کے آگے پیچھے جا رہے تھے اور کہاں یہ کہ وہ چھوٹا سا گھر ہمارے شایانِ شان نہیں ہے۔ ساس بولی۔ ”تم نے جانا ہے تو جا کے مل آؤ، لیکن رات کو وہاں رکنا نہیں واپس آجانا۔“

”جی بہتر!“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ان کی بات مان لی۔

☆......☆

نوید کے ماں باپ کا تو واحد سہارا ہی چلا گیا تھا۔ بوڑھی ماں سارا دن دروازے کے پاس بیٹھی رہتی۔ آتے جاتے لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھتی اور پوچھتی۔ ”میرا نوید تو نہیں دیکھا تم نے؟“

”رات کو بھلا چنگا تھا۔ پتا نہیں کہاں گیا؟ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ باتوں کے دوران ہی وہ رونا شروع کرتی تو اس کی آواز لوگوں کے دلوں کو چیر دیتی۔ اس آواز میں بلا کا کرب ہوتا، ہجر کا، جدائی کا درد، کبھی نہ لوٹ کر آنے والے کی راہ دیکھنے والی بوڑھی ماں کے سوالوں کو کوئی بھی جواب نہ دے سکتا۔ بوڑھا باپ چارپائی کے ساتھ لگ گیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات ختم ہو گئے، گاؤں والوں نے بھی محمود گل سے ملنا ملانا کم کر دیا۔ محمود ویسے بھی اب گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔ وہ بھی نوید کی موت کا ذمہ دار صوفیہ کو سمجھتا تھا۔ اس لیے جب صوفیہ ان سے ملنے آئی تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔

”میرے لیے تم اسی دن ہی مر گئی تھیں جس دن تمھاری ڈولی اٹھی تھی۔“ اس نے نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ تاہم جو تحفے تحائف وہ ساتھ لائی، ان سے اس کی ماں اور بہن بھائیوں کے منہ بند ہو گئے۔ اور وہ اس کے ساتھ پہلے کی طرح گھل مل گئے۔

”چاچی لوگوں کا کیا حال ہے؟“ بالآخر وہ سوال اس کی زبان پر آ ہی گیا جو وہ کافی دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

”چاچی پاگل ہو گئی ہے، چاچا بھی گھر سے کم ہی نکلتا ہے اور ثمینہ بھی چپ بیٹھی رہتی ہے۔“ اس کی چھوٹی بہن نے جواب دیا۔ شام کو جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو ماں اور بہن بھائیوں نے اسے روک لیا کہ کل چلی جانا لیکن وہ نہ رکی اور واپس سسرال آگئی۔



چند دن اس کی سسرال میں خوب آؤ بھگت ہوئی، وہ اس بات کی دلدادہ تھی کہ لوگوں کی توجہ اس کی جانب رہے۔ چند دنوں بعد سب اپنے اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ارسلان کی دو بہنیں کالج جاتی تھیں، ایک گریجویشن کر رہی تھی دوسری انٹر کی طالبہ تھی۔ ان کے اپنے مشاغل تھے، کالج سے واپس آ کر وہ اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتیں، ارسلان کہیں رات کو دیر سے گھر آتا۔ سارا دن وہ اکیلے پڑے پڑے بور ہوتی رہتی۔ ایک دن وہ جویریہ کے کمرے میں گئی، جویریہ اس کی بڑی نند تھی۔ صوفیہ نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سامنے جویریہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی وہ فلم دیکھنے میں اس قدر منہمک تھی کہ اسے صوفیہ کے اندر کمرے میں آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ لیپ ٹاپ کا رخ دروازے کی طرف تھا اور جویریہ اوندھی لیٹی فلم دیکھ رہی تھی۔ فلم کے دونوں کردار کو دیکھ کر شادی شدہ ہونے کے باوجود صوفیہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“

جویریہ یک دم اچھلی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو پھر فوراً اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور اس کا ردِعمل بھی شدید تھا۔ ”تمھیں جرأت کیسے ہوئی، بنا دستک دیے میرے کمرے میں داخل ہونے کی۔“

صوفیہ نے غصے سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”میں ابھی امی کو بتاتی ہوں۔“

”بتاؤ! شاباش ابھی جا کے بتاؤ لیکن بہتر ہے میرے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔“ صوفیہ کمرے سے جانے لگی تو اس نے اسے آواز دی۔ ”اِدھر آؤ۔“

اس نے صوفیہ کو کندھے سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا، لیپ ٹاپ کو بند کیا اور کہنے لگی۔ ”یار! یہ انجوائے ہے۔ پلیز غصے میں تمھیں الٹ بول دیا، برا نہ ماننا۔ اور مما کو نہ بتانا پلیز۔ اس طرح کرو تم اپنے کمرے میں پڑی بور ہوتی رہتی ہو، میرے پاس آجایا کرو، دونوں دیکھیں گے۔“

صوفیہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر چلی آئی۔ اس دن وہ بہت بے چین رہی، اس کا دل تھا کہ وہ رات کو ارسلان کو ساری بات بتا دے گی لیکن شام کو ارسلان جلدی گھر آگیا۔ اس نے اسے تیار ہونے کا کہا پھر وہ کھانا کھانے باہر چلے گئے تو وہ بھول گئی۔ واپسی پر رات کو دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر آئے تو ارسلان نے لیپ ٹاپ نکال لیا اور اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”جان! آج تمھیں ایک چیز دکھاتا ہوں بہت زبردست ہے تم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ پر کوئی فلم لگا دی۔ یہ ایک انگلش موویٰ تھی تاہم تھوڑی دیر بعد جب وہی مناظر سامنے آئے جو وہ دن میں دیکھ چکی تھی تو شوہر کی موجودگی میں اس نے شرما کے آنکھیں جھکا لیں۔

اس دن کوئی فنکشن تھا سب گئے تھے اس کی طبیعت خراب تھی وہ نہیں گئی۔ رات کو اس نے کمرے میں کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد سر درد کی گولی لی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ رات کا آخری پہر ہوگا جب اس نے محسوس کیا کہ ارسلان آیا ہے اور آتے ہی اس نے صوفیہ کو لپٹا لیا۔ وہ غنودگی کی حالت میں تھی۔ ”پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ لیکن اس نے کوئی جواب دیے بغیر پیش قدمی جاری رکھی۔ اچانک صوفیہ کو لمس اجنبی سا لگا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی تاہم اس وقت تک دیر ہو چکی تھی آنے والا اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئی۔ ”انکل! آپ“ اس کی آواز میں لکنت آگئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

سیٹھ احمد حسیب بولے۔ ”کیا ہوا یار! کیوں اس طرح رو رہی ہو۔ چپ کر جاؤ۔“

صوفیہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں آپ کی بیٹی کی جگہ ہوں، آپ کے بیٹے کی بیوی جسے وہ اتنے شوق سے بیاہ کر لایا تھا۔“

احمد حسیب نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”وہ میرا خون نہیں ہے۔ لے پالک ہے صرف میں نے اسے اپنا نام دیا ہے پھر میں نے یہ شادی اسی لیے کرائی تھی کہ تم خود مجھے پسند آگئی تھیں۔ ورنہ ارسلان جو مرضی کر لیتا یہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جو ہو گیا وہ پلٹ نہیں سکتا۔ تم رونا بند کرو اور ہاں ارسلان کو نہ بتانا، وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ البتہ میں تمھیں طلاق دلوا دوں گا اور اگر اس نے زیادہ شور کیا تو اسے نکال باہر کر دوں گا۔“ صوفیہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا وہ سمجھ گئی تھی کہ اس جال سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

چھ ماہ گزر گئے، وہ صرف چار بار اپنی ماں کے گھر گئی۔ دولت کی ریل پیل نے اسے شاہانہ زندگی کا عادی بنا

دیا تھا۔ کبھی اس کے ذہن میں یہ بات آتی کہ اس نے دولت کی خاطر ارسلان سے شادی کی تھی لیکن یہ دولت بہت خرابیاں بھی ساتھ لائی تھی۔ وہ سوچتی کہ اگر نوید سے شادی کرلی تو اس کے جسم کا مالک صرف نوید ہوتا لیکن ارسلان سے شادی کے بعد...... اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اب جویریہ سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں اکٹھی فلمیں دیکھتی تھیں۔ وہی کام جو اسے کبھی بہت برا لگتا تھا اب وہ اس سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ سیٹھ حسیب کو بھی راضی کرنا پڑتا تھا اور یہ کام بہت تکلیف دہ اور کراہت آمیز تھا اس کے لیے۔ شکوہ بھی کرتی تو کس سے۔ اگرچہ اس کی ساس اسے اتنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن سسر اور جویریہ کی مکمل مدد اسے حاصل تھی۔

ستمبر کا مہینا تھا۔ موسم اگرچہ ابر آلود تھا تاہم بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ خلافِ توقع ارسلان جلدی گھر آگیا۔ وہ تھکاوٹ محسوس کررہا تھا۔ اسے بخار بھی تھا۔ ”میں سرد بادوں۔“

”یار! میری آنکھیں بھی جل رہی ہیں۔ آنکھیں بند کروں تو بہت بوجھ محسوس ہوتا ہے۔“

”آپ ڈاکٹر کے پاس چلے جائیں۔ یہ دیکھیں آپ کے جسم پر تو سرخ سرخ دانے سے بنے ہوئے ہیں۔“

”اوہ! نہیں۔“ دانوں کو دیکھ کر ارسلان بری طرح بدکا۔ وہ اسپتال چلا گیا، صوفیہ اور ڈرائیور ساتھ تھے۔ ڈاکٹروں نے چند ٹیسٹ کیے، دوائیاں دیں اور اسے ایڈمٹ کرلیا گیا۔ دوسرے دن تک بخار کی شدت سے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ شام کو رپورٹ بھی آگئی، اسے ڈینگی بخار ہوگیا تھا۔ ان دنوں شہر میں ڈینگی کی وبا عام تھی۔ روز سینکڑوں کی تعداد میں بچے، بوڑھے، جوان، مرد وزن اسپتالوں میں ڈینگی کے شبہے میں لائے جاتے۔ صوفیہ کے تو ہوش جاتے رہے۔ تاہم اسے یقین تھا کہ علاج ہو جائے گا۔ ارسلان نے بھی اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو اس نے کہا۔ ”علاج پیسے سے ہوتا ہے اور پیسا ہمارے پاس بہت ہے۔“ صوفیہ اس کے سرہانے بیٹھی رہی، وہ مشرقی بیوی تھی۔ نرس نے ارسلان کو ڈرپ لگادی اور اسے آرام کرنے کی تلقین کی۔ صوفیہ باہر ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ بریکنگ نیوز چل رہی تھی، نیوز کاسٹر چیخ چیخ کر بتارہی تھی۔ ”سیکریٹری صحت، ڈینگی وائرس کی وجہ سے جاں بحق ہوگئے۔“ صوفیہ کا دل ایک دم دھڑکنا بھول گیا۔ اگر سیکریٹری صحت کا علاج نہیں ہوسکا تو...... اس سے آگے وہ نہ سوچ سکی۔

دوسرے دن جب ڈاکٹر نے ارسلان کا چیک اپ کیا تو وہ پریشان ہوگیا۔ ”ارسلان صاحب کے پلیٹ لیٹس تیزی کے ساتھ ختم ہورہے ہیں۔“

ارسلان کے ناک اور منہ سے خون بھی بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے سارے گھر والے اس کے پاس موجود تھے۔ صوفیہ کو نوید کی امی کی بات یاد آرہی تھی اور اس کا دل ہول کھا رہا تھا، ”خدا کرے جس دولت کے بل پر آج تم میرے بیٹے کی خوشیاں چھین کر لے جارہی ہو وہ دولت تمہارے کسی کام نہ آئے۔“

چار دن موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہنے اور لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود ارسلان جانبر نہ ہو سکا۔ چوتھے دن شام کو اس نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

صوفیہ کی تو دنیا ہی لٹ گئی۔ ارسلان کی تدفین کب ہوئی؟ اسے پتا نہ چل سکا کہ وہ تو ہوش وخرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ تیسرے دن جب ارسلان کے قل ہوگئے تو ارسلان کی ماں نے صوفیہ کو گھر سے نکال دیا...... ”ڈائن میرے جوان بیٹے کو کھا گئی۔“

صوفیہ نے ان کی بہت منتیں کیں لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا، اس نے سیٹھ حسیب کی طرف دیکھا لیکن اس نے بھی منہ موڑ لیا۔ اس لیے کہ اس نے ایک نئی سیکریٹری رکھی تھی جس کے ساتھ اس کی شامیں گزر رہی تھیں۔

وہ لٹی پٹی اپنے میکے پہنچی، جب ان کو علم ہوا کہ صوفیہ کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے تو وہ دل مسوس کررہ گئے۔ محمود گل قدرت کی اس ستم ظریفی پر کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا۔ نوید کی موت نے اسے بہت بڑا دھچکا لگایا تھا۔ اسے صوفیہ کے نام تک سے نفرت ہوگئی تھی لیکن جب اس کی بیٹی گھر واپس آگئی تو وہ باپ تھا، بیٹی کا دکھ برداشت نہ کرسکا۔ اسے گلے لگا لیا اور دیر تک روتا رہا۔ صوفیہ بھی جی بھر کر روئی۔ دوسرے دن اس نے امی کو ساتھ لیا اور قبرستان چلی گئی۔ نوید کی قبر کی پائنتی بیٹھ کر وہ کافی دیر روتی رہی اور اس سے معافی مانگتی رہی۔ آخر میں اس نے ہاتھ باندھ لیے اور فریاد کے لہجے میں بولی۔ ”اب تو معاف کردو مجھے، اپنے کیے کی بہت بڑی سزا بھگت لی میں نے۔“

وہ روتی رہی، اب اس کی کون سنتا؟ اس کی ایک آواز پر دوڑ کر آنے والا تو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔



# آدھا سچ

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
یہ واقعہ میرے ایک رپورٹر دوست نے سنایا۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خود آپ بھی اس درد کو محسوس کریں گے مگر میں یہ بتا دوں کہ یہ واقعہ حرف بہ حرف سچ نہیں ہے کچھ میں نے تخیل سے بھی کام لیا ہے۔


محمد کبیر عباسی
(مری)


آج کی شام بہت خوبصورت تھی۔ تفریح گاہ میں خاصی رونق تھی۔ خوب چہل پہل تھی۔ لگ یوں رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ ہر عمر اور ہر جنس کے لوگ موجود تھے۔ مگر زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ کچھ لوگ گھاس پہ بیٹھے ستا رہے تھے تو کچھ بینچوں پر براجمان تھے۔ کبھی خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ لہراتے رنگین پیراہن میں کھلتے پھولوں جیسے بھاگتے دوڑتے بچے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے نوجوان جوڑے اور جلترنگ سے قہقہے رونق میں اضافہ کررہے تھے۔ ہر ایک کے

انداز میں بے فکری تھی۔

بچوں کا زیادہ زور جھولوں کی طرف تھا۔نوجوان فلائنگ بوٹ پر رش لگائے ہوئے تھے۔جب فلائنگ بوٹ نیچے آتی تو خوشی سے معمور چیخوں سے پارک گونجنے لگتا۔ ہر کوئی خوشیاں کشید کرنے میں مشغول تھا مگر ذیشان سکندر اس ساری گہما گہمی سے بے نیاز ایک تنہا گوشے میں بیٹھا گھاس کے تنکے نوچے جارہا تھا۔شاید وہ اپنے اندر اٹھتے مدوجزر کو شانت کرنے کے لیے بے خیالی میں ایسا کررہا تھا کیونکہ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

وہ ایک رپورٹر تھا۔ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرتے وقت اس کے حوصلے جوان تھے۔مارکیٹ میں میڈیا پرسنز کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ذیشان کے ذہن میں یہی تھا کہ ماسٹرز کے بعد اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا جلد ہی دولت اور شہرت کے راستے اس کے لیے کھلتے چلے جائیں گے مگر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اس کی ساری توقعات پہ پانی پھر گیا۔چار ماہ کی بے روزگاری کے بعد اسے بہت مشکل سے ایک چینل میں ٹرینی رپورٹر کی جاب ملی تھی۔اس کے ابو فوت ہو چکے تھے دو بہنیں شادی شدہ تھیں۔فلیٹ کرائے کا تھا۔اس چھوٹے سے فلیٹ میں وہ اپنی بوڑھی ماں اور نو بیاہتا بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا۔اس کے ابو کی قلیل سی پنشن مل رہی تھی اسی میں گزارہ کرنا پڑتا تھا۔تعلیم بھی اس نے بڑی مشکل سے حاصل کی تھی۔اس لیے وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ماں کی ضد کے آگے اسے جھکنا پڑا تھا کیونکہ ماں نے اپنے بڑھاپے اور تنہائی کا رونا شروع کردیا تھا۔ ماہ رخ اس کی خالہ زاد تھی۔وہ اپنے نام کی طرح خوبصورت تھی۔سنہری رنگت اور بال ایسے سنہری جو اسے ایک گڑیا کا سا روپ دیتے تھے۔خوب سیرتی و خوبصورتی کم کے اکٹھے کم ہی ملتے ہیں مگر اس حوالے سے ذیشان خوش قسمت رہا۔ماہ رخ نے بخوبی گھر سنبھال لیا اور گھر کے ساتھ اس کے دل کی حکمران بھی بن گئی۔

تین ماہ بعد ماہ رخ کی طبیعت کچھ سست رہنے لگی۔چیک اپ کرانے پہ ڈاکٹر نے خوش خبری سنا دی تھی۔یہ ان کے لیے خوشی کی خبر تھی مگر کم آمدنی کے باعث خوشی سے زیادہ اندیشے ستانے لگے تھے۔

اس کی تنخواہ تو کم ہی تھی مگر کمائی کے دیگر کافی ذرائع تھے۔اچھے کام پر بونس بھی تھے مگر نا تجربہ کاری کے باعث ذیشان ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پارہا تھا۔

ماہ رخ کی طبیعت اکثر خراب رہتی۔گھر میں اس کی دیکھ بھال کے لیے ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔وہ باحوصلہ خاتون تھیں اس لیے زبان سے کچھ نہیں کہتیں مگر ذیشان کو احساس تھا۔ماہ رخ کی ڈلیوری کے دن قریب آتے جارہے تھے اس لیے اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی کہ آج اس کے باس نے یک دم ہی جیسے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا۔

باس نے اسے اپنے روم میں بلایا تو وہ خوش خوش اندر گیا تھا مگر اندر پہنچتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ باس کا پارہ بہت ہائی ہے۔حسام علی عام طور پہ اس سے اچھے طریقے سے بات کرتا تھا۔مگر آج اس کا انداز قطعی مختلف تھا۔

''تمہیں کتنا عرصہ ہوگیا ہے ادھر کام کرتے ہوئے؟'' اس سوال میں چھپی تنبیہ کو ذیشان نے صاف محسوس کرلیا تھا۔

''سال ہونے والا ہے سر!'' اس نے اندیشوں سے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے اس عرصے میں کوئی ڈھنگ کا کام کیا؟'' اس سوال میں دبا دبا غصہ ذیشان کو مزید پریشان کرگیا۔

''سر مجھے جہاں بھی کوریج کے لیے بھیجا گیا بہترین رپورٹنگ کی ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے صفائی پیش کی جو حسام علی کا پارہ مزید ہائی کرنے کا سبب بن گئی۔

''اور وہ رپورٹنگ کیا تھی۔گوجرانوالہ میں مرغیوں نے انڈے دینے بند کردیے۔یا لاہور کی بھینسوں کا دودھ کم ہوگیا ہے۔کیا تمہیں صرف ایسی خبریں دینے کے لیے رکھا گیا ہے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔''تین ماہ ہوگئے ہیں تمہیں کوئی ڈھنگ کی رپورٹ دیئے۔دیکھو خبر کی تلاش میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔خبر نہ ملے تو بنانا بھی پڑتی ہے۔جب تک کسی کام کا کہا نہ جائے تب تک کیا تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟ اپنے کولیگز سے ہی کچھ سیکھو۔'' اس بار حسام نے نرمی سے نصیحت کی۔

ذیشان کا اٹکا سانس بحال ہوا ہی تھا کہ حسام پھر بولا۔اس بار اس کا لہجہ سرد تھا۔''اگر تین دن کے اندر تم کوئی بڑی خبر نہ لائے تو اپنے آپ کو فارغ سمجھنا۔''

باس تو اپنا فرمان جاری کرکے اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔مگر ذیشان کو نئی پریشانی نے آلیا۔وہ دفتر سے نکلا تو گھر جانے کی بجائے اس تفریح گاہ میں بیٹھ گیا۔تب سے وہ یہاں بیٹھا فکر سے ہلکان ہورہا تھا۔جانے کتنا وقت گزر گیا اسے ہوش آیا تو اندھیرا پھیلنا شروع ہوچکا تھا۔تفریح گاہ میں رش کچھ اور بڑھ چکا تھا۔مصنوعی روشنیوں نے وہاں کے حسن میں مزید اضافہ کردیا تھا مگر ذیشان کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔اس نے کیمرا اٹھایا اور گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔



کیمرا اسے چینل کی طرف سے ملا تھا۔یہ جدید ترین ڈی ایل ایس آر کیمرا تھا۔نائٹ موڈ پہ بھی اس کا رزلٹ شاندار تھا۔جاتے جاتے اس نے زوم کرکے گہما گہمی کے کچھ سین عکس بند کیے۔فرنٹ گیٹ کافی دور تھا۔ذیشان کا گھر اس تفریح گاہ سے عقبی جانب تھا۔عقبی طرف ایک دیوار کچھ ٹوٹی ہوئی تھی ذیشان اگر فرنٹ سائڈ سے جاتا تو اسے گھوم کے جانا پڑتا اور یہ راستہ کافی طویل تھا۔اس لئے وہ اکثر عقبی حصے کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے گزر کے آتا جاتا تھا۔یہ راستہ کافی سنسان تھا اس طرف لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی خاص کر اندھیرا پھیلنے کے بعد کوئی بھی اس طرف نہیں آتا تھا۔درختوں میں اندھیرا کچھ اور گہرا ہوا تو ذیشان کو چلنے میں مشکل پیش آنے لگی۔ اس نے ٹارچ لائٹ آن کرنے کی غرض سے سیل فون نکالا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے ایک مدھم آواز ٹکرائی۔جھاڑی کے پیچھے شائد کوئی فون پہ کسی سے بات کررہا تھا۔فطری تجسس کے تحت ذیشان جھاڑی کے قریب ہوکر بات سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''جانباز تیار ہے ناں؟ باقی ساتھیوں سمیت اسے بھیج دو۔میں پارک کی عقبی دیوار کے پاس ہوں۔سارا پلان مکمل ہے۔'' وہ وقفے وقفے سے بول رہا تھا۔

ذیشان کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس قسم کے پلان کا ذکر کیا جارہا ہے۔اسے حشرات بھی تنگ کررہے تھے۔وہ آگے بڑھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اگلے جملے نے اس کے اوسان خطا کردیے۔

''کم سے کم پچاس بندے تو مریں گے ہی۔ بہت رش ہے۔بس تم۔لوگ بیس منٹ میں پہنچو۔''

یہ لوگ شاید پارک میں کوئی دہشت گردانہ واردات کرنے جارہے ہیں اور وہ بھی صرف بیس منٹ بعد۔ذیشان کے پاس وقت بہت کم تھا۔وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور تیزی سے جھاڑی سے دور جانے لگا۔کچھ دور جاکے اس نے سیل فون نکالا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کا نمبر ملانے لگا کہ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور اس نے ہاتھ روک لیا پھر ایک دوسرا نمبر ملا کر باتیں کرنے لگا۔

☆......☆
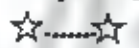
چینل کے نیوز روم میں بہت رش تھا۔ایک بڑی بریکنگ نیوز نشر ہورہی تھی جس نے پورے ملک میں کھلبلی مچا دی تھی۔ہر کوئی اپنے کام میں مصروف تھا۔ہر پل نئی نئی زپورٹس آ رہی تھیں۔جو تیاری کے مراحل سے گزر کے نشر ہورہی تھیں۔آج بہت کچھ ایسا بھی تھا جس نے سب سے پہلے اسی چینل سے ''ایکسکلیسو'' کی اسٹامپ کے ساتھ نشر ہونا تھا۔رپورٹنگ مینیجر بے چینی سے ذیشان کا انتظار کررہا تھا۔آج ہی اس نے ذیشان کو جھاڑ پلائی تھی اور آج ہی ذیشان نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا تھا۔

''اسٹاف کے ساتھ جب تک سختی نہ کی جائے کام نہیں کرتے۔'' اس نے سوچا۔

اچانک دروازہ کھلا اور ذیشان اندر آیا۔وہ پسینے سے شرابور تھا۔اس کے کپڑوں پہ گھاس اور مٹی کے داغ واضح نظر آرہے تھے مگر وہ اس وقت اپنے حلیے سے قطعی بے نیاز لگ رہا تھا۔اس کے چہرے پہ فاتحانہ تاثرات تھے۔اندر آتے ہی اس نے کیمرا اپنے باس کے ٹیبل پہ رکھا اور تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گیا۔

حسام علی نے بے تابی سے کیمرا اٹھایا۔وہ اتنا بے تاب تھا کہ اس نے کیمرا پی سی کے ساتھ کنیکٹ کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

''سارے کلپس اسی میں ہیں ناں؟'' اس نے ذیشان سے استفسار کیا۔

ذیشان نے اثبات میں سر ہلایا۔''میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔کچھ مناظر اس وقت بھی عکسبند کیے تھے۔ایک منٹ کیمرا مجھے دیں میں وہ کلپس آپ کو لگا کے دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ذیشان نے اپنے باس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ویڈیو ریوائنڈ کرتے ہوئے اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔اس نے ویڈیو بناتے وقت بھی غور نہیں کیا تھا اور ابھی بھی اس کی توجہ ویڈیو پر نہیں تھی ورنہ اس کے تاثرات مختلف ہوتے۔

پارک میں تفریح میں مشغول لوگوں کے ویڈیو کلپس کو حسام نے بے توجہی سے دیکھا۔مگر اگلا سین دیکھ کے اس کے چہرے پہ سنسنی نمودار ہوگئی۔

وہ تین آدمی تھے جو ٹوٹی ہوئی دیوار سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ تینوں نے بھاری بھرکم لبادے پہن رکھے تھے۔حالانکہ موسم قدرے گرم تھا۔ان میں سے ایک شخص ادھر ہی رک گیا جب کہ دو آگے بڑھنے لگے۔کچھ دور جاکے ایک شخص دوسرے کو اشاروں سے کچھ سمجھانے لگا۔اس کے بعد ایک شخص آگے بڑھ گیا۔جب کہ دوسرا ادھر ہی رک کے اسے دیکھنے لگا جوں ہی وہ شخص رش والے علاقے کے پاس پہنچا دوسرا فرد تیزی سے واپس آیا۔کیمرا پھر آگے جانے والے فرد پہ مرکوز ہوگیا۔وہ تیزی سے آگے بڑھتا جارہا تھا۔وہ لوگوں کے درمیان پہنچا تو ایک زوردار دھماکا ہوا۔کیمرا کی اسکرین پر آگ کے شعلے ایک لمحے کے لیے نظر آئے۔اس کے بعد ایسا لگا جیسے ویڈیو بنانے والا شخص بھی لڑکھڑا گیا ہو۔کچھ دھندلے مناظر کے بعد

کیمرا پھر دھماکے کے بعد کے مناظر پہ فوکس ہو گیا۔

جھلسے ہوئے آدھے ادھورے اجسام، زخمیوں کی آہ و بکا، ایمبولینسیز کا شور یہ سارے مناظر دل دہلا دینے والے تھے مگر ویڈیو دیکھتے ہوئے حسام کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

پوری ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور ذیشان کو گلے لگا لیا۔

"ویلڈن میرے شیر...... آج تم نے واقعی کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ میں کہتا تھا ناں خبریں بنانا پڑتی ہیں۔ آج کے دور میں وہ ہی رپورٹر کامیاب ہے جو خبریں بنانے کے فن میں طاق ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔" ذیشان شرمیلے سے انداز میں مسکرا کے بولا۔

"اچھا میں یہ سب نیازی کے حوالے کر کے آتا ہوں وہ اس کی ایڈیٹنگ کر کے آن ایئر کر دیں گے۔ آج پھر ہم بازی لے گئے۔ اور یہ سب تمھاری بدولت ہوا۔" اس کے لہجے میں ذیشان کے لیے ستائش تھی۔

ذیشان کو بھی اپنی پریشانیاں کم ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

باس کافی دیر بعد واپس آیا تو پُرسکون لگ رہا تھا۔ "اب ذرا تفصیل سے بتاؤ، یہ سب کیسے ہوا؟"

سر میں پارک سے نکل رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو فون پہ باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ وہ دھماکے کے لیے اپنے ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ پولیس کو مطلع کروں مگر وقت کم تھا۔ پولیس کے پہنچنے تک دھماکا تو ہو ہی چکا ہوتا الٹا ڈر تھا کہ پولیس مجھے ہی نہ پکڑ لے۔ اس لیے میں نے آپ کو کال کی اور جو آپ نے کہا اسی پہ عمل کیا۔ ذیشان نے تھکے تھکے انداز میں بتایا۔ "سر یہ ساری ویڈیو تو آن ایئر نہیں جا سکتی دھماکے کے بعد کے سینز ہی ہم دکھا سکتے ہیں ناں؟"

ذیشان کے سوال میں اندیشے بول رہے تھے۔

"تم فکر نہ کرو ہم اپنا کام جانتے ہیں کہ کیا نشر کرنا ہے اور کیا نہیں۔" حسام نے ذیشان کو تسلی دی۔

"سر مجھے اب اجازت دیں گھر پہ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کی طبیعت بھی آج کل ٹھیک نہیں رہتی اسے ڈاکٹر کو بھی دکھانا تھا مگر......" ذیشان اپنی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے جھجک گیا۔

"اوہ! آج تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔ اسپیشل بونس کی سفارش میں کر دوں گا۔ ابھی تم اس سے کام چلاؤ۔"

حسام نے ایک چیک ذیشان کی طرف بڑھایا۔

بیس ہزار کا چیک دیکھ کے ذیشان کی باچھیں کھل گئیں۔

وہ نیازمندانہ انداز میں بولا۔ "بہت شکریہ سر۔ میں اب چلتا ہوں۔"

گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ مطمئن تھا۔ پچھتاوے کا مبہم سا احساس بیس ہزار کا چیک دیکھ کے کہیں دور جا سویا تھا۔ اسے یہ خیال تک نہ آیا کہ لوگوں کے لیے تو وہ لوگ ہی دہشت گرد تھے جنھوں نے دھماکا کیا تھا حالانکہ دہشت گرد تو اس کا چینل بھی تھا جس نے صرف ایک سنسنی خیز خبر کے لیے اسے استعمال کیا۔

دہشت گرد تو وہ خود بھی تھا جس نے اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دی۔ مگر آج کے دور میں ایسا سوچتا کون ہے۔

رکشا اس کی گلی میں پہنچا تو گلی کے نکڑ والے مکان سے رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید دھماکے میں اس گھر کا کوئی فرد بھی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ ذیشان نے پہلے ادھر رکنے کا سوچا۔ مگر وہ جسمانی تھکن کے ساتھ ذہنی طور پر بھی تھکا ہوا تھا۔ ایسے مناظر مزید دیکھنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

گھر پہنچ کے رکشے والے کو اس نے کرایا دیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کا فلیٹ دوسرے فلور پر تھا۔ وہ کال بیل بجانے والا تھا کہ اس کا پڑوسی ساتھ والے فلیٹ سے نکلا۔ وہ ذیشان کو دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ تذبذب کے عالم میں اس نے ذیشان سے سوال کیا۔ "ذیشان بھائی کدھر تھے آپ میں دو گھنٹے سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہا ہوں مگر آپ کا نمبر بند جا رہا ہے؟"

"کام پر تھا اور سیل کی بیٹری ختم تھی۔ کیوں خیریت تھی ناں۔" ذیشان کے لہجے میں الجھن تھی۔

"وہ...... وہ آپ کو اپنی بیوی اور امی کا پتا ہے، کدھر ہیں وہ؟"

"گھر میں ہی ہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہینڈل دبایا مگر دروازہ لاک تھا۔

"جب دھماکا ہوا تو وہ تفریح گاہ میں تھیں۔ میں اور میری بیوی کچھ دیر پہلے ہی انھیں دھماکے والی جگہ کے قریب بیٹھا دیکھ کے آئے تھے۔ ہم ابھی گیٹ سے باہر نکلے ہی تھے کہ دھماکا ہو گیا۔ مرنے والوں کی لاشیں ناقابلِ شناخت تھیں۔ زخمیوں میں بھی وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئیں۔"

پتا نہیں وہ کیا کیا کہتا جا رہا تھا مگر ذیشان سمجھ نہیں پا رہا تھا اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں نے اس کا وزن سہارنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کے نیچے گر چکا تھا۔

اس کے خودغرضانہ فیصلے سے جہاں سینکڑوں چراغ گل ہوئے تھے وہاں اس کے پاس بھی کچھ نہیں بچا تھا۔



# فیس بک والی

جناب مدیر اعلیٰ
سلام شوق
میرے دوست سلمان کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ہے، میں نے اسی واقعے کو اپنے انداز میں کہانی کی شکل دی ہے تاکہ سرگزشت کے قاری خاص کر فیس بک پر وقت گزارنے والے کہیں سلمان ... کی طرح زندگی کو داؤ پر نہ لگا لیں۔

اکبر بخاری
(شجاع آباد، ملتان)

سچ تو یہ ہے کہ وہ مقام جنت سے کم خوب صورت نہیں تھا۔ سبزہ ہی سبزہ۔ فلک بوس پہاڑ، ٹھنڈی ٹھنڈی زندگی بخش ہلکی ہلکی چلتی ہوئی بادِ بہاری۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم غم و اندوہ، رنج و الم، پریشانیوں اور دکھوں سے عبارت زندگی کی تلخیوں سے نکل آئے ہوں اور اب ایسی زندگی کی شروعات کر رہے ہوں جس میں فقر و فاقہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہو۔ ایسی آئیڈیل زندگی کا کوئی تصور تو کر سکتا ہے مگر شاید زندگی میں ایسی زندگی کسی کو میسر کبھی نہیں رہی ہے اور نہ ہی کبھی میسر آ سکے۔ میری زندگی میں نتاشا کا شامل ہونا، شاید میری زندگی کا وہ انقلاب تھا جسے میں نے بہت بعد میں محسوس کیا۔ نتاشا ایک بڑے باپ کی بڑے دل والی لڑکی تھی۔ ہماری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ جب میں اسلام

آباد ایئرپورٹ پر اپنی ٹیکسی ایف ایکس میں کسی سواری کی تلاش میں تھا تو ایک خوب صورت، گوری چٹی، انگریزوں جیسی نظر آنے والی سواری نے مجھے روکا۔ عموماً صبح دس بجے دبئی سے آنے والی فلائٹ میں سواریوں کو لینے کے لیے ان کے عزیز و اقارب ضرور آتے ہیں اور ہم جیسے ٹیکسی ڈرائیوروں کے لیے چند سواریاں ہی بچتی ہیں۔ مجھے قطعاً اُمید نہیں تھی کہ ایسی خوب صورت تنہا لڑکی کو کوئی لینے نہیں آیا ہوگا مگر جب اس نے مجھے ہاتھ دے کر قریب بلایا تو مجھے عجیب سی خوشی ہوئی کیونکہ دیگر ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنی اپنی ٹیکسیوں میں موجود تھے۔ میں فوراً گاڑی اس کے قریب لے گیا اور تیزی سے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ سواری جس کا نام نتاشا مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کے پاس کوئی خاص سامان نہ تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا بریف کیس اور بڑا سا پرس تھا۔ اس کے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی خوشبو کا ایک ایسا خوشگوار جھونکا گاڑی میں داخل ہوا جیسے ساری بہاروں کی خوشبوؤں کے جھونکے میری گاڑی میں اتر آئے ہوں۔ گاڑی کے مہک اٹھنے کے احساس کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری تقدیر ہی بدل گئی ہو۔ میں خاموشی سے منتظر تھا کہ سواری کہاں چلنے کے بارے میں حکم دیتی ہے لیکن نتاشا نے کہا۔ ''چلیے۔''

میں نے گاڑی آہستہ آہستہ چلانی شروع کر دی ایئرپورٹ سے جیسے ہی گاڑی باہر نکلی اس نے کہا۔ ''دائیں طرف کو مڑ جائیں۔'' اور پھر بائیں دائیں کا ایسا چکر چلا کہ ہر موڑ پر مجھے مڑنا پڑ رہا تھا۔ نتاشا نے کرائے کے بارے میں کچھ بھی طے نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے منزل بتائی تھی بلکہ وہ مسلسل ہدایات دے رہی تھی کہ اب دائیں مڑیں یا بائیں مڑیں۔

میں کئی سال سے پنڈی اسلام آباد میں ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ مجھے اسلام آباد اور پنڈی کے بارے میں کافی حد تک معلومات ہیں کہ کون سا علاقہ کتنے فاصلے پر واقع ہے۔ نتاشا خاموش تھی صرف کسی موڑ پر مجھے بائیں یا دائیں مڑنے کی ہدایت کرتی۔ ایک بار جب گاڑی ایک گلی میں داخل ہوئی تو ایک دم نتاشا نے کہا کہ گاڑی آہستہ کریں اور سامنے کھلے ہوئے گیٹ کے اندر لے چلیں۔ میں گاڑی اندر لے گیا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ میں کس جگہ ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے اور یہ کوٹھی کس کی ہے۔ کوٹھی کوئی دس مرلہ پر مشتمل تھی۔ نتاشا نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ''نیچے اتر آئیں۔ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی۔''

سچ پوچھیے تو میں اس وقت بہت ہی زیادہ گھبرا رہا تھا اور خود کو کسی ایسے گروہ کی تحویل میں محسوس کرنے لگا تھا جو ٹیکسی ڈرائیورز کو کسی تنہا مکان میں لے جا کر لوٹ لیتے ہیں اور گاڑی بھی چھین لیتے ہیں بلکہ بعض کی تو لاشیں بھی نہیں ملتیں اگر کسی کی لاش ملتی بھی ہے تو کسی بند بوری میں۔ بہرحال میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میم! آپ کی منزل آگئی ہے۔ مجھے کرایہ ادا کیجیے اور جانے دیجیے۔''

لیکن نتاشا نے کہا۔ ''سلمان! گاڑی سے اتر آئیں اور اندر چلیں۔''

میں بری طرح چونک گیا کیونکہ میں نے اپنا نام ڈرائیونگ کے دوران اسے نہیں بتایا تھا بلکہ پورے راستے خاموش ہی رہا تھا اور نہ ہی سمت بتانے یا گاڑی موڑنے کے سوا نتاشا نے کچھ بتایا تھا یا پوچھا تھا۔ اب میں اور پریشان ہو گیا کہ اسے آخر میرا نام کیسے معلوم ہوا۔

''آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟''

میرے منہ سے نکلے ہوئے یہ لفظ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی، اس نے کہا۔ ''پہلے ڈرائنگ روم میں آجاؤ پھر تمہیں بتاتی ہوں۔''

میں ہچکچاتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

ڈرائنگ روم خالی تھا مگر بڑے سادہ اور خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کوئی موجود نہیں ہے۔ میں نے مڑ کر اندر آنے والے دروازے کو دیکھا وہ گیٹ جو گاڑی کے اندر آتے وقت کھلا ہوا تھا اب بند ہو چکا تھا جب کہ گیٹ کے ساتھ موجود چھوٹی سی چوکیدار کے لیے بنی ہوئی کوٹھری میں کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ میں آج کہاں پھنس گیا ہوں؟'' سوچ سوچ کر میرا دماغ سن ہوا جا رہا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے جان بوجھ کر کسی ٹریپ میں پھنسالیا گیا ہے۔ میں پریشان تو تھا ہی مگر اپنے آپ کو الرٹ رکھنے کی بھی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس قسم کے رویے کا مظاہرہ مجھے کرنا چاہیے۔ میں اسلام آباد میں دو ڈھائی سال سے ٹیکسی چلا رہا تھا یہاں مجھے ہر روز نت نئے تجربات سے گزرنا پڑتا تھا۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ سواری مجھے اپنے ساتھ لے گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سواری نہیں کوئی شکار تلاش کرنے والی خاتون تھی جو



نوجوانوں کی جوانی کے شکار پر ہر روز شام کو نکلتی ہے۔ مجھے اپنی تعریف تو نہیں کرنی چاہیے لیکن میں قبول صورت سے زیادہ خوب صورت ہوں بلکہ میری شخصیت میں لوگوں کے لیے ایک گمنام سی کشش بھی ہے۔ بالخصوص خواتین کو میں نے کئی بار دیکھا کہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی ہیں لیکن نتاشا نے تو مجھ سے فری ہونے کی بھی کوشش نہیں کی تھی اور اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا مجھے جانتی بھی ہے۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ باہر چلا جاؤں یا بیٹھا رہوں کہ اندر کا دروازہ کھلا اور نتاشا ٹرے لیے جس میں ایک کولڈ ڈرنک رکھی تھی اندر آئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

''سلمان صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا نام نتاشا ہے۔ کیا کچھ یاد آیا؟''

میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر میرے دماغ کے کسی کونے میں بھی ایسی خوب صورت لڑکی کی نہ کوئی تصویر تھی نہ ہی یہ نام مجھے جانا پہچانا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میم میں آپ کو نہیں جانتا۔ پلیز آپ مجھے فارغ کریں اور جانے دیں۔''

وہ بولی۔ ''ایسی کیا جلدی ہے۔ آپ کو کرایہ آپ کے خیال سے بھی زیادہ ملے گا، ذرا تشریف رکھیں، کولڈ ڈرنک لیجیے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں اور آپ کو کیسے جانتی ہوں۔''

''میں پریشان ہونے کے باوجود اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ کولڈ ڈرنک ایک مشہور زمانہ برانڈ کی تھی۔ میں نے وہ اٹھائی اور ایک گھونٹ پی۔ مجھے اس کا ذائقہ اس برانڈ کے ذائقے سے ذرا مختلف محسوس ہوا۔ میں نے ابھی دوسرا گھونٹ بھی نہیں لیا تھا کہ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کولڈ ڈرنک میں ضرور کچھ ملا ہوا تھا۔ میرا سر مزید گھومنے لگا میں نے اٹھنا چاہا لیکن میں اٹھ نہ سکا۔ میں نے دیکھا کہ نتاشا کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے مدھم ہوتا جا رہا ہے۔ میں شاید بے ہوش ہو رہا تھا لیکن میری سانس ٹھیک چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میرے ہوش گم ہو گئے تھے اور میں واقعی بے ہوش ہو گیا تھا۔ بے ہوش ہوتے وقت میرے احساسات پر صرف یہ فکر سوار تھی کہ اب کیا بنے گا۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا.....!''

جب میری آنکھ کھلی تو یہ وہ جگہ ہرگز نہیں تھی جہاں میں بے ہوش ہوا تھا بلکہ یہ ایک پہاڑی مقام تھا جو شاید میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کھڑکی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ صبح کا وقت ہے۔ وقت تقریباً وہی تھا جس وقت میں نتاشا کو لے کر اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ میرا سر ہلکا ہلکا بھاری تھا لیکن کسی قسم کی کوئی کمزوری قطعاً محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میز پر کچھ پھل موجود تھے جن میں سیب، کیلے، انگور اور ایسے ہی دیگر پھل شامل تھے۔ میں بہت فکرمند تھا اور اپنے اندر شدید غصہ بھی محسوس کر رہا تھا اور یہ سوال رہ رہ کر میرے دماغ میں اٹھ رہا تھا کہ یہاں مجھے کون لایا؟ میں نے کھڑے ہو کر جب دروازہ کھولنا چاہا تو اچانک دوسرے دروازے سے نتاشا داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو ہوش آگیا۔ جب آپ کولڈ ڈرنک پیتے پیتے اچانک بے ہوش ہو گئے تو میں بہت پریشان ہو گئی۔ میرے والد دبئی میں کاروبار کرتے ہیں۔ میری ساری فیملی وہاں سیٹل ہے۔ میں کبھی کبھی اپنی خاندانی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے اپنے والد کے حکم پر پاکستان آتی ہوں۔ آپ کو جس مکان میں لے کر آئی تھی وہ ہمارا آبائی گھر تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھے بے ہوش کیوں کیا؟ میں اب کہاں ہوں؟''

## کچھ اچھی باتیں

☆ لوگوں کے لیے تم تب تک اچھے ہو جب تک تم... ان کی امیدوں کو پورا کرو اور تمہارے لیے بھی لوگ تب تک اچھے ہیں جب تک تم ان سے کوئی امید نہ رکھو۔

☆ اگر لوگ تم پر تنقید کرتے ہیں، تمہیں دکھ دیتے ہیں، تم پر چلاتے ہیں تو پریشان مت ہو بس اتنا یاد رکھو کہ ہر کھیل میں تماشائی شور مچاتے ہیں کھلاڑی نہیں۔

☆ اگر کوئی تم پر کسی دوسرے شخص کو ترجیح دے تو افسردہ مت ہو کیونکہ آپ کسی بندر کو قائل نہیں کر سکتے کہ شہد کیلے سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔

مرسلہ: اُمِ ایمان، ڈیرہ غازی خان

نتاشا بولی۔ ”میں نے آپ کو بے ہوش نہیں کیا بلکہ آپ خود بخود کولڈ ڈرنک پیتے ہی بے ہوش ہوگئے تھے۔ آپ ہمارے نتھیا گلی کے قریب والے مکان میں ہیں۔ یہ مکان بھی ہمارا ہے۔ جب آپ بے ہوش ہوگئے تو میں بہت پریشان ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں آپ کو اسپتال لے جاؤں گی یا پولیس کو اطلاع کروں گی تو کوئی بڑی پریشانی کا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو یہاں لے آؤں۔ اس مکان کے قریب ہمارے ایک انکل رہتے ہیں جو ڈاکٹر بھی ہیں انہوں نے ہی آپ کا علاج کیا ہے۔“

میں پریشانی سے بولا۔ ”مگر میری ٹیکسی کہاں ہے؟ اور میں یہاں پہنچا کیسے؟“

میرا یہ سوال سن کر نتاشا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ شرماتے ہوئے بولی۔ ”میں نے آپ کو بڑی مشکل سے آپ کی گاڑی میں سوار کیا تھا اور میں ہی آپ کو بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر اس مکان میں لائی ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں مجھے اس کام کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ آپ اتنے ہینڈسم اور خوب صورت ہیں کہ میں تو آپ پر فدا ہوگئی ہوں۔ اب آپ کے بغیر ایک لمحہ بھی میرے لیے گزارنا ناممکن ہوگیا ہے۔ دراصل جب میں نے آپ کو آپ کی فیس بک آئی ڈی پر دیکھا میں تو جب ہی سے آپ کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی۔ کیا آپ کو یاد آیا کہ آپ سے آپ کی آئی ڈی پر میں نے آپ کے بارے میں آپ سے پوری معلومات لی تھیں۔ آپ نے تو مجھے اپنی گاڑی کا نمبر تک بتا دیا تھا۔“

اب مجھے یاد آیا کہ واقعی فیس بک پر میری ایک گرل فرینڈ کا نام نتاشا تھا جس سے اکثر چیٹ بھی ہوتی رہتی تھی لیکن وہ اپنی تصویر کے مقابلے میں بہت زیادہ خوب صورت تھی۔ اتنی خوب صورت کہ جتنی کوئی پری ہوسکتی ہے۔ کوئی حور ہوسکتی ہے مگر نہیں پری بھی اتنی خوب صورت نہ ہوگی اس کی دودھ جیسی رنگت پر اس کے سرخ ہونٹ گلاب سے بھی زیادہ نرم تھے۔ اس کی آنکھوں میں سمندروں کی گہرائیوں سے بھی زیادہ گہرائی تھی۔ اس کے نقوش یونانی تھے۔ اس کی گفتگو میں اتنی مٹھاس تھی کہ شہد بھی کیا ہوگا۔ میں تو مبہوت ہوکر اسے دیکھے جارہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے مجھ پر یہ سارے لمحات فلم بن کر گزر رہے ہوں۔ میں نے اس کی سانسوں کی آواز کے زیر و بم کو بہت قریب سے محسوس کیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

میں اپنے بے ہوش ہونے کو تو بالکل ہی بھول گیا۔ میں نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”آپ مجھے یہاں کیوں لے آئی ہیں؟ جب کہ ہماری ملاقات صرف فیس بک پر ہی ہوئی ہے۔ آپ مجھے مطلع کرکے بھی تو اپنے ساتھ لاسکتی تھیں؟“

نتاشا بولی۔ ”ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے ہی آپ کو کولڈ ڈرنک میں بے ہوشی کی دوا ملا کردی تھی تاکہ آپ کو یہاں لاسکوں۔ دراصل مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ پہلی ملاقات ہی میں میرے ساتھ چلے آئیں گے اور اگر چلے بھی آئیں گے تو میرے بارے میں کیا سوچیں گے جب کہ میں ہر حال میں آپ کو پانا چاہتی ہوں۔ آپ میری منزل ہیں۔ میرے لیے سہانا سپنا ہیں۔ میں آپ سے غائبانہ عشق کرتی ہوں۔ میں آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے ساتھ دبئی چلیں گے ہم وہاں ساری زندگی عیش سے گزاریں گے پلیز پلیز آپ میرے ساتھ چلیں گے ناں؟“

ان لمحات میں، میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان محسوس کررہا تھا۔ جیسے کوئی نواب، جیسے کوئی شہزادہ جو ایسی شہزادی کے ساتھ جو اس پر مرمٹی ہو لیکن میں پھر بھی اس کے قریب نہیں ہو پارہا تھا جب کہ وہ آہستہ آہستہ میرے مزید قریب ہوتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ صوفے کے ایک کنارے سے سرکتے سرکتے میں دوسرے کنارے تک پہنچ گیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ سرکتے سرکتے میرے مزید قریب ہوتی چلی گئی تھی۔ اتنا قریب کہ میں اس کی گرم سانسیں اپنی گردن پر محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کو اس قدر جذباتی ہوتے دیکھ کر میرے بھی اندر کہیں محبت کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ دل تیز دھڑک رہا تھا۔ محبت کا ایک نشہ تھا۔ سرور تھا جو آہستہ آہستہ مجھے جکڑنے لگا تھا لیکن میں شروع دن ہی سے پاکیزہ محبت کا قائل ہوں۔ میں عورت کو ایک سیکس سمبل سمجھنے سے ہمیشہ محفوظ رہا ہوں میرے نزدیک عورت سے ایک حد تک فاصلہ ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ میں عورت سے کسی بیماری یا عارضے کی بنا پر دور رہتا ہوں بلکہ میں عورت کو چراغِ محفل کی بجائے چراغِ خانہ دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی کسی بھی قسم کی مجبوری سے بھی فائدہ اٹھانا بزدلی اور زیادتی سمجھتا ہوں۔ میں ایک دم کھڑا ہوگیا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کر وہ بھی کھڑی ہوگئی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت اس کی جذباتی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اچانک وہ میرے گلے میں جھول گئی۔ اس نے اتنی شدت سے گرم جوشی اور طاقت سے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا کہ میں بھی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ یہ وہ لمحات تھے جب میں بھی بہک گیا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ انسانیت کے مقام سے ہی گر جاتا۔ میں نے اس کی تمام تر پیش رفت کے باوجود اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ”ہم آج نہیں تو کل ضرور ایک ہو جائیں گے ہمارا رشتہ معاشرے کی نظر میں معتبر ہوگا۔ پلیز مجھے اگنور مت کرو۔ مجھے وقت دو میں تمہارے لیے دبئی سے آئی ہوں۔ یہ جگہ، یہ مقام کتنا رومینٹک ہے۔ مجھے اپنی محبت کے سمندر میں ڈوب جانے دو، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نتاشا یہ ٹھیک ہے کہ تم مجھے اتنا چاہتی ہو کہ میری چاہت میں بے اختیار ہوکر دبئی سے چلی آئی ہو اور اب تمام اخلاقی حدود کراس کرکے مجھ میں کھو جانا بھی چاہتی ہو مگر میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں۔ تم بھی مجھے پسند آئی ہو لیکن تم مجھ پر تب ہی حلال ہوگی جب ہمارا نکاح ہوجائے گا۔ میں اس سے پہلے تمہارے ساتھ کسی قسم کی کوئی جذباتی اور غیر اخلاقی حرکت نہیں کرسکتا۔“

یہ سن کر نتاشا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے مجھے پیار سے بستر پر دھکا دیا۔ میں بستر پر لیٹ سا گیا۔ اس نے کہا۔ ”ذرا ٹھہرو میں اپنے لیے اور تمہارے لیے انگوروں کا رس لاتی ہوں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے پھر بے ہوش کرنے کے لیے۔“

اس نے کہا۔ ”کون اپنی جان کو بے ہوش کرنا چاہے گا۔“

جب وہ واپس آئی تو اس ٹرے میں انگوروں کے رس کا بڑا سا ڈبا تھا اور سیل پیک تھا اس نے کہا۔ ”لو یہ جوس خود کھولو اور پہلے مجھے کسی بھی گلاس میں ڈال کردو۔“

میں نے ایک گلاس میں جو میری طرف تھا جوس کا ڈبہ کھول کر جوس اس میں ڈالا اور نتاشا کو دیا جو وہ غٹاغٹ پی گئی۔ اب میں بے فکر ہوگیا تھا کہ اس جوس میں بے ہوش کرنے والی دوا نہیں ہے۔ میں نے دوسرے گلاس میں جوس ڈالا اور پی گیا۔ جوس پیتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سر چکرانے لگا اور مجھے نتاشا دور ہوتی ہوئی مسکراتی ہوئی ہنستی ہوئی دکھائی دی۔ . . . میں ایک بار. . . . پھر بے ہوش ہوگیا تھا جب میری آنکھ دوبارہ کھلی تو میں اپنی ٹیکسی میں بے ہوش پڑا تھا۔ میرے بائیں پہلو میں درد کی شدید ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔ میں نے قمیص اونچی کرکے دیکھا تو بائیں پہلو میں قمیص کے نیچے پٹیاں بندھی ہوئی تھیں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اٹھا۔ درد سے میرا برا حال تھا اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچا مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر کے اسپتال پہنچا تھا لیکن جب میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور جاتے ہی اس کے ساتھ موجود کاؤچ پر لیٹ گیا تو ڈاکٹر نے دوسرے تمام مریضوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے میرا معائنہ کیا تھا۔ یہ بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے کہ کسی نے میرا بایاں گردہ نکال لیا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے اپنے اسپتال میں داخل کرلیا۔ میری فوری ٹریٹمنٹ شروع کردی۔ مجھے ایک گردے کے بغیر ٹھیک ہونے میں دو ماہ لگ گئے تھے۔ مجھے رہ رہ کر وہ خوب صورت ناگن یاد آتی تھی جس کا نام نتاشا تھا لیکن ایک دن جب میں اپنی ٹیکسی چلانے کے قابل ہوا تھا تو ایک عجیب و غریب اور چونکا دینے والا معاملہ سامنے آیا۔ ہوا یوں جیسے ہی میں نے اپنی گاڑی کا ڈیش بورڈ کھولا تو اس میں موٹا تازہ لفافہ موجود تھا میں نے بے صبری سے جب وہ لفافہ کھولا تو اس میں پانچ ہزار روپے کے نوٹوں کی پندرہ گڈیاں موجود تھیں۔ یہ تقریباً پچھتر لاکھ روپے تھے ساتھ ہی ایک خط موجود تھا۔ یہ خط اردو میں تھا جسے کسی کمپیوٹر سے ٹائپ کیا گیا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔ ”پیارے سلمان! میری جان میں واقعی آپ کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں آپ جیسے شریف نوجوان سے مل کر میں نے بے حد مسرت محسوس کی ہے۔ آج جب کہ ہر قدم پر ہوس کا جال بچھا ہوا ہے تو میں نے تمہاری طرف ہوس سے مجبور ہوکر پیش قدمی کی لیکن تم نے میرے حسن سے متاثر ہونے کے باوجود کوئی غیر اخلاقی حرکت کرنا پسند نہیں کی۔ ہمارا گروہ گردوں کی فروخت کا کام کرتا ہے ہم مجبور لوگوں سے بھی اور بالخصوص تمہارے جیسے صحت مند، نایاب خون کے گروپ رکھنے والے لوگوں سے جائز و ناجائز طریقے استعمال کرکے گردے حاصل کرتے ہیں اور بیرونِ ملک فروخت کردیتے ہیں، یقین کرو تمہارے گردے کے 75 لاکھ روپے ہی ہم نے وصول کیے تھے جو ہم تمہیں دے رہے ہیں مجھے یقین ہے تم مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے ہوگے لیکن میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوچکی ہوں لیکن تم سے دور رہنے پر بھی مجبور ہوں۔“

تمہاری نتاشا!

# امانت

محترم و مکرم معراج رسول

السلام علیکم

ہر انسان کے اندر ایک اور انسان ہوتا ہے خود ہی فیصلہ کرنے والا لوگ اسے ضمیر کہتے ہیں۔ ضمیر کی بازیگری کس قدر ہوش اڑانے والی ہوتی ہے یہ میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے۔ جی ہاں میری اپنی زندگی میں، یہ قصہ میرا اپنا ہے اسی لیے میں نے اپنا اصل نام اور اپنے شوہر کا مخفی رکھا ہے۔ صرف ضمیر کے آگے مجبور ہو کر میں اپنا یہ اہم واقعہ سنا رہی ہوں۔ اگر پسند آجائے تو سرگزشت میں لگا دیں۔

شائستہ

(کراچی)

اس روز میں صبح سے ہی مصروف تھی حالانکہ مجھے کام کرنے کا دورہ کبھی کبھی پڑتا ہے ورنہ گھر کے کام کاج کے لیے میں نے دو ملازمائیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک کھانا پکانے اور دوسری گھر کی صفائی، برتن اور کپڑے دھونے پر مامور ہے۔ ہم دو میاں بیوی ہیں، اس لیے کام بھی کچھ زیادہ نہیں۔ ملازمائیں خوش رہتی ہیں کیونکہ میں انہیں کام کے مقابلے میں کافی زیادہ تنخواہ دیتی ہوں۔ کھانا پکانے والی صبح دس بجے آتی ہے اور دونوں وقت کا کھانا بنا کر چلی جاتی



ہے۔ البتہ شام کو روٹیاں میں اپنے ہاتھ سے پکاتی ہوں کیونکہ عاطف کو گرم روٹی کھانے کی عادت ہے۔ اسی طرح صبح کا ناشتا بھی میں ہی بناتی ہوں جو عموماً سلائس اور آملیٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔ عاطف کو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پسند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کروں۔ اس طرح انہیں مجھ سے دو چار باتیں کرنے کا موقع مل جاتا ہے ورنہ دن بھر تو وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہوتا۔ وہ عموماً دیر سے گھر آتے ہیں اور رات کو کھانا کھانے کے بعد پھر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے تھوڑا وقت مل جائے تو وہ ٹی وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ البتہ اتوار کا دن میرے لیے مخصوص ہے۔ اس روز وہ کوئی کام نہیں کرتے اور سارا دن میرے ساتھ گزارتے ہیں۔ اگر کہیں جانے کے لیے کہوں تو انکار نہیں کرتے اور اگر کوئی پروگرام نہ ہو تو ہم رات کا کھانا باہر کھاتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی کام کی۔ صبح کے ناشتے اور رات کی چار روٹیاں پکانے کے علاوہ میرے پاس کوئی مصروفیت نہیں۔ اس لیے دن بھر ٹی وی دیکھتی یا رشتے داروں اور سہیلیوں سے فون پر بات کرتی ہوں۔ اسی وجہ سے تھوڑی سی کاہل اور سست بھی ہو گئی ہوں لیکن جب کام کرنے پر آجاؤں تو میری پھرتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں نمٹا دیتی ہوں، وہ بھی ایسا ہی ایک خاص دن تھا۔ اس روز میری خالہ زاد بہن شائلہ نواب شاہ سے آرہی تھی۔ اب اسے میرے پاس ہی رہنا تھا۔ دراصل پچھلے دنوں میں اپنے ماموں زاد بھائی کی شادی کے سلسلے میں نواب شاہ گئی تو مجھے خالہ کے حالات کا علم ہوا۔ اس وقت تک ہمیں یہی معلوم تھا کہ وہ ایک خوش حال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ خالو ٹھیکے دار تھے اور ان کے گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور سب بچے پڑھ رہے تھے لیکن کچھ دنوں سے خالو کے مالی حالات بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور ان کا کام مندا چل رہا تھا۔ کبھی کوئی چھوٹا موٹا ٹھیکا مل جاتا تو چار دن اچھے گزر جاتے ورنہ تنگی ترشی سے گزارہ کرنا پڑتا۔ دراصل خالو کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا جو کماتے وہ خرچ کر دیتے۔ انہوں نے کبھی کچھ بچانے کی کوشش نہیں کی۔ خالہ گھر کے خرچ میں سے کمیٹی ڈال کر کچھ جوڑ جمع کر لیتیں تا کہ کسی ضرورت کے وقت وہ پیسا کام آجائے۔

یہ سب باتیں مجھے نواب شاہ جا کر معلوم ہوئیں۔ سب سے زیادہ افسوس یہ سن کر ہوا کہ مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے خالو نے شائلہ کی پڑھائی ختم کروا دی تھی اور وہ انٹر کرنے کے بعد گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ خالو ویسے بھی کچھ قدامت پسند واقع ہوئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ زیادہ پڑھ لکھ کر انہیں کیا کرنا ہے۔ شادی کے بعد تو ہانڈی چولہا ہی کریں گی۔ اس معاملے میں خالہ بھی ان کی ہم خیال تھیں اور کہتی تھیں کہ جو پیسا لڑکیوں کی پڑھائی پر خرچ ہوتا ہے وہ ان کا جہیز بنانے کے کام آئے گا جب کہ شائلہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے رو رو کر مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ اس کے انٹر میں بہت اچھے نمبر آئے تھے اور اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو سکتا تھا لیکن گھر والے نہیں مانے۔ وہ ڈاکٹر تو نہ بن سکی لیکن اس کے دل میں آگے بڑھنے کی لگن تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم ماسٹرز ہی کر لے۔

یہ سب سننے کے بعد مجھے شائلہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی اور میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن بات آگے بڑھانے سے پہلے ضروری تھا کہ میں عاطف کی رضامندی حاصل کروں۔ رات کو میں نے انہیں فون کیا تو مجھے ان کی جانب سے گرین سگنل مل گیا۔ اس کے بعد میں نے خالہ اور خالو کو پیشکش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو شائلہ کو میرے پاس کراچی بھیج دیں۔ میں اسے پڑھاؤں گی اور اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گی۔ خالہ تو فوراً تیار ہو گئیں لیکن خالو اس تجویز کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے وہی پرانی بات دہرائی کہ لڑکیوں کو اتنا پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ ان کی قسمت میں تو روٹی ہانڈی اور بچے پالنا ہی لکھا ہے لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو وہ ملازمت کر کے مرد کا بوجھ بانٹ سکتی ہے۔ بڑی مشکل سے خالو کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی اور وہ اس شرط پر تیار ہوئے کہ اگر اس دوران شائلہ کا کوئی رشتہ آگیا تو وہ فوراً اس کی شادی کر دیں گے اور اس کی تعلیم ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی اور طے پایا کہ یونیورسٹی کا نیا سیشن شروع ہونے پر شائلہ میرے پاس کراچی آجائے گی۔

شائلہ کو دوہری خوشی ملی تھی۔ ایک تو یہ کہ اس کا تعلیمی سلسلہ بحال ہو رہا تھا دوسرے یہ کہ وہ کراچی جیسے شہر میں میرے پاس رہے گی۔ جہاں کا ماحول اس کے پینڈو نما گھر

سے کہیں بہتر تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے گھر میں آسائش کی ہر چیز میسر تھی اور وہ بڑے آرام سے میرے ساتھ رہ سکتی تھی۔ میں نے اس کے لیے اپنے برابر والا کمرا تیار کروا دیا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ اس کمرے کا قالین اور پردے سب بدل ڈالے اس کے لیے ایک خوب صورت سی رائٹنگ ٹیبل، ڈریسنگ ٹیبل، وارڈروب اور کمپیوٹر وغیرہ سب مہیا کر دیا۔ عاطف تو اس کے کمرے میں ایک چھوٹا ٹیلی وژن بھی رکھنا چاہ رہے تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ یہ اس کے پڑھنے کے دن تھے اگر وہ ٹیلی وژن دیکھنے بیٹھ جاتی تو اس کی پڑھائی متاثر ہو سکتی تھی۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دس بج رہے تھے۔ جس ٹرین سے شمائلہ کو آنا تھا۔ وہ بارہ بجے پہنچتی تھی۔ کھانا پکانے والی آ گئی تھی۔ میں نے اسے دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دیں اور خود نہانے چلی گئی۔ عاطف نے گاڑی بھیج دی تھی اور اب مجھے شمائلہ کو لینے کینٹ اسٹیشن جانا تھا۔ ٹرینوں کی آمد میں عموماً تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلی اور بارہ بجے سے کچھ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئی۔ اتفاق سے ٹرین بھی آ گئی تھی۔ شمائلہ کے ساتھ اس کا بڑا بھائی امجد بھی آیا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں ان دونوں کو لے کر گھر آ گئی۔ وہ دونوں بہن بھائی پہلی بار کراچی آئے تھے۔ اس لیے راستے کی گہما گہمی اور ٹریفک دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ گھر پہنچ کر میں نے ان دونوں کو فریش ہونے کے لیے کہا اور ملازمہ سے کہہ کر ان کے لیے ہلکا سا ریفریشمنٹ تیار کروایا۔ دوپہر کے کھانے کی میز پر امجد نے کہا کہ وہ شام کی گاڑی سے واپس چلا جائے گا۔ کیونکہ اسے دوسرے روز یونیورسٹی جانا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا اور کہنے لگا کہ وہ اپنی پڑھائی کا حرج نہیں کر سکتا۔ مجبوراً میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے اسٹیشن چھوڑ آئے۔

شمائلہ اپنا کمرا اور میرا گھر دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ اس نے کبھی ایسی پُرآسائش زندگی کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ وہ بہت سیدھی اور پُرخلوص لڑکی تھی اور اپنی سادگی میں بعض اوقات سوچے سمجھے بغیر بول جاتی تھی۔ رات کے کھانے پر عاطف بھی موجود تھے۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور شمائلہ سے اس کے پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگے جب شمائلہ نے انہیں بتایا کہ وہ کیمسٹری میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے اسے بی بی اے میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا اور بولے۔ ”آج کل پروفیشنل ڈگری کی زیادہ مانگ ہے اگر بی بی اے یا ایم بی اے کر لوگی تو تمہارا مستقبل سنور جائے گا۔“

”لیکن عاطف بھائی میں نے تو سائنس پڑھی ہے کیا مجھے داخلہ مل جائے گا۔“

”کیوں نہیں، تم ٹیسٹ میں بیٹھ جاؤ۔ ابھی تمہارے پاس تیاری کے لیے وقت ہے۔“

دوسرے روز میں شمائلہ کو اپنے ساتھ گھر کے قریب واقع ایک انسٹی ٹیوٹ میں لے گئی۔ جہاں بی بی اے کے ٹیسٹ کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ انہوں نے اس سے چند بنیادی سوالات کیے اور اسے داخلہ دے دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ دو مہینے میں اتنی تیاری کروا دیں گے کہ وہ با آسانی ٹیسٹ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگلے دن سے شمائلہ نے انسٹی ٹیوٹ جانا شروع کر دیا اور زور و شور سے ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی۔

اس روز ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ وہ صبح چھ بجے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں سات بجے کے قریب ناشتا بنانے کچن میں گئی تو وہ لاؤنج میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی کچن میں آ گئی اور بولی۔ ”باجی میں آپ کی کچھ مدد کروں۔“

”ارے نہیں رہنے دو، کام ہی کتنا ہے صرف چائے اور آملیٹ ہی تو بنانا ہے۔“

”اور پراٹھے؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”نہیں ہمارے یہاں پراٹھے کوئی نہیں کھاتا۔ ڈبل روٹی سے ہی کام چل جاتا ہے اگر تم کہو تو تمہارے لیے پراٹھے بنا دوں۔“

”نہیں مجھے بھی کوئی ایسا شوق نہیں ہے۔ البتہ ہمارے گھر میں سب لوگ ناشتے میں پراٹھے ہی لیتے ہیں۔ امی بے چاری پکاتے پکاتے تھک جاتی ہیں۔ میرے آنے کے بعد ان پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہوگا۔“

”ہاں یہ تو ہے جہاں افراد زیادہ ہوں وہاں کام بھی زیادہ ہوتا ہے۔“

”باجی ایک بات پوچھوں، اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔“ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ضرور پوچھو۔ میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گی۔“

”آپ کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی



تک بے اولاد ہیں، آپ نے کوشش نہیں کی یا کوئی اور مسئلہ ہے؟“

”تمہارے دونوں ہی اندازے غلط ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اولاد کی شدید خواہش ہے اور ہم دونوں اپنا معائنہ بھی کروا چکے ہیں۔ سب رپورٹس نارمل ہیں اور بظاہر کوئی خرابی نہیں۔ بس اوپر سے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ مجھے افسردہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی اور گھبراتے ہوئے بولی۔ ”سوری باجی میرا مقصد آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا۔ میں نے تو بس یونہی ایک بات پوچھ لی تھی۔“

”کوئی بات نہیں شمائلہ۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں یہ دکھ تو میری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ بس میرے لیے دعا کرو کہ میری یہ محرومی جلد از جلد دور ہو جائے۔“

”انشاء اللہ۔“ اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”باجی! آپ مایوس نہ ہوں۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

شمائلہ نے انسٹی ٹیوٹ جانا شروع کر دیا اور پوری طرح ٹیسٹ کی تیاری میں لگ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں تھے اور جو چند جوڑے وہ اپنے ساتھ لائی تھی وہ بھی معمولی قیمت اور پرانے فیشن کے تھے جب کہ وہ جس انسٹی ٹیوٹ میں جا رہی تھی وہ پوش علاقے میں واقع تھا اور وہاں آنے والے اسٹوڈنٹ انتہائی ماڈرن اور فیشن ایبل تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ ان لوگوں میں بیٹھ کر احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ اسے ایک روز اپنے ساتھ لے کر بازار گئی اور اسے جدید وضع کے پانچ چھ بیش قیمت سوٹ دلوائے۔ پھر ایک بیوٹی پارلر میں لے جا کر اس کے چہرے کا فیشل اور ہیئر ڈریسنگ کروائی۔ شام کو عاطف گھر آئے تو وہ بھی اس کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں نے اس کے لیے کچھ انگلش میگزین اور انگریزی زبان سکھانے کے کیسٹ منگوائے اور اس سے کہا کہ وہ اپنی انگریزی بہتر بنائے۔ وہ چھوٹے شہر سے آئی تھی۔ اس لیے اسے جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے میں تھوڑی سی دشواری ہو رہی تھی۔ اس لیے میں اس کی گرومنگ پر زیادہ توجہ دینے لگی۔ میں اسے ایک ماڈرن لڑکی کے روپ میں دیکھنا چاہ رہی تھی تاکہ اسے کسی بھی مرحلے پر احساسِ کمتری نہ ہو۔

شمائلہ نے یونیورسٹی کا انٹری ٹیسٹ پاس کر لیا اور اسے با آسانی بی بی اے میں داخلہ مل گیا۔ وہاں کی سمسٹر فیس اتنی زیادہ تھی کہ خالو سارا سال بچت کر کے بھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے لیکن میں نے اس کی بالکل پروا نہیں کی کیونکہ اسے اپنی ذمے داری پر لے کر آئی تھی۔ اس لیے اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا بھی مجھ پر لازم تھا۔ میں نے اس کے آنے جانے کے لیے وین بھی لگوا دی تھی تاکہ وہ بسوں کے دھکے کھانے سے بچ جائے۔ میں اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھ رہی تھی۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ مکمل سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کر لے تاکہ میں خالہ اور خالو کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔

اس نے کبھی خواب میں بھی ان آسائشوں کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ شہزادیوں کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ صبح یونیورسٹی جاتی، دو ڈھائی بجے واپس آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی اور پھر پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ اسے کام کرنے کی عادت تھی لیکن میرے گھر میں اس کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ شام کو روٹیاں بنا دیا کرے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ میں اسے گھر کے کاموں سے دور رکھنا چاہتی تھی اور میری خواہش تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھے۔ اسے کوکنگ کا بہت شوق تھا۔ میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ اپنی پسند کی ڈش بنا سکتی ہے۔ اب اس کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ آ گیا تھا۔ وہ ٹی وی اور رسالوں سے نئے نئے کھانے بنانے کی ترکیبیں سیکھتی اور چھٹی والے دن ان کا تجربہ کرتی اس کی بنائی ہوئی ڈشیں بے حد مزے دار ہوتیں اور عاطف کی زبان تو تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔

وہ میری بہت احسان مند تھی اور اکثر کہا کرتی۔ ”باجی آپ میرے لیے جو کچھ کر رہی ہیں وہ تو کوئی سگی بہن بھی نہیں کرتی۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ تو کبھی نہیں اتار سکتی لیکن دعاؤں میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

میں اس کی باتیں سن کر شرمندہ ہو جاتی اور کہتی۔ ”گڑیا میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض ادا کر رہی ہوں اگر میرے بچے ہوتے تو ان کی تعلیم کا خرچ اس سے بھی زیادہ ہوتا۔ بس تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ میں سمجھوں گی کہ تم نے میرا قرض چکا دیا۔“

دن یونہی گزرتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے چار

سال بیت گئے۔ اس کا بی اے مکمل ہو گیا تھا اور خالو چاہتے تھے کہ وہ نواب شاہ واپس آجائے تا کہ وہ کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر سکیں لیکن شائلہ نے انکار کر دیا۔ وہ کراچی میں رہ کر کوئی ملازمت کرنا چاہتی تھی تا کہ اپنے گھر والوں کی مالی مدد کر سکے۔ اس کے دو بڑے بھائی امجد اور ارشد برسر روزگار تھے لیکن شادیاں کر کے الگ ہو گئے تھے اور ان سے خالو کو کوئی سپورٹ نہیں مل رہی تھی۔

شائلہ نے ملازمت ڈھونڈنا شروع کر دی لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ شہر میں جگہ جگہ پرائیویٹ یونیورسٹیاں کھل گئی تھیں جو تھوک کے حساب سے ڈگریاں بانٹ رہی تھیں۔ اس لیے مقابلہ سخت ہو گیا تھا۔ دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے تو وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی۔ ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ اسے اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ عاطف کا اپنا کاروبار تھا اور ان کے دفتر میں اس کے لیے باآسانی جگہ نکل سکتی تھی میں نے عاطف سے ذکر کیا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ گھر کے لوگوں کو دفتر کے معاملات سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں اس پر راضی کیا کہ وہ شائلہ کو اپنے دفتر میں عارضی ملازمت دے دیں تا کہ اسے کچھ تجربہ ہو جائے۔ اس دوران وہ دوسری جگہ ملازمت کی تلاش جاری رکھے گی اور جیسے ہی اسے کامیابی ملے گی۔ وہ یہ جاب چھوڑ دے گی۔

عاطف نے اس سلسلے میں تین شرطیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ وہ دفتر میں کسی پر عاطف سے اپنی رشتے داری ظاہر نہیں کرے گی اور اسے ملازمت حاصل کرنے کے لیے انٹرویو کے مرحلے سے گزرنا ہو گا۔ دوسری یہ کہ وہ دفتر کی باتیں گھر میں نہیں کرے گی اور تیسری عجیب و غریب شرط یہ تھی کہ وہ عاطف کے ساتھ دفتر نہیں جائے گی بلکہ اسے اپنی سواری کا بندوبست خود کرنا ہو گا۔ مجھے یہ شرط سن کر بہت غصہ آیا۔ بھلا یہ کیا تک ہوئی کہ گھر کی گاڑی ہوتے ہوئے وہ سواری کے حصول کے لیے پریشان ہو۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ملازمت مل جائے تو اپنے اکاؤنٹ سے اسے ایک گاڑی خرید کر دے دوں گی۔

عاطف بھی پورے بیورو کریٹ تھے۔ انہوں نے شائلہ سے کہا کہ وہ ان کے دفتر میں جاب کے لیے اپلائی کرے اور اپنی درخواست کوریئر کے ذریعے بھیج دے۔ شائلہ نے ایسا ہی کیا اور ایک ہفتے بعد ہی اسے انٹرویو لیٹر مل گیا۔ عاطف اس دوران یوں لاتعلق بنے رہے جیسے وہ کسی دوسری کمپنی میں انٹرویو دینے جا رہی ہو۔ اس انٹرویو میں وہ کامیاب ہو گئی اور اسے چالیس ہزار روپے ماہانہ پر ملازمت مل گئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انٹرویو لینے والوں میں عاطف بھی شامل تھے لیکن انہوں نے گھر آکر بتایا کہ شائلہ نے اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل بوتے پر یہ ملازمت حاصل کی ہے اور انہوں نے اسے کوئی فیور نہیں دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے شائلہ سے یہ بھی کہا کہ وہ دوسری ملازمت کے حصول کے لیے اپنی کوشش جاری رکھے کیونکہ یہ ایک عارضی انتظام ہے اور اسے یہ ملازمت صرف اس لیے دی گئی ہے کہ وہ کچھ تجربہ حاصل کر سکے۔

شائلہ چاہتی تھی کہ وہ ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے دو تین روز کے لیے نواب شاہ چلی جائے کیونکہ بعد میں اس کے لیے چھٹی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ عاطف نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن وہ ڈسپلن کی بہت پابندی کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے شائلہ کو بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ جنرل منیجر کو فون کر کے مطلع کر دے کہ کب ڈیوٹی پر حاضر ہو سکتی ہے۔

خالہ اور خالو کو جب معلوم ہوا کہ اسے اتنی اچھی ملازمت مل گئی ہے تو ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شائلہ کے دن یوں پھر جائیں گے۔ البتہ شائلہ کے بھائیوں کے چہرے لٹک گئے اور وہ اس سے حسد محسوس کرنے لگے۔ بڑے بھائی امجد نے تو زور و شور سے اس ملازمت کی مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ شائلہ کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔ لہٰذا اسے واپس اپنے گھر آجانا چاہیے۔ آخر ہم کب تک دوسروں کا احسان لیتے رہیں گے لیکن خالو نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ وہ شائلہ کی ترقی سے جل کر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے کام سے کام رکھے اور دوسروں کے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائے۔

شائلہ کو پہلی تنخواہ ملی تو وہ گھر کے لیے بہت سی چیزیں خرید کر لائی۔ جن کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ اس وقت تو میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں اسے سمجھایا کہ وہ اس طرح پیسے ضائع نہ کرے۔ وہ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ گھر بھیجتی رہے اور بقیہ پیسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے تا کہ وقت پڑنے پر اس کے کام آسکیں۔ ملازمت کرنے کے بعد اس کی شخصیت میں مزید نکھار آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چار سال پہلے والی شائلہ ہے جسے نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ تھا اور نہ ہی وہ چار



لوگوں میں بیٹھ کر بات کر سکتی تھی۔ اب وہ جدید فیشن کا لباس پہنتی۔ اس کی سنگھار میز قیمتی میک اپ کے سامان سے بھری ہوتی۔ اسے مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ وہ ہر مہینے دو چار کتابیں خرید کر لاتی اور فارغ وقت میں انہیں پڑھتی رہتی۔ میں نے اسے گاڑی دلوانا چاہی لیکن اس نے منع کر دیا کہ وہ کراچی کے ٹریفک میں ڈرائیونگ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے وین ہی ٹھیک ہے۔

چھ مہینے گزر گئے لیکن اسے کوئی دوسری ملازمت نہیں ملی اور نہ ہی میں نے اسے اس سلسلے میں کوئی کوشش کرتے دیکھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن سے مطمئن ہے لیکن میں اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ کسی بھی وقت عاطف اسے ملازمت سے جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی کوئی دوسری جاب تلاش کر لے۔ اس بارے میں ایک دن اسے ٹٹولا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ واقعی سنجیدہ نہیں تھی چنانچہ میں نے اسے بروقت آنے والے حالات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"شائلہ! تمہیں یاد ہے کہ عاطف نے عارضی طور پر تمہیں یہ جاب دی تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم دوسری ملازمت کی تلاش میں سنجیدہ نہیں ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی روز تمہیں یہاں سے جواب مل جائے۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔ "باجی آپ فکر نہ کریں۔ ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے جنرل منیجر سرفراز صاحب میرے کام سے بہت خوش ہیں بلکہ وہ تو کہہ رہے تھے کہ ایک سال پورا ہو جائے تو وہ میری تنخواہ میں اضافہ کی سفارش کریں گے۔"

مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔ "دیکھو بی بی یہ لوگ اپنے ماتحتوں سے کام لینے کے لیے ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن تم عاطف کے مزاج کو نہیں جانتیں۔ جس دن انہیں یاد آگیا کہ تمہیں عارضی طور پر ملازمت دی گئی تھی۔ وہ فوراً تمہاری چھٹی کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ جو کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کے بعد اس نے اخبار میں ملازمتوں کے اشتہار باقاعدگی سے دیکھنا شروع کر دیے۔ دو چار جگہ درخواست بھی دی لیکن بات نہیں بنی۔ اس بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر میں نے ایک دن عاطف سے بات کی اور بتایا کہ شائلہ کو کوشش کے باوجود ابھی تک دوسری ملازمت نہیں ملی اور وہ اس وجہ سے بہت پریشان ہے۔

"کیوں، اسے یہاں کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ہی تو کہا تھا کہ یہ ایک عارضی انتظام ہے اور اسے جلد ہی دوسری ملازمت تلاش کرنا ہو گی۔"

"وہ بات پرانی ہو گئی۔ اب اس نے کمپنی میں اپنی جگہ بنا لی ہے اور اس کی کارکردگی کی رپورٹس حوصلہ افزا ہیں۔ اس لیے فی الحال اس کی جاب کو کوئی خطرہ نہیں۔"

یہ سن کر میں مطمئن ہو گئی اور اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی اب میری ذمے داری ختم ہو چکی تھی۔ اسے جس مقصد سے کراچی لے کر آئی تھی وہ پورا ہو گیا تھا اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ انہی دنوں خالہ کا فون آیا۔ وہ اس کی شادی کے بارے میں فکرمند تھیں۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی تھیں لیکن شائلہ کے لیے تا حال کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔ خالہ نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"وہ ایف اے پاس ہی ٹھیک تھی۔ کم از کم خاندان برادری میں اس کے جوڑ کا رشتہ تو مل جاتا۔ اب وہ پڑھ لکھ کر بڑی افسر بن چکی ہے۔ اس کے لیے ڈپٹی کمشنر کہاں سے لاؤں۔ اب تم ہی اس کے لیے کراچی میں کوئی رشتہ دیکھو۔"

مجھے ان کی باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ میرا احسان ماننے کی بجائے الٹا مجھ کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں۔ میں نے اس پر جو پیسا خرچ کیا، اس پر محنت کی، چھوٹی بہن کی طرح اس کا خیال رکھا۔ وہ سب خاک میں مل گیا۔ صرف اس لیے کہ میں اس کو کراچی لے آئی تھی جس کی وجہ سے اس کی شادی نہ ہو سکی۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آگیا۔ کیا ضرورت تھی مجھے خدائی فوجدار بننے کی۔ اچھا تھا شائلہ نواب شاہ میں ہی رہتی اور کسی پرچون فروش یا چھوٹے موٹے کاریگر کی بیوی بن کر ہر سال بچے جن رہی ہوتی۔ تاہم میں نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور بڑے تحمل سے بولی۔ "خالہ آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے مجھے یہ ذمے داری سونپی ہے۔ انشاء اللہ اسے بھی پورا کر کے دکھاؤں گی۔"

"اور بی بی لڑکے والوں کو پہلے ہی بتا دینا کہ ہم زیادہ جہیز نہیں دے سکتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں وہ پھیل جائیں۔"

مجھے بہت زور کی ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔ "خالہ رشتہ تو ہونے دیں جہیز کی بات بھی ہو جائے گی اور ویسے

آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ماشاء اللہ شمائلہ اس قابل ہے کہ وہ اپنا جہیز خود بنا سکے۔''

اس کے بعد میں نے شمائلہ کی شادی کا بیڑا اٹھا لیا لیکن اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ضروری تھا کہ شمائلہ سے اس کی مرضی معلوم کرلی جائے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی کو چاہتی ہو۔ چنانچہ میں نے ایک روز شام کی چائے پر اسے گھیر لیا۔ اس کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی اور وہ ساڑھے پانچ بجے تک گھر آجاتی تھی جب کہ عاطف کی واپسی دیر سے ہوتی تھی اور وہ عموماً سات آٹھ بجے تک گھر آتے تھے۔

''شمائلہ! تمہاری تعلیم مکمل ہو گئی۔ ماشاء اللہ برسرروزگار بھی ہو، اب آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''سوچ رہی ہوں کہ ایگزیکٹو ایم بی اے کرلوں۔ اس کی کلاس صرف اتوار کو ہوتی ہے۔''

''میں تمہارے کیریئر نہیں بلکہ آیندہ زندگی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ شادی کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''وقت آنے پر شادی بھی ہو جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری اپنی بھی کوئی سوچ ہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''پسند کرتی تھی لیکن اب اس نے بھی راستہ بدل لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ میرے چچا کا بیٹا جمیل ہے۔ ہم بچپن سے ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور سب خاندان والے یہی سمجھ رہے تھے کہ میری شادی جمیل سے ہی ہو گی۔ ہمارے ددھیال میں پڑھائی کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے جمیل نے بھی اپنے بزرگوں کی تقلید کی اور میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ اس کے دماغ میں باہر جانے کی دھن سوار تھی۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوئی ٹیکنیکل ڈپلومہ کرلے تاکہ اسے مڈل ایسٹ میں کوئی اچھی جاب مل سکے لیکن وہ ایجنٹوں کے چکر میں پڑ گیا تھا جو لاکھ دو لاکھ لے کر ویزے کا بندوبست کیا کرتے تھے اور ملازمت دلانے کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے بھی میرے کراچی آنے کی مخالفت کی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ پڑھ لکھ کر میں اس سے دور ہو جاؤں گی لیکن اس وقت مجھ پر تعلیم حاصل کرنے کا جنون سوار تھا۔

اس لیے میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی اور کراچی آگئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ اس نے ویزے کے لیے پیسے جمع کرنے کی خاطر چچا کے ساتھ دکان پر بیٹھنا شروع کردیا۔ وہ باہر تو نہ جا سکا لیکن دو سال بعد چچا نے اس کی شادی کردی۔ سنا ہے کہ چچی اس کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئی تھیں لیکن امی نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ دونوں کی تعلیمی قابلیت اور لائف اسٹائل میں بہت فرق ہے۔ اس لیے یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ اب وہ پرچون کی دکان چلا رہا ہے اور اس کی بیوی اس عرصے میں دو بچوں کی ماں بن چکی ہے۔''

''بہت افسوس ہوا۔ تمہاری ناکام محبت کی داستان سن کر۔'' میں نے بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ ''ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اس کا تمہارے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تھا۔''

''جی ہاں سب یہی کہتے ہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لیکن بچپن کی محبت کو بھلانا اتنا آسان نہیں۔ آج بھی اس کی یاد آتی ہے تو دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے۔''

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب گزری باتوں کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم جوان، خوب صورت، پڑھی لکھی اور برسرروزگار ہو۔ تمہارے لیے رشتوں کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔ اب تم یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ دیکھنا کتنی اچھی جگہ تمہاری شادی کرواتی ہوں۔''

''آپ میرے لیے کیا کیا کریں گی۔'' وہ چہرے پر پھیکی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''پہلے ہی مجھ پر آپ کے بہت احسانات ہیں۔ میں شاید ہی ان کا بدلہ چکا سکوں۔''

''تم بار بار ایسی باتیں کرکے مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا اور آیندہ بھی اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر ہی تمہارے لیے کچھ کروں گی۔''

میں نے دوسرے دن سے اپنی ملنے جلنے والیوں سے شمائلہ کے رشتے کے لیے کہنا شروع کردیا۔ عاطف کا خاندان بہت بڑا تھا لیکن وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید ان کے دفتر میں شمائلہ کے جوڑ کا کوئی لڑکا ہو۔ یہی سوچ کر میں نے ان کے سامنے یہ ذکر چھیڑا تو وہ بھنا اٹھے اور بولے۔

''کیا سمجھ رکھا ہے تم نے۔ میں نے کوئی شادی دفتر کھول رکھا ہے کہ تمہاری بہن کے لیے رشتہ تلاش کروں۔''

''یہ میں نے کب کہا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کی نظر میں کوئی مناسب لڑکا ہو تو مجھے بتا دیں۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گی۔''

''اول تو میرے دفتر میں اتنے زیادہ لوگ کام نہیں کرتے اور جو تھوڑے بہت مرد ہیں وہ غالباً سبھی شادی شدہ ہیں اور اگر ایک آدھ کنوارا ہوا تو میں اس سے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ شمائلہ سے شادی کرلے۔ تم کسی شادی دفتر سے رابطہ کیوں نہیں کرتیں۔''

''مجھے ان پر اعتبار نہیں۔ سنا ہے کہ یہ لوگ رجسٹریشن کے نام پر بھاری فیس ایڈوانس میں لے لیتے ہیں اور دو چار ڈی رشتے دکھانے کے بعد خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔''

''سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سرفراز صاحب کی بیٹی کی شادی بھی میرج بیورو کے ذریعے ہوئی ہے۔ وہ ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش ہے۔''

''اچھا دیکھوں گی۔'' میں نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ میں اپنی کوششوں میں لگی ہوئی تھی لیکن ابھی تک اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل سکا تھا۔ اسی دوران میں نے ایک بات نوٹ کی کہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش رہنے لگی ہے۔ کتابوں سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی اور وہ زیادہ وقت ٹی وی دیکھتے ہوئے گزار دیتی تھی۔ میں نے اکثر اسے تنہائی میں گنگناتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ اس کی زندگی میں کوئی مرد آگیا ہے۔ لڑکیاں عموماً اس کیفیت میں اس وقت مبتلا ہوتی ہیں جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگئی کہ وہ کون خوش نصیب ہے جس نے شمائلہ کے دل میں جگہ بنالی ہے لیکن میں نے اس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ خود ہی مجھے بتا دے گی۔

انہی دنوں ایک اور غیر معمولی بات دیکھنے میں آئی۔ وہ وین سے دفتر آتی جاتی تھی۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ واپسی میں عاطف کے ساتھ آنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک لڑکی جاب چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اس کے حصے کا کام بھی اسی کو دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے کبھی کبھی دیر تک رکنا پڑ جاتا ہے تو وہ عاطف کے ساتھ واپس آجاتی ہے۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک چلتا رہا تو مجھے کچھ شک ہونے لگا کیونکہ اب شمائلہ تقریباً روزانہ ہی عاطف کے ساتھ واپس آنے لگی تھی اور یہ ایسی بات نہ تھی کہ اسے نظرانداز کردیا جاتا۔

عاطف یا شمائلہ سے بات کرنے سے پہلے میں نے اپنے طور پر انکوائری کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز جب شمائلہ وین سے واپس نہیں آئی تو میں نے چھ بجے کے قریب اس کے دفتر فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ گویا دفتر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں آٹھ بجے کے قریب گھر واپس آئے لیکن میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے جب بھی پانچ بجے کے بعد دفتر فون کیا تو وہاں فون اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ جب کہ وہ دونوں ساڑھے سات آٹھ بجے کے قریب واپس آرہے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ عاطف اور شمائلہ دفتر سے نکلنے کے بعد دو ڈھائی گھنٹے کہیں جا کر

## بحر منجمد شمالی
## (Arctic Ocean)

یہ یوریشیا اور شمالی امریکا کے شمالی ساحل سے گھرا ہوا ہے اور آبنائے بیرنگ کے ذریعے بحر الکاہل سے ملتا ہے۔ رقبہ: 5,440,000 مربع میل، اوسط گہرائی 13 ہزار فٹ اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 18,456 فٹ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کا حجم بحر الکاہل کے حجم کا بیسواں حصہ ہے۔ بحر منجمد شمالی کے ساحل زیادہ تر برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور غیر آباد ہیں، تاہم چند بندرگاہیں ایسی ہیں جہاں کچھ تجارتی رونق دکھائی دیتی ہے۔ بحر منجمد شمالی کے مشہور جانور والرس، سیل اور آبی پرندے ہیں۔

یہ مندرجہ ذیل بحیروں پر مشتمل ہے۔ بحیرہ بیوفورٹ (Beaufort Sea)، گرین لینڈ، بحیرہ نارویجین، بحیرہ بیرنٹس، بحیرہ (Barents Sea)، کارا، بحیرہ (Kara Sea)، لیپٹیو، بحیرہ (Lecptev Sea)، ایسٹ سائبیرین، بحیرہ، چوکچی، بحیرہ (Chukchi Sea)۔ بحیرہ منجمد شمالی ایٹمی آبدوزوں کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن یہاں تجربات بھی برابر جاری رکھے جاتے ہیں۔

مرسلہ: محمد وہاب الدین انصاری۔ پاک پتن

گزارتے ہیں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے عاطف سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میرے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور ایک دن عاطف نے خود ہی ناشتے کی میز پر یہ قصہ چھیڑ دیا۔ عام طور پر وہ ناشتے کے فوراً بعد دفتر کے لیے روانہ ہوجاتے تھے لیکن اس دن وہ کافی دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھے رہے میں جب ناشتے کے برتن اٹھانے لگی تو وہ گھمبیر لہجے میں بولے۔

''شائستہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

میں چونک گئی۔ ایسی کیا بات ہوسکتی ہے جس کے لیے انہوں نے صبح کے وقت کا انتخاب کیا۔ میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''کہیے کیا بات ہے۔ میں سن رہی ہوں۔''

''شائستہ ہماری شادی کو پندرہ سال ہوگئے ہیں اور ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ میں پینتالیس سال کا ہو چکا ہوں اور میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ ہمارے بعد اس وسیع و عریض جائیداد اور کاروبار کا مالک کون ہوگا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ہمیں ہر حال میں اس کی رضا میں راضی رہنا ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو تقدیر پر شاکر ہونے کی بجائے کوئی تدبیر بھی کرنی چاہیے شاید بہتری کا راستہ نکل آئے۔''

''میں سمجھی نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ حالانکہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی تھی۔

''کچھ دوستوں نے مشورہ دیا ہے اور میں بھی بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دوسری شادی کرلوں۔ شاید اس طرح سے ہمارے آنگن میں بہار آجائے۔''

مجھے یوں لگا تھا جیسے نزدیک ہی کوئی زوردار دھماکا ہوا ہو۔ جس سے میرے گھر کے در و دیوار ہل کر رہ گئے ہیں۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں شاک کی کیفیت سے باہر آئی اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''اگر دوسری بیوی سے بھی اولاد نہیں ہوئی پھر آپ کیا کریں گے۔''

''صبر کر کے بیٹھ جاؤں گا لیکن ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو شوق سے دوسری شادی کرلیں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''دیکھیں عاطف! آپ کی طرح مجھے بھی اولاد کی شدید آرزو ہے اور میں بھی اپنی ممتا کی پیاس بجھانے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ میں آپ کو دوسری شادی کی اجازت صرف اس شرط پر دے سکتی ہوں کہ آپ کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا پہلا بچہ میرا ہوگا۔ اس عورت کا اس بچے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ البتہ اس کے بعد وہ جتنے چاہے بچے پیدا کرے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔''

''یہ کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو؟'' عاطف غصے سے بولے۔ ''بھلا کوئی عورت اپنا بچہ تمہیں کیوں دے گی؟''

''اگر یہ شرط منظور نہیں تو میں آپ کو دوسری شادی کی اجازت بھی نہیں دوں گی۔ آپ مجھے طلاق دے کر ہی یہ شوق پورا کرسکتے ہیں۔''

''یہ ناممکن ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ دراصل یہ سب کاروبار جائیداد اور اثاثے میری ملکیت ہیں۔ ابو کے انتقال کے بعد میں ہی ان کی اکلوتی وارث تھی۔ اس لیے ان کا سب کچھ میرے حصے میں آگیا۔ عاطف میرے شوہر ضرور ہیں لیکن ان کی حیثیت ایک منتظم کی سی ہے۔ میں نے انہیں کاروبار چلانے کے لیے مکمل اختیارات دے رکھے ہیں اور کبھی ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتی۔ تاہم کمپنی کی مالک میں ہی ہوں۔ اس لیے وہ مجھے چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو بیوی کے ساتھ ساتھ انہیں اس کاروبار سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔

''ٹھیک ہے اگر مجھے نہیں چھوڑ سکتے تو دوسری شادی کرنے کے لیے آپ کو میری شرط ماننا ہوگی۔''

''فی الحال اس پر اصرار کرنا ٹھیک نہیں۔ جب بچہ ہوگا تو میں کوئی نہ کوئی چکر چلا کر اسے تمہارے حوالے کردوں گا۔ شادی کے بعد وہ عورت میرے قابو میں ہوگی اور اسے ہر صورت میں میری بات ماننا ہوگی۔''

میں چند لمحے سوچتی رہی۔ ان کا کہنا بھی صحیح تھا۔ ہمیں ایک وارث کی شدید ضرورت تھی جو ہمارے بعد اس کاروبار



اور جائیداد کو سنبھال سکے۔ اس میں مجھے اپنا فائدہ نظر آرہا تھا اگر مجھے بچہ مل جاتا تو میں اس کی پرورش اور تربیت اپنے انداز میں کرتی۔ وہ مجھے ہی اپنی ماں سمجھتا اور اس طرح میری ممتا کو ٹھنڈک مل جاتی۔ میں نے عاطف سے پوچھا۔ ''کیا میں اس خوش نصیب کا نام جان سکتی ہوں جسے آپ نے اپنا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''نام بتانے میں کوئی حرج نہیں۔'' وہ بڑے پُرسکون انداز میں بولے۔ ''آج نہیں تو کل تمہیں اس کا نام معلوم ہو جائے گا۔ میں شمائلہ سے شادی کرنا چاہ رہا ہوں اور وہ بھی اس کے لیے تیار ہے۔''

یہ دوسرا دھماکا تھا جس نے میرے ہوش و حواس اڑا دیے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شمائلہ اتنی گری ہوئی حرکت کرے گی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اسے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا اور اس نے میرے احسانوں کا یہ صلہ دیا کہ میرے ہی گھر میں نقب لگا دی۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگیں اور میں غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی۔ ''اس حرافہ کو تو میں آج ہی جوتے مار کر گھر سے نکالتی ہوں۔''

''نہیں نہیں اسے کچھ مت کہنا۔'' عاطف گھبراتے ہوئے بولے۔ ''اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ بے چاری تو آخر وقت تک انکار کرتی رہی۔ میں ہی اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ جنگل کا پھول ہے جسے شہر کا گل دان راس نہیں آیا۔ وہ نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ نواب شاہ میں اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں ہے اور کراچی میں اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں مل رہا۔ اس لیے میں نے اس کا سہارا بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے شادی کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے کبھی سر نہیں اٹھائے گی اور ہمیشہ تم سے دب کر رہے گی۔''

عاطف کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ میرے لیے شمائلہ سے اچھی سوکن کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی لیکن میں اتنی جلدی ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی اس لیے طنز کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن آپ کے مقابلے میں اس کی عمر بہت کم ہے۔ کم از کم وہ آپ سے بیس سال چھوٹی ہے کیا یہ بے جوڑ شادی نہیں کہلائے گی۔''

''جب وہ اس بے جوڑ شادی پر تیار ہے تو کسی دوسرے کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''اس کے گھر والے تیار ہوجائیں گے؟''

''یہ اس کا مسئلہ ہے۔ وہ انہیں راضی کرلے گی اور اگر وہ نہ مانے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ عاقل بالغ اور خود مختار ہے۔ قانون اسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے۔''

ایسا لگ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان تمام معاملات پہلے ہی طے پاچکے تھے اور اب عاطف مجھے صرف اطلاع دینے کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ میری سمجھ میں ساری صورتِ حال آگئی تھی۔ اس لیے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔''

''ہاں ہاں اچھی طرح سوچ لو۔'' وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے البتہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔''

عاطف کے جانے کے بعد میں نے گاڑی نکالی اور سیدھی مسز رحمانی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس وقت گھر پر ہی تھیں۔ مسز رحمانی کا مختصر تعارف یہ ہے کہ وہ ہمارے کلب کی سینئر ترین ممبر تھیں اور عورتوں کو ان کے مسائل کے بارے میں مشورہ دیا کرتی تھیں۔ ان کی حیثیت ایک کنسلٹنٹ کی سی تھی جو مناسب فیس لے کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو کیونکہ میں نے پہلے کبھی ان سے کسی مسئلے کے بارے میں رجوع نہیں کیا تھا لیکن ان کے دیے ہوئے مشورے بڑے کارآمد ہوتے تھے۔ اسی لیے وہ کلب کی تمام خواتین ممبروں میں بے حد مقبول تھیں۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ میرے لیے چائے منگوائی اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ میں نے شمائلہ کے کراچی آنے سے لے کر اب تک کے تمام واقعات ان کے سامنے رکھ دیے اور تازہ ترین مسئلہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے بیچ میں ایک دو سوال کیے پھر بولیں۔ ''دیکھو بی بی تم سے بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ایک جوان لڑکی کو اپنے گھر میں رکھا۔ اس سے بڑی غلطی یہ کی کہ اسے شوہر کے دفتر میں جاب دلوادی۔ وہ چھوٹے شہر کی رہنے والی ان عنایتوں کا بوجھ نہ اٹھا سکی اور تمہارے شوہر کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئی۔ معاف کرنا۔ تم نے خود ہی انہیں یہ موقع فراہم کیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ بی اے کرنے کے بعد اسے واپس نواب شاہ بھیج دیتیں۔ وہ خود ہی اپنے لیے کوئی جاب ڈھونڈ لیتی لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں

آتا۔ اب بتاؤ کہ کیا کرنا ہے۔''

''یہ پوچھنے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔'' میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''میری مانو تو اپنے شوہر کو اس لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت دے دو۔ تمہارا شوہر تو بہت فرمانبردار قسم کا بندہ لگتا ہے جو اس نے پندرہ سال انتظار کرلیا ورنہ لوگ تو چار پانچ سال بعد ہی دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ یہ لڑکی پہلے ہی تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد اور بھی مطیع و فرمانبردار ہو جائے گی۔ اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ تمہارے شوہر کو لے کر الگ ہو جائے گی۔ تم اسے اپنے ساتھ ہی رکھو گی۔ اس کے بچے پر بھی تم بآسانی کنٹرول حاصل کرسکتی ہو۔ وہ صرف نام کی ماں ہوگی۔ وہ بچہ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ تم اسے جس رنگ میں چاہو ڈھال سکتی ہو۔''

مسز رحمانی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ اگر عاطف کو دوسری شادی کرنی ہی تھی تو اس کے لیے شائلہ سے زیادہ مناسب لڑکی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی بجائے کوئی دوسری عورت آجاتی تو میرے لیے اسے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا اور نہ ہی وہ اپنا بچہ آسانی سے میرے حوالے کرتی۔ عاطف نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمیں اپنے کاروبار اور جائیداد کے لیے ایک وارث کی شدید ضرورت تھی۔ ورنہ ہمارے بعد یہ سب کچھ فلاحی اداروں کو چلا جاتا یا لالچی اور خودغرض رشتے دار اس پر قبضہ کرلیتے۔ عاطف نے بہت انتظار کرلیا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کی مراد ضرور پوری ہو گی جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مراد تو جب پوری ہوتی جب میں ماں بننے کے قابل ہوتی۔

جی ہاں میں نے اس معاملے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ شادی کے دو تین سال بعد تک جب اولاد نہیں ہوئی تو ہم دونوں نے اپنا طبی معائنہ کروایا۔ عاطف کی رپورٹس نارمل آئیں لیکن جس لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا تھا اس نے رپورٹس دیکھنے کے بعد بتا دیا کہ میرے اندرونی نظام میں کوئی پیدائشی نقص ہے جس کی وجہ سے میں کبھی ماں نہیں بن سکتی اور یہ ایک ایسی خرابی ہے جس کا علاج ممکن نہیں۔ میں یہ سن کر اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ کسی عورت کے لیے اس سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا ہے جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عاطف کو اصل بات بتاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتے۔ میں پہلے ہی ایک کرب سے گزر رہی تھی۔ عاطف کی دوسری شادی کا صدمہ میرے لیے جان لیوا ہوتا اور میرے پاس انہیں روکنے کا کوئی قانونی، اخلاقی اور شرعی جواز نہیں ہوتا چنانچہ میں نے اپنا سہاگ بچانے کے لیے عاطف سے جھوٹ بولا اور ان سے کہہ دیا کہ میری رپورٹس نارمل ہیں۔ عاطف اپنے کاموں میں اتنے الجھے رہتے کہ ان کے پاس کسی بات کی گہرائی میں جانے یا اس کا کھوج لگانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے میری بات پر یقین کرلیا اور اُمید بر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

میں نے گھر آنے کے بعد اس معاملے پر مزید سوچ بچار کی اور فیصلہ کرلیا کہ مجھے عاطف کو دوسری شادی کی اجازت دے دینی چاہیے۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ شائلہ کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا تھا۔ عاطف سے شادی کر کے اس کا مستقبل محفوظ ہو جاتا۔ عاطف باپ بن جاتے اور مجھے بھی اپنی جائیداد کا وارث مل جاتا۔ چنانچہ میں نے دوسرے روز ہی عاطف کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ انہیں ہر قیمت پر اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے شائلہ کا پہلا بچہ میرے حوالے نہ کیا تو میں دونوں کو گھر سے نکال کر اپنی ساری دولت اور جائیداد کسی رفاہی ادارے کے نام کر دوں گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے باوجود مجھے خدشہ تھا کہ شاید شائلہ کے گھر والے اس رشتے پر رضامند نہ ہوں کیونکہ عاطف اور شائلہ کی عمر میں کم از کم بیس سال کا فرق تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کی سگی بھانجی تھی اور شاید وہ یہ مناسب نہ سمجھتے کہ ان کی بیٹی مجھ پر سوکن بن کر آئے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ پروپوزل قبول کرلیا۔ شاید وہ شائلہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ کنواری ہی بیٹھی رہے گی لہٰذا انہوں نے بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ میں نے نکاح سے ایک ہفتہ پہلے شائلہ کو نواب شاہ بھیج دیا۔ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم بھی کہ وہ اپنے لیے شادی کے ملبوسات اور ایک جیولری سیٹ خرید سکتی۔ اس کے لیے بری میں نے تیار کی اور اپنی طرف سے ایک سیٹ بھی چڑھا دیا۔ میں یہ سب کچھ اپنے مفاد میں کر رہی تھی کیونکہ بچے کی پیدائش تک شائلہ کو خوش اور مطمئن رکھنا انتہائی ضروری تھا۔

میں نے اپنی نگرانی میں اس کے لیے حجلہ عروسی تیار کروایا اور دل پر پتھر رکھ کر اپنا سہاگ اس کے حوالے کر دیا۔ اگلے روز میں نے اپنی کوٹھی کے لان میں ہی دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا جس میں شائلہ کے گھر والوں کے علاوہ چند خاص لوگوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ سارے مہمان میرے حوصلے کی داد دے رہے تھے کہ میں کس طرح خوش دلی سے اپنی سوکن کا استقبال کر رہی ہوں انہیں کیا معلوم کہ اس ڈرامے کے پیچھے میرے کیا مقاصد تھے۔

شروع شروع میں شائلہ کافی جھینپی جھینپی رہی۔ وہ مجھ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ تین چار دن بعد عاطف نے دفتر جانا شروع کر دیا تو میں نے شائلہ کو اپنے پاس بٹھا کر کہا۔ ''دیکھو بی بی یہ تقدیر کے فیصلے ہیں۔ تمہارے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ اس گھر میں میری سوکن بن کر آؤ اس لیے تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بخوشی عاطف کو دوسری شادی کی اجازت دی کیونکہ اس میں میرا اپنا مفاد تھا۔ ہم پندرہ سال سے اولاد کے لیے ترس رہے ہیں لیکن اب عاطف کا صبر جواب دے گیا۔ انہیں اولاد کی بڑی تمنا ہے اور میں بھی اپنے شوہر کی خوشی چاہتی ہوں۔ اب ہماری تمام اُمیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ میں پہلے بھی تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھی اور آئندہ بھی تمہارے ساتھ میرا یہی رویہ ہوگا۔''

میری باتیں سن کر اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کروایا تو وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''باجی! آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ ان کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ میں نے ان احسانوں کا کیا بدلہ دیا لیکن خدا کی قسم باجی اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ یہ عاطف ہی تھے جنہوں نے مجھے پروپوز کیا۔ میں کئی مہینے تک انہیں ٹالتی رہی لیکن جب انہوں نے کہا کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اگر میں نے ان کا پروپوزل قبول نہیں کیا تو وہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرلیں گے۔ تب پہلی بار میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر انہوں نے واقعی کسی دوسری عورت سے شادی کرلی تو وہ نہ جانے آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کیوں نہ میں اس کی جگہ لے لوں چنانچہ بحالتِ مجبوری میں نے ہاں کر دی لیکن میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔''

''تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہم سب اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہیں۔ اس فیصلے میں بھی ہم تینوں کا مفاد وابستہ تھا۔ جو ہوا اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلو اور دعا کرو کہ جس مقصد کے تحت یہ قدم اٹھایا گیا ہے اس میں کامیابی ہو۔''

وہ میری سوکن تھی لیکن میں نے پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھا۔ عاطف اب بھی میرے کمرے میں سوتے تھے لیکن میں زبردستی انہیں اس کے پاس بھیجتی تھی تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزارنے کا موقع مل سکے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ شادی کے صرف دو ماہ بعد ہی اس نے مجھے خوش خبری سنا دی۔ عاطف کو معلوم ہوا تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھے۔ میری خواہش تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اور گھر پر آرام کرے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی تنخواہ سے گھر والوں کو سپورٹ کر رہی ہے کیونکہ خالو کے پاس کوئی کام نہیں تھا اور بھائی نالائق نکلے۔ اس لیے اس کا جاب پر جانا ضروری تھا۔

ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ شائلہ کو چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے اس نے دفتر سے چھٹی کرلی میں ہی اسے اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی۔ اس نے شائلہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور بولی کہ فکر کی کوئی بات نہیں سب کچھ نارمل ہے۔ البتہ اسے وہ سب احتیاطیں ضرور کرنا ہوں گی۔ جو عورتیں زچگی کے زمانے میں کیا کرتی ہیں۔ گھر آنے کے بعد میں نے اس کے لیے جوس بنایا اور بولی۔ ''اپنا خیال رکھو اور ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا ہے اس پر پوری طرح عمل کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس مرحلے سے بخیر و خوبی گزر جاؤ اور ایک صحت مند بچے کو جنم دو۔''

اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جذباتی انداز میں بولی۔ ''آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ شاید میری سگی ماں بھی اتنا نہ کرسکتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے احسانوں کا بدلہ کس طرح اتاروں۔ پہلے آپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ پھر آپ ہی کے کہنے پر عاطف نے مجھے اپنی کمپنی میں ملازمت دی اور سب سے بڑا احسان تو آپ نے یہ کیا کہ مجھے اپنے سہاگ میں شریک کرلیا۔ کوئی بھی عورت اپنی خوشی

سے ایسا نہیں کرسکتی۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں آپ کے تمام احسانوں کا بدلہ ایک ہی دفعہ میں اتار دوں۔''

میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''یہ تم نے کیا احسان احسان کی رٹ لگا رکھی ہے تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا وہ تمہیں مل گیا۔ اب آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔''

''نہیں باجی! آپ مجھے مت روکیں۔ جانتی ہوں کہ آپ پچھلے پندرہ سال سے اولاد کے لیے ترس رہی ہیں۔ میں آپ کی اس محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنا پہلا بچہ آپ کو دے دوں گی۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ آپ کا بچہ ہو گا۔ آپ ہی کو اپنی ماں سمجھے گا اور اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اس کی حقیقی ماں ہوں۔''

اس کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ وہ ہو بہو وہی الفاظ بول رہی تھی جو میں نے دوسری شادی کے لیے شرط عائد کرتے وقت عاطف سے کہے تھے لیکن یہ بات میرے اور عاطف تک محدود تھی۔ شمائلہ سے ایسا کبھی کوئی ذکر نہیں ہوا۔ پھر وہ میرے دل کا حال کیسے جان گئی۔ میں جو چاہ رہی تھی وہ اس نے خود ہی کہہ دیا تاہم میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

''میں تم پر یہ ظلم نہیں کرسکتی۔ تم ہی اس کی ماں ہو۔ میں تمہیں اس حق سے محروم نہیں کروں گی۔''

''آپ کو میری یہ بات ماننا ہوگی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''ورنہ میں یہ بچہ ضائع کردوں گی۔''

''پاگل ہوگئی ہو جو اول فول بولے جارہی ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔ یہ بچہ تمہارے پاس خدا کی امانت ہے اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض بنتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اپنا فرض پورا کروں گی لیکن آپ کو بھی میری بات ماننا ہوگی۔''

''اچھا اچھا دیکھا جائے گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''پہلے وہ وقت تو آئے۔''

زچگی سے تین ماہ قبل میرے کہنے پر اس نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ میں اس کے آرام کا پورا خیال رکھ رہی تھی۔ اسے وقت پر دوائیں، پھل اور ڈاکٹر کی تجویز کردہ غذا دی جارہی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے لیے علیحدہ سے ایک خادمہ کا بندوبست کردیا تھا جو چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ شمائلہ کا باقاعدگی سے چیک اپ ہورہا تھا اور ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق سب کچھ نارمل تھا۔

خدا خدا کرکے وہ دن بھی آگیا جب شمائلہ کو ڈلیوری کے لیے اسپتال لے جایا گیا۔ وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ کسی وقت بھی ڈلیوری متوقع ہے لیکن اس میں تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ جب ڈاکٹروں کی کوشش کے باوجود نارمل طریقے سے زچگی نہیں ہوسکی تو آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میں بھی کوئی گھبرانے والی بات نہیں تھی۔ بہت سے بچے آپریشن کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں لیکن نہ جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ میں آپریشن تھیٹر کے باہر پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھی تسبیح کے دانے گن رہی تھی اور عاطف بھی بے چینی سے کوریڈور میں ٹہل رہے تھے۔ کافی دیر بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر منہ لٹکائے ہوئے باہر آئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی میں نے اندازہ لگالیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں اور عاطف اس کی طرف لپکے تو وہ آہستہ سے بولی۔ ''مبارک ہو مسٹر عاطف آپ ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہیں لیکن......!''

''لیکن کیا؟'' عاطف بے چین ہوتے ہوئے بولے۔

''آپریشن کے دوران ایک پیچیدگی ہوگئی تھی ہم نے بچے کو تو بچا لیا لیکن آپ کی مسز اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔''

میرے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی اور میں دیوانہ وار آپریشن تھیٹر کی طرف لپکی لیکن عاطف نے مجھے روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم شمائلہ کی لاش لے کر گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ بچے کو اسپتال والوں نے روک لیا تھا۔ اسے کچھ دن انکیوبیٹر میں رکھا جانا تھا۔ شمائلہ کی تجہیز و تکفین ہوگئی اور چار دن بعد اسپتال والوں نے بچہ ہمارے حوالے کردیا۔

میں نے بچے کا نام کاشف رکھا ہے۔ میں جو چاہتی تھی وہ پورا ہوگیا بلکہ شمائلہ نے جو کہا تھا وہ کردکھایا۔ بڑی خود دار تھی۔ کسی کے احسانوں کا بوجھ لینا اسے گوارہ نہیں تھا یا پھر وہ دلوں کو پڑھنے کا ہنر جانتی تھی اور اسے میری خواہش کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اب میں اس بچے کو شمائلہ کی امانت سمجھ کر پال رہی ہوں اور میری کوشش ہے کہ اسے ایک اچھا اور کامیاب انسان بناسکوں۔



نسرین سے مجھے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اس سے منگنی کرنا پڑی۔ نسرین میرے چھوٹے چچا کی بیٹی ہے۔

ڈیڈی اپنے بھائی بہن میں سب سے بڑے ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائی ہیں ریحان انکل اور فرقان چچا۔ سلمٰی آنٹی اپنے بھائیوں کی اکلوتی اور سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے سارے گھر کی لاڈلی ہیں۔

ڈیڈی، ان کے دونوں بھائی اور بہن گو کہ ایک ہی ماں

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

امید قوی ہے کہ بخیریت ہوں گی۔ ارسال کردہ سچ بیانی میری نہیں، میرے ایک عزیز دوست کی ہے جس سے کچھ ہی دنوں پہلے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں دفتر کے ایک ضروری کام سے امریکا گیا تھا۔ وہیں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے خود بیتی سنائی تو میں اسے قلم بند کرنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید کسی کو یہ بات بھا جائے اور وہ ''فیوچر سیکیور'' کرنے کا اصل طریقہ یاد کرلے۔

حسن رزاقی
(ایبٹ آباد)

باپ کی اولاد ہیں لیکن ان سب کے رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ڈیڈی، ریحان انکل اور سلمٰی آنٹی کو زمانہ کے ساتھ چلنا آتا ہے، وہ آج کی دنیا کے جدید تقاضوں کو بخوبی نباہتے ہیں جب کہ فرقان چچا کا رہن سہن باقی سب بہن بھائیوں سے جدا ہے۔ کچھ دقیانوسی طرز کا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ شاید فاطمہ چچی ہیں جن کا تعلق اس طبقہ سے ہے جو پرانے زمانہ کی تہذیب اور قدروں کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنے کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ مجھے ان کے طور طریقوں سے وحشت سی ہوتی ہے لیکن نسرین سے منگنی میری مجبوری تھی۔ اس مجبوری کی دو وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ نسرین کو میری دادی نے اپنی وفات سے پہلے میری منگیتر کی مانگ بنا دیا تھا اور میرے باپ چچا اس کے خلاف نہیں جاسکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں اگلے ہفتے امریکا کے لیے روانہ ہونے والا تھا اور ممی ڈیڈی کو ڈر تھا کہ اگر انہوں نے مجھے منگنی کی زنجیر سے نہیں باندھا تو عین ممکن ہے کہ میں ان کے لیے کوئی گوری امریکن بہو لے آؤں۔ جس کے لیے وہ کسی طور تیار نہیں تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ پاکستان کا ہر نوجوان بشمول میرے اپنی باقی زندگی امریکا کی جنت میں گزارنا چاہتا تھا مگر اس جنت میں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ بہت کم لوگ گرین کارڈ کے لیے درخواست دینے کے اہل تھے اور جو اہل تھے ان کو بھی درخواست دینے کے بعد برسوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر اُمیدواروں کی قسمت جاگ گئی۔ امریکی حکومت نے گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے ایک لاٹری کی اسکیم نکالی جس میں ہر شخص اپنی قسمت آزما سکتا تھا۔ میں نے اور سلمان نے بھی اپنی قسمت آزمانے کی ٹھانی۔ ہم دونوں نے اس لاٹری میں اپنی اپنی درخواست ڈال دی۔

سلمان، ریحان انکل کا بیٹا ہے۔ میری اور سلمان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ ایک ہی اسکول اور کالج میں ہم نے ساتھ ساتھ پڑھا تھا اور ہماری دلچسپیاں بھی ہم آہنگ تھیں۔ اس کے برعکس فرقان چچا کے بیٹے اسد سے میری کوئی خاص دوستی نہیں تھی حالانکہ وہ نسرین کا بھائی تھا۔ اسد کے قرب میں مجھے وحشت ہوتی تھی اس کے بھی وہی خیالات اور ترجیحات تھیں جو فاطمہ چچی کی تھیں۔ وہی گھٹا ہوا ماحول اور ہر وقت خاندانی اقدار کی ٹھیکیداری۔ اونچا پائنجامہ، داڑھی اور داڑھی بھی خودرو جنگل کی طرح اگی ہوئی۔ داڑھی اگر رکھنا ہی تھی تو فرنچ کٹ داڑھی بھی رکھی جاسکتی تھی مگر اس کو تو خودرو جنگل اگانا تھا۔

سلمان کا نام تو لاٹری میں نہیں نکلا البتہ میرا نام نکل آیا۔ سلمان کو لاٹری میں نام نہ نکلنے کا بہت زیادہ افسوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''یار اگر میں بھی تمہاری طرح لکی ہوتا تو ہم دونوں ایک ساتھ امریکا جارہے ہوتے۔ وہاں جاکر اکٹھے زندگی سنوارتے۔ یہاں تو کوئی خاص اپار چونٹی نظر نہیں آتی۔ ہماری نسل کے ہر نوجوان کو جس میں، میں بھی شامل تھا۔ اپارچونٹی صرف امریکا میں ہی دکھائی دیتی تھی۔''

بالآخر وہ دن بھی آگیا جس دن مجھے امریکا کے لیے روانہ ہونا تھا۔ باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ نسرین بھی مجھے خدا حافظ کرنے آئی تھی مگر وہ مجھ سے مخاطب تک نہیں ہوئی ایک کونے میں اوڑھنی سر پر ڈالے نظریں جھکائے کھڑی رہی۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ دادی کی خواہش تو پوری ہوگئی مگر میں اس بیک ورڈ لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی گزاروں گا جس محفل میں جاؤں گا اس کی حرکتوں کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ راستے بھر میں ان ہی خیالوں میں الجھا رہا۔

جب سے میرے امریکا جانے کا پروگرام پکا ہوا تھا۔ ڈیڈی اور ممی نے ہدایتوں اور نصیحتوں کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ممی کی اہم ترین نصیحت تھی کہ وہاں کی لڑکیوں کے ہتھکنڈوں سے بچے رہنا، اس طرح سے اپنے دام میں پھانستی ہیں معصوم لڑکوں کو کہ ان کے چنگل سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ سانپ کا کاٹا تو شاید پھر بھی پانی مانگ لے مگر ان کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ ڈیڈی کی نصیحتوں کا سارا زور اپنا فیوچر بنانے پر تھا۔ پیسا پس انداز کرنا۔ جاتے ہی وہاں میرا اکاؤنٹ کھول کر پیسے جمع کروا دینا۔ پہلا موقع ملتے ہی گھر خرید لینا۔ وہاں پر گھر دس بیس فیصد ڈاؤن پیمنٹ پر مل جاتے ہیں۔ فیوچر سیکیور کرنے کے لیے سر پر چھت کا ہونا بہت ضروری ہے اور ہاں آگے چل کر لیک فرنٹ پراپرٹی ضرور خریدنا۔ لیک فرنٹ پلاٹوں کی قیمت بہت تیزی سے بڑھتی ہے بہت اچھا انویسٹمنٹ ہوتا ہے۔

جب میں اگزیشن ہال جانے لگا تو ممی اور ڈیڈی نے مجھے گلے لگا کر ایک بار پھر اپنی اپنی نصیحتوں کا اعادہ کیا۔ ان کے لیے اپنی نصیحتیں دہرانے کا یہ آخری موقع تھا۔ سب سے آخر میں مجھے فرقان چچا نے گلے سے لگا کر اپنی مختصری پانچ لفظی نصیحت سے نوازا۔ ''بیٹا! ایمان بچا کر رکھنا۔''

☆......☆

نیویارک میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا سوائے اسکول کے ایک پرانے ساتھی کے۔ وہ مجھے لینے ایئرپورٹ آیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے گیا۔ یہ



کوئینز کے علاقے میں ایک بیڈ روم کا اپارٹمنٹ تھا جس میں وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا چند رسمی باتیں کیں پھر اپنے بیڈ روم میں جاکر میرے دوست اسلم کو آواز دی۔ میں ان دونوں کا مکالمہ سن سکتا تھا۔

''تمہارے دوست کے ساتھ سامان بھی ہے۔ کیا وہ یہاں ٹھہرے گا؟''

''ہاں صرف چند دن کے لیے۔'' اسلم نے جواب دیا۔ ''وہ پہلی دفعہ پاکستان سے باہر آیا ہے یہاں اور کوئی اس کا جاننے والا نہیں ہے۔''

لڑکی نے دوٹوک جواب دیا۔ ''نو وے No way۔''

کمرے سے باہر آکر اسلم نے مجھ سے معذرت کی اور مجھے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں چھوڑ آیا۔ جہاں میں نے تین راتیں گزاریں۔

مغربی ممالک میں جو بھی تارکین وطن جاتے ہیں ابتدائی ایام میں ان کو بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے حصے کے دھکے کھائے پھر کوئی چھ ماہ کے بعد مجھے ایک ڈھنگ کی نوکری ملی گو کہ میں نے ڈیڈی کی نصیحت کے مطابق بینک اکاؤنٹ تو کھول لیا تھا لیکن نصیحت کے دوسرے حصے ''اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرواتے رہنا'' کا فی الحال سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، جو بھی تنخواہ ملتی روزمرہ کے خرچوں کے لیے بھی مشکل سے پوری پڑتی۔

مجھے جو نئی نوکری ملی تھی اس کی تنخواہ معقول تھی اور ہر دو ہفتے بعد ملتی تھی۔ جب دو ہفتے بعد مجھے پہلی تنخواہ ملی تو میں نے اگلے دو ہفتے کے خرچے کے پیسے نکال کر باقی تنخواہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروا کر ڈیڈی کو خوش خبری سنائی کہ ان کی پہلی نصیحت کا دوسرا حصہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ ڈیڈی نے فون پر ہی میری پیٹھ ٹھونک کر مجھے شاباش دی۔

امریکا میں معقول نوکری نہ ملنے کی بڑی وجہ میری ڈگری تھی۔ میں نے پاکستان میں بی کام کیا تھا جس کی امریکا میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرے پاس فیوچر سیکیور کرنے کے لیے امریکا کی ڈگری لازمی تھی۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے میں نے شام کی کلاسوں میں میجور M.B.A کے چار سالہ پروگرام میں داخلہ لے لیا۔

ڈیڈی کی نصیحت نمبر ایک پر تو میں عمل کرچکا تھا مگر ممی کی نصیحت پر عمل کرتے وقت میرے باس کی سیکریٹری مزاحمت بن کر کھڑی ہوگئی۔ ایک دن وہ میرے دفتر میں داخل ہوئی۔

''میں لنچ کرنے جارہی ہوں۔ تم چلو گے؟''

معصوم سی دعوت تھی میں تیار ہوگیا۔ یہ صرف ابتداء تھی ممی کے خدشات پورے ہونے کی۔ ڈراپ سین میں بقول ممی کے اس ناگن نے مجھے ایسا ڈسا کہ میں پانی بھی نہ مانگ سکا۔ ہماری شادی ہوگئی۔ کرسٹنا میرے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس شادی نے ممی کی نصیحت کی تو صرف دھجیاں اڑائی تھیں مگر فرقان چچا کے لیے یہ دو دھاری تلوار تھی۔ ایک دھار نے ان کی نصیحت کے ٹکڑے بکھیر دیے، دوسری دھار نے ان کی بیٹی کے خواب چکنا چور کردیے لیکن جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔

کرسٹینا کی ماں فرانس سے اور اس کے باپ اٹلی سے آکر امریکا میں آباد ہوئے تھے۔ کرسٹینا کے ماں باپ کے فرانسیسی اور اطالوی نژاد ہونے کا اثر میری زندگی میں اور تو کسی چیز پر نہیں پڑا سوائے کھانے کے، ویسے تو یہ اثر بہت خوشگوار تھا کہ کرسٹینا انتہائی اعلیٰ درجے کا پاستا بناتی تھی جو اس کے باپ کی مرغوب غذا تھی اور ساتھ ہی ساتھ بہت ہی عمدہ فرانسیسی کھانے بھی بناتی تھی۔ میرے خیال میں جس اہتمام سے فرانسیسی قوم اپنے کھانے بناتی اور کھاتی ہے شاید ہی کوئی دوسری قوم پیٹ کی خاطر اتنی محنت مشقت برداشت کرسکے لیکن اس محنت مشقت سے تیار کیے گئے کھانے میں ایک قباحت تھی۔ ہر اچھے فرانسیسی کھانے میں وائن کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ میں نے کرسٹینا سے احتجاج کیا کہ میں شراب کی آمیزش والا کھانا نہیں کھا سکتا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے دلاسہ دیا کہ یہ شراب یا وائن تو کھانے پکانے کے عمل میں اڑ جاتی ہے۔ صرف اس کا تھوڑا سا ذائقہ اور خوشبو باقی رہ جاتی ہے۔ میں نے اس کی تاویل کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ فرقان چچا کی ایمان بچانے والی نصیحت پر ایک اور ضرب لگ چکی تھی۔

ایک شام میں دفتر سے گھر آیا تو ممی کا فون آیا۔ ''تمہارے ڈیڈی کو شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ فوراً آجاؤ۔''

مجھے نوکری شروع کیے ہوئے ابھی صرف چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ اگر چھٹی ملی بھی تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی جس میں سے تین دن سفر میں نکل جائیں گے۔ کرسٹینا میرے باس کی سیکریٹری تھی اس نے کسی نہ کسی طرح کوشش اور سفارش کرکے مجھے دو ہفتے کی چھٹی دلوا دی۔ سفر کے دوران میں پریشان تھا کہ ڈیڈی کی اس حالت میں، میں ان کو کرسٹینا کے بارے میں کیسے بتاؤں گا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ ڈیڈی ممی کو ابھی یہ بات بتانا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ میری خود غرضی تھی۔ اس

لیے کہ میں نے اپنی سہولت کے لیے نسرین کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ جب تک فرقان چچا تک یہ بات نہیں پہنچے گی، وہ نسرین کو میرے نام پر بٹھائے رکھیں گے۔

ڈیڈی کی حالت میری توقعات سے کہیں زیادہ خراب تھی۔ وہ سی سی یو میں انتہائی نگہداشت والے مریضوں میں تھے۔ بات کرنے پر پابندی تھی۔ ان سے کرسٹینا سے متعلق تو کیا کسی بھی تعلق سے آج بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس موقع پر سلمان میرے کام آیا۔ میں نے ساری بات اس کو بتا دی اور ہدایت کی کہ کسی مناسب موقع پر میرے امریکا واپس جانے کے بعد یہ خبر ممی اور فرقان چچا تک پہنچا دے۔ خلافِ توقع سلمان کا ردِعمل میرے حق میں تھا۔ "تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اس گھر گھسنی نسرین کے ساتھ تمہارا نباہ نہیں ہوسکتا تھا۔" میرا خون بڑھ گیا۔

ڈیڈی گھر آچکے تھے مگر ان کی طبیعت ابھی بھی بہت ابتر تھی۔ آج مجھے واپس امریکا جانا تھا۔ میں ڈیڈی کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"بیٹا۔" انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اب میں زیادہ دن نہیں جیوں گا۔" پھر وہ سانس لینے کے لیے رکے۔ "ضروری ہے کہ میں تم کو جائیداد بینک وغیرہ کے متعلق وصیت اور نصیحت کر جاؤں۔" پھر انہوں نے مجھے رک رک کر تمام تفصیل بتائی اور آخر میں وہی ہدایت کہ میرے پاس امریکا میں اپنا فیوچر بنانے کا بہترین موقع ہے۔ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔

میرے امریکا واپس پہنچنے کے دوسرے دن ڈیڈی کا انتقال ہوگیا میرے باپ کی میت کو کاندھا دینے کا قرض میرے فیوچر پر قربان ہو چکا تھا۔ وہی فیوچر جس کو بنانے کی نصیحت ڈیڈی مرتے مرتے بھی کر گئے تھے۔

پاکستان سے واپس امریکا آئے ہوئے مجھے چند مہینے ہو چکے تھے۔ ایک صبح میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ممی کا فون آیا۔ بغیر کسی سلام دعا کے ہی انہوں نے پتھر پھینک مارا۔

"یہ کیا حرکت کی تم نے؟"

"کیسی حرکت؟ کون سی حرکت؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کرسٹینا سے شادی والی حرکت اور کون سی حرکت۔ مجھے سلمان نے ساری بات بتا دی ہے۔ افسوس ہے کہ تم نے ماں باپ کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ کم از کم ان کو اطلاع ہی دے دیتے۔ کیا تم کو اسی دن کے لیے پیدا کیا تھا۔" پھر توپ کا آخری گولہ۔ "میں فرقان بھائی اور نسرین کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ بچی تو تمہارے نام پر جیتی ہے۔"

میرے پاس ممی کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نہ صرف اپنی چاہنے والی ماں کا مجرم تھا بلکہ فرقان چچا اور نسرین کا بھی مجرم تھا۔ میں نے ماں اور چچا دونوں کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ ماں اور باپ اگر ایک ہی پس منظر سے ہوں، ایک ہی معاشرہ سے تعلق رکھتے ہوں تو اولاد کی تربیت آسان ہو جاتی ہے۔ اگر معاشرہ اور اعتقاد مختلف ہوں تو صورتِ حال نازک ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے بچوں کے لیے کہ ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ باپ کی تقلید کریں یا ماں کی۔ اکثر اوقات ایسے بچے ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ میرے بیٹے کے لیے صورتِ حال اس سے بھی زیادہ سنگین ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ میں اور کرسٹینا دونوں نوکری کر رہے تھے۔ ہمارے بچے کی پرورش بے بی سسٹر کے گھر پر ہو رہی تھی۔ کرسٹینا اگر نوکری چھوڑ دیتی تو ہمارا اپنا گھر خریدنے کا خواب پورا نہیں ہوسکتا تھا اور ڈیڈی کی نصیحت تھی کہ جتنی جلدی ہوسکے اپنا گھر خرید لینا کیونکہ بغیر اپنے گھر کے فیوچر سیکیور نہیں ہوسکتا۔ اسی تگ و دو میں مزید چند سال گزر گئے۔

پاکستان سے بہن کا فون آیا، ممی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے آپ فوراً آجایئے۔

یہ میرے لیے ایک اور آزمائش تھی۔ کرسٹینا کے یہاں پھر سے ولادت ہونے والی تھی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اس کو کسی وقت بھی اسپتال لے جانا پڑ سکتا تھا۔ میں ماں کے جنازے کو بھی کندھا دینے سے محروم رہ گیا۔ ماں کی یاد میرے دل میں کچوکے لگاتی تھی۔ میں نے اپنی نومولود بیٹی کا نام ماں کے نام پر ثمینہ رکھ دیا۔ ماں نہ سہی۔ اس کا نام تو زندہ رہے گا۔

ثمینہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد مجھے پاکستان جانا پڑا۔ موروثی جائیداد وغیرہ کے معاملات طے کرنے تھے۔ تمام معاملات کو حل کرنے کے بعد میں نے تمام جائیداد کو بیچ کر بہن کا حصہ بہن کو دیا اور اپنے حصے کی رقم امریکا منتقل کر دی۔ اس رقم سے میں نے اپنے پہلے گھر کی ڈاؤن پےمنٹ کر دی۔ میں اپنا فیوچر سیکیور کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکا تھا۔ ڈیڈی کی نصیحت کی اطاعت کی ابتدا ہو چکی تھی، ان کی روح خوش ہوگی۔

میں اپنا ایم بی اے کا کورس دو سال پہلے مکمل کر چکا تھا جس کے بعد میرے لیے ترقی کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اب میں ایک بہت بڑے کارپوریشن میں کام کر رہا تھا۔ میری انتھک



محنت اور جانفشانی نے مجھے بہت جلد ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچا دیا تھا لیکن امریکا کی کارپوریٹ لائف کا ایک پہلو اور بھی ہے۔

یہاں پر جتنی بڑی بڑی کمپنیاں ہیں ان کے امریکا اور کینیڈا میں بیسیوں دفاتر اور کارخانے ہوتے ہیں۔ میری کمپنی کے نہ صرف کینیڈا اور امریکا میں بیس سے زیادہ دفاتر تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے دس بارہ اور ملکوں میں بھی ان کے دفاتر تھے۔ ان کمپنیوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے کاروبار کو منافع بخش طریقے سے چلانے کے لیے اپنے مڈل اور سینئر مینجمنٹ کا ایک دفتر سے دوسرے دفتر تبادلہ کرتے رہیں۔ کمپنی کے عملے کو تو اس کے بہت عالی اور دوسرے فوائد ہوتے ہیں مگر ان کے بچوں پر اس کے بہت زیادہ مفروضہ اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسان کی نفسیاتی ضرورت ہے کہ وہ ایک مانوس ماحول میں رہے۔ ماحول بدلتا ہے تو انسان اپنی سمت کے تردد میں پڑ جاتا ہے۔ کشش و پیچ اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب باپ کا تبادلہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں کیا جاتا ہے تو بچوں کو اپنے اسکول اپنے دوستوں اپنی مانوس جگہوں اور چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ نئے شہر میں ان کو نئے اسکول جانا پڑتا ہے۔ نئے دوست بنانے پڑتے ہیں۔ نئی جگہوں سے آشنائی پیدا کرنا پڑتی ہے۔ زیادہ تر بچے اس کڑی صورتِ حال سے نمٹ نہیں پاتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کے ذہنی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں مگر ایک خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی چیز یا انسان سے مکمل طور پر دل نہیں لگا سکتے ہیں۔ کوئی مستقل بندھن نہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہر چیز ہر تعلق عارضی ہوتا ہے۔

میرے دونوں بچے، اپنے ماں باپ کے مختلف پس منظر، عادات اور معاشرہ کے ساتھ ساتھ بندھن کی اس غیر یقینی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ اس سب پر ستم بالائے ستم میں ان کی پرورش خالص مادی و معاشی اقدار پر کر رہا تھا۔ میں بھی ان کو وہی نصیحت کر رہا تھا جو ڈیڈی نے مجھے کی تھی۔ اپنا "فیوچر سیکیور" کرو۔ میں نے ان کے لیے دنیا کی ہر مادی آسائش مہیا کر رکھی تھی مگر کبھی ان کو یہ نہیں بتایا کہ انسان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے۔ میں خود بھی اس سے ناآشنا تھا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں کبھی کسی مضبوط انسانی بندھن میں نہ بندھ سکے۔ ہمارا مذہب، ہماری اقدار ہماری روایات کبھی ان میں راسخ نہ ہوسکیں۔

کہانی بہت لمبی ہے۔ صرف اتنا بتا دوں کہ میرے دونوں بچے بہت ذہین تھے میں نے ان کو امریکا کے بہترین

## جیٹ انجن Jet Engine

کسی ایسے بیلن کا تصور کیجیے جو ایک طرف سے کھلا ہو اور اس کے اندر دھماکے سے اڑ جانے والی گیس بھری ہوئی ہو۔ اس سمت گیس کو آگ لگے گی اور دھماکے کا دباؤ بیلن کے بند حصے پر پڑے گا تو بیلن اس سمت میں آگے بڑھے گا۔ جیٹ انجنوں کی اساس اسی اصول پر ہے اور ایسے انجنوں والے ہوائی جہاز کافی بلندی پر بہت تیز رفتار سے اڑ سکتے ہیں۔ پیٹرول اور ہوا کو مخلوط کر کے اڑنے والی گیس تیار ہوتی ہے۔ ایک بادگیر آلے Impeller کے ذریعے ہوا انجن کے سامنے والے حصے سے فراہم کر کے کھینچ لی جاتی ہے۔ آگ لگنے والے خانے (Combustion Chambers) میں پیہم تیز اور تواتر کے ساتھ آگ لگتی رہتی ہے اور اس جلتی ہوئی ہوا کا مستقل دھارا یکساں طور پر بھاپ نکاس کون پر سے ہوتا ہوا بھاپ نکاسی نلکی (Exhaust Pipe) میں پہنچتا ہے۔ جہاں سے یہ انجن کے پچھلے حصے میں نکل جاتا ہے۔ باہر نکلتے وقت اس کے دباؤ کی وجہ سے ایک چرخی گھومنے لگتی ہے۔ چرخی ایک دھرے کو گھماتی ہے اور دوسرے سے بادگیر پرزہ چلتا رہتا ہے جو انجن کے سامنے سے ہوا جمع کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ جیٹ انجن کو آگے بڑھنے کے لیے اپنے پیچھے کثیف ہوا کی موجودگی کی ضرورت نہیں ہے جس کو انجن کی بھاپ دھکا دے کر جہاز کو آگے بڑھائے۔ انجن اس وجہ سے آگے بڑھتا ہے کہ آگ لگنے والے خانوں میں ہوا دھماکے سے اڑ کر مشین کو آگے کی طرف دھکیلتی ہے۔ اس اعتبار سے جیٹ انجن کو پنکھے سے چلنے والے انجن (Propeller Engine) پر فوقیت حاصل ہے کیوں کہ یہ اتنی بلندی پر بھی اڑ سکتا ہے جہاں ہوا کی کثافت بہت کم ہوتی ہے۔

مرسلہ: خرم اختر۔ یو اے ای

اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔اعلیٰ تعلیم۔میرے بیٹے کو اس کی کمپنی نے عارضی طور پر اپنے آسٹریلیا کے دفتر بھیجا تھا۔ وہ جگہ میرے بیٹے کو اس قدر بھائی کہ اس نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرکے وہیں کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔اپنے دفتر کی مصروفیات کی بنا پر میں اس کی شادی میں شرکت نہیں کرسکا۔ میری بیٹی کی شادی ہوچکی تھی۔اس کے شوہر کا تعلق میکسیکو سے تھا، وہ یو این او میں ملازم تھا۔پچھلے دو سال سے اس کی پوسٹنگ برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں تھی۔کرسٹینا کا انتقال ہوچکا تھا۔میں لیک فرنٹ پر بنائے ہوئے اپنے دو ایکڑ کے شاندار گھر میں مقیم تھا۔میرا فیوچر ہر طرح سے سکیور ہوچکا تھا۔

میں جب سے امریکا آیا تھا پاکستان صرف دو دفعہ گیا تھا۔ڈیڈی کی بیماری کے وقت اور ممی کی وفات کے بعد جائیداد کی تقسیم کے لیے اس کے بعد میری کاروباری مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں پاکستان جاسکتا، گوکہ میں بچوں کو یورپ گھمانے تین چار مرتبہ جاچکا تھا۔آج نہ جانے کیوں مجھے پاکستان کی یاد ستا رہی تھی۔میں نے بہن کو فون کیا۔ ”ہائے بھیا آپ نے کیسے یاد کرلیا۔“

بہن کا شکوہ بجا تھا۔اس سے میرا تعلق واجبی سا ہی رہ گیا تھا۔مجھے یاد نہیں کہ پچھلی بار میں نے کب اس کو فون کیا تھا۔

”کچھ نہیں بانو، تمہاری اور پاکستان کی یاد آرہی تھی اس لیے فون کرلیا۔“

”شکر ہے بھیا۔آپ کو بہن کی یاد تو آئی۔آپ بہن کو دیکھنے پاکستان کیوں نہیں آجاتے۔آپ نے تو امریکا جاکر اس دیس کو بالکل ہی بھلا دیا جس کی مٹی سے آپ کی تخلیق ہوئی تھی۔“ بانو کی بات حق تھی۔

کراچی ایئرپورٹ پر برسوں کے بعد میں نے اپنی بہن کو گلے لگایا تو بچپن میں ساتھ گزاری ہوئی زندگی میری آنکھوں میں سنیما کی ریل کی طرح گھوم گئی۔ ہم لوگ ایئرپورٹ سے بانو کے گھر آگئے۔

میں بانو کے گھر میں اپنے کمرے میں آرام کررہا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ ”بھیا نسرین آپ سے ملنے آئی ہے۔“ نسرین کی آمد میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں بال درست کرتا ہوا۔ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا۔نسرین نے صوفے سے اٹھ کر میری طرف دیکھا۔ہم دونوں کو ایک دوسرے کے زمانہ کی گردش سے بدلے ہوئے نقوش کو پہچاننے میں چند سیکنڈ لگے۔

وقت دنیا کا سب سے زیادہ ہیبت ناک بیوٹی پارلر ہے۔انسان جب اس بیوٹی پارلر سے باہر نکلتا ہے تو اس کے دامن میں صرف حسرتیں ہوتی ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو زندگی کی حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور پُروقار طریقے سے زندگی گزارنا جانتے ہیں۔رسمی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد نسرین نے کہا۔ ”نعمان بھیا میں آپ سے ایک خاص وجہ سے ملنے آئی ہوں۔“ نسرین کے منہ سے اپنے لیے ”بھیا“ کا لفظ کچھ عجیب سا لگا۔

”ہاں بتاؤ نسرین کون سی خاص وجہ ہے۔“ میں نے معلوم کرنا چاہا۔

”میں آپ کو صرف اتنا بتانے آئی ہوں کہ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی کدورت نہیں ہے۔“ پھر نسرین نے وضاحت کی۔ ”جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے کرسٹینا سے شادی کرلی ہے تو مجھے دلی صدمہ پہنچا۔میں شدید غصہ میں تھی۔آپ کے لیے میری پسندیدگی نفرت میں تبدیل ہوگئی تھی۔پھر میری شادی امجد سے ہوگئی۔آپ امجد سے مل چکے ہیں وہ میری خالہ کے بیٹے ہیں۔“

”ہاں، میں نے اقرار کیا۔“ میں امجد سے کئی بار مل چکا ہوں۔مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تم کو بے انتہا پسند کرتا تھا مگر ہماری منگیتر ے کی مانگ اس کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

”جی یہ سب سچ ہے۔“ کہتے ہوئے نسرین نے بات آگے بڑھائی۔ ”میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ امجد ایک بہترین شوہر ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مجھے نیک اور صالح اولاد سے نوازا ہے۔میں مجموعی طور پر اپنے گھر میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں آپ کی طرف سے میرا دل بالکل صاف ہے۔آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔“ اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہی ہوں؟“

”نہیں مجھے خیال نہیں آیا۔“ میں نے جواب دیا۔

نسرین نے وجہ بتائی۔ ”میری امی نے ہمیشہ ہم بھائی بہن کی پرورش میں اعلیٰ اقدار اور قرآنی تعلیمات کو بہت اہمیت دی۔انہوں نے مجھے سکھایا کہ انسان کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔یہ تعلیم ہم کو ہماری کتاب دیتی ہے۔اگر کسی انسان سے تمہارے دل میں کدورت آجائے تو اس کو اپنے دل سے نکال دو اور صرف اپنے دل سے نکالنا کافی نہیں ہے۔اس انسان کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اب تمہارے دل میں اس کی طرف سے کوئی کدورت نہیں ہے۔اس انسان کو اس بات سے



مطلع کردو۔میں نے اسی لیے آپ کو یہ سب باتیں اتنی تفصیل کے ساتھ بتائی ہیں۔“

نسرین تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی مگر میں کافی دیر تک اس کا اور کرسٹینا کا موازنہ کرتا رہا۔مجھے کرسٹینا سے کسی قسم کا کوئی گلہ نہیں تھا وہ ایک بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی مگر ان دونوں ہستیوں میں وہی فرق تھا جو ایک مشرق کے پروردہ اور ایک مغرب کے پروردہ میں ہوتا ہے۔ سارا زور معیشت پر، انسانی اقدار ثانوی ہوکر رہ جاتی ہیں۔

جس صبح نسرین آئی تھی اسی شام مجھے سلمان سے ملنے جانا تھا۔ہم پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ یار تم لکی تھے تمہاری لاٹری نکل آئی تم امریکا چلے گئے۔اگر میری بھی لاٹری نکل آئی ہوتی تو میں بھی تمہاری طرح عیش کرتا لیکن کوئی بات نہیں“ مگر میرا بیٹا گرین کارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔“

سلمان کا بیٹا امریکا میں تھا وہاں پر اس نے گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے ایک امریکن لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ سلمان کی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ”یار میں اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔“ سلمان نے کہا پھر اپنا جملہ مکمل کیا۔ ”میں اکیلا ہوں تو کیا ہوا۔میرے بیٹے کا فیوچر تو سکیور ہوجائے گا۔“

”سلمان!“ میں نے اس کو مخاطب کیا۔ ”یار سب سے ملاقات ہوگئی۔ مگر میں اب تک اسد سے ملنے نہیں گیا۔“ سلمان نے اس کو فون کیا۔نسرین کا بھائی ہے۔فون پر طے ہوا کہ میں اور سلمان کل رات کا کھانا اسد کے گھر پر کھائیں گے۔ اسد ابھی تک فرقان چچا کے بنائے ہوئے ناظم آباد کے تین سو گز والے گھر میں رہ رہا تھا۔اس گھر میں وہ اپنے بڑے بیٹے، بہو اور اپنی اکلوتی پوتی اور دو پوتوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔

میں سلمان اور اسد تیس بتیس برس کے بعد ایک جگہ اکٹھا ہوئے تھے۔ہم لوگ باتوں میں مصروف تھے کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔اسد نے با جماعت نماز پڑھائی۔میں بھی وضو کرکے اسد اور اس کے پوتوں کے ساتھ جماعت میں شامل ہوگیا۔

نماز کے کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔اسد نے دروازہ کھول کر آنے والے مہمان کو اندر بلا لیا۔ ”نعمان بھائی“۔ اسد نے آنے والے مہمان سے میرا تعارف کرایا۔ ”آج جمعہ ہے ہر جمعہ کی شام آپ کے ہم نام مولانا نعمانی صاحب میرے پوتوں اور پوتی کو قرآن کا درس دینے آتے ہیں۔جب تک ان کا درس ہوتا ہے ہم چل کر بیڈ روم میں باتیں کرتے ہیں۔“

”نہیں اسد۔“ میں نے مولانا نعمانی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کبھی درس قرآن میں شرکت نہیں کی ہے۔میں بھی آج اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں گا۔“

مولانا صاحب نے سورہ البقرہ کی ان آیات کی تلاوت کی جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ذکر ہے جو ان دونوں عالی مرتبت پیغمبروں نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔اس کے بعد مولانا صاحب نے وضاحت فرمائی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تو مرتے وقت اپنے بیٹوں کو دین اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی مگر آج کا مسلمان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہے۔جب موت کے دہانے پر پہنچتا ہے تو اپنی اولاد کو دین کے متعلق تو کوئی وصیت یا نصیحت نہیں کرتا، ہاں البتہ یہ ضرور نصیحت کرتا ہے کہ فلاں سے پیسے لے لینا میں نے اس کو قرض دیا تھا اور فلاں جائیداد اور پلاٹ کا خیال رکھنا اور پھر بھی ہم یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں برکت نہیں رہی۔“ مولانا صاحب کی باتیں میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئیں۔میں نے اور میرے باپ نے اپنی اپنی اولاد کو صرف فیوچر سکیور کرنے کی نصیحت کی تھی۔سلمان نے بھی اپنے بیٹے کو یہی نصیحت کرتے ہوئے اس کی شادی ایک امریکی لڑکی سے کرا دی۔شاید یہی وجہ ہے کہ میری اور سلمان کی زندگیوں میں وہ سکون اور احساس طمانیت نہیں ہے جو اس کی زندگی میں تھا باوجود اس حقیقت کے کہ دنیاوی دھن دولت کے معاملے میں اسد ہمارا پاسنگ بھی نہیں۔

☆.....☆

میں ابھی ابھی پاکستان سے واپس امریکا آیا ہوں۔ پہلے میں نے سامان اپنے کمرے میں رکھا پھر غسل خانے میں جاکر شاور لیا۔اپنا پسندیدہ گاؤن پہنا اور کچن میں چائے بنانے آگیا۔کچن میں ہر چیز صاف ستھری ہے۔قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ جین نے آج صبح آکر کچن کی صفائی کی ہے۔جین میری میڈ کا نام ہے۔جین ہفتے میں تین دن میرے گھر کی جھاڑ پونچھ اور صفائی کرنے آتی ہے۔اپنی زندگی میں کرسٹینا یہ سارے کام خود کرتی تھی بہت سگھڑ عورت تھی۔اس نے مجھے ساری زندگی بہت آرام دیا تھا۔چائے کا مگ لے کر میں ٹی وی لاؤنج میں آگیا۔ٹی وی کا سوئچ آن کرکے اس کے سامنے اپنی پسندیدہ لیزی بوائے کی آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر

دراز ہوگیا۔ چائے کی چسکیوں کے دوران پاکستان کی یادوں نے مجھے گھیرلیا۔ وہاں کے لوگ مجھے یاد آنے لگے۔

سب سے پہلے مجھے اپنے بچپن کی ساتھی بہن بانو یاد آگئی۔ جب میں نے کراچی میں اس کو اپنے گلے سے لگایا تو مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے یہ میرے ہی بدن کا بچھڑا ہوا حصہ تھا جو دوبارہ میرے اندر ضم ہوگیا تھا۔ بانو سے میرا حسین بچپن رقم تھا۔

پھر مجھے نسرین کی یاد نے گھیرلیا۔ وہی نسرین جس سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور جب میں نے کرسٹینا سے شادی کی ...تو مجھے نسرین کے بچھڑ جانے پر اتنا بھی احساس زیاں نہیں ہوا تھا جتنا ایک پینسل کے گم جانے پر ہوتا ہے۔ مگر اسی نسرین نے مجھے عفو اور درگزر کا وہ عملی سبق دیا تھا جو شاید ایک جید عالم بھی نہ دے پاتا اور یہ سبق اس تربیت کا ثمر تھا جو تربیت نسرین کی ماں نے نسرین کو دی تھی۔ وہی نسرین کی ماں جن کو میں ممی اور سلمٰی آنٹی کے مقابلے میں دقیانوسی اور گنوار گردانتا تھا کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ ممی اور سلمٰی آنٹی کی طرح سوسائٹی میں موو کرسکیں۔ مگر آج میں ان کی تربیت کو سلام کررہا تھا۔ ان کی تربیت نے کیسے ہیرے تراشے تھے۔

اور سلمان جس کی سوچ بالکل میری سوچ کی طرح کلیتاً مادی تھی ہم دونوں کو فیوچر سیکیور کرنے کے آگے کچھ نہیں سوجھتا تھا لیکن اسد ہم دونوں سے کس قدر مختلف تھا۔ مجھے اسد سے وحشت سی ہوا کرتی تھی۔ میں اس کی جنگل جیسی بے ہنگم داڑھی اور اونچے پائجاموں سے الرجک تھا مگر آج اگر میں اپنا اور اسد کا موازنہ کروں تو ہم دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ جو سکون مجھے اسد کے گھر میں محسوس ہوا وہ میرے گھر میں کہیں نہیں تھا۔ مجھے اپنا دو ایکڑ کی لیک فرنٹ پراپرٹی پر بنا ہوا شاندار گھر اسد کے ناظم آباد کے تین سو گز کے گھر کے مقابلے میں جھونپڑا محسوس ہورہا تھا، میرا گھر دنیا جہاں کے قیمتی نوادرات سے بھرا ہوا تھا لیکن یہ سب بے جان تھے۔ اسد کے گھر میں اپنوں کے وجود کی گرمی تھی۔ اپنوں کی سانسوں کی مہک تھی۔ میرا گھر اس مہک سے خالی تھا۔ میں انہیں سوچوں اور یادوں میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر برابر میں رکھی ہوئی میز پر سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔ آواز آئی۔ ''ہیلو ہاؤ آر یو اولڈ مین۔'' یہ میرے بیٹے کی آواز تھی اردو میں اولڈ مین کا ترجمہ شاید بڈھا کھوسٹ کیا جائے گا مگر یہ امریکا کی ایک اور سوغات ہے۔ وہاں کے نوجوان اپنے باپ کو کسی باتوقیر خطاب کے بجائے اولڈ مین کہتے ہیں۔ امریکا میں رہنے والے پاکستانی نوجوان بھی اب ان کی تقلید کرنے لگے ہیں۔

''ٹھیک ہوں بیٹا تم کب آرہے ہو؟'' میں نے پُرامید ہوکر پوچھا۔ مجھے اپنے بیٹے سے ملے ہوئے دو سال سے اوپر ہوچکے تھے۔ اس کا پچھلے سال میرے پاس آنے کا پروگرام تھا لیکن اس کی اسی زمانے میں شادی ہوئی تھی۔ اس نے میرے پاس آنے کا پروگرام مؤخر کردیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ہنی مون منانے ورلڈ ٹور پر چلے گئے تھے۔ اس سال چھٹیوں میں اس کا میرے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بالکل پکا تھا تم کب میرے پاس آرہے ہو۔ میں نے پوچھا۔

''اولڈ مین! میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے۔'' میرے بیٹے نے جواب دیا۔'' میں خوش ہوگیا کہ اب جلد اپنے بیٹے کو دیکھوں گا۔'' بیٹے نے اپنا سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ''دراصل میں نے اور سیمون نے ......'' سیمون میری بہو کا نام ہے جس کو میں پہلی بار دیکھوں گا۔ ''سیمون نے اپنے لیے گھر پسند کرلیا ہے۔ بہت اچھا گھر ہے اچھی قیمت پر مل رہا ہے کل ہم اس کی ڈیل پکی کررہے ہیں۔''

''مبارک ہو بیٹا۔'' میں نے خوش ہوکر کہا۔ ''انسان کے سر پر چھت کا ہونا بہت ضروری ہے۔''

''تھینکس اولڈ مین! ہماری تمام جمع پونجی اس گھر کے ڈاؤن پے منٹ میں چلی جائے گی۔ جس کی وجہ سے ہم آپ سے ملنے اس سال نہیں آسکتے۔ اگلے سال ضرور آئیں گے۔''

میری ساری خوشی پر اوس پڑگئی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ بیٹا باپ کا بھی تمہارے اوپر کوئی حق ہے۔ تم باپ کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہو مگر میں ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ قصور اس کا نہیں میرا تھا میں نے اس کو بتایا ہی نہیں تھا کہ انسانوں کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہوتے ہیں۔ نقص اس کی سوچ میں نہیں تھا۔ میری تربیت میں تھا۔ میں نے بھی اپنے بیٹے کو وہی نصیحت کی تھی جو میرے ڈیڈی نے مجھے کی تھی۔ ''اپنا فیوچر سیکیور کرنا اور فیوچر سیکیور کرنے کے لیے سر پر چھت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پہلا موقع ملتے ہی گھر خرید لینا۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا۔'' میں نے نحیف آواز میں مایوس ہوکر کہا۔ ''تم مجھ سے ملنے اگلے سال بھی آجانا تمہارے فیوچر کے لیے گھر خریدنا بہت ضروری ہے۔'' ریسیور میرے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر جاگرا۔ مجھے اسد یاد آگیا جس کا بیٹا اپنے بیوی بچوں سمیت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہوتا تھا۔



# ہمتِ مرداں

مدیر سرگزشت
سلام مسنون
عرصہ بعد ایک اور سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس کا ایک کردار میں خود ہوں اور دوسرا کردار وسیم حیدر ہے جس نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں اس کی جہد مسلسل کو قرطاس پر منتقل کروں تاکہ دوسرے بھی سبق حاصل کریں۔

وحید ریاست بھٹی
(کلر سیداں)

یہ واقعہ جون 2006ء کا ہے۔ اس دن صبح طلوع ہوتے ہی سورج نے کرنوں کی بجائے آگ برسانا شروع کردیا تھا۔ نہانے کے باوجود بھی پسینا بہہ رہا تھا۔ گرمی نے نہ صرف جسم بلکہ روح تک کو مضمحل کردیا تھا، آفس چونکہ میری رہائش سے فقط پندرہ منٹ کی دوری پہ تھا مگر یہ تھوڑی سی دوری بھی آج جاں لیوا ثابت ہورہی تھی فٹ پاتھ پہ چلنا پل صراط پر سے گزرنے کے مترادف تھا۔ بس ایک بات قلب و ذہن کی دنیا میں سمائی ہوئی تھی کہ جلد از جلد منزلِ مقصود

(بینک) تک پہنچ جاؤں۔

بالآخر میں آفس پہنچ ہی گیا اتفاق سے بجلی بھی موجود تھی ورنہ آج دم ہی نکل جاتا، آفس پہنچ کر یخ بستہ حال میں ائیر کنڈیشنڈ کے آگے کھڑا ہو گیا۔ گرمی کا احساس ختم ہوا تو اپنی نشست پہ براجمان ہوا۔ خلافِ معمول آج بینک میں کچھ زیادہ ہی رش تھا، کافی دیر تو سر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی مگر اتنا تھا کہ ہمارے کاؤنٹر کے دائیں جانب ایک ہیولا سا فضا میں معلق محسوس ہو رہا تھا، جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کریڈٹ کارڈ ڈیپارٹمنٹ کا نمائندہ وسیم حیدر کھڑا تھا۔

میں یہاں آپ کو اپنے بینک کے حوالے سے کچھ بتاتا چلوں کہ ہر بینک کو مالی اور انتظامی امور کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے پورے ملک میں مختلف Zones میں تقسیم کیا جاتا ہے، ہر زون میں بینک کی مختلف پروڈکٹس مثلاً انشورنس، اقساط پر گاڑی دینا، مکان بنانے کے لیے قرض دینا اور کریڈٹ کارڈ وغیرہ بنوانے کے لیے علیحدہ علیحدہ ڈیپارٹمنٹ ہوتے ہیں اور ان ڈیپارٹمنٹ کو بینک کی پروڈکٹس سیل کرنے کے لیے Third Party Contract کے ذریعے پڑھے لکھے نوجوانوں کو ملازم رکھ لیا جاتا اور پھر ہر نوجوان کو اس زون میں واقع تین سے پانچ برانچز دے دی جاتی ہیں کہ ان متعین کردہ برانچز میں جا کر مختلف کھاتہ داران سے رابطہ کر کے بینک کی پروڈکٹس زیادہ سے زیادہ سیل کریں، اس کام کے لیے انہیں تنخواہ کے علاوہ ہر ماہ کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔ جو جتنی زیادہ محنت کرتا ہے اتنا ہی پھل پاتا ہے۔ وسیم حیدر بھی ان باہمت سیلز بوائز میں سے ایک تھا جسے بینک نے اپنی اسکیم کریڈٹ کارڈ کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ہماری برانچ لیاقت روڈ میں لگائی گئی تھی۔ وہ ہفتے میں دو تین دن آتا یا اگر کوئی کھاتہ دار کسی پروڈکٹ میں دلچسپی کا اظہار کرتا تو ہم اسے ٹیلی فون کر کے بلا لیتے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ " آن کال میسر رہتا تھا"، میں بیان کر رہا تھا کہ میرے کاؤنٹر کے دائیں جانب وسیم حیدر چپ چاپ کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا، یار تم اتنی دیر سے کھڑے ہو بندہ سلام ہی کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتا ہے۔ وہ کہنے لگا، وحید بھائی آپ کام میں اتنے محو تھے کہ میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔

میں نے اس سے مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ میں نے کہا، "بیٹے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے آج تو تمہیں چھٹی کرنی چاہیے تھی۔ تمہیں آفس کی بجائے ڈاکٹر کے پاس ہونا چاہیے تھا تم عجیب انسان ہو اتنے تیز بخار میں بھی بینک آ گئے۔

وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "بھائی آپ مجھے کاغذ اور قلم عنایت فرمائیں گے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں استعفیٰ تو نہیں دے رہے ہو؟" اور کاغذ، قلم تھما دیے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جب اس نے کاغذ، قلم واپس کیے تو میں نے اس کی تحریر پڑھنا شروع کی جس نے میرے ہوش اڑا دیے کہ اتنا خوش لباس اور خوش مزاج انسان، کتنے کرب سے گزر رہا ہے اور ہمیں اس بات کی خبر تک نہیں۔ اس نے لکھا۔ "میں ڈاکٹر کے پاس دوا لینے کیسے جاتا؟ جبکہ میرے پاس اتنی بھی رقم نہیں کہ میں صبح کا ناشتا ہی کر سکتا اور دو ماہ سے بیٹھک کا کرایہ جہاں میں رہ رہا ہوں، بھی ادا نہیں کر سکا، آپ ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

یقین مانیں یہ پڑھ کر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے کہ ہمارے ساتھ بات بات پہ قہقہے لگانے والا اتنا بھی لاچار ہو سکتا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ملازم بینک کا ہو اور اس کے پاس پیسے نہ ہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟ تو اس بات کا جواب یہ ہے کہ وسیم حیدر بینک میں Contract Basis پہ ملازم تھا اور اس کی تنخواہ صرف سات ہزار روپے تھی باقی اس کی کمائی کریڈٹ کارڈ کے مرہونِ منت تھی۔ دن بھر وہ جتنے بھی کارڈز بنواتا، ہر کارڈ پر اس کا طے شدہ کمیشن تھا، جس سے وہ اپنی گزر اوقات کا سامان کرتا اور اپنے والدین کو ہر مہینے کچھ رقم بہاولپور بھیجا کرتا تھا۔

میں نے اس کی تحریر پڑھ کر فوراً چپکے سے لفافے میں بند کر کے کچھ روپے دیے اور کہا کہ پہلے جا کر ناشتا کرو اور پھر ڈاکٹر کے پاس جاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا، میں معمول کے مطابق اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شاید ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ وہ واپس آ گیا اور میرے کاؤنٹر کے پاس پہلے کی طرح کھڑا ہو گیا میں نے کہا۔ "ہاں اب کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور ایک شاپنگ بیگ میں دوائیں نظر آئیں۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے دوا لے آئے ہو تو اب انہیں کھانا اور صحت یاب ہونا بھی تمہارا کام ہے۔ میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ "میں آپ کو دکھانے آیا ہوں کہ آپ کے پیسوں کا میں نے غلط استعمال نہیں کیا، یہ دوائیں اس بات کی گواہ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بکواس نہ کرو اور گھر جاؤ، آرام کرو، جب ٹھیک ہو جاؤ تو بینک آ جانا۔"

☆......☆

تقریباً پندرہ دن کے بعد وہ آیا آتے کے ساتھ ہی سلام کیا۔ میں نے حال احوال دریافت کیے، کہنے لگا۔ "آپ کی دعاؤں سے اب الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں آپ کام سے فارغ ہو جائیں تو باہر تشریف لے آئیں، آپ سے ایک بہت ضروری مسئلے پر بات کرنی ہے فی الحال میں باقی اسٹاف سے علیک سلیک کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔"

اندازاً دس پندرہ منٹ تک میں اپنے کام سے فارغ ہو گیا اور باہر آ کر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ہاں اب بولو، وہ کون سی ضروری بات ہے جو تم نے کرنی تھی؟"

کہنے لگا۔ "ایسے ہی تو بات نہیں کرنی جی، بات کرنے کے کچھ آداب ہوتے ہیں، کچھ لوازمات ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "زیادہ فلسفہ نہ جھاڑو، ذرا آسان پیرائے میں بیان کرو۔"

کہنے لگا۔ "بھائی جان میرا مطلب ہے کوئی چائے پانی، کوئی کولڈ ڈرنک، کوئی جوس وغیرہ منگائیں، تب جا کے آپ سے آپ کے اور اپنے فائدے کی بات کرنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔"

میں نے اپنے پیون کو چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لانے کا کہا۔ جب تک چائے آتی اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ "حضور یہ آپ کی امانت ہے۔"

میں نے کہا۔ "کون سی امانت؟"

کہنے لگا۔ "جب میں بیمار ہوا تھا تو آپ نے جو مشکل وقت میں میری مدد کی تھی اس کا بدلہ تو میں نہیں چکا سکتا مگر وہ روپے تو لوٹا سکتا ہوں۔"

مجھے اس پر غصہ آ گیا میں نے کہا۔ "وسیم میں نے تمہارے ساتھ جو بھی کیا، کوئی احسان سمجھ کر نہیں بلکہ چھوٹا بھائی سمجھ کر تم مجھے اسی طرح عزیز ہو جس طرح مجھے میرا چھوٹا بھائی عزیز ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی اتفاق سے وسیم ہی ہے اور ہاں ایک بات یاد رکھنا کہ بڑے بھائی چھوٹے بھائیوں پہ احسانات نہیں کیا کرتے سمجھے اور یہ پیسے اب کبھی مجھے لوٹانے کی کوشش نہ کرنا، ہو سکتا ہے یہی جذبۂ ہمدردی مجھے اللہ پاک کے ہاں سرخرو کر دے۔" میری ان باتوں سے اس کی آنکھوں میں نمی، وہ جھلملاتے موتیوں کی صورت واضح طور پہ دیکھی جا سکتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "اب وہ ضروری بات بتاؤ جس کے لیے تم اتنے بیقرار ہوئے جا رہے تھے؟"

کہنے لگا۔ "وحید بھائی، مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا آپ جیسے لوگوں کی بدولت ہی قائم و دائم ہے۔"

میں نے کہا۔ "مکھن نہ لگاؤ کام کی بات کرو۔"

پھر وہ گویا ہوا۔ "وحید بھائی، میں پندرہ دن سے میں لیٹا پلاننگ کرتا رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کس حوالے سے پلاننگ کرتے رہے ہو؟"

کہنے لگا۔ "یہی کہ میں بینک میں دیکھتا رہتا ہوں کہ زیادہ تر کسٹمرز آپ سے ہی آ کر ہیلو ہائے کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو تمہارے خیال میں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے؟"

"پہلے پوری بات تو سن لیں، میں نے سوچا ہے کہ آپ کی جان پہچان سے فائدہ اٹھاؤں۔"

میں نے کہا۔ "اب ذرا اس فائدہ اٹھانے والی بات کی کھل کر تشریح کر دو۔"

کہنے لگا۔ "وحید بھائی، بات اپنے تک ہی رکھیے گا کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "جب اعتماد کیا ہے تو بلا جھجک کہو میں رازداری کا وعدہ کرتا ہوں۔"

کہنے لگا۔ "وحید بھائی آپ اپنے دوستوں سے کہیں کہ وہ کریڈٹ کارڈ بنوائیں۔ ایک کریڈٹ کارڈ پر مجھے اٹھارہ سو روپے کمیشن ملتا ہے آٹھ سو روپے آپ رکھ لیں اور ایک ہزار روپیا میں رکھ لوں گا، اب بتائیں اس بزنس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے یا نقصان؟"

میں نے کہا۔ "میرے بھائی کے ہم نام دوست، میں

تمہاری فہم اور غور و فکر سے ترتیب دیے گئے بزنس کی تعریف نہ کروں تو یہ زیادتی ہوگی مگر مجھے معاف رکھنا کہ میں دوستوں کو کریڈٹ کارڈ بنوا کر دوں اور چند روپے کمیشن کی مد میں اپنی جیب میں ڈال لوں، وسیم صاحب میں نے دوستوں سے تعلق ہمیشہ بغیر مطلب کے ہی نبھایا ہے اور انشاء اللہ آیندہ بھی اسی نہج پر چلنے کا پروگرام ہے۔''

میرے اس بیان سے وہ کچھ شرمندہ بھی ہوا اور کچھ سہم سا بھی گیا۔ اسے خاموش اور پریشان دیکھ کر میں نے ہی سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا میں نے کہا۔''چھوٹے بھائی ایک یہ بھی تو صورت ہو سکتی ہے کہ میں اپنے دوستوں سے کہوں کہ وہ کریڈٹ کارڈ بنوالیں اور تم ان کے کمیشن سے ایک عدد بالکل نئی موٹر سائیکل خرید لو تاکہ تمہیں آنے جانے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بقول تمہارے کہ تم کریڈٹ کارڈز کی خاطر مختلف مارکیٹس اور مختلف علاقوں کے دکانداروں کے پاس اکثر پیدل ہی جاتے ہو۔ جب تمہارے پاس اپنی موٹر سائیکل ہوگی تو تم زیادہ بہتر انداز میں مارکیٹنگ کر سکو گے اور زیادہ تعداد میں کریڈٹ کارڈز بنوا سکو گے جس سے تم بھی اور تمہارے گھر والے بھی خوش و خرم رہیں گے۔''

میری باتوں پر وہ مبہوت رہ گیا اور فرطِ جذبات میں آکر مجھ سے لپٹ گیا، کہنے لگا۔''پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔''ہاں مجھے کچھ نہ کچھ ملنا تو چاہیے مگر روپے نہیں تمہارے دل سے نکلی ہوئی خلوص سے بھرپور دعائیں۔'' پھر میں نے اسے تفصیلاً سمجھایا کہ اسے اب کیا کرنا پڑے گا۔

میں نے کہا۔''وسیم صاحب آپ کو نئی موٹر سائیکل خریدنے کے لیے کتنے کریڈٹ کارڈز درکار ہوں گے؟''

کہنے لگا۔''بھائی جان اگر آپ پچیس کارڈز بنوادیں تو سمجھیں میری نئی موٹر سائیکل مجھے مل گئی۔''

میں نے کہا۔''مجھے منظور ہے، اب یہ تمہارے حوصلے اور محنت کا امتحان ہے کہ تم کتنے نمبر لے کر پاس ہوتے ہو، پھر میں نے پچیس Visiting Cards لیے اور شام کو گھر پہنچنے کے بعد ٹیلی فون انڈیکس لے کر بیٹھ گیا اور اپنے بہترین دوستوں کا انتخاب کرنے لگا، فہرست دوستاں خاصی طویل تھی اس مقصد کے لیے میں نے کوشش کی کہ تجارت پیشہ اور بینکرز قسم کے دوستوں کی لسٹ ترتیب دوں۔ وہ اس لیے کہ ان سے کریڈٹ کارڈ کے حوالے سے رابطہ زیادہ مناسب رہے گا، فہرست دوستاں مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنے ہر Visiting Card پہ مندرجہ ذیل عبارت اپنے دوستوں کے نام لکھی''اپنے چھوٹے بھائی وسیم کو بھیج رہا ہوں، خصوصی تعاون درکار ہے، اُمید ہے مایوس نہیں کریں گے، والسلام وحید''۔

صبح جب میں بینک پہنچا تو وسیم حیدر پہلے سے میرا منتظر تھا میں نے تمام اسٹاف سے دعا سلام کی اور پھر اپنے Visiting Cards وسیم کے حوالے کیے اور تاکید کی کہ کسی سے تم نے کچھ نہیں کہنا، خوش اسلوبی سے ملنا، باقی کام میرے کارڈز انشاء اللہ خود کریں گے، وہ بہت خوش ہوا اور کارڈز لے کر چلا گیا، تین دن کے بعد آیا۔ نہایت ادب سے ملا اور بہت جذباتی ہو رہا تھا، کہنے لگا۔''وحید بھائی جان مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ زیادہ اچھے ہیں یا آپ کے دوست۔''

میں نے کہا۔''میں تو انتہائی نالائق انسان ہوں، ہاں البتہ میرے دوست ایک سے بڑھ کر ایک نفیس طبع کے مالک ہیں۔''

پھر جب اس واقعہ کو ایک مہینا گزر گیا تو میں پریشان کہ وسیم جانے کدھر غائب ہو گیا؟ نہ اتا نہ پتا، اللہ خیر کرے، کہیں بینک چھوڑ کر کسی دوسرے بینک میں تو نہیں چلا گیا کیونکہ آج کل اس بات کا چلن عام ہو چکا ہے کہ آج اس نگر کل اس نگر، ایک دن وہی روزانہ والی مصروفیات یعنی وہی جمع تفریق والا کام جاری تھا کہ میرے کاؤنٹر کے دائیں جانب پھر ایک ہیولا سا لہراتا نظر آیا، میں نے اب کی بار نظر اٹھا کر دیکھنے میں تاخیری حربہ استعمال نہیں کیا دیکھا تو محترم وسیم حیدر صاحب بمع مٹھائی کے ڈبے کے کھڑے ہیں۔ مجھے نظر اٹھا کے دیکھ کر کہنے لگا۔''بھائی جان، باہر تو تشریف لائیں ایک بڑی خبر آپ کی منتظر ہے۔''

میں کاؤنٹر سے باہر آیا تو وہ اس طرح ملا جس طرح پیروں سے مرید ملا کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔''پگلے اتنی زیادہ عقیدت اللہ خیر کرے۔''

کہنے لگا۔''وحید بھائی میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں؟''

میں نے کہا۔''یار پہلے پوری بات بتا پھر آخر میں شکریے کا دور چلے گا۔''

وہ کہنے لگا۔''وحید بھائی آپ کے Visiting



Cards نے کرامت جیسا کام کیا ہے۔'' اس نے کارڈز کی کرامت کے ثبوت کے لیے پہلے ایک چابی ہوا میں لہرائی اور پھر بڑے ادب سے میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے وسیم پر رشک آیا، اس نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔''وحید بھائی آپ کی اور آپ کے دوستوں کی وجہ سے میں صاحب موٹر سائیکل ہو گیا ہوں، اللہ پاک آپ کو دونوں جہانوں میں کسی کا محتاج نہ کرے، سدا سکھی رکھے۔''

وہ اور بھی بہت طویل دعائیں دینے کا پروگرام مرتب کر کے آیا تھا مگر میں نے اسے درمیان میں ہی روک دیا کہ اللہ پاک کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنا حوصلہ بخشا اور تمہارے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ جب خدا کسی کے رزق میں اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایسے ایسے اسباب پیدا فرما دیتا ہے کہ عقل جہان حیرت میں گم ہو جاتی ہے اور انکی انعامات کا اور اک پھر بھی نہیں کر پاتی اور ہاں پیارے بھائی ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا بقول واصف علی واصف''اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارا رزق اللہ کے پاس ہے تو تم کبھی بھی رزق تلاش نہ کرو بلکہ اللہ کو تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔'' اس کے بعد میں نے اس سے کہا۔

مجھے اللہ پاک نے جتنی فراست و بصیرت بخشی ہے، میں اس کی روشنی میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمالیا ہے، اب یہ تم پہ ہے کہ تم اس پاک پروردگار کا کس قدر شکر ادا کر کے شاکرین کی فہرست میں نام لکھواتے ہو۔''

اس نے میری باتیں سننے کے بعد کہا۔''وحید بھائی پہلے منہ میٹھا کریں اور پھر میری ایک دلی خواہش ہے کہ سب سے پہلے آپ موٹر سائیکل چلائیں تاکہ میرے دل کو قرار آئے۔''

میں نے اس جذباتی انسان کی خواہش کو بصد احترام پورا کیا اور باہر جا کر جب موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ سے لکھی تحریر بخوبی پڑھی جا سکتی تھی۔ اور میں اپنے دوستوں کو دل ہی دل میں کچھ اس انداز میں داد وفا دے رہا تھا۔

کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ آگے کا ماجرا اس کی زبانی تمام باتیں اس نے مجھے کل بتائیں۔

کل اتفاق سے وہ مجھے کلر سیداں میں نظر آگیا۔ وہ

☆ دنیا میں تقریباً آدھی جھیلیں انسانی سرگرمیوں کے باعث تنزلی کا شکار ہیں۔

☆ چین کی 100 جھیلیں بری طرح آلودہ ہو چکی ہیں ان جھیلوں کا 70 فیصد پانی میونسپل اور صنعتی اخراج پر مشتمل ہے۔

☆ کمبوڈیا کی جھیل Tonle sap بری طرح مٹی سے بھرتی جارہی ہے جس کی بنیادی وجہ اس جھیل کے واٹرشیڈ کے علاقوں میں درختوں کی بے تحاشا کٹائی ہے۔

☆ نیکارا گوآ کی Lake Managoa حیاتیاتی تنوع سے عاری ہو چکی ہے کیوں کہ 1925ء سے بغیر کسی کشید کے گندہ پانی اور میونسپل ویسٹ اس جھیل میں ڈالا جارہا ہے۔

☆ شمالی تیونیسیہ Northern Tunisia کی جھیل Lch Keul کو پانی مہیا کرنے والے دریاؤں کے رخ موڑنے کے حوالے سے اس جھیل کو خطرات کا اندیشہ ہے۔

....☆....☆....

☆ مصر کی Lake Manzala مچھلیوں سے محروم ہو چکی ہے جس کی بنیادی وجہ پورٹ سعید کی توسیع کے نتیجے میں 1970ء کے عشرے میں زہریلے صنعتی مادے کا جھیل میں پھینکا جانا تھا۔

☆ جھیل وکٹوریہ کا 30 میٹر سے زائد گہرائی کا پانی آکسیجن سے محروم ہو چکا ہے کیوں کہ ہر سال جھیل میں 2 ملین لیٹر گندا پانی تنزانیا کی جانب سے پھینکا جارہا ہے۔

☆ سائبیریا کی جھیل Baikal میں آلودہ فیکٹریاں ملین کیوبک میٹر مادہ پھینک چکی ہیں جس سے 1990ء کے عشرے کے وسط تک جھیل کی تہہ کے 20 مربع کلومیٹر علاقے میں آلودگی کے باعث آکسیجن کی مقدار کم ہو چکی ہے۔

☆ مغربی افریقا کے ممالک چاڈ، نائیجیریا اور کیمرون کی سرحدوں پر واقع جھیل چاڈ ان تینوں ممالک کے تازہ پانی کے آبپاشی کے منصوبوں کا ماخذ ہے لیکن گزشتہ 30 سالوں میں جھیل کے سائز میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی ہے۔ 1963ء سے اب تک جھیل اپنے اصل سائز کے مقابلے میں صرف 20 فیصد رہ گئی ہے جس کی وجہ آب و ہوا میں تبدیلی اور زراعت کے لیے پانی کی زیادہ مانگ ہے۔

مرسلہ: راحت علی کراچی

خاصا بدل گیا تھا۔ اس نے مجھے پہچانا اور باقی کی کہانی سنائی۔ ”میرا پورا نام وسیم حیدر ہے اور میری پیدائش 1986ء کو ضلع بہاولپور کی تحصیل یزمان میں ہوئی۔ میں اپنے والدین کی دوسری اولاد تھا۔ مجھ سے بڑا میرا ایک بھائی ہے جبکہ دو بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں، میرے والد صاحب ٹریکٹر کے ماہر ترین کاریگروں میں شمار ہوتے ہیں اور اس میدان میں انہوں نے اللہ پاک کے فضل و کرم سے بہت روپیا کمایا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میری عمر صرف دو سال تھی تو والد صاحب پوری فیملی کو لے کر حج کے لیے گئے پھر مجھے اسکول داخل کرایا گیا۔ میں نے میٹرک 2002ء میں فرسٹ ڈویژن میں اسٹڈیز اسپیل انگلش سسٹم اسکول یزمان سے پاس کیا، پھر 2004ء میں گورنمنٹ کالج یزمان سے ایف، ایس، سی، سیکنڈ ڈویژن میں پاس کی۔ ایف، ایس، سی کرنے کے بعد 2006ء میں، میں نے Third Party Contract پر ایم، سی، بی میں بطور پرسنل بینک کنسلٹنٹ کے جاب کا آغاز کیا اور اسی دوران میں آپ سے لیاقت روڈ برانچ میں ملاقات ہوگئی۔ وحید بھائی جب آپ چند گھریلو معاملات کے سبب 2008ء کو راولپنڈی سے ٹرانسفر ہو کر اپنے آبائی علاقے گلر سیداں چلے گئے تو پھر اس کے بعد میں نے آپ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق زیادہ سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ میں جہاں دن میں بیس پچیس دکانوں پہ مارکیٹنگ کے لیے جاتا تھا، اپنی کنوینس ہونے کے ناتے پینتالیس پچاس دکانوں پر جانے کے قابل ہو گیا۔ ظاہر ہے اس سے میری آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے کافی سارے لوگوں کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔

اسی دوران 2008ء میں والز آئس کریم کے سیلز منیجر صاحب کے پاس جانا ہوا، وہ بہت نفیس انسان تھے انہوں نے نہ صرف کریڈٹ کارڈ کے لیے اپلی کیشن فارم سائن کر کے دیا بلکہ مجھے walls میں جاب کے لیے بھی آفر کر دی، سیلری پیکج، بینک کی نسبت دو گنا تھی۔ میں نے ہاں کر دی اور یوں بینک کو 2008ء میں الوداع کہہ کر walls میں بطور راوٹ سیلز آفیسر راولپنڈی میں ہی اپائنٹ ہو گیا، اسی دوران 2008ء میں، میں نے بحیثیت پرائیویٹ طالب علم ”اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور“ سے، بی، اے، کا امتحان بھی پاس کر لیا، اس کے بعد میں نے 2009ء کو اینگرو فوڈز میں بطور راوٹ سیلز آفیسر کام شروع کر دیا۔ چند ماہ بعد میری ترقی بھی ہوگئی اور میری تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا اور اب میں اینگرو فوڈز میں بطور ٹیریٹری سیلز منیجر خدمات سر انجام دینے لگا۔ اینگرو فوڈز میں 2011ء تک جاب کرتا رہا۔ 2012ء کو میں نے ”شنگریلا پرائیویٹ لمیٹڈ“ میں بطور ایریا سیلز منیجر جولائی 2013ء تک کام کیا، اس کے بعد اگست 2013ء میں Lotte Kolson Pakistan Ltd میں بطور ایریا سیلز منیجر بہاولپور جاب کا سلسلہ شروع ہوا اور ہنوز جاری و ساری ہے، الحمدللہ اب میری ماہانہ آمدنی ستر ہزار روپے سے بھی زیادہ ہے، اور سب سے بڑھ کر کمپنی نے Cultus گاڑی اور ساتھ میں فری سیل سروس دی ہوئی ہے اور میرے ماتحت جنوبی پنجاب کے اکتیس شہر آتے ہیں، اسی سال 2015ء میں عمرہ کا ٹکٹ بھی جیت چکا ہوں اور عنقریب اللہ پاک اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس بارگاہ میں حاضر ہونے جا رہا ہوں، جتنا بھی اس مالک الملک کا شکر ادا کروں کم ہے، اس کریم پروردگار نے میری اوقات سے بڑھ کر مجھ عاجز و مسکین کو نوازا ہوا ہے، اور ہاں سال 2012ء کو میں رشتہ ازدواج میں بھی بندھ چکا ہوں اور پاک پروردگار نے نہایت فرمانبردار بیوی سے نوازا ہوا ہے اور کرم بالائے کرم کہ اللہ پاک نے اپنی ہمیشہ سے وسعت پذیر رحمت کے سبب ایک چاند سی بیٹی بھی عطا کر رکھی ہے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ پڑھائی کے سلسلے کو از سر نو جاری رکھوں، اسی سبب سے میں نے ”ورچول یونیورسٹی آف پاکستان بہاولپور“ میں، ایم، بی، اے، میں داخلہ لے لیا ہے، دعا فرمائیں اللہ پاک اس امتحان میں بھی کامیاب و کامران ٹھہرائے، آمین، ثم آمین“

میں یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ انسان صرف قسمت کے سہارے ہی منزلیں سر نہیں کرتا بلکہ عزم و حوصلہ بھی ہمیشہ جوان رکھنے کی اشد ضرورت پیش آتی ہے۔ آدمی تھوڑی سی محنت اور ہمت، جذبہ خلوص کے تحت کرے تو کوئی مشکل نہیں کہ منزل خود ہی چل کر قدموں میں آ جائے، بقول مدھو کر بہاری۔

انہیں منزل نہیں ملتی، جو قسمت کے سہارے ہیں!
ہے ان کی زندگی بھی موت، جو ہمت کو ہارے ہیں



جناب معراج رسول
السلام علیکم
یہ سرگزشت مجھے پرسوں اس کہانی کے مرکزی کردار نے سنائی ہے۔ اسے میں اپنے انداز میں احاطہ تحریر میں لایا ہوں۔ اُمید قوی ہے کہ آپ کو یہ داستان بھی پسند آئے گی۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

غربت اور ایمانداری، یہ دو چیزیں بیک وقت کسی انسان کے پاس ہوں تو کبھی کبھار زندگی اسے آزمائش میں بھی مبتلا کر سکتی ہے اور جس سے نکل آنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے بھی زندگی میں ایسی ہی ایک آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان دنوں میں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ بچیاں جوان ہوئی گھر بیٹھی تھیں۔ بچہ بیمار تھا، میری نوکری چھوٹ چکی تھی اور باوجود کوشش کے میں کہیں کام تلاش نہیں کر سکا تھا۔ گھر میں ماں، باپ، بہن، بھائی یا کسی اور قسم کی ذمہ داری نہیں تھی۔ بس ایک

بیوی اور چار بچے تھے، جن کی کفالت میرے سپرد تھی۔ سب سے بڑی بچی اٹھارہ سال کی تھی، اس سے چھوٹی چودہ سال کی۔ اس سے چھوٹا ایک لڑکا بارہ سال کا تھا اور اس سے چھوٹا سات سال کا۔ انسان کی شکل وصورت اور وجود تو خدا ہی بناتا ہے اور وہی اس میں خوبیاں اور خامیاں پیدا کرتا ہے، پر لوگ نجانے کیوں، ان چیزوں کا کمال یا قصوروار اسے کروانے لگتے، جس میں کوئی ایسی خوبی یا خامی ہو۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ میری بڑی بیٹی کی ایک ٹانگ میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی اور یہ مسئلہ، بچپن میں پولیو کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر یہ لنگڑاہٹ والی بات نکال دی جائے تو خدا نے میری چاند جیسی بچی کو کس شے سے نہیں نوازہ تھا؟ اتنی خوبصورت اور خوب سیرت تھی کہ محلے کے لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ پر اس کے باوجود اس کے لیے جو رشتہ آتا تھا، مسترد ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں اچھے اور خوشحال لوگ اس کے لیے رشتہ لے کر آتے تھے۔ پھر بعد میں عام سے اور غریب غربا کے رشتے آنے لگے۔ غریبوں یا غربت پر مجھے اعتراض نہیں تھا، میں خود غریب بندہ تھا۔ پر وہ رشتے غربت کے ساتھ ساتھ دوسرے عیبوں کے ساتھ بھی جڑے ہوئے تھے۔ کوئی چرسی ہوتا تو کوئی رنڈوا کوئی دوسری شادی کے لیے آجاتا تھا۔ ہم شاید حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے سعدیہ کا ان میں سے کسی ایک سے رشتہ کر دیتے، پر ان میں کوئی ایک تو ایسا ہوتا، جو اسے دو وقت کا کھانا، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور چھت کا سہارا دے سکتا۔ ہمیں ضمانت دیتا کہ وہ یہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہے۔ پر کوئی ایسی ضمانت دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ وعدے تو کرتے تھے، پر ہماری ہلکی پھلکی شرائط ماننے کو بھی تیار نہیں تھے اور بغیر شرائط کے سعدیہ کو یوں بیاہ دینا ہمیں گوارہ نہیں تھا۔ میں اور میری بیوی نازیہ، ہم دونوں ہی سعدیہ کو بہت چاہتے تھے۔ وہ ہمیں جان سے بھی عزیز تھی اور اس کے اچھے نصیب کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اور کچھ کرنا نہ سہی، پر دعا کرنا تو ہمارے اختیار میں تھا، اور وہ ہم کر رہے تھے، ہر نماز کے بعد۔ وہ شاید دعا کی قبولیت کی گھڑی تھی کہ اس دن سعدیہ کے لیے ایک بہت ہی اچھا رشتہ آگیا۔ لڑکا کسی بینک میں ملازم تھا اور اچھی تنخواہ لے رہا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ تھے۔ لڑکے نے سعدیہ کی معذوری کو نظر انداز کرتے ہوئے، پہلی ہی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ کو بھی یہ رشتہ پسند آیا تھا۔ انہیں خوبصورت، نیک، سلجھی ہوئی اور اچھی طبیعت کی لڑکی چاہیے تھی اور یہ سب خوبیاں سعدیہ میں موجود تھیں۔ لڑکے کی ماں نے دیکھتے ہی کہا۔ ''ماشاء اللہ، بہت ہی پیاری بچی ہے، نظر نہ لگے۔ کیا ہوا جو پاؤں میں تھوڑا سا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ ہمیں آپ کی بچی پسند ہے اور ہمارے بیٹے کو بھی۔''

میں اور نازیہ دل ہی دل میں خدا کے شکر گزار تھے کہ اس کے گھر میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ میں نے کہا۔ ''آپ لوگوں کا بڑا پن ہے ورنہ لوگ رائی کو پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ اور یہ بات سچ کہی آپ نے، ہماری بچی بہت ہی نیک اور سلجھی ہوئی ہے۔ یہ آپ لوگوں کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔''

''جی، جی انشاء اللہ......'' ہم دونوں میاں بیوی مسکرا دیے۔ ''اچھا بھئی باقی سب تو ٹھیک ہے، یہ بتائیں، بچی کو جہیز میں کیا کیا دے رہے ہیں آپ؟'' لڑکے کی ماں نے کہا تو ہم دونوں کے دل کی دھڑکن اچانک ہی رکنے لگی۔ ہم ان کی بات کی تہ میں پہنچ گئے تھے۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا تھا۔ سعدیہ کو دیکھنے کے لیے اسی طرح کے اچھے رشتے بھی آئے تھے، انہوں نے بھی اس کی معذوری کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے پسند کر لیا تھا، پر یہ سلسلہ وہاں آکر ختم ہو گیا، جہاں جہیز کی بات آئی تھی۔ یوں تو ہم میاں بیوی نے سعدیہ کے لیے جو کچھ ہو سکا تھا، بنا رکھا تھا، پر اتنا کچھ دینا ہمارے بس سے باہر تھا، جس کا لوگ تقاضہ کرتے تھے۔ پہلے اور آج کے زمانے میں بہت فرق آگیا تھا۔ لوگ اس معاملے میں بہت سیدھی اور صاف بات کرنے لگے تھے۔ میں نے کہا۔ ''بس جی غریب بندے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکا ہے، ہم نے سعدیہ کے لیے جوڑ رکھا ہے۔ وہی دیں گے اسے۔''

''اچھا، مثلاً کیا کیا؟'' مجبوراً ہمیں بتانا پڑا کہ ہم نے کیا کیا جوڑ رکھا ہے۔

''بس اتنا ہی؟'' ان کا لہجہ اچانک تھوڑا سا بدل گیا۔ ''بھئی ہمارا بیٹا ہزاروں میں ایک ہے۔ اچھی جاب کرتا ہے، ہزاروں کماتا ہے ہر ماہ۔ اب ماشاء اللہ دس مرلوں کا اپنا ذاتی مکان بنوا رہا ہے۔ آپ کو کم سے کم اتنا تو دینا چاہیے کہ ہمیں اس مکان کے لیے کوئی ضرورت کی چیز نہ لینی پڑے۔ اور پھر وہ آپ کی بیٹی کا ہی گھر ہوگا۔ جہاں وہ خود ان چیزوں کو استعمال کرے گی۔''

''جی جی، آپ کی بات درست ہے پر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا تو نازیہ نے میرا ہاتھ دبایا۔ ''جی آپ لوگ بات پکی کریں، ہم اپنی بچی کو ہر چیز دیں گے، جو جو آپ کہیں گی۔'' میں بیوی کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ ''دیکھیں جی، جو چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں، میں ان کی لسٹ آپ کو دے دیتی ہوں، ان کا بندوبست کرلیں۔ مثلاً...... فریزر، ایل ای ڈی، اے سی۔ فرنیچر کا مکمل سامان، واشنگ مشین، ائیر کولر اور......'' انہوں نے چند ایک دوسری چیزوں کا نام بھی لیا۔ ''اور ہاں، لڑکے کو سلامی میں ایک عدد ون ٹو، فائیو بائیک بھی...... کیا آپ دے سکیں گے؟''

میرا اور بیگم کا سانس سینے میں اٹکا رہ گیا۔ نازیہ بمشکل بولی۔ ''جی جی، ہم اپنی سی پوری کوشش کریں گے۔''

''کوشش نہیں، بات پکی ہو تو ہم بھی بات پکی کریں۔ ورنہ ہمارے بیٹے کے لیے اور بھی بہت سے رشتے ہیں۔''

''آپ ہمیں کچھ دنوں کا وقت دیں۔ ہم اِدھر اُدھر سے کوشش کرتے ہیں، اُمید ہے اتنا کچھ کرلیں گے۔''

''جی کوئی جلدی نہیں۔ آپ اِدھر اُدھر سے کوشش کیجیے، سوچیے، ہم ایک ہفتے بعد آئیں گے۔''

وہ تینوں چلے گئے اور ہمیں سوچوں کے بھنور میں ڈبو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بیگم سے کہا ''یہ کیا کیا تم نے؟ ہم اتنی چیزوں کا کہاں سے بندوبست کریں گے؟''

''اللہ مالک ہے، ہو جائے گا۔ جوان بچی سر پر بیٹھی ہے۔ آپ کے سامنے کیسے کیسے رشتے آتے رہے ہیں۔ اتنے عرصے بعد اتنا اچھا رشتہ آیا ہے، کیسے جانے دیتی؟ لڑکا بھی ماشاء اللہ خوبصورت اور کمانے والا ہے اور ہماری بچی کے جوڑ کا ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے، پر بات اب بھی وہی ہے کہ ان سب چیزوں کا بندوبست کہاں سے ہوگا؟ تمہیں پتا ہے کہ میری نوکری چھوٹ گئی ہے، دو وقت کے کھانے کا بھی بمشکل بندوبست ہوتا ہے اور......''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''وہ جو میاں صاحب ہیں نا، ہم ان کی سفارش سے، ان کے بینک سے پانچ لاکھ کا قرضہ لے لیتے ہیں۔ میں نے ایک بار ان کی بیگم نے اس بارے میں بات کی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ میاں صاحب ہمیں قرضہ دلا دیں گے۔'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں بے روزگار ہوں اور کوئی پتا نہیں کہ کب نوکری ملے گی...... ہم قرضے کی قسط کہاں سے بھریں گے؟''

''آپ سے ایک اور بات بھی کہنی ہے اگر وہ بھی مان لیں تو......''

''وہ بھی کہہ دو۔''

''وہ میاں صاحب کی بیگم ہیں نا، وہ کہہ رہی تھیں، اگر میں ان کے ہاں کام کروں تو وہ دس ہزار ماہانہ تنخواہ دیں گے...... اگر آپ کی اجازت ہو تو...... کام بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ بس گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑے برتن دھونے کا کام ہے...... صبح آٹھ نو بجے جانا ہے اور شام کو واپس لوٹ آنا ہے......''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''دیکھو نازیہ! ابھی میرے ہاتھ پیر سلامت ہیں، جب یہ ٹوٹ جائیں تو اپنا یہ شوق پورا کر لینا۔''

وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''مجھے معلوم ہے، آپ بہت خوددار ہیں۔ آپ کی غیرت کو یہ گوارہ نہیں ہوگا...... پر یہ بھی تو دیکھیں کہ جوان بچی سر پر بیٹھی ہے، معذور ہے۔ اس کے لیے اتنا اچھا رشتہ پھر نہیں آئے گا۔ اگر ہم دونوں کی کوشش سے اس کا فرض ادا ہو جائے تو...... اسے ایک اچھا گھر مل جائے گا۔ دوسری بچی بھی جوان ہے، اس کے بارے میں بھی سوچنا ہے ہمیں۔ وقت تو ویسے بھی کٹ رہا ہے، اس طرح بھی کٹ جائے گا۔ دو تین سالوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مجھے پتا تھا کہ اب وہ اپنے آنسوؤں کا ہتھیار استعمال کرے گی، جس کے آگے میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ سو اس کا موقع آنے سے پہلے ہی میں کمرے سے نکلا اور گھر سے باہر چلا آیا۔ اس کی بات ماننا مجھے کسی طور گوارہ نہیں تھی۔ میں باہر نکل کر بستی میں آوارہ گردی کرتا رہا اور اس مسئلے کے حل کے لیے سوچتا رہا۔ لوگوں سے ادھار لینا بہت دشوار تھا اور پھر اتنا زیادہ قرضہ کوئی دے بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر پانچ دس ہزار کی بات ہوتی تو بات بن بھی سکتی تھی مگر یہاں تو لاکھوں کی بات تھی۔ تب کہیں جا کر بات بنتی۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تو نازیہ میرے قریب آگئی۔ ''میں نے دوپہر کو آپ سے کچھ پوچھا تھا۔''

''میں نے جواب دے دیا تھا۔''

اچانک اس کے گرم گرم آنسو ٹپ ٹپ کر کے میرے سینے پر گرنے لگے۔ مجھے اسی کا خطرہ تھا۔ ''میں نے ساری زندگی آپ سے کچھ نہیں مانگا، آج اپنی بچی کے اچھے نصیب کے لیے آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں۔ دے سکتے ہیں تو دے دیں، میں اس کے بعد آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔'' میں

ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اس سے پیار تھا اور حد سے زیادہ تھا۔ وہ دنیا کی ان ہزاروں عورتوں میں سے ایک تھی، جو شوہر کی خوشی کے لیے اپنا سکون تک حرام کیے رہتی ہیں۔ پچھلے بیس برسوں میں شاید ہی ہماری لڑائی ہوئی ہو۔ ہماری زندگی میں دکھ سکھ بھی آتے رہے اور ہم نے اچھا برا وقت بھی کاٹا، مگر اس نے نہ ہی کبھی مجھ سے کچھ مانگا اور نہ ہی کسی بات کا شکوہ کیا۔ اور آج وہ روتے ہوئے مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی۔ مجھ میں ہمت نہ ہوئی کہ اس بار میں اسے انکار کرتا۔ میں نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھے۔ ''اچھا جو دل چاہے کرو، پر یہ رونا دھونا بند کرو۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آگئی، میں بھی مسکرا دیا۔ کبھی کبھی تقدیر انسان کو کیسے کیسے کام کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ ''اچھا سعدیہ کہاں ہے؟''

''وہ برآمدے میں نوافل پڑھ رہی ہے۔ آپ جانتے تو ہیں کہ وہ ہر جمعرات کو آدھی رات تک مصلے پر بیٹھی رہتی ہے۔ بہت نیک بچی ہے، اللہ نصیب اچھے کرے۔''

''سب تمہاری تربیت کا نتیجہ ہے۔''

''نہیں، یہ آپ کے رزق حلال کی برکت ہے۔''

''میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نازیہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں نے تمام عمر بچوں کو رزق حلال کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اور اسی کوشش میں ہی میری نوکری گئی تھی۔ میں جس دکان پر کام کرتا تھا، اس کے مالک نے اپنی دکان میں موبائل اور کمپیوٹر اسسریز کا سامان ڈالا ہوا تھا۔ دکان میرے سپرد تھی۔ میں ہی اسے سنبھالتا تھا۔ کچھ دن پہلے انہوں نے میری تنخواہ بڑھانے کی بات کی تو میں بہت خوش ہوا تھا، مگر اس وقت میری خوشی پر اوس پڑ گئی تھی جب انہوں نے کہا کہ وہ دکان میں غیر ملکی فلموں کی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز ڈالنا چاہتا ہے کہ میں یہ کام بھی کرتا رہوں۔ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے میری بات کی پروا کیے بغیر فلموں کی سی ڈیز...... دکان میں لا کر رکھ دیں۔ مجبوراً مجھے وہ نوکری چھوڑنا پڑی۔ میرے ضمیر نے مجھے یہ کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس دن سے اب تک میں بے روزگار تھا۔ صبح میں کام کی تلاش میں گھر سے نکلنے لگا تو نازیہ نے ایک بار پھر مجھ سے تصدیق چاہی۔ ''تو میں میاں جی کے گھر جا کر ان سے بات کروں؟''

''جو مناسب لگے کرو۔'' میں نے رات کو ہی اجازت دے دی تھی۔ میں خود کام کی تلاش میں صبح سے شام تک بھٹکتا رہا، مگر مجھے ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ مغرب سے کچھ دیر بعد میں واپس گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ میرے سامنے ایک سیاہ رنگ کا شاپر پڑا ہوا تھا، جس میں میرا اندازہ تھا کہ کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ میرا خیال بالکل درست نکلا۔ میں نے شاپر اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک رومال تھا، جس میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھا، میرا دل دھڑکنے لگا۔ شاید اس میں رقم تھی۔ میں نے تسلی کے لیے رومال کھول کر دیکھا اور...... میرا سانس سینے میں رک کر رہ گیا۔ اس میں نئے نئے ہزار ہزار کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں تھیں۔ وہ غالباً پانچ لاکھ روپے تھے اور بالکل نئے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے وہ رقم بینک سے نکلوائی ہو اور...... میں نے احتیاطاً ادھر ادھر دیکھا، کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے رومال بند کیا، شاپر میں ڈالا اور گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے نازیہ کو دوسرے کمرے میں بلایا اور بلب کی دم توڑتی روشنی میں، شاپر میں سے رومال نکالا اور اسے کھول کر نازیہ کے سامنے رکھ دیا۔ رقم دیکھتے ہی وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔ ''یہ...... یہ کہاں سے آئے آپ کے پاس؟''

''راستے میں پڑے ملے ہیں۔''

''راستے میں پڑے ملے ہیں؟ کیا مطلب...... اتنی بڑی رقم راستے میں کیسے پڑی مل سکتی ہے؟''

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' میں اس کی بات سے خفا ہو گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا'' نازیہ کے لہجے میں اب بھی لرزش تھی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ اتنی بڑی رقم......''

''مجھے لگتا ہے، کسی سے غلطی سے گر گئی ہے۔ صبح ادھر ادھر سے پتا کر کے لوٹا دیں گے۔''

وہ اب بھی گم صم سی تھی اور لاشعوری طور پر ان روپوں کی گڈیوں کو سہلا رہی تھی۔ ''اچھا، گنیں تو سہی کہ کتنے ہیں؟''

''ہمیں کیا، جتنے ہوں، ہم نے کون سا اپنے پاس رکھنے ہیں۔''

''پھر بھی دیکھیں تو سہی۔'' خود میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ میں ان روپوں کو تسلی سے گنوں۔ میں نے انہیں گنا، میرے اندازے کے مطابق وہ پورے پانچ لاکھ روپے تھے۔ اتنے روپے ایک ساتھ، نہ ہی میں نے دیکھے تھے اور نہ ہی نازیہ نے۔ ہم دونوں کی حالت بہت عجیب تھی۔ جب میں



نے نازیہ کو بتایا کہ کل رقم کتنی ہے تو اس کی سانس اور غیر ہموار ہو گئی۔ میں نے وہ رقم رومال میں باندھی اور شاپر میں ڈال کر اسے تھما دی۔ ''جاؤ، اسے بکسے میں رکھ کر تالا لگا آؤ'' نازیہ گئی اور وہ رقم بکسے میں رکھ کر تالا لگا آئی۔ ہم دونوں اپنی اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئے تو میں نے پوچھا۔ ''میاں جی کے گھر سے ہو آئیں؟''

''جی۔'' اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ ''پھر؟''

''میاں جی نے کہا ہے کہ پہلی بار ایک ساتھ اتنی رقم نہیں مل سکتی۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہزار مل جائیں گے، اس سے زیادہ نہیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا کہ آپ سے بات کر کے بتاؤں گی۔''

''اتنے پیسوں میں تو صرف دو تین چیزیں ہی آئیں گی۔ ہمارا مسئلہ تو حل نہیں ہوگا۔''

''تو پھر آپ ہی بتائیں کیا کریں؟''

''کل دیکھتے ہیں۔ فی الحال تو تھکن سے برا حال ہے۔ جی چاہتا ہے آنکھیں بند کروں اور سو جاؤں۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ جس کی رقم ہے، اسے تلاش کر کے واپس کرنی ہے۔ معلوم نہیں وہ کتنا پریشان ہو رہا ہوگا۔''

''چلیں ٹھیک ہے، آپ آرام کریں'' نازیہ کروٹ بدل کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر چاہنے کے باوجود میں نیند کو اپنے قریب نہ بلا سکا۔ کہنے کو تو میں نے نازیہ سے کہہ دیا تھا کہ میں صبح اس رقم کے مالک کو تلاش کر کے یہ رقم اس تک پہنچا دوں گا، پر اب میرا ارادہ ڈگمگانے لگا تھا۔ اچانک ہی بہت سی سوچوں نے میرے ذہن کو اپنا گھر بنا لیا۔ ایک خیال آتا، شاید خدا نے ہماری مدد کرنے کے خیال سے یہ رقم ہم تک پہنچائی ہو، کیوں کہ میں نے اور نازیہ نے ہر نماز کے بعد خدا سے بہت رو رو کر اس معاملے میں دعائیں کی تھیں، شاید یہ رقم اس لیے مجھے ملی ہو؟ ورنہ اس راستے سے اور کتنے لوگ گزر رہے تھے، یہ رقم ان کے ہاتھ کیوں نہیں لگی؟ پھر خیال آتا، شاید یہ رقم کسی غریب شخص کی گری ہو، جو ضرورت مند ہو اور...... پھر دوسرے ہی پل، میں اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا۔ کسی غریب شخص کے پاس اتنی رقم کیسے آسکتی ہے؟ یہ یقیناً کسی امیر شخص کی رقم ہوگی، جس کے جانے سے شاید اسے فرق نہ پڑتا ہو، پر ہمارے اس سے سارے کام سیدھے ہو سکتے تھے۔ میں سوچوں کے بھنور میں ڈوبا نجانے کب تک جاگتا رہا کہ اچانک شازیہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''جاگ رہے ہیں آپ؟''

''ہوں۔''

''سنیے!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟ کیوں نہ یہ رقم ہم خود رکھ لیں؟ اس سے ہمارے سب حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں......''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا'' معلوم نہیں یہ کس کی رقم ہے، اس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ یہ بددیانتی ہوگی۔''

''بددیانتی کیسے ہوگی؟ یہ کسی کی امانت تھوڑی ہے، جس میں ہم خیانت کر رہے ہیں۔ یا کسی سے چھین رہے ہیں۔ میں نے خدا سے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ مجھے لگتا ہے خدا نے میری سن لی ہے۔ اور اس رقم کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔''

اس کی آواز تھوڑی بلند ہوئی تو میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آہستہ بولو، بچے جاگ جائیں گے۔''

''آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آئیں'' اس نے چارپائی سے اترتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ وہ کمرا بچوں کے کمرے سے ذرا دور تھا۔ ''تو پھر کیا خیال ہے آپ کا؟'' نازیہ نے پوچھا۔

''سچ پوچھو تو میں بھی اب تک اسی بارے میں سوچ رہا تھا، پر میرا دل نہیں مان رہا۔ مجھے لگتا ہے، جیسے یہ غلط ہے۔ تمام عمر ہم نے بچوں کی رزق حلال سے پرورش کی ہے اور اب......''

''آپ اپنے دل کو فی الحال ایک طرف رکھ کر دماغ سے صرف سعدیہ کے بارے میں سوچیں۔ خدا نے اس کا نصیب سنوارنے کا ہمیں ایک موقع دیا ہے، اگر ہم نے یہ موقع بھی گنوا دیا تو ایسا موقع پھر ہمیں نہیں ملے گا۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں، جو آپ کی مرضی۔ آپ حالات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ شاید نازیہ نے مجھے اس بات کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ ''اچھا میں تمہاری بات مان لیتا ہوں پر جب لوگوں نے ہم سے اس رقم کے بارے میں پوچھا تو ہم کیا کہیں گے؟''

وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ ''ہم کون سا دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہیں جو وہ ہم سے پوچھیں گے؟ اور اگر کسی نے پوچھ بھی لیا تو کہہ دیں گے کہ ہم نے چار پیسے جمع کیے تھے، وہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔'' اس کے لبوں پر

ایک آسودہ سی مسکراہٹ اتر آئی۔ میں بھی یہ فیصلہ کرکے کسی حد تک پُرسکون ہوگیا۔ سچ میں ہمارے حالات بدلنے کا وقت آگیا تھا۔ اس رقم سے سعدیہ کا بہترین جہیز بن سکتا تھا۔ اس کی اچھی طرح سے شادی ہوسکتی تھی۔ اس رات، ہم رات گئے تک سعدیہ کے جہیز میں دینے والی چیزوں کے بارے میں بات کرتے رہے کہ ہم سعدیہ کو کیا کیا دیں گے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں صبح جاکر نہ صرف ان چیزوں کی قیمت معلوم کرآؤں گا، اگر مناسب لگا تو کچھ چیزیں خرید بھی لاؤں گا۔ اس رات مجھے اور نازیہ کو بڑی اچھی نیند آئی۔ صبح میں ناشتا کرکے اس کام کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک نازیہ گھبرائی ہوئی سی کمرے سے باہر نکلی۔ ''سنیے جی! بازار بعد میں جایئے گا، پہلے ڈاکٹر کے پاس جاکر وسیم کی دوائی لے آئیں، وہ بخار میں تپ رہا ہے۔''

میں نے اندر جاکر دیکھا، وہ سچ میں بخار میں جل رہا تھا۔ پتا نہیں وہ رات ہی رات کیسے بخار کی لپیٹ میں آگیا تھا؟ شام کو تو اچھا بھلا سویا تھا وہ۔ سات سالہ وسیم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور فوراً ہی ڈاکٹر زاہد کے کلینک کی طرف چل دیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو بیس اکیس سالہ شعیب، ڈاکٹر زاہد سے کسی موضوع پر بات کررہا تھا۔ وہ میرے گھر سے ذرا ہی فاصلے پر رہتا تھا۔ ''جی آپ کے کہنے پر ہم نے انہیں نیند کی گولیاں کھلادی تھیں، پر وہ ابھی تک نہیں اٹھے۔ آپ اگر ایک نظر چل کر دیکھ لیتے تو......''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس انہیں سکون سے سونے دیں، جب تک وہ سوتے رہیں۔ نیند پوری ہوتے ہی وہ خود بیدار ہوجائیں گے۔''

''کیا ہوا بھائی آپ کے والد صاحب کو؟'' میں نے شعیب سے پوچھا۔ جواب ڈاکٹر زاہد نے دیا ''کچھ نہیں۔ بس کل ذرا دل کی تکلیف ہوگئی تھی، صدمے کی وجہ سے۔''

''صدمے کی وجہ سے؟''

''جی بھائی!'' اس بار شعیب نے کہا۔ ''کل چھوٹے بھائی کا آپریشن ہے۔ ابو جی نے گاؤں والا مکان بیچ کر آپریشن کے لیے پانچ لاکھ روپے جمع کیے تھے۔ کل ہم وہ رقم بائیک پر لا رہے تھے کہ ابو جی سے وہ رقم راستے میں کہیں گر گئی۔ ہم واپس بھاگے، اِدھر اُدھر سے معلوم کیا پر...... رقم نہیں ملی۔ رقم تو ہاتھ کا میل ہے، چلی جاتی، زیادہ دکھ نہیں ہوتا، پر کل بھائی کا آپریشن ہونا ہے اور اتنی جلدی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ اسی صدمے کی وجہ سے ابو جی کل بے ہوش ہوگئے تھے۔ ہوش میں آئے تو بہت بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ ہم نے زاہد بھائی کو بلایا تو انہوں نے انجکشن لگا کر، نیند کی گولیاں دے کر چلے آئے۔ بس اسی سلسلے میں ان کے پاس آیا تھا۔'' پھر وہ ڈاکٹر زاہد سے مخاطب ہوا۔ ''اچھا بھائی! ذرا فرصت نکال کر ایک نظر ابو جی کو دیکھ لیجیے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں آتا ہوں فرصت میں۔'' شعیب کے جانے کے بعد مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مجھے جو رقم ملی تھی، وہ انہی کی تھی۔ اچانک میری کیفیت ایک بار پھر رات جیسی ہو گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پر تھوڑی دیر بعد ہی اس کشمکش کا خاتمہ ہوگیا۔ میں یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں وسیم کی دوائی لے کر گھر آیا، اسے کمرے میں لٹایا اور نازیہ کو کچھ بتائے بغیر گھر سے باہر نکل آیا۔ میرے قدم چاچا عباس کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ نیند سے بیدار ہوچکے تھے۔ وہ سچ میں بہت کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی حالت اجڑ چکی تھی، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ میں نے دعا سلام کے بعد اپنے ہاتھ میں لیا ہوا شاپر کھولا اور اس میں رکھا ہوا رومال نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ رومال پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سے گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے یا پوچھتے، میں نے کہا۔ ''یہ رقم کل مجھے راستے میں پڑی ہوئی ملی تھی، میں اٹھا کر گھر لے گیا۔ آج ڈاکٹر زاہد کے کلینک پر شعیب بھائی سے پتا چلا کہ یہ رقم آپ کی ہے تو دینے چلا آیا۔ گن لیجیے، ایک روپیا بھی کم نہیں ہے۔'' ان کی حالت اچانک ہی غیر ہونے لگی۔ اس وقت شعیب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے رومال کھول کر دیکھا۔ اس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں موجود تھیں۔ چاچا عباس کی آنکھوں سے اچانک ہی آنسو بہنے لگے۔ ''وحید پتر! ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ آپ نے جس طرح ہماری مدد کی......''

''چاچا جی! میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ رقم آپ کی تھی، آپ کو لوٹا دی، مجھے سکون مل گیا۔ اچھا چلتا ہوں، اللہ کی امان......''

''وحید بھائی! کوئی چائے پانی......؟'' شعیب نے کہا۔

''نہیں بھائی، اللہ بہت دے......''

''جیتے رہو پتر، اللہ سلامت رکھے۔'' چاچا عباس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر اچانک ہی وہ ایک جملے کی تکرار کرنے لگے ''جزاک اللہ خیرا۔ جزاک اللہ خیرا۔ جزاک اللہ خیرا......'' نجانے کب تک وہ یہ آخری جملہ دہراتے رہے، باہر نکلنے تک ان کا یہ جملہ میرے کانوں سے ٹکراتا رہا۔ میرا رات کو کیا گیا فیصلہ غلط تھا۔ خدا نے مجھے اس فیصلے پر عمل کرنے سے بچا لیا تھا۔ میں وہاں سے باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک مجھے راستے میں سلیم صاحب مل گئے۔ وہی سلیم صاحب، میں جن کی دکان پر کام کرتا تھا۔ انہوں نے دعا سلام کے بعد پوچھا۔ ''وحید بھائی! کہاں گم ہیں آج کل، کہیں دکھائی ہی نہیں دیتے؟''

''کہیں نہیں، بس یہیں ہوں۔''

''کام وغیرہ کیا کررہے ہیں؟''

''کچھ نہیں فارغ ہوں۔''

''تو میرے پاس آجاؤ اسی شاپ پر......''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو کام آپ مجھ سے لینا چاہتے ہیں، وہ میرے بس کا نہیں ہے۔ میں وہ کام نہیں کر سکتا۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''بھئی آپ جیت گئے، میں ہار گیا۔ اور دوسرا یہ کہ میں وہ کام شاپ سے ختم کرچکا ہوں۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ بعد میں، میں نے ایک دو عالم دین سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی اسے غلط قرار دیا۔ بس تب سے وہ کام ختم کردیا میں نے۔ اب تو آسکتے ہیں نا میرے پاس؟ میں دو ہزار تنخواہ بھی بڑھا رہا ہوں آپ کی۔''

''جی بھائی ضرور۔ اب کیوں نہیں آؤں گا۔''

''ابھی چلیں؟''

''چلیے۔'' وہ سارا دن میں نے سلیم صاحب کی دکان پر گزارا اور شام کو واپسی پر ان سے دو ہزار روپے ایڈوانس بھی لیتا آیا۔ میں سارا راستہ الجھا الجھا سا رہا کہ میں نازیہ کو اصل بات کیسے بتاؤں گا؟ اس نے کیسے کیسے خواب بن رکھے ہوں گے اور...... میں گھر میں داخل ہوا تو میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ نازیہ بھاگ کر میرے قریب آرکی۔ ''سعدیہ کا سامان لے آئے آپ؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ رقم جیسے مجھے ملی تھی، اسی طرح گم ہوگئی مجھ سے'' میری بات سن کر وہ مجھے حیرت سے تکنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی اور سوال کرتی، میں نے اپنے قدم اندر کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

☆☆☆

رات کو ہم سونے کے لیے لیٹے تو نازیہ نے پوچھا۔ ''سچ سچ بتائیں اس رقم کا کیا کیا آپ نے؟''

''بتایا تو تھا کہ گم ہوگئی مجھ سے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کوئی بچے ہیں جو آپ سے گم ہوگئی؟'' وہ خفا ہو گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی۔ میری بات سنتے ہی اس کے چہرے پر جو بے چینی اور اضطراب تھا، وہ سکون میں بدلتا چلا گیا۔ ''کیا ٹھیک نہیں کیا میں نے؟''

''بالکل ٹھیک کیا آپ نے۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔ اللہ کرم کرے گا۔ وہی کرم کرنے والا ہے۔ وہی ہماری بچی کے نصیب اچھے کرے گا۔'' اور پھر ہوا بھی وہی۔ خدا نے کچھ ہی دنوں میں سعدیہ کے نصیب اچھے کر دیے تھے۔ جو لوگ کچھ دن پہلے سعدیہ کا رشتہ دیکھنے آئے تھے اور اپنی شرائط رکھ کر چلے گئے تھے، وہ دو دن بعد دوبارہ آئے۔ پر جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم اپنی اوقات سے زیادہ نہیں دے سکتے تو وہ اس رشتے سے انکار کرکے چلے گئے تھے۔ ہم دونوں میاں بیوی اداس ہوگئے تھے، پر خدا کو ہماری اداسی منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ دو دن بعد وہی لوگ ایک بار پھر ہمارے گھر میں تھے۔ بغیر کسی شرط کے سعدیہ کا رشتہ کرنے کے لیے اور اس کے لیے انہیں، ان کے بیٹے سہیل نے مجبور کیا تھا۔ اسے پہلی نظر میں ہی سعدیہ پسند آگئی تھی اور وہ بغیر کسی شرط کے اسے اپنانے کو تیار تھا۔ وہی اپنے ماں باپ کو رضامند کرکے لے آیا تھا۔ کچھ دن بعد ہم نے سعدیہ کی سادگی سے شادی کردی تھی۔ آج وہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ بہت خوش ہے اور اس کی ساس اور سسر بھی کہ ان کے بیٹے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ میں اور نازیہ بھی بہت خوش ہیں۔ خدا نے ہم پر خصوصی کرم کیا ہے۔ آج میرا اپنا کام ہے۔ سلیم صاحب والی وہ دکان اب میری ہے۔ وہ دیارِ غیر جانے لگے تو اپنی دکان مجھے فروخت کرگئے۔ میں نے ان کے پیسے جلد ہی جمع کرکے ان کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادیے تھے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میرے حالات اچانک ہی کیسے بدل گئے ہیں؟ کیا میرے نصیب میں ہی ایسا لکھا تھا یا پھر خدا نے میری کسی نیکی کا صلہ دیا ہے؟ یہ خیال آتا ہے تو میرا ذہن اچانک ہی چاچا عباس کی طرف چلا جاتا ہے، جو انہوں نے میری ایمانداری کا صلہ مجھے دعاؤں میں دیا تھا۔ ''جزاک اللہ خیرا...... جزاک اللہ خیرا...... جزاک اللہ خیرا......'' اور مجھے خیال آتا ہے، یہ یقیناً ان کی دعاؤں کا ہی اثر ہے، جو خدا نے مجھے خیر کی جزا سے اس طرح نوازا ہے۔

جناب مدیراعلیٰ

سلام تہنیت

میں نے ایک غلطی پہلے کی اور دوسری غلطی اس سے بھی بھیانک لیکن دونوں غلطیوں میں واضح فرق ہے اسی لیے میں نے نام اور مقام بدل دیا ہے۔ اُمید ہے آپ اس پر میرا وہی نام ڈالیں گے جو کہانی پر لکھا ہے۔

شبانہ

(فیصل آباد)

وحید میرے پاس آیا مگر آج میں نے اس کی قربت میں ذرا بھی سنسنی یا جذبات محسوس نہیں کیے۔ بس یوں لگا جیسے میں معمول کا کوئی کام کر رہی ہوں۔ کھانا کھا رہی ہوں یا گھر کی صفائی اور دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ وحید اللہ میرا شوہر ہے اور ہماری شادی کو یہ تیسرا مہینا ہے۔ بیوی کے جذبات اتنی جلدی سرد نہیں ہوتے ہیں اور وہاں تو بالکل سرد نہیں ہوتے جب شادی گھر سے بھاگ کر کی ہو۔ میں نے وحید سے محبت کی اور گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ یہ میری پہلی نہیں دوسری شادی ہے۔ میری پہلی شادی عنایت سے چار سال پہلے ہوئی تھی۔ میں تین سال اس کی بیوی رہی اور مشکل میں رہی۔ عنایت تو اچھا شوہر تھا مجھ سے محبت کرتا تھا اور خیال بھی رکھتا تھا۔ مگر اس کے گھر والے پہلے دن سے ہی میرے دشمن بن گئے تھے۔ اس کی وجہ مجھے کچھ عرصے بعد پتا چلی کہ عنایت نے مجھے پسند کر کے شادی کی تھی۔ ان دنوں میں کالج کے سیکنڈ ائر میں تھی جب عنایت نے مجھے کالج سے آتے جاتے دیکھا اور دل ہار بیٹھا۔

مگر ہوا یہ کہ ادھر اس نے مجھے دیکھا اور ادھر میں پیپرز دے کر گھر بیٹھ گئی۔ کیونکہ کالج ابھی گریجویشن تک نہیں پہنچا تھا اور ہمارے علاقے میں یہی واحد کالج تھا اور ٹیچرز نہ ہونے کی وجہ سے یہاں بی اے کی کلاسز شروع نہیں ہو سکی تھیں۔ مجھے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ حالانکہ میں گھر بیٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ ایک کالج ہی تو تھا جہاں میں ذرا کھلی ہوا میں سانس لیتی تھی۔ میرے گھر کا ماحول میرے باپ اور بھائیوں نے قید خانے کا سا رکھا ہوا تھا جہاں ہم بہنوں کو کھل کر بولنے اور ہنسنے کی اجازت بھی نہیں تھی کہ ہماری آواز باہر جاتی اور پڑوسی سن سکتے تھے۔ ہم بے پردہ ہو کر باہر نہیں جا سکتے تھے۔ اسکول اور کالج کے علاوہ کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں آج بھی حیران ہوتی ہوں کہ ہمیں اسکول اور پھر کالج میں پڑھنے کی اجازت کیسے مل گئی۔

شاید اس لیے کہ ہمارے چاچے کی بیٹیاں بھی اسکول اور کالج میں پڑھتی تھیں اور ابا کی چاچے سے سخت لگتی تھی اس لیے اس نے ہمیں بھی پڑھایا مگر اس سے ہٹ کر ہم تین بہنوں کو کوئی رعایت نہیں ملی۔ ہمارا قصبہ نما گاؤں وسطی پنجاب کے ایک دور دراز علاقے میں ہے۔ قصبہ یوں ہے کہ اس پورے علاقے میں یہی منڈی ہے۔ یہاں اجناس منڈی ہے اور اس کے ساتھ ضرورت کی ساری چیزیں بھی یہاں ملتی ہیں۔ آبادی بھی زیادہ ہے مگر ماحول روایتی اور دیہاتی ہے۔ اسکول اور کالج پاس ہی تھے مگر پہلے ہم بھائیوں کی نگرانی میں آتے جاتے تھے۔ پھر وہ ابا کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے تو ہم تانگے میں آنے جانے لگے۔ میرا نمبر بہنوں میں دوسرا ہے۔ مجھ سے بڑی ممتاز ہے اور مجھ سے چھوٹی سلطانہ ہے۔ میرا نام شبانہ ہے۔ ابا جو حاجی صاحب کے نام سے معروف ہے اس کا نام عبدالکریم ہے اور وہ منڈی میں آڑھتی تھا۔ میرے دونوں بڑے بھائی کم عمری سے ابا کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے تھے۔ اس لیے وہ سات آٹھ جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکے۔



مجھ سے بڑی ممتاز ابھی بارھویں میں تھی کہ اس کا بیاہ ہو گیا اور اس نے بارھویں کے پرچے شادی کے بعد دیے تھے۔ اس وقت وہ اُمید سے بھی ہو گئی تھی۔ طبیعت خرابی میں اس نے جیسے تیسے پرچے دیے اور فیل ہونے کے بعد دوبارہ پرچے دینے سے انکار کر دیا۔ ویسے بھی اسے پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی وہ بھی گھر کے ماحول سے دور رہنے کی خاطر کالج آتی جاتی تھی۔ مجھے کسی قدر شوق تھا مگر اصل وجہ وہی تھی جو میں بیان کر چکی ہوں۔ البتہ سلطانہ کو سچ مچ پڑھنے کا شوق تھا اور اس نے ابا سے پہلے ہی بات کر لی تھی کہ وہ انٹر کے بعد اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ کرے گی۔ ابا نے اسے اجازت دے دی۔ وہ ابھی میٹرک میں تھی۔ میں پرچے دے کر گھر آ کر بیٹھی تھی کہ عنایت کی ماں اور بہن رشتہ لے کر آ گئیں۔ اتفاق سے وہ جان پہچان والے تھے اس لیے ابا یا بھائیوں کو شک بھی نہیں ہوا کہ رشتہ عنایت کی پسند سے آیا ہے۔

اگر انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو رشتہ تو ایک طرف رہا امکان یہی تھا کہ میرا جنازہ اٹھ جاتا ورنہ ہڈی پسلی ایک ہونا تو لازمی تھی۔ اس بارے میں میرے ابا اور بھائی ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عنایت دودھ کا کاروبار کرتا تھا۔ مگر وہ ودھی نہیں تھا، ذات کا ہماری طرح آرائیں تھا۔ وہ دودھ جمع کر کے اسے پیک کرنے والی کمپنیوں کو بیچتا تھا۔ اچھا کاروبار تھا اور صورت شکل کا بھی ٹھیک تھا۔ پھر کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ البتہ عنایت کی ماں اور بہن کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے ولایت کی بیوی کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ سال کے چھ مہینے وہ میکے بیٹھی رہتی تھی۔ کہنے والے فساد کی جڑ، ہونے والی نند زینت کو قرار دیتے تھے جو شادی کے دو مہینے بعد طلاق لے کر گھر آ بیٹھی تھی اور اب اس کا مشن اپنی بھابی کو طلاق دلوانا تھا۔ مگر میرے گھر والوں نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی اور میرا رشتہ عنایت سے کر دیا۔ چار مہینے بعد میری شادی ہوئی تو میں مشکل سے انیس برس کی تھی۔ دنیا کا اتنا پتا نہیں تھا مگر ذہین اور زبان کی تیز تھی مگر میرا اصل اثاثہ میری خوب صورتی تھی۔ عنایت پہلی رات ہی مجھ پر لٹو ہو گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا۔ ”دیکھ عنایت میں نے سنا ہے تیری ماں اور بہن مزاج کی بہت تیز ہیں مگر میں بتا دوں میں بھی کم نہیں ہوں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ گھر میں جھگڑا نہ ہو تو ان کو قابو میں کرنا تیرا کام

ہے ورنہ جھگڑا ہوگا اور میں تیری بھابی کی طرح گھر بیٹھ جاؤں گی۔ تو ان کو قابو میں رکھے گا تو تیری ہر بات مانوں گی اور تجھے خوش رکھوں گی۔"

اس وقت بھی عنایت کی بھابی میکے میں تھی اور بڑی مشکل سے اس شرط پر شادی میں شرکت پر راضی ہوئی تھی کہ ولایت اسے الگ گھر میں رکھے گا۔ ولایت بھائی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ میرا سسر ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھا اور اب فارغ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا یا کھانستا رہتا تھا۔ عنایت میری بات سے ڈر گیا اس نے کہا۔ "شبانہ تو فکر مت کر میں ان دونوں کو قابو رکھوں گا۔"

میری ساس کی زبان کم تیز نہیں تھی۔ اس کا اندازہ مجھے شادی کی صبح ہوگیا جب اس نے ہمارے کمرے آس پاس بلند آواز سے بولنا شروع کر دیا اور موضوع وہ عورتیں تھیں جو دیر تک شوہروں کے ساتھ کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ میں نے عنایت کو اٹھایا۔ "جا اپنی بات ثابت کر۔"

عنایت نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور تیز آواز میں بولا۔ "اماں کیا کڑ کڑ لگائی ہے۔ کل رات شادی ہوئی ہے، کیا منہ اندھیرے اٹھ جائیں۔"

ساس کی زبان بند ہوگئی اور میں جان بوجھ کر اس دن بارہ بجے کمرے سے نکلی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے عنایت سے کہا کہ مجھے گھر لے چل۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔ اس پر میری ساس نے پھر بولنا شروع کیا اور عنایت کے خاموش کرانے پر چپ ہوئی۔ میرا گھر دو گلی پار تھا۔ میں نے راستے میں کہا۔ "تمہاری ماں سدھرنے والی عورت نہیں ہے۔"

"میری طرف سے اجازت ہے وہ ایک بولے تو اسے دو سنانا۔"

میں دل میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی۔ بلکہ میں نے دو فیصلے کیے تھے کہ ایک تو کسی بات پر چپ نہیں رہنا اور دوسرے از خود کوئی کام نہیں کرنا تھا۔ کم سے کم ایک مہینے میرا چائے کا کپ دھونے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں نے جس کام کو ہاتھ لگایا وہ میرے متھے مار دیا جائے گا۔ ولیمہ تین دن بعد تھا اور میں دو دن میکے رہی۔ یہ بات میں نے عنایت سے کہہ دی تھی کہ ولیمے سے پہلے مجھے لینے نہ آئے۔ آتے ہوئے میں اپنا زیور اور میک اپ کا سامان ساتھ لے آئی تھی۔ تاکہ ولیمے کے لیے گھر سے تیار ہو کر جاؤں۔ اب میں نے یہ کرلیا تھا کہ دو دن سسرال میں رہتی اور دو دن کے لیے میکے آجاتی۔ اگر میرے سسرال والے اعتراض کرتے تو عنایت میری ڈھال بن جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت سکون تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں اس سے محبت کرنے لگی۔

میں دل و جان سے عنایت کی خدمت کرتی۔ اس کا کام بہت محنت والا تھا۔ وہ صبح نکلتا تو شام کو گھر میں گھستا تھا۔ میری ساس اور نند نے کبھی اسے ناشتا بنا کر نہیں دیا تھا۔ ناشتا وہ باہر ہی کرتا تھا۔ مگر شادی کے ایک مہینے بعد جب میں نے کام میں ہاتھ ڈالا تو ناشتا تیار کرکے اور اسے کرا کے روانہ کرتی تھی۔ اسے دیسی گھی کے پراٹھے اور تلے انڈوں کا ناشتا اچھا لگتا تھا۔ کبھی سوجی کا حلوا بنا دیتی تھی۔ ناشتا ہم دونوں ساتھ کرتے اور اس کے جاتے ہی میں کمرے میں گھس جاتی اور دوپہر تک آرام کرتی تھی۔ کھانا ابھی تک میری ساس بناتی تھی اور روٹیاں تندور سے لگ کر آتی تھیں۔ جب دوپہر میں کھانا بن جاتا تو میں باہر آتی اور کھانا کھا کر دوبارہ کمرے میں گھس جاتی۔ باہر میری ساس نند بولنا شروع کرتیں تو میں موبائل میں ہینڈ فری لگا کر گانے سننے لگتی۔ ہاں میرے سامنے بولتیں تو میں نکا کر جواب دیتی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق میری شادی کے دو مہینے بعد سارے گھر والوں نے جرگہ کیا۔ میری ساس نے عنایت سے کہا۔ "یہ لاڈو کب تک بیٹھ کر کھائے گی، کیا اس کے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں ہیں۔"

عنایت سے پہلے میں نے جواب دیا۔ "میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اور میں تم جیسے دس کو بٹھا کر کھلا سکتی ہوں مگر کیوں کھلاؤں۔"

"تو اپنا تو کرلے۔" ساس بلبلا کر بولی۔

"اپنا کیا کرلوں۔ اپنا اور عنایت کا ناشتا خود بناتی ہوں۔ تم صرف ایک سالن بناتی ہو روٹی تندور سے لگ کر آتی ہے۔ اب کیا اپنا الگ سالن بناؤں؟"

الگ باورچی خانے کی بات آئی تو اس کی جان نکل گئی۔ "میرا یہ مطلب تھوڑی ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "گھر میں دس کام اور ہوتے ہیں تو ایک کام نہیں کرتی ہے۔"

"اس گھر کا مسئلہ کام نہیں ہے۔ پہلے تم لوگ اپنا رویہ ٹھیک کرلو۔ بہو لاتے ہو کوئی جانور خرید کر نہیں لاتے۔ ولایت کی بیوی کیوں میکے بیٹھی ہے۔ اس نے کام کیا اور تم دونوں ماں بیٹی ہاتھ توڑ کر بیٹھ گئیں۔ وہ جانور کی طرح محنت کرتی اور تم لوگوں کی باتیں بھی سنتی۔ مجھے اس کی طرح مت



سمجھنا اور تم لوگوں کا مسئلہ ہے تو سب جمع ہوگئے۔ کبھی بیٹے کا سوچا جو بیوی کے ہوتے ہوئے بھی رنڈووں کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس پر تم لوگوں نے سب کو جمع کیا؟ مگر بیٹے کی پرواہ ہوتی تو کرتے۔ پہلے ولایت کا مسئلہ حل کرو۔ اس کی بیوی آئے تو کام کی تقسیم کی بات کرنا۔ گھر میں چار عورتیں ہیں سب کو برابر کا بانٹنا۔"

عنایت اور سب میری زبان پر حیران تھے۔ ساس اور زینت کے پاس میری باتوں کا جواب نہیں تھا۔ اگرچہ انہوں نے درمیان میں شور شرابا کیا تھا مگر عنایت اور ولایت نے انہیں ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ میں نے ولایت کی بیوی کی واپسی کی بات کی تو وہ بھی میرا حامی ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "شبانہ ٹھیک کہہ رہی ہے، پہلے صاحبہ کا مسئلہ حل کرو۔"

"اس کا ایک ہی حل ہے اسے طلاق دو۔" زینت تڑخ کر بولی۔

"پھر دوسری کروں اور تم لوگوں کے کہنے پر اسے بھی طلاق دے دوں۔" ولایت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میری زندگی کا مقصد یہی رہ گیا ہے؟"

میں نے ولایت سے کہا۔ "بیوی شوہر کی ذمے داری ہوتی ہے اگر وہ ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو تم اسے الگ گھر لے دو۔ مگر اسے کہو کہ ایک بار آجائے اگر اس بار بھی نہ رہ سکے تو پھر اسے الگ گھر لے کر دینا۔"

"میں کل ہی جاتا ہوں۔"

"پر اس سے جو وعدہ کرکے لانا وہ پورا بھی کرنا۔" میں نے ولایت کو خبردار کیا۔ "اپنی ماں بہن کو بھی بتا دینا کہ کس شرط پر لائے ہو۔"

انہوں نے جو پھلجھڑی لگائی تھی وہ الٹا ان کے گلے پڑ گئی۔ گھر میں واحد فرد جو کسی کا طرفدار نہیں تھا وہ میرا سسر تھا۔ حقے کے بعد اسے صرف کھانے سے دلچسپی تھی کہ تینوں وقت کا کھانا اسے وقت پر ملنا چاہیے تھا۔ اگر کسی وجہ سے کھانے میں دیر ہوتی تو میری ساس کی شامت آجاتی۔ اس لیے وہ کھانے کے معاملے میں چوکس رہتی تھی۔ کچن کی صفائی اور دوسرے کام زینت کرتی تھی۔ اپنے اپنے کمروں کی صفائیاں سب خود کرتے تھے اور صحن کی صفائی ماسی کرتی تھی۔ کپڑے سب اپنے اپنے دھوتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مشترکہ کام بہت کم تھا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ ان ماں بیٹی نے کھانا بنانے سے لے کر پورے گھر کی صفائی اور سب کے کپڑے دھونے کی ذمے داری بھی صاحبہ پر ڈال دی تھی۔ خود انہوں نے ہل کر پانی پینا بھی بند کر دیا تھا۔

صاحبہ بے چاری اپنی ہمت سے بڑھ کر کرتی رہی لیکن اس وقت اس کی ہمت جواب دے گئی جب انہوں نے تندور بھی گھر میں بنانے کا سوچا۔ اس نے پہلے ولایت سے شکایت کی مگر وہ اس کی سنتا نہیں تھی، اس میں ماں بہن سے نمٹنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر وہ جا کر میکے بیٹھ گئی۔ اس نے ولایت سے کہا کہ اتنا کام میں میکے میں کروں تو میری بھابیاں میرے پاؤں دھو کر پیا کریں اور یہاں تمہاری ماں، بہن صبح شام مجھے ستاتی ہیں۔ کچھ عرصے بعد ولایت جا کر اسے منا لایا۔ مگر یہاں وہی وطیرہ رہا تو وہ پھر میکے چلی گئی اور اس کے بعد صرف میری شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ میں خود دو بار عنایت کے ساتھ جا کر اس سے ملی اور وہ مجھے بھلی عورت لگی تھی۔ بچے نہیں تھے اور اسے اسی بات کا دکھ تھا کہ اس کے بچے ہوتے تو ولایت اسے یوں میکے میں نہ چھوڑ رکھتا۔

اگلے دن ولایت گیا اور صاحبہ کو لے آیا۔ میری توقعات کے عین مطابق اس نے شرط رکھی تھی کہ وہ صرف اپنی ذمے داری پوری کرے گی اور اگر اس سے کسی نے فضول میں جھگڑا کرنے کی کوشش کی تو ولایت اسے الگ گھر لے کر دے گا۔ ولایت نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اس صورت میں وہ اسے الگ گھر لے کر دے گا۔ ولایت نے اس سے کہا کہ وہ صرف اس کا اور اپنا کام کرے گی اور اپنے کمرے کی ذمے دار ہوگی۔ باقی اس پر کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔ وہ آئی تو ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور سمجھایا کہ ڈرنا چھوڑ دے جو ڈرتا ہے دنیا والے اسے اور ڈراتے ہیں۔ اپنے اوپر بھروسا کر اور اپنے شوہر کو اپنا بنا کر رکھ۔ صاحبہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی مگر اتنی سمجھدار نہیں تھی، اس نے دیکھا کہ میں عنایت سے کیسے بنا کر رکھتی ہوں، اس نے اسی طرح اپنے شوہر سے بنا کر رکھنی شروع کر دی۔ وہ اس کی خدمت دل و جان سے کرتی مگر اب اس نے گھر کے دوسرے کام چھوڑ دیے تھے۔

زینت کی زبان میں جتنا زہر تھا اس سے زیادہ اس کے دل میں تھا۔ اس نے ماں کو اپنی مٹھی میں کیا ہوا تھا اور وہ اس کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنتی تھی۔ اسے صرف برتن دھونے اور باورچی خانے کی صفائی کرنی پڑتی تھی اس میں بھی اس کی جان جاتی تھی۔ شکل صورت کی اچھی تھی مگر اخلاق اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس

کی شادی نہ ہوئی تو یہ ساری عمر یہیں بیٹھی رہے گی اور فتنہ انگیزیاں کرتی رہے گی۔ بہتر ہے اس کی شادی کردی جائے۔ ممکن ہے وہ اس بار گھر بسا لے۔ میں نے عنایت اور صاحبہ نے ولایت سے بات کی اور انہیں صاحبہ کی شادی کروانے کو کہا۔ خود وہ بھی فکرمند تھے۔ جوان بہن گھر بیٹھی کسے اچھی لگتی ہے۔ وہ ابھی مشکل سے چوبیس سال کی تھی۔ ایک بار شادی کا مزہ چکھ چکی تھی تو اس کا یوں گھر بیٹھنا شرعی اور اخلاقی لحاظ سے بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

دونوں بھائیوں نے اس کے لیے رشتے کی تلاش شروع کی۔ اپنے جاننے والوں میں کہا اور کچھ عرصے بعد انہیں ایک ریٹائرڈ فوجی کا رشتہ مل گیا۔ نذیر علی حوالدار ریٹائر ہوا تھا اور فوج سے ملنے والی رقم سے اس نے زمین خرید لی تھی۔ پندرہ ایکڑ زمین تھی اور اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ پہلی بیوی اس کی نوکری کے عرصے میں فوت ہوگئی تھی۔ اب دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ عمر بیالیس برس تھی مگر دیکھنے میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔ ولایت اور عنایت نے ماں باپ سے بات کی۔ زینت کو پتا چلا تو اس نے بہت شور مچایا کہ اس کی شادی بڈھے سے کر رہے ہیں مگر جب اسے نذیر کی تصویر دکھائی اور اس کے بارے میں بتایا تو وہ راضی ہوگئی۔ میں اور صاحبہ اس رشتے سے سب سے زیادہ خوش تھے۔ کیونکہ دونوں کی دوسری شادی تھی اس لیے سادگی سے کی گئی۔

زینت گھر سے گئی تو یک دم سکون آگیا۔ میری ساس کی زبان بھی مدھم پڑگئی تھی۔ وہ اکیلی ہوئی تو اسے خیال آیا کہ بہوؤں سے بنا کر رکھی جائے۔ اب وہ ہم سے میٹھی بنتی تھی۔ مجھے تو خیر اس سے یا سسرال سے کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میں نے پہلے روز سے انہیں ٹھیک کرکے رکھا تھا۔ البتہ صاحبہ نے ان لوگوں کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھائی تھی اور وہ تکلیف اب تک اس کے اندر تھی اس لیے وہ ساس کو زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور دو باتیں کرلیتی تھی مگر یہ بیٹھک میں نے اپنے کمرے سے باہر ہی رکھی تھی۔ دو تین بار میری ساس نے کمرے میں آکر بات کرنے کی کوشش کی مگر میں اسے باہر لے آئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایک بار کمرے میں آگئی تو پھر یہیں براجمان رہا کرے گی اور وقت بے وقت میرا دماغ کھائے گی۔ اسے بولنے کی عادت تھی اور پرانے قصے زبان کی نوک پر رکھے

رہتے تھے۔ میں باہر ہی بنتی تھی اور جب بور ہونے لگتی تو کام کے بہانے اٹھ جاتی تھی۔ صاحبہ بہانہ بھی نہیں کرتی تھی جیسے ہی وہ بولنا شروع کرتی صاحبہ چلی جاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور میری شادی کو تین سال ہونے کو آئے تھے۔ اب تک میں ماں نہیں بن سکی تھی۔ حالانکہ مجھ میں یا عنایت میں کوئی نقص نہیں تھا۔ ڈاکٹر حکیم کرکے بھی دیکھ لیا تھا۔ ایک بار عنایت مجھے اوکاڑہ لے گیا اور وہاں ایک اچھے اسپتال میں چیک کرایا۔ میرے ٹیسٹ بھی ہوئے مگر سب ٹھیک تھا۔ بس اوپر والے کی مرضی نہیں تھی۔ یہی صاحبہ کا تھا اس میں بھی کوئی کمی خامی نہ تھی اور سب ٹھیک تھا پر اب تک ماں نہیں بن سکی تھی۔ ادھر ہوا یہ کہ زینت شادی کے دسویں مہینے ہی ماں بن گئی۔ اب وہ جب آتی ماں کے اس حوالے سے کان بھرتی تھی۔ شروع میں تو ہماری ساس خاموش رہی کیونکہ ولایت اور عنایت دونوں ہی اس کی نہیں سنتے تھے مگر جب شادی کے تین سال بعد بھی کچھ نہیں ہوا تو اس نے رفتہ رفتہ بولنا شروع کردیا۔ صاحبہ کی شادی کو چار سال سے اوپر ہوگئے تھے۔ صاحبہ پریشان تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ”اب تو ولایت نے بھی کہنا شروع کردیا ہے اسے اولاد کی خواہش ہے۔“

”صرف تیرا قصور تو نہیں ہے ویسے بھی اولاد مرد کی قسمت سے ہوتی ہے۔“

”مجھے ڈر ہے وہ دوسری شادی نہ کرلے۔ زینت کی ایک نند شادی کے لائق ہے۔“

میں نے عنایت سے بات کی تو اس نے بھی یہی بتایا کہ ولایت اولاد چاہتا ہے۔ اگر جلد صاحبہ ماں نہ بن سکی تو وہ دوسری شادی کرلے گا۔ ولایت ایسا ہی کرتا لیکن ان ہی دنوں صاحبہ اُمید سے ہوگئی اور یوں اس کے سر پر لٹکتی تلوار ہٹ گئی۔ میرے سر پر تلوار تو نہیں تھی مگر مجھے ساس اور نند کے طعنوں کا سامنا ضرور کرنا پڑ رہا تھا اور میں چاہتی تھی کہ ماں بن کر ان کا منہ بند کردوں۔ پر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ البتہ عنایت کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ اولاد نہ ہونے کو مسئلہ نہیں بنائے گا۔ دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے والہانہ انداز میں کہا۔ ”شانی اگر مجھے کہا جائے کہ ایک طرف ساری دنیا اور دوسری طرف تو ہو تو میں ساری دنیا کو چھوڑ کر تجھے لے لوں گا۔“

وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ بن کہے مجھے طرح طرح



کی چیزیں لاکر دیتا تھا۔ میری الماری کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود میرے پاس میک اپ کے بہترین سامان اور خوشبوؤں کی کمی نہیں تھی۔ وہ میرے لیے ٹی وی لایا۔ یہاں گرمیاں بہت شدید ہوتی ہیں وہ روم کولر لایا۔ یہ سب اس نے بن کہے کیا اور اگر میں کہہ دیتی تو وہ چیز تو وہ لازمی لاتا تھا۔ مگر مجھے چیزوں کا شوق نہیں تھا۔ ہاں کپڑے اچھے لگتے تھے اور بجنا سنورنا تو ہر عورت کو اچھا لگتا ہے۔ میں عنایت کے لیے دل سے بجتی سنورتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ گھر آیا ہو اور اس نے مجھے خراب حلیے میں دیکھا ہو۔ اسے پسینے کی بو ناگوار گزرتی تھی۔ وہ خود دن میں دو بار نہاتا تھا اور سردیوں میں بھی اس کا یہ معمول برقرار رہتا تھا۔ میں اس کی خاطر روز نہاتی تھی۔ گرمیوں میں عام طور سے شام کو جب ذرا ٹھنڈا ہوجاتا اور سردیوں میں دوپہر میں نہاتی تھی۔ حالانکہ مجھے نہانا مشکل مرحلہ لگتا ہے۔ خاص طور سے سردی میں تو میں تین چار دن بعد نہاتی تھی۔ مگر شادی کے بعد عنایت کی خاطر روز نہانے لگی۔

میں سمجھتی تھی کہ مجھے عنایت سے ایسی محبت ہے جیسی ہر بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے لیکن اس سے محبت کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب گھر میں اس کی خون میں لت پت لاش آئی۔ میں دوپہر میں کمرے میں تھی جب باہر شور اٹھا اور پھر میری ساس کی دھاڑوں کی آواز آئی تو میں بوکھلا کر باہر آئی۔ عنایت کو چارپائی پر لٹا کر لارہے تھے۔ کسی ظالم نے سر کے پچھلے حصے میں کوئی سخت چیز ماری تھی۔ اس کا کرتہ خون میں تربتر تھا۔ میں چلائی اور اس پر گری پڑی۔ ”عنایت کیا ہوا ہے تجھے؟“

مگر عنایت خاموش تھا۔ پھر کسی نے زور سے کلمہ پاک پڑھا تو میں اپنے حواس قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد تین دن تک یہ ہوتا رہا کہ میں ہوش میں آتی اور عنایت کا سوچتے ہی مجھ پر غشی طاری ہوجاتی تھی۔ جب میں رات تک بے ہوش رہی تو میرے بھائی ڈاکٹر کو لے آئے اس نے انجکشن دیا اور کہا کہ اگر یہی کیفیت برقرار رہے تو مجھے کسی اسپتال لے جائیں ورنہ میری زندگی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ اگلے دن بھی میں ہوش میں آنے کے بعد بے ہوش ہوتی رہی تو بھائی مجھے گاڑی میں ڈال کر ڈسٹرکٹ اسپتال لے گئے جہاں میں دو دن داخل رہی اور علاج کے بعد مجھے تیسرے دن مکمل ہوش آیا جب عنایت کا سوئم بھی ہوچکا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں واپس سسرال آئی اور پہلے

ہی دن مجھے اندازہ ہوگیا کہ شاید عدت تک بھی میں مشکل سے یہاں رہ سکوں۔ ساس اور میری نند کا رویہ خوفناک حد تک خراب تھا اور وہ کھل کر مجھے ڈائن اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں جوان کے بیٹے اور بھائی کو کھا گئی تھی۔

میں نے سوچا اور اپنے ماں باپ کو پیغام بھیجا کہ مجھے آکر لے جائیں کیونکہ یہ لوگ مجھے ٹھیک سے عنایت کا سوگ منانے بھی نہیں دے رہے۔ میرے گھر والے آئے اور مجھے سامان سمیت لے گئے۔ میری ساس اور نند نے کوشش کی کہ جو زیور عنایت نے دیا تھا وہ ہتھیا لیں مگر میں نے انہیں ایک چھلا بھی نہیں دیا اور جاتے ہوئے انہیں خبردار کیا کہ عنایت کی وراثت میں میرا حصہ ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ مکان سسر کا تھا اور کچھ زمین تھی وہ بھی اسی کے نام تھی۔ باقی کاروبار دونوں بھائیوں کا تھا مگر تمام کام اور حساب زبانی ہوتا تھا۔ اس لیے جب ایک روز ولایت آیا اور مجھے پچاس ہزار روپے تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

”شانہ یہ کاروبار میں وہ روپیا تھا جو عنایت کا بنتا تھا۔ وہ میں نے تجھے دے دیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی اصل حق دار تو ہے۔“

”میں شکر گزار ہوں مجھے تو اس کی اُمید بھی نہیں تھی۔“

”میں عنایت کی بیوی کا حق کیسے مار سکتا ہوں وہ میرا ایک ہی تو بھائی تھا۔“ ولایت رونے لگا۔ ”نہ جانے کس ظالم نے اسے یوں بے دردی سے مار دیا۔“

ہوا یہ تھا کہ اس روز عنایت اور ولایت الگ الگ علاقوں کے لیے نکلے تھے۔ عنایت جہاں گیا وہاں اس نے دودھ جمع کیا اور اسے اپنی موٹر سائیکل پر ڈرموں میں لاد کر لا رہا تھا کہ راستے میں کسی نے گھات لگا کر اسے قتل کردیا۔ اس پر چلتی موٹر سائیکل پہ حملہ ہوا تھا۔ وہ نیچے گرا تو حملہ کرنے والے نے لاٹھی یا کسی سخت چیز سے اس کے سر پر اتنی قوت سے وار کیا کہ اس کا بھیجا باہر آگیا تھا۔ وہ وہیں مر گیا۔ اس کی لاش ایک نزدیکی کسان نے دیکھی اور شور مچایا تو سب جمع ہوگئے۔ پولیس نے لاش پہلے مقامی اسپتال بھیجی وہاں سے وہ گھر لائی گئی۔ گاؤں دیہات میں آج بھی پوسٹ مارٹم کا رواج نہیں ہے بس ظاہری طور پر دیکھ کر موت کی وجہ جان لیتے ہیں۔ قاتل پکڑا نہیں گیا اور نہ ہی قتل کی وجہ سمجھ میں آئی کیونکہ عنایت کا بٹوہ اور موبائل اس کے پاس تھا۔ بٹوے میں کوئی سات ہزار کی رقم تھی اور اس کا موبائل بھی اچھا والا

تھا۔

اس لیے یہ رہزنی کی واردات نہیں تھی بلکہ صاف قتل کی واردات تھی۔ قاتل اسی ارادے سے آیا تھا۔ ولایت کا کہنا تھا کہ یہ ایسا کاروبار تھا جس میں چھوٹے موٹے تنازعے ہو جاتے ہیں کیونکہ اور بھی لوگ یہ کام کرتے تھے اور جن سے دودھ لیا جاتا تھا وہ بعض اوقات موقع سے فائدہ اٹھا کر جہاں چار پیسے زیادہ ملتے تھے وہاں دودھ دے دیا کرتے تھے اور جن سے باقاعدہ زبان ہوتی تھی ان کو نہیں دیتے تھے۔ اس سے جھگڑے بھی ہوتے تھے مگر یہ کبھی ہاتھا پائی تک بھی نہیں پہنچے۔ قتل تو بہت بڑی بات تھی۔ پولیس نے چند دن تفتیش کی اور کھانا پی کر چلے جاتے تھے اس کے بعد اس کی زحمت بھی نہیں کی۔ ولایت بے چارہ چند مہینے تک تھانے کے چکر لگاتا رہا اور تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ صاحبہ ماں بننے والی تھی اوزا سے شوہر کی توجہ کی ضرورت تھی پھر عنایت کے بعد سارا کام بھی اسے اکیلے دیکھنا پڑتا تھا اس لیے ولایت کے پاس اب تھانے کے چکر لگانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ پولیس پہلے ہی تفتیش سے ہاتھ اٹھا چکی تھی۔

میں بھی اس بارے میں سوچ سوچ کر تھک چکی تھی کیونکہ عنایت مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ اس کی کسی سے معمولی سی کھٹ پٹ بھی ہوتی تھی تو مجھے آ کر بتاتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کی کسی سے اس حد تک دشمنی ہوتی کہ وہ اسے قتل کر دیتا اور عنایت مجھ سے اس کا ذکر نہ کرتا۔ یہ تو بالکل اندھا قتل تھا۔ میرا دھیان ایک واقعے کی طرف گیا۔ کچھ عرصے پہلے ہمارے گاؤں کے نزدیک میلہ لگا تھا۔ جیسا کہ عید پر لگتے ہیں۔ عنایت مجھے وہاں لے کر گیا تھا۔ جب میں باہر جاتی تو چادر لے کر اسی سے نقاب بھی کر لیتی تھی۔ اس روز بھی میں نے چادر لی ہوئی تھی۔ عنایت کے ساتھ میلے میں گھوم کر اپنی پسند کی چیزیں دیکھ رہی تھی۔ ایک جگہ سانپ والا تھا۔ میں وہاں رکی تو پیچھے عنایت کی کسی سے تکرار ہو گئی۔ مگر بس ایک منٹ کی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر عنایت اور وہ جس سے اس کا جھگڑا ہو رہا تھا وہ لوگوں کے پیچھے تھے اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد غصے میں بھرا ہوا آیا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا کس سے جھگڑ رہا تھا؟“

”کچھ نہیں۔“ عنایت نے گرم لہجے میں کہا۔ ”ایک لفنگا تھا۔“

میں سمجھی کہ کسی نے میرے حوالے سے کچھ کہا ہوگا اور عنایت کو غصہ آ گیا ہوگا۔ میرے معاملے میں وہ بہت حساس تھا۔ اسی وجہ سے میں نے بعد میں بھی اس سے نہیں پوچھا کہ اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد ہم گھر واپس آ گئے۔ یہ عنایت کے قتل سے چند مہینے پہلے کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی جھگڑا میرے علم میں نہیں تھا۔ بہرحال ہونے والی بات ہو چکی تھی چاہے وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ میں نے عدت ماں باپ کے گھر گزاری اور اس سے پہلے ہی عنایت کی ماں نے پیغام بھجوا دیا تھا کہ ان کا اب مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کون سا ان سے تعلق رکھنا تھا۔ میں ماں باپ کے گھر سکون سے تھی۔ میرے باپ اور بھائی بے شک دوسرے معاملات میں سخت سہی لیکن وہ خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیویوں کو بھی قابو کیا ہوا تھا جیسے ابا نے اماں کو قابو کیا ہوا تھا اس لیے ہمارے گھر میں ساس بہو اور نند بھاوج والا جھگڑا نہیں تھا۔

مجھ سے چھوٹی سلطانہ کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ بی ایڈ کر کے ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر لگ گئی تھی۔ اس کے لیے رشتہ بھی اتفاق سے ایک اسکول پرنسپل کا آیا تھا۔ وہ اب اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ ممتاز کا شوہر ذرا سخت مزاج تھا مگر روپے پیسے والا تھا اور اسے خوش رکھا ہوا تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ میں بیوہ ہو کر آئی تو گھر والوں کو میری فکر لگی کہ وہ میری کہیں شادی کر دیں۔ میں ابھی جوان تھی، چوبیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے کا چھریرا جسم اب بھر گیا تھا مگر میری خوب صورتی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ شاید بڑھی ہی تھی۔ عدت ختم ہوتے ہی میرے لیے رشتے کی تلاش شروع ہو گئی۔ مجھے سن گن مل گئی تھی۔ ایک بار میں نے ابا کو اماں سے بات کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب اسے کوئی کنوارہ تو ملنے سے رہا کوئی رنڈوا یا دوہاجا ہی ملے گا۔“

”دوہاجے میں تو کبھی نہیں مانے گی۔“ اماں نے میرے دل کی بات کی۔ ”وہ اس مزاج کی ہے نہیں ... جو شوہر میں شرکت برداشت کرے۔ اس کے لیے اکیلا بندہ ہی تلاش کرو۔“

اگرچہ عنایت کا دکھ کم نہیں ہوا تھا مگر میں نے زندگی کی یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ میں اکیلے نہیں رہ سکتی۔ ماں باپ کا گھر اس وقت تک ہوتا ہے جب تک ماں باپ زندہ ہوں ان کے بعد میں دربدر ہو جاؤں گی، رل جاؤں گی۔ اس لیے دوسری شادی ہی میرے مسئلے کا حل تھی۔ میں نے



خود کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اماں کی بات سن کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ میرے لیے کوئی دوسری شادی والا نہیں دیکھا جائے گا۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا میں شوہر میں شرکت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک بڑی عمر کا ہو اور پہلے بھی شادی کر چکا ہو مگر ہو اکیلا۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میرے لیے رشتے کی تلاش شد و مد سے جاری تھی۔ اتنا تو اماں ابا کو بھی معلوم تھا کہ ابھی وقت ہے۔ میں نوجوان لگتی ہوں دیر کی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میرے بھائی اور بھابیاں بھی کوشش کر رہے تھے۔ عدت تک میں گھر میں رہی تھی مگر عدت کے بعد میں نے گھر سے نکلنا شروع کیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میرے پاس کپڑے نہیں تھے اور گرمیاں آنے والی تھیں۔ میں نے سوچا اس لحاظ سے دو تین سوٹ لے آؤں۔ میں نے بڑی نور بھابی سے کہا۔ ”میرے ساتھ مارکیٹ تک چلو مجھے کپڑے لینے ہیں۔“

”تیرے بھائی سے کہتی ہوں وہ لے چلے گا۔“

مگر ان دنوں گندم کی فصل اتر رہی تھی۔ ابا اور دونوں بھائی بہت مصروف تھے۔ بھائی نے بھابی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلی جائے۔ میں اور بھابی اگلے دن مارکیٹ گئے۔ یہ زیادہ بڑی مارکیٹ نہیں ہے مگر اس میں کپڑے کی لائن اندر کر کے اور الگ سے ہے وہاں عام طور سے صرف عورتیں جاتی ہیں۔ دکانداروں نے ایسا انتظام رکھا ہی اس لیے تھا کہ اکیلی عورت بھی آ سکے۔ لان کے کپڑوں والی دکان شروع میں تھی۔ میں وہاں لان کے کپڑے دیکھنے لگی۔ اتفاق سے بھابی کو اپنے میکے میں آنے والی کسی شادی کے لیے کپڑے دیکھنے تھے۔ شادی بیاہ کے کپڑوں والی دکان اندر تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ میں لان کے پرنٹ دیکھ رہی تھی کہ کوئی میری برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ نوجوان اور خوش شکل آدمی تھا۔

شیو کے ساتھ اس نے نوکیلی مونچھیں رکھی تھیں اور یہ مونچھیں (؟) بات ہے اس پر جچ رہی تھیں۔ کپڑے دکھانے والا لڑکا سمجھا کہ یہ میرے ساتھ ہے۔ مجھے متوجہ پا کر وہ مسکرایا اور اچانک ہی کاغذ کا ایک چھوٹا سا گولہ میری گود میں ڈال کر اٹھ گیا۔ میں پہلے تو دم بخود رہ گئی پھر کپڑے دکھانے والا لڑکا نئے تھان لے کر آیا تو میں نے جلدی سے کاغذ کے گولے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ یہ اتنا چھوٹا سا تھا کہ میری ہتھیلی تلے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی معاملے کی نزاکت محسوس کر کے مجھے پسینا آنے لگا تھا۔ میں بچی یا نادان نہیں تھی جو سمجھ نہ پاتی کہ اس کاغذ میں کیا ہو گا۔ اسی وجہ سے جب میں نے اسے پھینکنا چاہا تو یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر اتفاق سے کسی نے اٹھا لیا اور پڑھ لیا اور اس میں میرے بارے میں کوئی واضح اشارہ یا میرا نام ہوا تو چوبیس گھنٹے سے پہلے سارا گاؤں اس قصے سے آگاہ ہو جائے گا۔ بات میرے گھر والوں تک جائے گی تو میری خیر نہیں ہو گی۔

لڑکا تھان پھیلا کر دکھا رہا تھا اور میں ہاتھ میں لیے بغیر دیکھ رہی تھی کیونکہ ہاتھ میں تو کاغذ تھا۔ میں کاغذ پرس میں ڈالنا چاہتی تھی مگر لڑکا اتنا نزدیک تھا کہ وہ دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی کہ میں اپنے پرس میں کچھ ڈالوں یا نکالوں۔ عورتیں عام طور سے پرچے پر سامان لکھ کر بازار جاتی ہیں۔ مگر چور میرے دل میں تھا اور یہ عام

سی بات میرے لیے بہت خاص ہوگئی تھی۔ اوپر سے اچانک ہی نور بھابی آگئی اور میں مزید نروس ہوگئی۔ شکر ہے اس نے آتے ہی لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور مجھے موقع ملا کہ کاغذ پرس میں ڈال سکوں۔ نور بھابی نے مجھ سے کہا۔ ''تو نے اب تک کچھ پسند ہی نہیں کیا؟''

''یہ پرانے پرنٹ دکھا رہا ہے نیا مال دبا کر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ بھابی نے لڑکے کو ڈانٹا۔

''اپنی ماں کا کفن بنانا ہے نئے پرنٹ کا جو ہمیں یہ کچرا دکھا رہا ہے۔''

لڑکا دانت نکالتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے کپڑے لے کر نکلے تو میں نے غیر ارادی طور پر آس پاس دیکھا مگر مجھے وہ لڑکا کہیں نظر نہیں آیا۔ راستے میں بھی میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا مجھے لگا کہ وہ آس پاس ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ آس پاس تھا بھی تو اس نے خود کو چھپایا ہوا تھا۔ گھر آنے تک یہ احساس اتنا شدید رہا کہ نور بھابی نے بھی نوٹ کرلیا اور بولی۔ ''کیا بات ہے مڑ مڑ کر کیوں دیکھ رہی ہے؟''

''وہ کتا......'' میں نے اشارہ کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سیاہ رنگ کا یہ نیم پاگل کتا نظر آگیا تھا۔ ''یہ مارکیٹ کے پاس بھی نظر آیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ پاگل ہے کہیں حملہ نہ کردے۔''

یہ سن کر نور بھابی بھی گھبرا گئی اور اس نے قدم تیز کر دیے اور کچھ دیر میں گھر آگیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر یہ سکون عارضی تھا کیونکہ اسے غارت کرنے والا کاغذ میرے پرس میں موجود تھا۔ میں جلد از جلد اسے ضائع کردینا چاہتی تھی۔ میں کچن میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا میں نے ماچس لی اور باتھ روم میں آئی۔ میں اسے جلانے جا رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ میں ایک نظر دیکھ لوں اس میں ہے کیا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کاغذ کا گولا کھولا اور اسے سیدھا کیا۔ اس پر ہاتھ سے لکھی ایک تحریر تھی۔ میں پڑھنے لگی۔ تحریر یہ تھی۔ ''شبانہ...... شاید تم یہ تحریر پڑھ لو۔ اگر تم نے اسے پڑھے بغیر ضائع کردیا تو مجھے پھر کوشش کرنی ہوگی۔ لیکن اگر تم پڑھ رہی ہو تو میں بتا دوں۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ (یہاں تک پڑھ کر میرے ہاتھ کانپنے لگے تھے) میں سیدھا آدمی ہوں اس لیے سیدھی بات کی ہے۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے میرے ذہن سے تمہارا خیال اور تمہارا خوب صورت وجود ایک لمحے کو بھی نہیں گیا۔ شبانہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمہارے گھر رشتہ بھیجنے کی کوشش کی مگر جس بندے نے ہماری طرف سے تمہارے باپ اور بھائی سے بات کی اسے گالیاں سننے کو ملی تھیں۔

میں یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ تمہارے باپ اور بھائیوں نے زیادتی کی ہے۔ انہوں نے ٹھیک گالیاں دی ہیں کیونکہ گاؤں میں میری شہرت اچھی نہیں ہے۔ میں آوارہ اور اوباش مشہور ہوں۔ یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ کھلے پیسے اور گھر والوں کی طرف سے آزادی نے مجھے بگاڑا ہے۔ مگر شبانہ جب سے تمہیں دیکھا ہے باخدا سب چھوڑ دیا ہے۔ اب میری آرزو تم ہو...... صرف تم۔ (یہاں تک پہنچ کر میں پوری ہی کانپنے لگی تھی۔ حالانکہ میں کوئی نوخیز کنواری لڑکی نہیں تھی۔ میں ایک بار کی شادی شدہ اور مرد کے جذبات کے تمام سرد و گرم سے اچھی طرح آشنا تھی۔ مگر ان الفاظ کو پڑھ کر میری حالت بری ہوگئی تھی) شبانہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے گھر والے راضی نہیں ہیں۔ اب میں کیا کروں کیونکہ اپنی زندگی تمہارے نام کر چکا ہوں۔ تمہارا وحید اللہ۔''

نیچے ایک لائن چھوڑ کر لکھا ہوا تھا۔ ''میں اس کا جواب لینے کے لیے روز صبح دس بجے تمہاری گلی سے گزروں گا اور اس وقت تک گزرتا رہوں گا جب تک مجھے جواب نہیں مل جاتا۔''

یہ وحید اللہ سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اگرچہ اس کی شہرت میں نے سنی تھی۔ خاص طور سے لڑکیوں اور عورتوں کے حوالے سے آئے دن اس کا نام سننے میں آتا تھا۔ وہ ایک زمیندار گھرانے کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اس کا باپ شریف آدمی تھا اور بھائی بھی برے نہیں تھے مگر وہ نہ جانے کس صحبت میں رہا کہ جوان ہوتے ہی الٹے سیدھے چکروں میں پڑ گیا۔ یہ خبر بھی تھی کہ پیتا بھی تھا۔ میں نے چند ایک بار اس کے بارے میں سنا مگر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے پڑ جائے گا اور مجھے یوں خط لکھے گا۔ سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں مارکیٹ جا رہی ہوں اور کیا اس نے خط پہلے سے تیار کیا ہوا تھا؟ کیونکہ ہم گھر سے نکل کر مارکیٹ پہنچے تو مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے اور اتنی جلدی وہ خط نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ چنا ہوا تھا۔

سچی بات ہے اس نے میرے دل پر اثر کیا تھا۔ مگر صرف اس حد تک کہ مجھے اس پر غصہ نہیں آیا تھا۔ ورنہ خط میں نے اسی وقت جلا دیا اور اس کی راکھ بہا دی۔ خط پڑھتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہوگئی تھی اور میں نے مناسب سمجھا کہ نہا لوں۔ پسینے کے ساتھ چہرے پر ہوائیاں بھی تھیں۔ نہانے سے میری حالت خاصی بہتر ہوئی تھی۔ اگلی صبح دس بجے میں کمرے میں تھی مگر میری توجہ باہر گلی کی طرف تھی۔ مجھے یقین تھا وحید ضرور گلی سے گزرا ہوگا۔ اتفاق سے اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی اور اماں نے باورچی خانے سے کہا۔ ''شبانہ دیکھ باہر کون ہے؟''

بھائیوں اور بھابیوں کی رہائش مکان کے پچھلے حصے میں تھی۔ اماں ابا اور میں سامنے والے حصے میں رہتے تھے اس لیے آنے گئے کو ہمیں ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ ابا تو صبح سویرے ہی چلا جاتا تھا اور اماں باورچی خانے میں لگی ہوئی تھی اس لیے اس نے مجھے کہا اور میں لرزتے قدموں سے دروازے تک آئی۔ میرے ذہن میں خدشہ تھا کہ شاید وحید اللہ دروازے تک آگیا تھا۔ مگر جب میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو برابر والوں کا بچہ کھڑا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ''باجی ماں لون (نمک) منگوا رہی ہے۔''

''رک میں لا کر دیتی ہوں۔'' میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا اور اندر آکر اماں سے کچھ نمک لیا اور جب بچے کو دینے گئی تو یہ دیکھ کر میرا سانس رک گیا کہ وہاں وحید اللہ موجود تھا۔ وہ سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور شاید میرا ہی منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور اشارے سے خط کا پوچھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلایا کر اسے بتایا کہ میں پڑھ چکی ہوں تو وہ کھل اٹھا اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے ویسا ہی کاغذ کا ایک گولا نیچے گرا دیا۔ اس دوران میں بچہ میرے ہاتھ سے نمک لے کر جا چکا تھا۔ وحید کو دیکھنے کے بعد مجھے اتنا ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ بچے کو نمک دیتی۔ وہ میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ وحید کے جانے کے بعد مجھے ہوش آیا اور میں نے چونک کر آس پاس دیکھا۔ اماں باورچی خانے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے گلی میں جھانکا اور تیزی سے باہر آکر کاغذ اٹھایا اور اندر آگئی۔ جب میں اندر آرہی تھی تو ہماری پڑوسن باہر نکل آئی۔ اس نے مجھے آواز دی۔

''شبانہ کیسی ہے؟ ٹھیک ہوں خالہ۔'' میں نے ہاتھ دوپٹے کے نیچے کرلیا حالانکہ کاغذ مٹھی میں اس طرح بند تھا کہ کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔

''تو نے آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''آؤں گی خالہ۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا اور اندر آگئی۔ اماں باورچی خانے سے نکلی۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی کس سے بات کر رہی تھی؟''

''زبیدہ خالہ سے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے پکڑ لیا تم جانتی ہو اس کی عادت کا، جان چھڑا کر آئی ہوں۔''

''اچھا اچھا۔'' اماں نے کہا اور آٹا نکالنے لگی۔ ہمارے ہاں دوپہر اور شام کی روٹیاں تندور سے لگتی تھیں۔ تندور والی آتی اور آٹا لے جاتی تھی پھر روٹیاں لگا کر گھر پہنچا جاتی تھی اس کو ہفتے کے ہفتے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ میں کمرے میں آئی اور پہلے وہاں دیکھنے لگی مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اماں یا کوئی اور اچانک آگیا تو مجھے کاغذ پڑھتے دیکھ کر متجسس ہوجائے گا۔ اس لیے میں باتھ روم میں آئی اور وہاں اسے کھول کر پڑھا۔ اس بار وحید اللہ نے اپنے جذبات کا اظہار اتنے شدید انداز میں کیا تھا کہ مجھ جیسی پختہ کار عورت بھی کانپ کر رہ گئی تھی۔ میرا چہرہ تپ گیا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی بھٹی میں بند ہوگئی ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں غصے کی بجائے جذباتی کیفیت میں ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں ٹھنڈی پڑنے لگی اور میں نے گھبرا کر کاغذ پرزے پرزے کیا اور اسے بہا دیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی اور اپنا سر تھام لیا۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ کیا میں بھی وحید اللہ میں دل چسپی لے رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے اور مجھ سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ یہی کھیل کھیل چکا تھا۔ مگر اس نے دونوں خطوں میں اپنی اس کمزوری کا اعتراف کیا تھا اور عہد کیا تھا کہ اب وہ کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اس بار بھی اس نے التجا کی تھی کہ میں اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں۔ مگر میں ایسا کیسے کرسکتی تھی۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اگر انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ میرے ٹکڑے کردیتے۔ میرا جنازہ اٹھا لیتے مگر وحید اللہ کو میری ڈولی اٹھانے نہ دیتے۔ دوسری طرف وحید اللہ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے۔ میرے باپ بھائی غصہ ور صحیح مگر وہ شریف لوگ تھے۔ وحید اللہ نہ صرف خود بدمعاش تھا بلکہ اس کی دوستی یاری بھی ایسے ہی لوگوں سے تھی۔ اگر بات بگڑ جاتی اور معاملہ مرنے مارنے تک پہنچتا

تو نقصان میرے باپ بھائیوں کا ہوتا۔

یہ سوچ کر میں کانپ گئی تھی۔ ان کی سخت گیری کے باوجود میں ان سے محبت کرتی تھی اور انہیں کوئی تکلیف ہو یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ جیسے جیسے میں اس پر سوچ رہی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ ایک بند گلی میں پھنس گیا تھا اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تب میں نے وحید اللہ کو خط لکھنے اور اس سے اس بات کو بھول جانے کی التجا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر میں خط کیسے لکھوں؟ دن میں تو یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے آج تک کسی کو خط لکھا بھی نہیں تھا کہ اسی بہانے لکھ لیتی۔ اب مجھے رات کا انتظار کرنا تھا، جب سب سو جاتے تو میں چپکے سے خط لکھ سکتی تھی۔ گرمیاں آگئی تھیں اور اماں ابا صحن میں چارپائیوں پر سوتے تھے۔ لیکن میں کمرے میں ہی سوتی تھی۔ البتہ دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ رات میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور جب سب سو گئے تو میں نے چپکے سے کاغذ قلم لیا اور باتھ روم میں آگئی۔ کمرے میں روشنی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے یہاں عجلت میں چند لائنیں گھسیٹیں۔

"یہ ممکن نہیں ہے میرے باپ بھائی نہیں مانیں گے۔ جھگڑا ہوگا اور ان کا کوئی نقصان مجھے گوارہ نہیں ہے۔ اس لیے مجھے بھول جاؤ۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر تحریر بگاڑ کر لکھی اور اپنا یا وحید اللہ کا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ میں نے کاغذ بھی وہ استعمال کیا جو چنے مرمرے والے سے ان چیزوں کے ساتھ لیا تھا۔ کاغذ کو حفاظت سے رکھ کر میں سو گئی۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اسے دیکھا۔ ابا اور بھائی حسبِ معمول سورج نکلتے ہی کام پر چلے گئے تھے۔ ناشتے کے بعد اماں اپنے کاموں میں لگ گئی اور میں کمرے میں آکر دس بجنے کا انتظار کرنے لگی۔ مگر میں سوچ رہی تھی کہ کس بہانے دروازے پر جاؤں۔ بلاوجہ جاتی تو اماں پوچھنے آجاتی۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے چند چھوٹے پتھر لیے اور جیسے ہی دس بجے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر ایک پتھر دروازے پر مارا۔ زور سے آواز ہوئی تو اماں نے کہا۔ "یہ کون پتھر مار رہا ہے۔"

چند لمحے بعد میں نے دوسرا مارا تو حسبِ توقع اماں نے مجھے پکارا۔ "شبانہ دیکھ، کوئی حرامی پتھر مار رہا ہے۔"

میں باہر نکلی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ ظاہر ہے کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے گلی میں جھانکا تو مجھے ایک سمت سے وحید اللہ آتا دکھائی دیا اور میں نے نمایاں کر کے کاغذ گلی میں پھینک دیا۔ دروازہ بند کر کے اندر پڑے پتھر بھی اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ اماں باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ "کون ہے؟"

"کوئی نہیں اماں کوئی بچہ ہوگا جو پتھر مار کر کسی گھر میں گھس گیا ہوگا۔"

ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بچے شرارت میں اور دوسروں کو تنگ کرنے کے لیے ایسے کام کرتے ہیں۔ میں اندر جانے کے بجائے صحن میں رہی۔ اماں نظر رکھنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے دروازہ کھول کر دیکھا اور کاغذ غائب پا کر سکون کا سانس لیا تھا۔ وحید اللہ اسے اٹھا لے گیا تھا۔ اگر اس کے دل پر میری بات اثر کرتی تو وہ شاید پیچھا چھوڑ دیتا اور میرا سکون غارت ہونے سے بچ جاتا۔ مگر ساتھ ہی میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ جلد میرا اندازہ درست نکلا جب اگلے دن دس بجے دروازے پر پھر کسی نے پتھر مارا اور اس سے پہلے کہ اماں جاتی میں کمرے سے نکلی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے تک آئی۔ بظاہر میں اس کو سنا رہی تھی جو روزانہ اس وقت پتھر مارتا ہے۔ مگر اصل میں میں اماں کو دروازے تک آنے سے روکنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس بار پتھر وحید نے مارا ہوگا۔ دروازہ کھولنے پر میرا قیاس ٹھیک ثابت ہوا۔ بالکل سامنے کاغذ کا گولا پڑا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اسے اٹھایا تو مجھے وحید اللہ گلی کے سرے پر جاتا دکھائی دیا۔ میں واپس آئی تو اماں باورچی خانے سے نکل آئی۔ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ "کون تھا؟"

"پتا نہیں اماں کون ہے جو اس وقت پتھر مارنے آجاتا ہے۔"

"تو نے دروازے کے آگے سے کیا اٹھایا تھا؟"

"پتھر پڑا تھا اسے دور کیا تھا۔" میں نے صفائی سے جھوٹ بولا کیونکہ کاغذ میں پہلے ہی گریبان میں ڈال چکی تھی۔ اس بار اماں نے بھی اس نادیدہ فرد کو گالیاں دیں۔ جو تنگ کرتا ہے۔ میں اندر جا کر کاغذ دیکھنا چاہتی تھی مگر اماں کے خوف سے وہیں صحن میں بیٹھی رہی۔ آج اماں کا انداز شک والا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ بات زیادہ دن چھپنے والی نہیں تھی۔ اگر وحید اسی طرح گلی کا چکر لگاتا رہا تو محلے والے بھی جان جائیں گے۔ اس سے پہلے اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا تھا۔ دوپہر کے بعد مجھے موقع ملا اور میں نے باتھ روم



میں جا کر کاغذ پڑھا۔ میں ششدر رہ گئی جب وحید اللہ نے میری ہی بات کو استعمال کیا اس نے لکھا تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ شادی پر آمادہ نہ ہوئی تو وہ رشتے کی بات خود میرے باپ اور بھائیوں سے کرے گا۔ اس کے بعد چاہے جو بھی نتیجہ نکلے۔ یعنی وہ پہلے ہی اس حد تک سوچ کر بیٹھا ہوا تھا۔ آخر میں اس نے دھمکی دی تھی۔ "شبانہ اس ہونے والے خون خرابے کو روکنا تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو چاہے تو سب خاموشی سے ہو سکتا ہے۔"

☆☆☆

رات کی تاریکی تھی، سردی کا آغاز تھا اس لیے لوگوں نے کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں جہاں گرمی میں جگہ جگہ لوگ چارپائیاں بچھا کر سو رہے ہوتے تھے۔ مگر آج صرف کتے تھے اور گاؤں کے کتے مجھے اور وحید اللہ کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے کسی نے بھونک کر یا پیچھے لگ کر دوسروں کو متوجہ نہیں کیا۔ بالآخر میں ہمت کر کے وحید اللہ کے ساتھ نکل آئی تھی۔ اس کے ساتھ تیز قدموں سے گلیوں سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ میرے یوں رات کی تاریکی میں گھر سے نکلنے کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ مجبوری، باپ اور بھائیوں کی زندگی کا خوف یا وحید کی محبت۔ وہ پاگل ہو گیا تھا مسلسل میرے پیچھے پڑا رہا اور بالآخر اس نے مجھے بھاگ چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ہمارے درمیان رابطہ بہت ہوشیاری اور احتیاط سے رہا تھا۔ اسی وجہ سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سارا رابطہ خطوط میں رہا تھا اور ہماری آمنے سامنے یہ دوسری ملاقات تھی جس میں گھر سے نکل کر اس کے ساتھ جا رہی تھی۔

دس منٹ بعد ہم گاؤں کے باہر پکی سڑک پر تھے اور وہاں ایک درخت تلے یوں کھڑے ہو گئے کہ تاریکی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ ہم بالکل خاموش تھے اور گھر سے نکلنے کے بعد میری اس سے ایک بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک نئی جیسی بڑی کار وہاں آکر رکی۔ وحید نے آگے بڑھ کر اس کا پچھلا دروازہ کھولا اور میرا بیگ اندر رکھ کر اس نے مجھے بھی اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں بیٹھ گئی تو اس نے دروازہ بند کیا اور خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اس کا دوست تھا جو فرار میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ سڑک صاف ہموار اور رات کے اس پہر خالی تھی۔ میں گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جب وہ مجھے کل گھر میں نہیں پائیں گے تو ان پر کیا گزرے گی۔ میں ایک خط لکھ آئی تھی کہ میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں اور جس کے ساتھ جا رہی ہوں اس سے شادی کروں گی۔ گناہ والا کوئی کام نہیں کروں گی۔ مگر اس خط سے کیا ہوگا جو بدنامی ہونا ہوگی وہ تو ہوگی۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے یا میں سوچوں سے تنگ آکر سو جانا چاہتی تھی۔ کسی وقت میری آنکھ لگ گئی اور جب کھلی تو گاڑی موٹر وے پر ایک ریستوران کے سامنے کھڑی تھی اور وحید کا دوست نہیں تھا۔ میں ہلی تو وحید نے مڑ کر دیکھا۔

"جاگ گئیں؟"

"ہاں۔" میں نے چادر درست کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے اندر چل کر منہ ہاتھ دھو لو پھر ناشتا کر کے چلتے ہیں۔"

"ہم کہاں ہیں؟"

"پنڈی سے کچھ دور ہیں۔" اس نے کہا۔ آسمان پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میں اور وحید اتر کر ریستوران میں آئے۔ واش روم میں میں نے منہ ہاتھ بھی دھویا اور تازہ دم ہو گئی۔ ناشتے کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ وحید نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اس نے بس یہی کہا تھا کہ وہ مجھے ایسی جگہ لے جائے گا جہاں میرے اور اس کے گھر والوں کی سوچ بھی نہ جا سکے۔ یہ تو ظاہری سی بات تھی کہ جب ہم دونوں ہی غائب ہوتے تو سب جان جاتے میں کس کے ساتھ گئی ہوں۔ اس کے بعد میرے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ساتھ وحید کے گھر والے بھی اس کی تلاش شروع کر دیتے۔ وہ ان سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد پنڈی یا اسلام آباد کا کوئی علاقہ آگیا اور پھر کار موٹر وے سے اتر کر ایک نیم شہری علاقے میں آئی۔ تھا تو یہ شہر کا کوئی حصہ مگر وہاں ماحول کسی قدر دیہاتی لگ رہا تھا۔ وحید نے بتایا۔

"یہ فتح جنگ کا نواحی علاقہ ہے۔"

یہاں بڑی کوٹھیاں تھیں یا خالی پلاٹ تھے۔ گاڑی ایک بڑی سی کوٹھی کے سامنے رکی۔ ڈرائیور جو وحید کی عمر کا جوان آدمی تھا اس نے اتر کر گیٹ کھولا اور گاڑی اندر لے گیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے تھے۔ اندر پہنچ کر اترے تو ڈرائیور نے کہا۔ "میں تمہارے لیے کوارٹر کھولتا ہوں۔ ابھی سامان نہیں ہے لیکن میرے کوارٹر میں سب ہے گزارا ہو جائے گا۔ ابھی تو تم لوگ میرے کوارٹر میں چلو۔"

کوارٹر کوٹھی کے بائیں طرف ایک دیوار کے پیچھے

تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو پہلو بہ پہلو دو دو کمروں کے تین کوارٹر تھے۔ ڈرائیور نے درمیان والے کوارٹر پر دستک دی تو اندر سے ایک کم عمر اور خوب صورت سی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ ڈرائیور کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ ''شاہد تو آگیا۔''

''ہاں ساتھ وحید اور اس کی گھر والی بھی ہے۔'' شاہد نے کہا۔ ''انہیں اندر لے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔''

لڑکی اصل میں شاہد کی بیوی تھی اور اس کے حلیے سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ اس کا نام رانیہ تھا مگر رانی کہلاتی تھی اور شاہد وحید کا دوست تھا جو کسی زمانے میں وحید کی غلط صحبتوں کا ساتھی تھا مگر پھر اس نے توبہ کرلی اور یہاں آکر ملازمت کرلی۔ رانی اور اس کی شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی کسی میاں عبدالعزیز کی تھی اور وہ کروڑ پتی بلکہ ارب پتی آدمی تھا۔ اس کی رہائش اسلام آباد میں تھی مگر یہ کوٹھی اس نے عیاشی کے لیے رکھی ہوئی تھی اور ہفتے میں دو دن وہ یہاں ہوتا تھا۔ کوٹھی میں ڈرائیور یعنی شاہد کے علاوہ ایک باورچی بھی تھا۔ رانی ہنس مکھ اور تیز طرار لڑکی تھی۔ وہ پھرتی سے ہمارے لیے چائے اور کچھ تیار چیزیں لے آئی۔ ساتھ ہی اس نے اطلاع دی کہ دوپہر کا کھانا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تیار ہو کر آئے گا۔ دو کمروں کا کوارٹر اس نے بہت اچھا سجایا ہوا اور صاف ستھرا رکھا تھا۔

رانی کی زبان بھی بہت تیز تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں ہمیں بہت کچھ بتا دیا۔ باورچی شرافت حسین گلگت کا رہنے والا تھا اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی مگر یہ اس کی تیسری بیوی تھی باقی دو بیویاں گلگت میں تھیں۔ تیسری بیوی عمر میں اس سے پورے تیس برس چھوٹی تھی۔ رانی نے بتایا کہ میاں صاحب کو اس کوٹھی کے لیے ایک چوکیدار کی ضرورت تھی جسے پستول اور رائفل چلانی آتی ہو۔ شاہد نے وحید سے بات کی اور وہ مان گیا۔ کچھ دیر میں شاہد آگیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے میاں صاحب کو کال کر کے بتا دیا ہے انہوں نے کل وحید کو بلایا ہے۔ اس کا انٹرویو ہوگا۔ امید ہے اسے نوکری مل جائے گی۔ شاہد کو پندرہ ہزار تنخواہ مل رہی تھی۔ رہنے کو جگہ اور کھانا پینا بھی فری تھا۔ کوٹھی کے کچن سے دوپہر اور رات کا کھانا آتا تھا۔ کھلا کھاتا تھا۔ میاں صاحب نے اجازت دی ہوئی تھی کہ جو چاہے پکائیں اور کھائیں۔ صرف ناشتا اور چائے اپنا کرنا پڑتا تھا۔ شاہد نے وحید کو آنکھ مار کر کہا۔ ''مزے ہی مزے ہیں۔''

''تیرے مزے میں جانتی ہوں۔'' رانی چہک کر بولی۔ ''تو آج کل برابر والے کوارٹر کے آس پاس رہتا ہے۔''

رانی کا اشارہ شرافت کے کوارٹر کی طرف تھا اس نے بتایا تھا کہ شرافت کی بیوی مشکل سے بیس سال کی اور بہت حسین تھی۔ شرافت اس پر سخت نظر رکھتا تھا اور اسے کوارٹر سے باہر آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ رانی کو یہاں آئے تین مہینے سے اوپر ہو گئے تھے مگر وہ ایک بار بھی اس کے کوارٹر میں نہیں آئی تھی۔ البتہ رانی اس کے پاس جاتی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''باجی آپ آگئی ہو اب کچھ رونق ہوگی۔ حسینہ اپنے شوہر کی طرح گھُس سی ہے۔''

میں سوچ رہی تھی کہ ابھی تک وحید نے ہمارے نکاح کا کچھ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میں اسی شرط پر گھر سے نکلی تھی کہ سب سے پہلے ہمارا نکاح ہوگا اس کے بغیر میں اس کے ساتھ اکیلے ایک لمحے کو بھی نہیں رہوں گی۔ وحید نے یقین دلایا تھا کہ بارہ گھنٹے سے بھی پہلے ہمارا نکاح ہو جائے گا۔ مگر یہاں بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ تین بجے ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا جو کوٹھی کے کچن سے آیا تھا اور بہت شاندار اور لذیذ تھا۔ اس کے بعد جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے چپکے سے وحید سے کہا۔ ''تو نے اب تک نکاح کا کچھ نہیں کیا؟''

''شاہد گیا تھا، مقامی مسجد میں نکاح خواں ہے مگر وہ کہیں گیا ہے شام تک آئے گا۔ تب شاہد اسے لے آئے گا۔''

میں نے اسے خبردار کیا۔ ''یاد رکھنا جب تک نکاح نہیں ہوگا میں تمہارے ساتھ کہیں اکیلے نہیں رہوں گی۔''

''شبانہ میں بھی تجھے درست طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''الٹے کام بہت کیے اب توبہ کرلی ہے۔''

اسی شام ہمارا نکاح ہوا۔ نکاح خواں رجسٹرڈ تھا۔ اس نے باقاعدہ فارم فل کیا اور مجھ سے کئی سوالات کیے۔ میں نے پہلی شادی کے بارے میں جھوٹ بولا ورنہ عنایت کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑتا اور وہ میرے پاس نہیں تھا۔ باقی میں اپنی ساری دستاویزات مع شناختی کارڈ کے لے کر آئی تھی۔ شاہد اور اس کا کوئی واقف کار گواہ بنے تھے۔ نکاح کی یہ تقریب شرافت حسین سے چھپائی گئی تھی۔ مقصد میاں صاحب کو بے خبر رکھنا تھا۔ چوکیدار کے لیے ان کی پہلی شرط یہی تھی کہ وہ شادی شدہ ہو اور بیوی بچوں کو ساتھ لا کر رکھے۔ شاہد نے وحید کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے مگر ابھی بچے نہیں ہیں۔ ہمارے پاس سوائے ذاتی سامان کے اور کچھ نہیں تھا اور خالی کوارٹر میں سوائے گرد مٹی کے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے ہماری پہلی رات شاہد کے کوارٹر میں یوں گزری کہ میں رانی کے ساتھ ایک کمرے میں سوئی اور وحید شاہد کے ساتھ دوسرے کمرے میں۔ یہاں سردی شدید تھی اور میں موٹے گرم کمبل میں بھی سردی محسوس کر رہی تھی۔

اگلے دن وحید صبح سویرے پہلے شاہد کے ساتھ میاں صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے انٹرویو اور اسلحے کے استعمال کا ٹیسٹ لے کر اسے ملازمت پر رکھ لیا۔ اس نے مجھے کال کر کے اطلاع دی اور کوارٹر صاف کرنے کو کہا۔ جب تک میں نے رانی کے ساتھ مل کر کوارٹر صاف کیا۔ وہ بازار سے گھر کا سامان لے کر آیا۔ اس کے پاس خاصی رقم تھی۔ میں بھی لاکھ سے اوپر رقم اور اپنا زیور لے کر آئی تھی مگر وحید نے مجھ سے کچھ نہیں لیا اور سب اپنا خرچ کیا۔ وہ ایک پرانا ڈبل بیڈ اور گدا، دو دروازے والی الماری اور چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل لایا۔ یہ پورا سیٹ تھا جو استعمال شدہ ہونے کی وجہ سے سستا مل گیا مگر پالش ہو کر اچھا لگ رہا تھا۔ تکیے چادریں اور کچھ فوری ضرورت کا سامان لے آیا۔ اس کے ساتھ دو نئے کمبل اور ایک گیس ہیٹر بھی لے آیا تھا کہ اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ یوں ہم اپنے کوارٹر میں رہنے کے قابل ہوئے۔

اس رات وحید پہلی بار میرے پاس آیا حالانکہ میں ایک دن پہلے اس کی بیوی بن گئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ اس کے والہانہ پن اور پُرجوش محبت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ عنایت بھی مجھ سے محبت کرتا تھا مگر اس میں بھی کبھی ایسا والہانہ انداز محسوس نہیں کیا۔ عورت اپنے مرد کی بھرپور محبت ہی تو چاہتی ہے اور جب یہ اسے ملتی ہے تو مرد خود بہ خود اس کے دل میں گھر کرتا جاتا ہے۔ پھر وحید کو عورتوں کو رجھانے کا فن بھی آتا تھا۔ یہ فن اس نے بہت سی عورتوں اور لڑکیوں سے تعلقات کے بعد سیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے خود بتایا۔ جب میں گھر سے نکلی تو میرے اندر ایک یاسیت اور اداسی سی تھی اور یہ اداسی شادی کی پہلی رات تک برقرار رہی تھی۔ اگلی صبح جب میں اٹھی تو میں نے خود کو بالکل مختلف محسوس کیا تھا۔ وحید نے بھی محسوس کرلیا وہ غسل خانے سے بال تولیے سے خشک کرتا نکلا تو مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ''آج تو بالکل بدلی ہوئی لگ رہی ہے۔''

''ہاں مجھے بہت عرصے بعد لگ رہا ہے کہ میں بدل گئی ہوں۔''

وحید خوش ہو گیا۔ ''تب کہیں باہر چلتے ہیں۔ گھومیں گے اور جو سامان لینا ہے وہ بھی لے آئیں گے۔''

میں مان گئی۔ یہ سارا دن ہم نے گھومنے میں گزارا۔ شام تک اتنا تھک گئے کہ مارکیٹ جانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ پھر دو تین دن تک یہی ہوتا رہا۔ رت جگوں اور دن کی سیروں نے ہمیں تھکا مارا تھا۔ مگر ایک عجیب سی توانائی تھی جو ہمیں چین سے بیٹھنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ پھر میاں صاحب آگئے اور اب وحید کو ڈیوٹی پر رہنا پڑتا تھا تو ان دنوں مجھے موقع ملا اور میں نے آرام کیا۔ رفتہ رفتہ ابتدائی جوش و ولولہ کم ہونے لگا اور گھر کی ضرورتیں اہمیت اختیار کرنے لگیں۔ اب میں رانی کے ساتھ خود جا کر سامان لانے لگی کیونکہ وحید کو دن میں مستقل گیٹ پر رہنا پڑتا تھا۔ شاہد نے اسے خبردار کیا تھا کہ میاں صاحب کبھی کبھی بتائے بغیر بھی آجاتے ہیں اسی طرح ان کے مہمان بھی آتے ہیں ان کو ریسیو کرنے کے لیے وحید کا گیٹ پر ہونا لازمی تھا۔ اگر وہ غائب پایا گیا تو اس کی نوکری تو جائے گی ہی، ساتھ ہی شاہد کی شامت بھی آئے گی۔

اس لیے وحید پوری توجہ سے ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک گیٹ پر ہوتی تھی اس کے بعد وہ کوارٹر میں آسکتا تھا لیکن میاں صاحب کے ہوتے ہوئے اسے گیٹ سے ہٹنے کی اجازت نہیں تھی اسے سونا بھی وہیں پڑتا۔ اسی لیے اب سامان لینے کے لیے بھی مجھے ہی جانا پڑتا تھا۔ یہاں مارکیٹ نزدیک اور اچھی تھی ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ میں اچھی طرح چادر میں لپٹ کر اور چہرہ چھپا کر باہر جاتی تھی۔ اگرچہ میں اپنے گاؤں سے بہت دور تھی اور ہمارا کوئی جاننے والا اس جگہ نہیں رہتا تھا مگر کیا کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو کب کون کہاں مل جائے؟ اس لیے میں اپنے طور پر پوری احتیاط کر رہی تھی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے میں ضرورت کا سارا ہی سامان لے آئی۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا تو وقت گزاری کے لیے ایک چھوٹا ٹی وی بھی لے لیا۔ صبح وحید کے جاتے ہی رانی آجاتی اس سے گپ شپ کرتی۔ دوپہر میں کھانے کے بعد آرام کرتی یا ٹی وی دیکھتی اور شام کو رانی کے پاس چلی جاتی، ہم مل کر باہر جاتے یا کوٹھی کے بڑے

سے لان میں ٹہلتے تھے۔شام میں وحید آجاتا اور رات ہماری ہوتی تھی۔

کوارٹر صاف ستھری حالت میں تھا۔مطلب کہ رنگ ہوا تھا اور کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا مرمت کا کام نہیں تھا۔پانی، بجلی اور گیس سمیت ساری سہولتیں تھیں۔نشست گاہ کے لیے ایک چھوٹا صوفہ سیٹ اور تخت لیا تھا، فرش پر سادہ قالین ڈال لیا تھا۔کھڑکیوں اور دروازوں کے لیے پردے لے آئی تھی۔موسم سرد تھا اس لیے ابھی پنکھوں کی ضرورت نہیں تھی۔پچھلی کھڑکی کوٹھی کے باہر کھلتی تھی اور یہاں ذرا نشیب میں کھائی جیسی تھی۔دن کے وقت یہاں کا منظر خوب صورت نظر آتا تھا۔کیونکہ باہر جگہ نشیبی تھی اس لیے کھڑکی کھلی بھی رہتی تو کوئی اندر دیکھ نہیں سکتا تھا۔میں خوش تھی اور وحید بھی خوش تھا اسے میں مل گئی تھی۔نوکری تھی اور شاہد جیسا دوست بھی تھا۔کبھی چھٹی والے دن وہ دونوں مل کر باہر جاتے تھے۔اگرچہ وحید کا کہنا تھا کہ وہ صرف گھومتے پھرتے اور باہر کھاتے ہیں مگر رانی کو یقین تھا کہ وہ پرانے دنوں کی یاد تازہ کرنے جاتے ہوں گے۔اس نے مجھ سے کہا۔''باجی یہ مرد بڑے بدذات ہوتے ہیں ان پر ایک فیصد اعتبار نہیں کرنا چاہیے پوری نظر رکھنی چاہیے۔ذرا نظر بچی اور یہ اپنا کام کر جاتے ہیں۔''

اگرچہ میں کسی حد تک اس سے متفق تھی مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔حسینہ سے ملنا کم ہوتا تھا کیونکہ وہ باہر نکلتی ہی نہیں تھی۔اس کا بڈھا شوہر کوٹھی کے کچن میں کام کرتے ہوئے دن میں دس بار اچانک کوارٹر آتا تھا۔ویسے اسے خود بھی شوق نہیں تھا وہ زیادہ تر آرام ہی کرتی رہتی تھی۔پڑھی لکھی نہیں تھی اور کوئی وقت گزاری کا سامان بھی نہیں تھا۔مجھے حیرت ہوتی کہ وہ پڑے پڑے اکتا نہیں جاتی تھی۔رانی نے اس کے حسن کے بارے میں درست کہا تھا۔بے پناہ سرخ و سفید رنگت اور بہت ہی دلکش نقوش کے ساتھ ساتھ اس کا جسم جیسے تراشا ہوا تھا۔کہیں ایک انچ فالتو گوشت نہیں تھا۔اس کا بڈھا اور چھوٹے قد کا شوہر یقیناً خوش قسمت تھا جو حسن اور خوب صورتی کے اس مجسمے کا مالک تھا۔میں اسے مجسمہ ہی کہوں گی کیونکہ اس کے چہرے پر تاثرات بھی بہت کم آتے تھے۔میں نے شاذ ہی اسے مسکراتے دیکھا اور ہنسنا وہ جانتی نہیں تھی۔وہ کوارٹر سے اس وقت نکلتی تھی جب میاں صاحب یا ان کے مہمان آئے ہوتے اور شرافت کو ایک مددگار کی ضرورت ہوتی تھی۔

جب ہم شروع میں آئے تو دل پر خوف سا طاری تھا کہ ابھی ہمارے گھر والے ہمارا تعاقب کرتے آجائیں گے۔ظاہر ہے وہ صرف پیچھے نہیں آئیں گے بلکہ ہمیں پکڑیں گے اور شاید ہمیں قتل بھی کر دیں۔وحید ظاہر نہیں کرتا تھا مگر اندر سے وہ بھی ڈرا ہوا تھا۔رات کو سوتے میں چونک جاتا اور نیند خراب ہوتی تو بہت دیر تک ٹہلتا رہتا۔میں پوچھتی تو ٹال جاتا مگر میں اس کی کیفیت سمجھتی تھی کیونکہ خود میری بھی کیفیت ہوتی تھی۔مگر جیسے جیسے وقت گزرا تو ہمارا اعتماد بحال ہوتا گیا۔وحید پہلے گیٹ کے باہر نہیں جاتا تھا اور کوئی آتا تو سامنے آئے بغیر پوچھتا تھا مگر اب وہ دن میں کرسی ڈال کر باہر بیٹھنے لگا تھا۔میں باہر جاتے ہوئے شروع میں چہرہ چھپاتی تھی مگر اب صرف چادر سر پر لیتی تھی اور چہرہ کھلا ہوتا تھا۔شادی کے بعد ہم باہر ضرور گھومے تھے مگر اس میں بھی پریشان رہتے تھے۔اب گھومنے جاتے تو آزادی کا احساس ہوتا تھا اور مزہ آتا۔شادی کے دوسرے مہینے میں نے وحید سے کہا۔''تجھے بچے کیسے لگتے ہیں؟''

''اچھے لگتے ہیں۔''اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔''بچے کسے برے لگ سکتے ہیں۔''

''میری مراد اپنے بچوں سے ہے۔''میں نے کہا۔''تجھے اپنے بچوں کی خواہش نہیں ہے۔''

''ابھی نہیں۔''اس نے خلاف توقع انکار کر دیا۔''دیکھ ابھی ہم ذرا سکون سے بیٹھے ہیں مگر آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہے۔ہو سکتا ہے ہمارے گھر والے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں، ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا پڑے۔ایسے میں بچوں کا چکر نہیں پال سکتے۔''

''یہ خطرہ تو ہمیشہ رہے گا۔''میں نے تلخی سے کہا۔

''یہ ہمارا عارضی ٹھکانہ ہے۔یہاں رہیں گے کچھ پیسے جمع کر لیں تو پھر کراچی جائیں گے۔وہ بڑا شہر ہے اور بہت دور بھی ہے۔وہاں ہم آسانی سے گم ہو سکتے ہیں۔اس کے بعد ہم بچوں کا بھی سوچیں گے۔''

وحید کی دلیل میں وزن تھا اس لیے میں چپ ہو گئی مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ اصل میں اسے بچوں سے دلچسپی نہیں ہے۔اس کا اندازہ مجھے اس سے بھی ہوا کہ وہ بچوں کے معاملے میں احتیاط کرتا تھا۔اس کی کوشش تھی کہ میں ماں نہ بنوں۔اسی لیے میں نے اس سے بات کی تھی۔اس نے کھل کر کہہ دیا کہ ابھی بچے نہیں چاہیے تھے۔اس دن وحید کا موڈ خراب ہو گیا تھا اور وہ یہاں آنے کے بعد پہلی بار مجھ سے



منہ پھیر کر سو گیا تھا۔اس کے چند دن بعد رانی نے شرماتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔وہ اور شاہد دونوں بہت خوش تھے۔ان کی خوشی دیکھ کر میں دل مسوس کر رہ گئی۔پہلی باری میں بھی مجھے یہ خوشی نہیں ملی اور اب وحید بچوں سے انکار کر رہا تھا۔پتا نہیں میرے مقدر میں کیا تھا۔

رانی اور یہاں موجود سب یہی سمجھتے تھے کہ میری پہلی شادی ہے۔شاہد کو بھی وحید نے اصل بات نہیں بتائی تھی اور کیونکہ وہ دوسرے گاؤں کا رہنے والا تھا اس لیے ہمارے گاؤں کے واقعات سے بے خبر تھا۔ویسے بھی شاہد کو وہاں سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔رانی نے کئی بار مجھے ماضی کے حوالے سے کریدا مگر میں اسے ٹال جاتی اور بہت کم بتایا تھا۔میری کوشش ہوتی تھی کہ جھوٹ نہ بولنا پڑے اور جو بات چھپانی ہو اسے سرے سے بتایا نہ جائے، کیونکہ جھوٹ کبھی نہ کبھی کھل جاتا ہے۔رانی بس اتنا جانتی تھی کہ میرے گھر والے وحید سے میری شادی پر آمادہ نہیں تھے اس لیے ہمیں گھر سے بھاگ کر شادی کرنا پڑی تھی۔اس کا تجسس ماند پڑا تھا مگر پھر بھی وہ کریدنے سے باز نہیں آتی تھی۔اسے ہر ایک کی فکر لگی رہتی تھی۔ایک بار شاہد اور وحید دونوں میاں صاحب کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔وہ دو دن کے لیے گئے تھے اور دو دن رانی میرے ساتھ سوئی تھی۔اسے اب اکیلے کوارٹر میں خوف آتا تھا۔ورنہ پہلے وہ اکیلی ہی رہتی تھی اور اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔

''پتا نہیں باجی جب سے بچہ آیا ہے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''ایسی حالت میں عورت کی کیفیت بدل جاتی ہے۔''میں نے اسے تسلی دی۔رات کو سوتی کم تھی اور باتیں زیادہ کرتی تھی اور اس نے پہلی بار مجھے حسینہ کے بارے میں بتایا کہ اس کا کسی سے چکر تھا۔میں اچھل پڑی۔''ایسا کیسے ہو سکتا ہے، اس کا شوہر دیکھا ہے اس کے ٹکڑے کر دے گا۔''

''وہ تو ہے پر باجی ذرا سوچ کہ یہ عورت اتنی مطمئن اور خوش کیسے رہتی ہے۔یہ بڈھا اسے کیا دیتا ہے، نہ کپڑا لتا اور نہ کوئی آسائش، بس سارا دن کوارٹر میں اکیلی رہتی ہے۔دل بہلانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ایسے تو کسی جانور کو رکھو تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔پر اس کا رنگ روپ دیکھا ہے، دن بہ دن روپ ہی نکھرتا جا رہا ہے۔''

''وہ اس کی عادی ہے۔''

اس بار رانی بتاتے ہوئے جھجکی تھی۔''کبھی کبھی رات کو اس کے کوارٹر سے آوازیں آتی ہیں۔''

''کیسی آوازیں؟''

رانی شرمائی۔''باجی سمجھا کر نا، تم بھی تو شادی شدہ ہو۔''

''اوہ، اچھا مگر وہ بھی تو شادی شدہ ہے۔''

''وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں مگر ایک رات آوازیں آئیں تو اس کا شوہر گھر میں نہیں تھا۔''

میں حیران ہوئی۔''وہ کہاں گیا تھا۔وہ تو دن میں گھر کے دس چکر لگاتا ہے رات میں اسے چھوڑ کر کہاں گیا ہوگا؟''

''اس رات اسے میاں صاحب نے اپنی اسلام آباد والی کوٹھی پر بلایا تھا وہاں کوئی بڑی دعوت تھی جس میں اس کی ضرورت بھی پڑ گئی۔یہ اس رات وہاں رہا تھا۔میں نے خود صبح اسے آتے دیکھا اور شاہد سے پوچھا تو اس نے بتایا تھا۔''

''تو نے آوازوں والی بات شاہد کو نہیں بتائی۔''

''توبہ کر باجی یہ بھی کوئی مردوں کو بتانے والی بات ہے۔''

''کب کی بات ہے؟''

''دو ہفتے پہلے کی۔'' اس نے حساب لگا کر بتایا۔ہمارے کوارٹر اس طرح تھے کہ آغاز میں ہمارا کوارٹر تھا۔درمیان میں رانی اور شاہد کا اور سب سے آخر میں شرافت اور حسینہ کا کوارٹر تھا۔مگر تینوں کوارٹرز کے آنے جانے کا راستہ ایک ہی تھا جو مین گیٹ کے پاس نکلتا تھا اور جس نے کوٹھی میں آنا جانا ہوتا تھا وہ اسی راستے سے آتا جاتا تھا۔میں سوچ میں پڑ گئی۔اگر حسینہ کے کسی سے تعلقات تھے تو وہ کون ہو سکتا تھا۔باہر کا کوئی فرد کوٹھی میں کیسے آ سکتا تھا جب کہ کوٹھی میں آمد و رفت کے لیے ایک ہی گیٹ تھا اور اس پر یا تو پہرہ ہوتا تھا یا پھر یہ بند رہتا تھا۔شاہد اور وحید اپنے کوارٹرز میں ہوتے تھے۔مجھے نہیں یاد کہ رات کبھی میری آنکھ کھلی ہو اور وحید بستر پر نہ ہو۔میری نیند ہلکی ہے اور ذرا سی آہٹ سے آنکھ کھل جاتی ہے۔میں نے جھجک کر رانی سے کہا۔''یہ یقیناً باہر کا کوئی آدمی ہوگا۔''

رانی ہنسی۔''تو باجی تم سمجھ رہی ہو ہمارے مردوں میں سے کوئی ہوگا۔شاہد تو اس رات میرے ساتھ تھا۔میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں جاگتی رہی تھی۔گھبرا کر بار بار کھلے صحن کی طرف جاتی اور جب سردی لگتی تو اندر آجاتی۔اسی دوران میں مجھے برابر سے آوازیں سنائی دی تھیں۔''

''وحید بھی کبھی غائب نہیں ہوا۔سوائے ان راتوں کے جب وہ گیٹ پر ہوتا تھا۔''

رانی نے یقین سے کہا۔''باجی باہر کا ہی کوئی بندہ ہوگا۔''

''مگر کیسے، باہر کا آدمی اندر کیسے آسکتا ہے؟''
''جب عورت خیانت پر آمادہ ہو تو بند تجوری سے راستے بھی نکال لیتی ہے۔'' رانی نے اپنی کمسنی کے باوجود پتے کی بات کی تھی۔
اگرچہ اس معاملے سے میرا یا وحید کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر مجھے خیال آیا کہ اگر معاملہ کھل گیا اور بات پولیس تک گئی تو شاید ہم بھی لپیٹ میں آجائیں۔ ممکن ہے میرے یا وحید کے گھر والوں نے ہمارے خلاف پولیس میں رپورٹ کرائی ہو اور پولیس ہماری تلاش میں ہو۔ اس اندیشے کے باوجود میں نے وحید سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ میں نے وحید سے پوچھا کہ کیا شرافت اکثر راتوں کو باہر رہتا ہے تو اس نے انکشاف کیا کہ مہینے میں چار پانچ بار وہ میاں صاحب کی اسلام آباد والی کوٹھی جاتا ہے اور اکثر رات وہیں رکتا ہے کیونکہ دعوتوں میں دیر ہوتی ہے اور اسے وہاں سے آنے میں مسئلہ ہوتا ہے اس لیے وہ رات رک کر صبح آتا ہے۔ میں نے رانی کو یہ بات بتائی تو وہ پُرجوش ہوگئی۔ ''باجی آوازیں ہر روز نہیں آتی ہیں کبھی کبھی آتی ہیں۔''
ان دنوں سردیاں تھیں اور راتوں کو ویسے ہی سناٹا ہوتا تھا پھر کوارٹر بہت چھوٹے اور آپس میں ملے ہوئے تھے اس لیے آوازیں آس پاس آسانی سے سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کوئی زور سے ہنستا تو مجھے بھی اپنے کوارٹر میں سنائی دیتا۔ اسی لیے میں اور وحید اپنی باتیں کرتے ہوئے محتاط رہتے تھے اور بہت دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ شروع میں ہم زیادہ بات کرتے تھے پر دو مہینے بعد اس موضوع پر شاذ ہی کوئی بات ہوتی تھی۔ وحید کا کہنا تھا کہ یہاں ایک سال رکیں گے اور پھر کراچی جائیں گے۔ جب تک وہ وہاں موجود اپنے کچھ دوستوں سے بات کرکے لائن بنانے کی کوشش کرے گا تاکہ وہ وہاں جائے تو اسے کام مل جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی بزنس کا سوچے۔ میرے پاس تقریباً تین ساڑھے تین لاکھ روپے مالیت کا زیور تھا۔ جو رقم ہم نے یہاں آنے کے بعد خرچ کی تھی اس سے زیادہ وحید کو تنخواہ کی صورت میں مل گئے تھے۔ اس لیے ہمارے پاس دو لاکھ سے اوپر رقم تھی۔
عنایت نے مجھے شادی کے بعد پہلی بار موبائل دیا تھا۔ یہ سادہ موبائل تھا جو کال کرنے اور سننے کے کام آتا تھا۔ پھر اپنے قتل سے دو مہینے پہلے اس نے مجھے دوسرا اچھا والا موبائل دلایا تھا۔ یہ بھی بٹن والا تھا مگر اس میں کیمرا اور دوسری چیزیں تھیں۔ میں اب تک یہی موبائل استعمال کر رہی تھی۔ البتہ وحید کے پاس بڑا اچھا والا موبائل تھا یہ آئی فون تھا۔ پرانا تھا مگر چلنے اور کام میں بہت اچھا تھا۔ وحید اسے بڑا سنبھال کر رکھتا تھا۔ میرے موبائل میں میموری کارڈ تھا جس میں گانے وغیرہ تھے میں فارغ اوقات میں وہ سنتی تھی۔ ایک دن میں نے گانے سننا چاہے تو وہ چلے نہیں اور اسکرین پر نو میموری کارڈ لکھا ہوا آرہا تھا۔ حالانکہ میموری کارڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے نکال کر پھر لگایا اور جب اس نے کام نہیں کیا تو میں نے نکال کر وحید کو دیا کہ اسے چیک کرالائے اگر خراب ہوگیا ہے تو دوسرا لادے۔
''دوسرا لانے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے کہا اور مجھے ایک پرانا میموری کارڈ دیا۔ ''یہ میرے پاس رکھا ہے لگا کر دیکھ لو اگر ٹھیک نہیں ہوا تو میں نیا لادوں گا۔''
میں نے لے کر لگایا تو یہ ٹھیک کام کر رہا تھا۔ مگر اس میں گانے وغیرہ نہیں تھے۔ وحید نے کہا۔ ''میں شام کو باہر جاؤں گا تو دینا میں اس میں گانے ڈلوا کرلے آؤں گا۔''
وحید گیٹ پر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد میں وقت گزاری کے لیے میموری کارڈ میں موجود چیزیں دیکھنے لگی۔ میں نے تصویروں والا فولڈر کھولا تو اس میں وحید نے خاصی تصویریں ڈالی ہوئی تھیں۔ میں تصویریں دیکھنے لگی اور پھر ایک تصویر میرے سامنے آئی تو میں چونک گئی۔ وحید کا کہنا تھا کہ اس نے پہلی بار مجھے اس وقت دیکھا جب میں بیوہ ہو کر گھر آگئی تھی۔ اس نے موقع نہیں بتایا تھا کہ کب دیکھا تھا۔ مگر یہ تصویر تو کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔ یہ اس دن کی تصویر تھی جب میں عنایت کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تھی اور وہاں عنایت کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بارہ بجنے میں کچھ پہلے کا وقت تھا اور یہ تصویر اسی دن پونے بارہ بجے لی گئی تھی۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہی تھی میرا دل ڈوب سا رہا تھا۔ وحید نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ کیا اس روز اس کا عنایت سے جھگڑا ہوا تھا اور یہ جھگڑا اس لیے ہوا تھا کہ وحید نے میری تصویر لی تھی۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ عدت کے بعد میں اسی دن پہلی بار نکلی تھی جب کپڑے لینے گئی تھی اور وہاں وحید ملا تھا۔
اگر یہ درست تھا تو عنایت کے قتل کا معما حل ہورہا تھا اور قاتل وحید تھا۔ یہ سوچ کر میرا سر چکرانے لگا کہ میرا موجودہ شوہر جس کے لیے میں گھر سے بھاگی تھی۔ اپنے باپ بھائیوں کی عزت کو پیروں تلے روندا تھا۔ وہ میرے پہلے شوہر کا قاتل تھا۔ میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ صرف ایک مفروضہ ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہی سچ ہے۔ شام کو جب وحید میموری کارڈ لینے آیا تو میں نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اسے میموری کارڈ دیتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔
''اس میں تمہاری تصویریں بھی ہیں میں نے پوری نہیں دیکھی ہیں جب تک گانے ڈلوا کر لاؤ گے تو پھر ساری دیکھوں گی۔''
وحید چونکا اور پھر اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ اس نے جلدی سے میموری کارڈ لیا اور چلا گیا۔ وہ خاصی دیر بعد آیا اور میموری کارڈ میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اپنے موبائل میں لگایا اور جب تصویروں والا فولڈر چیک کیا تو میری توقع کے عین مطابق اس میں سے وہ تصویر غائب تھی۔ وحید نے اڑا دی تھی۔ اس کے علاوہ باقی ساری تصویریں موجود تھیں۔ میرا یقین پختہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل جیسے اندر سے گھٹنے لگا تھا۔ اس دن رات کا کھانا جلدی آگیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو وحید نے کہا۔ ''آج شرافت اسلام آباد جارہا ہے۔''
شرافت دونوں ٹائم الگ الگ کھانا بناتا تھا لیکن جس دن اسے جانا ہوتا تھا اس دن وہ شام کا کھانا بنا لیتا اور کیونکہ وہ کچن بند کرکے جاتا تھا اس لیے کھانا پہلے ہی دے جاتا۔ اس دن سردی بہت تھی اور وحید سرِشام ہی آگیا۔ وحید چائے بہت اچھی بناتا تھا اور کبھی موڈ ہوتا تو بناتا تھا اس رات بھی چائے اس نے بنائی اور پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اگلے روز میں ذرا دیر سے اٹھی وحید گیٹ پر چلا گیا تھا اس نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے ناشتہ بنا کر دیا اور رانی کے پاس آئی تو وہ خود میرے پاس آنے والی تھی اور بہت بے تاب تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر میرے پاس آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ''باجی کل بھی یہاں کوئی آیا تھا۔''
میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ''تم نے سنا تھا؟''
''ہاں اور اس بار تو میں نے کسی مرد کی سرگوشیاں بھی سنیں۔'' اس نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''باجی یہ معاملہ تو بڑھتا جارہا ہے۔''
''بڑھ تو رہا ہے لیکن مجھے اُمید ہے جلد ہی ختم ہو جائے گا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔
''حیرت ہے ہمارے مردوں کو اب تک پتا نہیں چلا۔ حالانکہ مردوں کو ایسی باتوں کا جلد علم ہو جاتا ہے۔''
''ان کو بھی پتا چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر میں واپس آگئی۔ جب میں اپنے کوارٹر میں داخل ہو رہی تھی تو میں نے شرافت کو آتے دیکھا۔ وہ سوا پانچ فٹ قد کا دبلا اور چھوٹا سا آدمی تھا۔ چینیوں جیسے نقوش اور چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔ دیکھا جائے تو اس نے حسینہ جیسی جوان اور خوب صورت لڑکی سے شادی کرکے اس پر ظلم کیا تھا۔ مگر یہ ان کا رواج تھا وہاں اکثر ایسی ہی بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں۔ وہاں لڑکی خریدی جاتی ہے یعنی لڑکی کے باپ یا بھائی کو منہ مانگی رقم دی جاتی ہے تب وہ اس کی شادی کرتے ہیں۔ حسینہ نے بتایا کہ شرافت نے اس کے باپ کو پورے تیس ہزار روپے دیے تھے تب اس نے شرافت سے اس کا نکاح پڑھوایا۔ میں دنگ رہ گئی ایک جیتی جاگتی اور حسین مورت جیسی لڑکی صرف تیس ہزار میں بک گئی تھی۔ فائدہ اس کے باپ نے اٹھایا تھا اور اب شرافت اٹھا رہا تھا مگر اسے علم نہیں تھا کہ حسینہ کیسے اس کی عزت کو داغ لگا رہی ہے۔
شرافت اس کے بعد پورے ایک ہفتے تک اسلام آباد والی کوٹھی نہیں گیا۔ ایک ہفتے بعد شام کا کھانا جلدی آیا تو میں سمجھ گئی کہ شرافت آج اسلام آباد والی کوٹھی جارہا تھا۔ وحید نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ اس روز میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں کھانا کھا کر جلد لیٹ گئی۔ وحید نے چائے کے ساتھ مجھے پین کلر دی تھی۔ میں سوئی تو نصف رات کے قریب میری آنکھ کھلی اور دوسری بار میں شور سن کر اٹھی تھی۔ نزدیک سے نسوانی چیخوں کی آواز آرہی تھی اور پھر یہ چیخیں دردناک ہو گئیں۔ میں کوارٹر سے باہر آئی تو شاہد اور رانی بھی باہر نکل آئے تھے۔ اسی لمحے خون میں نہایا ہوا اور ہاتھ میں بڑا سا خون آلود چھرا تھامے شرافت اپنے کوارٹر سے باہر آیا۔ نسوانی چیخیں بھی خاموش ہوگئی تھیں۔ اس نے ہمیں دیکھا اور چھرا لہراتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کے جانے کے بعد شاہد ہچکچاتے ہوئے شرافت کے کوارٹر میں گیا۔ رانی مضبوطی سے مجھے پکڑے ہوئے تھی۔ کچھ دیر بعد شاہد الٹیاں کرتا ہوا باہر آیا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔
''اس نے دونوں کو...... قتل کر دیا۔''
یہ سن کر رانی نے زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ میں لرزتے قدموں سے کوارٹر کی طرف بڑھی۔ پہلے کمرے کے دروازے کے عین سامنے حسینہ کی عریاں لاش پڑی تھی۔ شرافت نے اسے بہت بری طرح سے مارا تھا۔ اس کا چہرہ اور گردن کا گوشت باہر آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا

دل بھی متلایا اور میں نے قے کر دی۔ مگر میں رکی نہیں، ہمت کر کے آگے بڑھی اور دوسرے کمرے تک آگئی جہاں وحید بھی بے لباس حالت میں یوں پڑا ہوا تھا کہ اس کی کھلی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ شرافت نے اسے گلے اور سینے پر وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں کچھ دیر اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر چکرا کر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو پولیس آچکی تھی اور ضابطے کی کارروائیاں کی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنے کوارٹر میں ہوش آیا تھا۔ رانی میرے پاس تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اس نے رندھے لہجے میں کہا۔

"باجی یہ کیا ہوا؟"

"وہی جو ایک دن ہونا تھا۔" میں بھی رونے لگی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا ہی شوہر ملوث ہے۔"

رانی نے آنسو پونچھے۔ "شرافت پکڑا گیا ہے۔ وہ بھاگا نہیں تھا باہر جا کر بیٹھ گیا تھا۔"

مجھے اس وقت وحید یا شرافت کا نہیں بلکہ اپنا خیال تھا کہ میرا کیا ہوگا۔ پچھلی بار جب شرافت اسلام آباد گیا اور وحید نے میرے لیے جو چائے بنائی وہ میں نے نہیں پی کیونکہ میں اسے اس میں کچھ ملاتے دیکھ چکی تھی۔ اس کے سامنے سونے کی اداکاری کی اور جب وہ چلا گیا تو میں اس کے پیچھے آئی اور اسے شرافت کے کوارٹر میں جاتے دیکھا تھا۔ اس رات صرف رانی نے ہی نہیں میں نے بھی آوازیں سنی تھیں۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس والے نے آکر میرا بیان لیا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ وحید ملازمت کے سلسلے میں یہاں تھا اور ہماری کچھ عرصے پہلے شادی ہوئی تھی۔ پولیس والے نے میرا نام پوچھا اور پس منظر کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ البتہ اس نے واردات کے بارے میں بہت سے سوال کیے تھے اور میں نے اکثر کا جواب نفی دیا کہ میں نہیں جانتی یا مجھے نہیں پتا تھا۔ بیان لے کر مجھ سے اس پر سائن کروائے گئے اور پولیس والے لاشوں اور شرافت کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے لیے یہ پکا پکایا کیس تھا۔

میاں صاحب بھی آگئے تھے اور انہوں نے پولیس سے کہہ دیا تھا کہ اس کی تشہیر نہ کی جائے۔ ورنہ ان کا نام آئے گا اور ان کی بدنامی ہوگی۔ قاتل پکڑا گیا تھا کیس خاموشی سے نمٹا دیا جائے۔ پریس ریلیز میں ان کا نام نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اخبارات یا میڈیا میں اس کے بارے میں بنا کسی حوالے کے خبر آئی۔ صرف مقتولین کا نام بتایا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر بیوہ ہوگئی۔ میرا دوسرا شوہر بھی قتل کر دیا گیا۔ وہ میرے پہلے شوہر کا قاتل تھا اور اس کی اصل قاتل میں ہوں۔ کیونکہ اس رات میں نے کوٹھی میں جا کر میاں صاحب کی اسلام آباد والی کوٹھی کال کی اور حسینہ بن کر شرافت سے بات کرانے کو کہا۔ جب وہ کال پر آیا تو میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ تمہاری بیوی اس وقت اکیلی نہیں بلکہ ایک مرد کے ساتھ ہے۔ میں نے کوشش کی کہ آواز بدل لوں اور جس طرح خاموشی سے کوٹھی میں گئی تھی اسی طرح واپس آگئی۔ خوش قسمتی سے شرافت نے بھی پولیس کو کال کا حوالہ نہیں دیا۔ وہ میاں صاحب سے طبیعت خرابی کا کہہ کر واپس آیا تھا۔ اس نے پولیس کو بھی یہی بیان دیا کہ وہ اتفاق سے واپس آیا تھا اور اس نے اشتعال میں یہ دونوں قتل کیے۔

اس موقع پر رانی اور شاہد نے میرا بہت ساتھ دیا۔ انہوں نے میرا خیال رکھا اور جب وحید کے گھر والے آئے اور انہوں نے مجھ پر چڑھائی کرنا چاہی تب بھی انہوں نے میرا دفاع کیا۔ وہ وحید کی لاش لے کر چلے گئے تھے۔ البتہ میرے گھر والے نہیں آئے۔ حالانکہ پتا انہیں بھی چل گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اب تک میں سرونٹ کوارٹر میں رہ رہی تھی۔ میاں صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جب تک چاہوں یہاں رہ سکتی ہوں۔ مگر میں بنا کسی جواز کے ایسے ہی تو یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر میاں صاحب نے مجھے ذرا دوسرے انداز میں سہارا دینا چاہا۔ بہ ظاہر وہ مجھے ملازمت کی پیشکش کر رہے تھے مگر میں سمجھ گئی تھی کہ یہ ملازمت کس قسم کی ہوگی اور میں ایسی ملازمت کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے ایک دن خاموشی سے کوٹھی سے نکل آئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنے گھر جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے وہاں میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔ شاید میرا انجام بھی وحید والا ہو مگر دنیا والوں کے ہاتھوں ذلت اٹھانے سے بہتر ہے کہ میں اپنوں کے ہاتھوں عزت سے مر جاؤں۔ اماں نے ابا سے ٹھیک کہا تھا میں مرد میں شراکت برداشت کرنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں نے وحید کو عنایت کا قتل معاف کر دیا تھا مگر جب میں اسے حسینہ کے کوارٹر میں جاتے دیکھا تو میری برداشت جواب دے گئی۔ جانے سے پہلے میں اپنی یہ کہانی لکھ کر اپنے پسندیدہ رسالے کو بھیج رہی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میرا انجام نامعلوم ہو۔



# اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

## دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ہاشمی گذشتہ 25برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہِ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

### دوغلا پن شخصیت کا حصہ

○ پیر صاحب! زندگی عجیب سی الجھنوں میں گزر گئی، چھوٹی تھی تو یوں لگتا تھا کہ بڑی ہو جاؤں گی تو سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ 7 برس کی تھی جب والدہ فوت ہو گئیں، رشتے داروں کے زور دینے پر والد صاحب نے دوسری شادی کر لی، سوتیلی ماں کا جو روایتی سلوک تھا میری نئی والدہ بالکل اس کے الٹ تھیں، نہایت محبتی اور پیار کرنے والی، انہوں نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا، مگر سچی بات یہ ہے کہ میں نے انہیں سوتیلی ماں سے زیادہ نہیں سمجھا، ہمیشہ ان کو آڑے ہاتھوں لئے رکھا، ان سے میرے تین بہن بھائی پیدا ہوئے مگر پھر بھی میرا پیار نفرت کو نا چھوڑ سکا، انہوں نے بہت اچھی جگہ میری شادی کی، مگر اس رشتے کی ساری برائی صرف یہ تھی کہ یہ میری ماں کی پسند تھا، میرے سسرال کی اچھائیاں، میرے شوہر کا والہانہ پن سب سے مجھے الجھن ہوتی تھی، میں آج یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میں اچھی بیٹی، اچھی بیوی اور اچھی ماں نا بن سکی، بس عجیب سی لاتعلقی، زہریلا پن اور دوغلا پن میری شخصیت کا حصہ رہا، سب میری خوبصورتی اور سلیقہ مندی کی تعریف کرتے ہیں، مگر میں سچی خوشی سے محروم ہوں میں بچوں کی طرح ہنسنا، کھلکھلانا چاہتی ہوں بے ساختہ گفتگو کرنا چاہتی ہوں مگر یہ سب نہیں ہوتا، ایک بار پہلے بھی آپ سے ملنے آئی تھی مگر اس دن بہت زیادہ لوگ تھے آپ نے کہا تھا کہ تفصیلی بات چیت کے لیے تھوڑا انتظار کر لیجیے مگر میں اٹھ کر آ گئی تھی، آج پھر آپ سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں ذہنی و دلی سکون کے لیے کوئی اسمِ الٰہی بتائیے، مجھے اپنی بیعت میں قبول فرما لیجیے، بہت تھک چکی ہوں۔ زہرہ۔ کراچی

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی روحانی کیفیت میں مثبت تبدیلی عطا فرمائیں۔ ماشاء اللہ۔ بعض اوقات بچپن کی تشنگی، محبت کی کمی بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہے، آپ کے معاملے میں استخارے سے یہ کیفیت سامنے آئی ہے کہ آپ کی والدہ کی طویل بیماری نے آپ کو خوف میں مبتلا رکھا، بنیادی طور پر آپ اس چیز سے خوفزدہ تھیں کہ آپ کی امی مر جائیں گی تو کیا ہوگا اور امی کے انتقال کے بعد جو آپ نے سال ڈیڑھ سال کا عرصہ تنہائی میں گزارا وہ آپ کی شخصیت کا حصہ بن گیا اور آپ چھن جانے کے خوف میں مبتلا ہو گئیں۔ میری بہن، کمی ہم سب کی زندگی میں کوئی نا کوئی ضرور ہوتی ہے بس ہمیں اس کو ہمت، جرأت سے پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، آپ ہر نماز کے بعد 170 مرتبہ آیت کریمہ پڑھا کریں، جب آپ اپنی بھانجی کی شادی میں لاہور آئیں تو بیعت بھی کر لیجیے گا۔

### مجھے کوئی متاثر نہیں کرتا

○ میری بیٹی کے رشتے بہت آتے ہیں مگر وہ ان کو کوئی نا کوئی بہانہ بنا کر مسترد کر دیتی ہے، حالانکہ ہم نے کہا ہے اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو اس کو بلا لو مگر وہ کہتی ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں اگر کوئی مجھے متاثر نہیں کرتا تو میں کیا کروں، میرا دل آمادہ نہیں ہوتا، یہاں کئی عاملوں کو دکھایا وہ کہتے ہیں کہ اس پر سایہ ہے، اب یہ تو اللہ ہی جانے کہ کیا مسئلہ ہے مگر اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کی دوسری بہنوں کا رشتہ بھی نہیں ہو رہا ہے، گھر میں یکے بعد دیگرے چار بچی شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں لیکن اس کی وجہ سے مسلسل تاخیر ہو رہی ہے، آپ سے روحانی علاج و عمل کی استدعا ہے۔ فاطمہ باقر۔ راولپنڈی

☆ آپ کی صاحبزادی کے لیے لوحِ تسخیر خاص، نقوش ارسال کیے جا

رہے ہیں 90 دن کے بعد کیفیت بتایئے گا، انشاء اللہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا جب شادی طے ہو جائے تو سیدہ کائنات جگر گوشہ رسول خداؐ سیدہ فاطمتہ الزہرہؓ کی نذر حسب توفیق بروز جمعہ کروا دیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی بیٹیوں کا نصیب اچھا کرے۔ (آمین)

لڑنے مرنے پر آمادہ

O سرکار! آپ کا صفحہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کئی سال پہلے آپ کے ہی ذریعے اللہ تعالیٰ نے بہت سے خوفناک حالات سے گزرنے میں مدد عطا کی تھی آج بہت طویل عرصے کے بعد آپ کو پھر سے پا لیا، اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ عطا کر دیا، ایک وقت تھا جب گمان ہی نہیں تھا کہ میں کبھی دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکوں گا۔ اب ایک اور مسئلہ درپیش ہے میرے سالے صاحب نے اپنی پسند کی شادی کی تھی شروع میں والدین راضی نہیں تھے لیکن پھر بیٹے کی خوشی کے آگے مجبور ہو گئے، مگر شادی کے بعد سے وہ بالکل بدل گیا، والدین سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا، بہنوں سے قطع تعلق کر لیا، چھوٹا بھائی اپنے سپر سٹور کو سنبھالتا تھا اس سے لڑ جھگڑ کر سارے سٹور کے کام کو سنبھال لیا مگر 6 مہینے میں ہی دو ڈھائی لاکھ سیل والا سٹور تباہ کر دیا، بیوی کے مسلسل کہنے میں ہے غرض گھر کا سکون برباد ہو گیا ہے، سسرال والے بات بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ہم لوگ سخت پریشان ہیں اوپر سے خاتون کے کسی اندرونی نقص کی وجہ سے اولاد کے امکانات بھی نہایت محدود ہیں، ہم کیا کریں روحانی راہنمائی عطا کیجئے۔ شہزاد اکرم۔ سیالکوٹ

☆ اللہ تعالیٰ خیر و عافیت رکھے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا فتاح یا قوی" پڑھ کر دعا کیا کریں۔ آپ کو فتح نامہ ارسال کیا جا رہا ہے 90 دن کے بعد حالات سے مطلع کیجئے گا۔ گیارہویں شریف میں آپ تمام فیملی کے ہمراہ شریک ہو سکتے ہیں۔

دل کا مریض

O میری شادی کو 22 سال ہو گئے ہیں ساری عمر والدین کی خدمت کی۔ 17 برس سعودیہ میں رہا ساری کمائی والدین کے سپرد کی ان کی ہی مرضی سے شادی کی، باقی بھائی بہت چھوٹے تھے ان کو پڑھایا لکھایا آج میرے حالات بہتر نہیں ہیں، کئی بار والد صاحب سے کہا کہ وہ مکان آپ نے میری کمائی سے بنایا تھا اب کوکہ سارے بھائی اس میں حصے دار بن گئے ہیں میرا شریعت کے مطابق حصہ دے دیں، میرے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں لیکن والد صاحب کسی بھی صورت حصہ دینے پر آمادہ نہیں ہیں الٹا وہ یہ کہتے ہیں کہ تم نے کیا کیا؟ اب بتایئے میں کیا کروں؟ باون برس کی عمر میں دل کا مریض ہو گیا۔ تین بیٹیاں جوان ہیں جبکہ اکلوتا بیٹا ابھی تیرہ برس کا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ آپ کوئی روحانی حل تجویز فرما دیں کہ والد صاحب حصہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ محمد نور اللہ۔ نواب شاہ

☆ عزیزم! ہر نماز کے بعد "یا عزیز یا قوی" پڑھ کر دعا کر لیں۔ آپ کے والد صاحب ضرور حصہ دیں گے، لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے، محفل درود شریف میں آپ کے لئے خصوصی دعا کی گئی ہے۔

جنات کا بسیرا

O پیر صاحب! ہم نے بڑی محنت سے گھر خریدا ہے۔ دو سال تو بہت اچھے گزرے پھر گھر میں آہستہ آہستہ مسائل پیدا ہونا شروع ہو گئے کبھی الماری میں رکھے ہوئے کپڑے خود بخود گیلے ہو جاتے، کٹ جاتے، کبھی دیواروں پر دسیوں چھپکلیاں نظر آنے لگتیں کبھی یوں لگتا ہے کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے مگر کوئی نہیں ہوتا مگر اب تو حد ہی ہو گئی ہے، ہم لوگ بہت زیادہ ڈرنا شروع ہو گئے ہیں عجیب قسم کی کیفیت رہتی ہے، کئی عاملوں کو دکھایا سب یہی کہتے ہیں کہ جنات کی ٹولی یہاں بسیرا کئے ہوئے ہے آپ ہماری مدد کیجئے ہم اس مکان میں رہنا چاہتے ہیں۔ امیر علی۔ کراچی

☆ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جو بھی مخلوق پیدا کی ہے اس کے لئے کچھ ضوابط بھی مقرر کیے ہیں خصوصاً جب جنات کے معاملات آتے ہیں تو پھر ان اصولوں کو سمجھنا بہت اہم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہزار فیصد اثر ہے لیکن اس کے لئے زبان و قلب کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ آپ سورۃ بقرہ کا آخری رکوع صبح شام 9 مرتبہ پڑھا کریں۔ آپ کو روحانی علاج ارسال کیا جا رہا ہے گھر میں پانچوں وقت اذان و نماز کا اہتمام کریں۔ 90 روز کے بعد صورت حال سے مطلع فرمائیں۔

نقش آدم و حوا علیہ السلام

O پیر صاحب! میں نے ایک علم جفر کے ماہر سے سنا ہے کہ کوئی نقش حضرت آدمؑ اور حواؑ سے بھی منسوب ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کے فوائد کیا ہیں؟ روبینہ کوثر۔ کراچی

☆ بیٹی! آپ نے صحیح سنا ہے نقش حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ علی الترتیب ۱۵ اور ۴۵ کا ایک مثلثی نقش ہوتا ہے اس نقش کو عموماً ایسے افراد کے لئے تیار کیا جاتا ہے جن میں وہ لوگ جو ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے ہوں، خصوصاً میاں بیوی کی ناراضگی کے حوالے سے یہ نقش علمائے جفر تیار کرتے ہیں اسی طرح محبت کے معاملات میں بھی اس نقش کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آستانہ عالیہ پر حضرت آدمؑ کے نقش پا کی شبیہ مبارک موجود ہے جہاں ہر اتوار کو بعد محفل درود شریف خواتین و حضرات زیارت بھی کرتے ہیں اور حضرت آدمؑ کے وسیلے سے دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام تمام عالم انسان کے جد امجد ہیں، ان کے وسیلے سے مانگی ہوئی دعائیں ضرور شرف قبولیت پاتی ہیں۔

ماں بننے سے خوفزدہ

O میری بیوی ماشاء اللہ بہت سمجھدار پڑھی لکھی ہیں، ہماری شادی کو 7 سال ہو گئے ہیں ایک بیٹا ہے اس بیٹے کی پیدائش پر کافی پیچیدگیاں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے بیگم کو شدید تکلیف اٹھانی پڑی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ دوبارہ ماں بننا نہیں چاہتی ہیں، کہتی ہیں کہ وہ اس مرحلے سے گزر نہیں سکتی ہیں، جبکہ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک اور اولاد سے نواز دیں۔ دراصل ہمارے ہاں بچے بہت کم ہیں میرے دونوں بھائیوں کے ہاں ایک ایک بچہ ہی ہے، ہم تین بھائی ہیں لیکن اس کے باوجود گھر خالی سا لگتا ہے، ہمیں ایسا روحانی علاج عطا کریں کہ جس سے بیگم راضی ہو جائیں نہایت شکر گزار رہوں گا۔ سید عباس حیدر۔ حیدر آباد

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی خوشیوں سے نوازے۔ (آمین) آپ کی بیگم دوران زچگی پیش آنے والی پے چیدگی اور تکلیف سے خوفزدہ ہو گئی ہیں، ان کے لئے لوح اسم ذات ارسال ہے۔ "یا اللہ یا حفیظ یا قوی" ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

شدید آرزو

O میری شادی کو 4 سال کا عرصہ گزر گیا ہے ایک بار امید ہوئی تھی لیکن وہ ضائع ہو گیا پھر اس کے بعد کوئی معاملہ نہ بن سکا، ڈاکٹری رپورٹس کے مطابق ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی امید نہیں ہوتی، بعض اوقات یہ ضرور ہوتا ہے کہ بیوی رات کو بہت بری طرح ڈر جاتی ہے، بہت علاج کروایا مگر افاقہ نہیں ہوا، اولاد کی شدید آرزو ہے کوئی روحانی علاج کیجئے۔ محمد علی۔ ساہیوال

☆ از روئے استخارہ آپ کی بیگم کسی حسد کے باعث بدعمل کے زیر اثر ہیں۔ سورۃ بقرہ کا آخری رکوع ہر نماز کے بعد 9 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف، آپ کے لئے بطور روحانی علاج نقش علاج درعقیم ارسال کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے یقین ہے کہ وہ آپ کو پنجتن پاک کے طفیل اولاد عطا فرمائے گا۔

محبت غیر کی ہے

O ہم گزشتہ 15 سالوں سے یہاں رہتے ہیں، ہر قسم کی سہولت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں کہ کسی سے کچھ بتا بھی نہیں سکتے ہیں، ہماری بیٹی کو ایک غیر مسلم سے محبت ہو گئی ہے، غیر مسلم وہ بھی ہندو، لیکن کیا کریں بیٹی کسی صورت کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے، کہتی ہے کہ میں کیا کروں میرا دل ہی نہیں مانتا اس کے علاوہ کچھ سوچنے کو لیکن ایسا کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنی بیٹی اس طرح بیاہ دیں، منت مرادوں کی پالی ہوئی بیٹی کے لئے سخت پریشان ہیں کوئی ایسا روحانی علاج بتا دیں کہ جس سے بیٹی کا دل اس سے پھر جائے اور وہ کوئی بھی کلمہ گو لڑکا پسند کر لے، ہمیں پسند کی شادی پر اعتراض نہیں مگر ایسی پسند سے توبہ ہی بھلی یہاں ایسی کئی مثالیں ہیں مگر جوان بچوں کو کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے، آپ سے التجا ہے کہ اس مسئلے کا حل فرمائیں۔ شمسہ۔ نارووال

☆ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ (آمین) اللہ تعالیٰ اسی لئے مال اور اولاد دونوں کو ہی آزمائش قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر آزمائش میں ہم سب کو سرخرو رکھے۔ (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا ہادی یا حفیظ یا مانع" پڑھ کر دعا کیا کریں آپ کے لئے لوح تسخیر خاص اور نقوش ارسال کئے جا رہے ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

یاد کروں بھول جاؤں

O امتحانات سر پر کھڑے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ جو یاد کروں وہ بھول جاؤں کے مترادف، رات رات بھر رٹے لگا لگا کر یاد کرتے ہیں مگر پھر سب بھول جاتا ہوں، یوں لگتا ہے کہ سلیٹ کی طرح ذہن بالکل صاف ہے، میری طرح اور بھی ہوں گے، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ امتحانات کے ساتھ ہی یہ مسئلہ کیوں ہوتا ہے، پورے سال ہی تمام ٹیسٹوں میں اچھے نمبر ہوتے ہیں مگر امتحانات کے نزدیک بالکل صفر، کوئی کہتا ہے کہ نظر لگ گئی ہے کوئی کہتا ہے کہ جادو ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا مسئلہ ہے اس کا روحانی علاج کیجئے۔ احسن علی۔ خوشاب

☆ عزیزم! اس بھوت کو امتحان کا خوف کہتے ہیں اور آپ جیسے نوجوان دوست اس بھوت کا شکار ہیں مگر آپ ہرگز نہ گھبرائیں، "سورۃ الم نشرح" ہر نماز کے 13 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کر کے پی لیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف، آپ کی کامیابی کے لئے لوح ارسال کی جا رہی ہے ساتھ میں نقوش اور تعویذ خاص بھی ہیں، امتحانات میں کامیاب ہونے کی مٹھائی ضرور کھلائے گا۔ انشاء اللہ

روحانی سکون

O محفل درود شریف میں شرکت کی بے حد روحانی سکون میسر آیا،

طبیعت ہلکی ہوگئی، والدہ بھی بہت خوش تھیں پھر آپ کی دعا نے دل کا بوجھ ہلکا کردیا یوں لگا کہ جیسے تمام مسائل ہی حل ہوگئے ہیں آئندہ سے ہم تمام لوگ باقاعدگی سے حاضری دیں گے، اس دن تورش بھی بہت تھا دوسرے آپ جیسی شخصیت کے سامنے اپنے مسئلے کے متعلق زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہورہی تھی، اس لئے خط کا سہارا لے رہا ہوں، مجھے ایک خاتون سے محبت ہوگئی ہے لیکن میری والدہ نہیں مانتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پہلی شادی کسی وجہ سے ختم ہوگئی تھی، شادی کے 4 ماہ کے بعد ہی طلاق ہوگئی تھی، کوئی بچہ نہیں میری والدہ کو لڑکی بہت پسند تھی مگر جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے صاف انکار کردیا، جبکہ میرا موقف یہ ہے کہ یہ حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا تھا وہ میری بہن بھی ہوسکتی ہے تو کیا اس کا مطلب ہے کہ سزا ہمیشہ لڑکی کو ہی ملتی رہے؟ میں ان ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ مہربانی فرما کر کوئی روحانی حل تجویز فرمادیں کہ والدہ بھی خوشی راضی ہوجائیں۔ محمد اسحاق۔ شیخوپورہ

☆ میاں! اچھے ارادے والے ضرور کامیاب ہوتے ہیں ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف ابراہیمی پڑھ کر دعا کیا کریں۔ لوح تسخیر خاص ارسال ہے، محفل درود شریف میں ہر فرد کو خوش آمدید کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کے طفیل ہم سب کی مرادوں کو پورا فرمائے۔ (آمین)

زکوٰۃ۔ ڈنڈی نہ ماریں

○ میں یہاں 8 سالوں سے رہتا ہوں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے پہلے بہت اچھا چلتا تھا مگر نجانے کیا ہوا کہ گاہک راستہ ہی بھول گئے ہیں پہلے رات 9 بجے تک تمام فوڈ اسٹف ختم ہوجاتا تھا، مگر اب 12 بج جاتے ہیں اکا دکا گاہک ہی آتے ہیں، بہت نقصان ہورہا ہے جی چاہتا ہے کہ بند کردوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ کیا کروں گا، پاکستان میں بھی کچھ نہیں ہے بیوی بچے بھی ساتھ ہیں خرچہ بہت ہے کوئی روحانی حل بتائیں تاکہ اس مشکل سے خلاصی مل جائے۔ عارف حسین۔ العین۔ یو اے ای

☆ عزیزم! مشکلات سے گھبراتے نہیں نظر اور حسد کا یہ دور عارضی ہے ہر نماز کے بعد 161 مرتبہ "یاوہاب یافتاح" پڑھ کر دعا کیا کریں۔ زکوٰۃ میں ہرگز ڈنڈی نہ ماریں۔ آپ کے لئے لوح اور نقوش ارسال کئے جارہے ہیں۔

روزے رکھوانا

○ والدہ بہت ضعیف ہیں شوگر اور ہارٹ کی مریضہ ہیں اب وہ روزے نہیں رکھ پاتیں ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ رمضان المبارک میں کوئی عبادت گزار مرد و خاتون کو روزے رکھوادیں، آپ اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کیجئے۔ فردوس عطا۔ پشاور

☆ آپ ادارے کے نمبر 042-35168036 پر رابطہ کرلیجئے۔

## محفل درود شریف ﷺ

ہر اتوار دوپہر 2 بجے تا 4 بجے منعقد ہوتی ہے

الحمدللہ آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ پر محفل درود شریف باقاعدگی سے گزشتہ کئی برسوں سے ہورہی ہے۔ جس میں سرکار دو جہاں سرور انبیاء حضور اکرم نور مجسم محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور درود شریف کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اور اختتام پر زندگی میں پیش آنے والے جملہ مسائل کے لئے اجتماعی دعا کی جاتی ہے خواتین کے لئے علیحدہ انتظام ہوتا ہے تمام عاشق رسول ﷺ خواتین و حضرات کو شرکت کی تاکید ہے۔

## تصانیف پیر شاہ محمد قادری

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ، عملیات اسماء الحسنیٰ، خواب اور تعبیر، بچوں کے خوبصورت نام، عملیات سے تصوف تک، ہاتھوں میں تقدیر، سید نا غوث الاعظم، جادو اور جنات، ہر اچھے بک اسٹال پر دستیاب ہیں۔

## ختم گیارھویں شریف

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ میں ہر مہینے کی پہلی اتوار کو صبح 10 بجے تا 2 بجے ختم گیارھویں شریف محفل نعت کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ محفل کے اختتام پر پیر شاہ محمد قادری خصوصی طور پر مریدین، عقیدت مندان اور ملک و ملت کی خوشحالی، حفاظت اور سلامتی کے لئے دعا کراتے ہیں۔

نوٹ: وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔ خواتین کے لئے باپردہ اہتمام ہوتا ہے۔ شرکاء کے لئے لنگر کا اہتمام ہوتا ہے۔

**ملاقات: صبح 11 تا 7 بجے شام**

آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ پیر شاہ محمد قادری
382-A/2 جوہر ٹاؤن نزد محمد علی چوک، کالج روڈ۔ لاہور
042-35168036
042-35167842
0302-5555967
0335-2911117